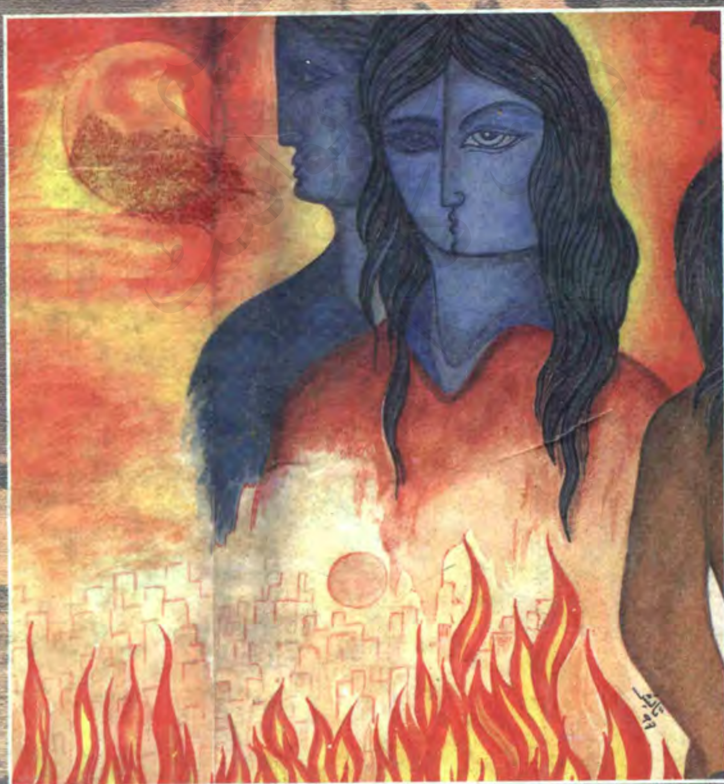
مستنصر حسین تارڑ

راکھ



مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ
بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا
عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿١٨﴾

جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی
مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور کی ہوا
چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے یہی
سب سے بڑی گمراہی ہے ○ ابراہیم ۱۸

کوئی کچھ بھی کہے، کہے مجھے کیا
بات جو میرے دل میں ہے، میں اگر
آج اپنی زبان پہ لا نہ سکا،
کل، میرے بعد، تیری منڈلی پہ جب
آگ برسے گی -- کون بولے گا!

مجید امجد

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں — ان میں سے ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس — اور وادیٔ سوات کا ایک سلیٹی منظر ہے — اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے — اور چوک چکلہ ہے۔

چار چیزیں ہیں....

''پانی ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں — '' ملاح نے جواب دیا۔

کیا یہ — پانی پیا جا سکتا ہے؟''

''نہیں — یہ ٹھہرا ہوا ہے، اس میں مچھلیاں اور مینڈک مرتے رہتے ہیں.. اور — رات کو سؤر بھی یہیں آتے ہیں، پینے کے لیے۔''

ملاح نے ''سؤر'' کا لفظ نہیں بولا تھا، بلکہ ''باہر والے'' کہا تھا تاکہ اس کی زبان پلید نہ ہو جائے..

اگر اس ملاح کو یہ معلوم ہو جائے کہ انگلستان میں متعدد بار بیکن اینڈ ایگ کا ناشتہ اس حقیر کے حلق سے اتر چکا ہے تو اس کا کیا ردِ عمل ہو گا....

کشتی سرکنڈوں کی جانب جا رہی تھی۔

''جلدی کرو، روشنی ہو رہی ہے۔''

''اور کتنی جلدی کروں چودھری صاحب — '' ملاح ناگواری سے بولا۔

سرکنڈوں کے اندر پانی کی سطح پر سے دھند اُٹھ رہی تھی... اس کی سفیدی میں سرکنڈوں کے پیکر ہولے ہولے حرکت کرتے تھے اور یہاں چونکہ گہرائی کم تھی اس لیے کہر کی ایک پتلی چادر پانی پر اکڑی ہوئی پڑی تھی اور کشتی کی روانی اس باریک شیشے کو کرچ کرچ کرتی چلی جا رہی تھی۔

''اس بوتل میں پانی نہیں ہے؟ — '' ملاح نے گردن کو بل دے کر پیچھے دیکھا۔

اور ان تین شکاری تھیلوں کو دیکھا جن میں سے ایک کے فلیپ کو دوہرا کرتی فلاسک باہر جھانکتی تھی۔

"نہیں — اس میں کافی ہے۔" اس نے اپنی افغانی جیکٹ کی جیب میں انگلیاں سیدھی کیں۔

"کھانے کو کچھ نہیں لائے چودھری صاحب —"

"ہوں —" اس نے سرہلایا۔ "یہ سوئیس لوگے؟" اس نے سوئیس کا ایک پیکٹ ملاح کے آگے پھینک دیا۔

"مہربانی جی —" ملاح نے پیکٹ کرتے کی جیب میں ٹھونس لیا۔

اندھیرے میں لَو دیتے ڈائل کو وہ اپنی آنکھوں کے قریب لایا — ابھی سورج نکلنے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔

کشتی کی رفتار یکدم دھیمی پڑ گئی۔ ملاح نے چپو اٹھا لیے تھے اور کشتی کا سرکنڈوں کو روندتا چلا جا رہا تھا اور سرکنڈے ابھی سیدھے کھڑے ہیں اور ابھی کشتی آگے پیچھے چلے جا رہے ہیں... کشتی اٹک اٹک کر رکنے لگی تو ملاح نے پھر پیچھے دیکھا "یہا ٹھیک ہے جی؟"

"نہیں —" اس نے فوراً کہا "یہاں ہم نظر آ جائیں گے — ذرا ادھر کنار کے قریب جو ڈِھب ہے ادھر لے چلو —"

ملاح نے اس کے فیصلے کو پسند نہیں کیا اور ذرا بے توجگی سے پھر چپو اٹھا لیے...

وہاں ڈِھب اور سرکنڈوں میں وہ بالکل اوجھل ہو گئے۔

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ —"

ملاح نے اپنے تہمد کی گرہ ڈھیلی کی اور اُسے کھول کر سر پر رکھ لیا۔ پانی میں اتر سے پیشتر اس نے سوئیس کا پیکٹ بھی کرتے کی جیب میں سے نکال لیا۔ لیکن یہ احتیاط ضروری تھی کیونکہ یہاں پانی گھٹنوں سے اوپر نہیں آتا تھا۔ زندگی بھر کے یخ تجربے باوجود ملاح نے جونہی پانی میں قدم رکھا اس کے منہ سے بلند آہنگ میں ایک نہایت گالی برآمد ہوئی اور اس کا پورا بدن ٹھٹھرنے لگا لیکن کنارہ ساتھ ہی تھا۔ اس باندھتے ہوئے پیچھے دیکھا تو وہ سرکنڈے بھی گہری دھند میں جا چکے تھے جن کے اندر وہ کشتی تھی...

مشاہد علی کشتی کے کناروں کے اندر تک جھکا اور پھر بے حد احتیاط سے ہتھیلیوں کے حصار کے اندر لائٹر کے مدھم شعلے کو بند کر کے ایک سگرٹ سلگا لیا... اور سگرٹ سلگاتے ہی وہ سیدھا ہوا اور اس نے اپنے آس پاس نہایت غور سے دیکھا اور ہر شکاری جو سگرٹ سلگاتا ہے وہ غیر شعوری طور پر ایسے ہی کرتا ہے... اور وہاں جہاں تک وہ اس تاریکی میں گھلتی سفیدی میں دیکھ سکتا تھا، وہاں دُھند اور سرکنڈے تھے اور گلی سڑی گھاس کی بو تھی... اور کوئی نہ تھا۔

وہ آج خوش قسمت رہا تھا — ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شکاری اپنے تئیں کسی نہایت غیر معروف اور دوسرے شکاریوں کی فہم سے اوجھل کسی سپاٹ میں دبکا بیٹھا سگرٹ سلگا کر آس پاس دیکھتا تو ہر جھاڑی اور ہر سرکنڈے میں اسے سگرٹوں کے جگنو دمکتے دکھائی دیتے... دوسرے شکاری وہاں پہلے سے موجود ہوتے... اور کسی معزز شکاری کے لیے اس سے بڑی حرماں نصیبی اور کوئی نہیں ہوتی کہ اس کے دریافت کردہ شاندار سپاٹ پر درجنوں شکاری پہلے سے موجود سینڈوچ کھا کر سگرٹ پی رہے ہوں —

لیکن مشاہد علی آج خوش قسمت رہا تھا — وہاں اور کوئی نہ تھا۔

کشتی کے گیلے پیندے پر اس کے تینوں تھیلے پڑے تھے۔ خوراک والا تھیلا وہی تھا جس میں سے فلاسک جھانکتی تھی اور اس میں برگیتا کے بنائے ہوئے ٹھنڈے سویڈش سینڈوچ بھی تھے... ویڈرز والا تھیلا پچکا پڑا تھا کیونکہ ریکسین کے بنے ہوئے واٹر پروف ویڈرز اس کے بدن پر کھنچے ہوئے تھے... تیسرا تھیلا بھی خالی تھا سوائے چھ نمبر کے کارتوسوں کے تین ڈبوں کے... اور بندوق اس کے گھٹنوں پر آرام کر رہی تھی۔ وہ بار بار اس پر ہاتھ پھیر کر اندھیرے میں مسکراتا... اس کے ذہن میں بہت کچھ آتا اور وہ سر جھٹک دیتا۔ بندوق کی نالیوں کے درمیان اس کی انگلیاں پھسلتی ہوئی چلتی جاتیں اور ہر لمحہ اسے یقین ہوتا کہ ب وہ کسی ابھار پر ہوں گی لیکن وہ تقریباً اسی سطح پر رہتیں... روسی ساخت کی بیکال ایک رصے سے اس کا ساتھ دے رہی تھی... یہ متعدد بار پانی میں بھی گری، جیپ کے آہنی فریم کے ساتھ برابر ٹکراتے رہنے کے باوجود وہ پہلے دن کی طرح مضبوط اور خوش وضع تھی۔ سے بغیر وجہ کے رف اینڈ ٹف نہیں کہا جاتا تھا۔ بیکال یوں بھی ہالینڈ اینڈ ہالینڈ اور پرڈی کی بہت سستی بندوق تھی۔ اس نے اسے ان زمانوں میں حاصل کیا تھا جب اس کا ہاتھ رے تنگ تھا لیکن اب تو وہ ہالینڈ اینڈ ہالینڈ بھی خرید سکتا تھا لیکن بیکال اس کی ساتھی بن

چکی تھی اور وہ اس سے جدا نہیں ہو سکتا تھا.... ویسے بھی جدائی کے دن شاید قریب تھے شکار کے احساس میں، اس کی طلب اور دیوانگی میں اب وہ تقریباً جنسی وحشت مفقود ہو رہی تھی جو پچھلے برسوں میں تھی... جونہی موسم بدلتا تھا، راتیں سرد ہونے کو آتیں اور ہوا بدن کو چھوتی ہوئی اس کے لوں لوں کو کھردرا کرتی تو اس کے پورے بدن میں پرندوں کے پروں کی شائیں شائیں چلنے لگتی... اور تب شکار کی تیاری شروع ہو جاتی... وہ ہر دوسرے چوتھے روز اس سپاٹ پر پہنچ جاتا جہاں اسے دسمبر کے دنوں میں آنا تھا۔ اور سورج طلوع ہونے سے نصف گھنٹہ پیشتر پہنچتا، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ یہاں ہوا کا رخ کیا ہو گا مرغابی کدھر سے آئے گی اور بیٹھنے کے لیے سب سے بہتر جگہ کونسی ہو سکتی ہے... لیکن اس دسمبر میں بدن کو وہ کچھ نہ ہوتا تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا... شاید جدائی کے دن قریب تھے

اس نے کلائی اپنی آنکھوں کے قریب کی... روشنی اب اتنی ہو چکی تھی کہ وہ وقت دیکھ سکتا تھا... بس اب انہیں کسی بھی لمحے آسمان پر نمودار ہونا تھا... اس نے افغانی جیکٹ کی جیبوں میں بھرے ہوئے کارتوسوں کو چیک کیا... بندوق کی نالیوں میں رفٹ کارتوسوں سرخ گولائیوں کو دیکھا اور یہاں وہ پھر مسکرایا۔ کیونکہ کارتوسوں کے درمیان وہ ایک چھ سانپل تھا جس پر زد لگنے سے سب کچھ فائر ہوتا تھا۔ گولائیوں کے درمیان میں ابھرا ہوا اس نے اس سے پیشتر روزمرہ کے استعمال کی اشیا میں جنسی شباہتیں کبھی تلاش نہیں تھیں، یا اسے نظر نہیں آتی تھیں اور اب شاید اس کی عمر ایسی تھی جب بقول کسے ان ڈرٹی اولڈ مین ہو جاتا ہے نہیں ایسا نہیں... یا شاید ایسا ہی ہے.....

آسمان پر سپیدۂ سحر تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا اور اس کی سفیدی پانی کی گہری تاریکی کو بھی کم کرتی چلی جاتی تھی اور تب اس نے دیکھا کہ پانی کی سطح بالکل ہموار ہے...

"اوہ شِٹ" وہ زیرِ لب بڑبڑایا.. اس نے جلدی سے بندوق خالی تھیلوں کے ا رکھی اور ڈولتے قدموں سے چلتا کشتی کے پچھلے حصے میں پڑی اس بوری کو اٹھالایا جس ڈیکائے سنبھالے ہوئے تھے۔ بوری کو کشتی میں الٹ کر وہ پانی میں اتر گیا... ویڈرز واقعی پروف تھے اور اس کی ٹانگوں کو باہر کی یخ سردی کا کوئی اندازہ نہ تھا... جب اس کا موسموں کو سہار سکتا تھا تو وہ کبھی ویڈرز نہیں پہنتا تھا... وہ یخ پانیوں میں اترتا تو اس کا ماس چند لمحوں کے لیے سرد ہوتا اور پھر سنبھل جاتا اور وہ پانی میں اپنے آپ کو کھینچ کھینچ چلتا تو ٹانگوں سے اوپر کا سارا بدن بے چین ہونے لگتا... اور جب پہلی مرتبہ اسے شدید

ہوا اور بہت دن تک بستر پر پڑا رہا تو اسے اگلے شکار پر ویڈرز پہننا پڑے..... اور پہلے روز جب اس کے ماس اور سرد پانی کے درمیان ریکسین حائل ہوئی تو گویا ماس اور پانی کے میل کی لذت ختم ہوئی..... پتہ نہیں کون تھا جو پانی میں مقید تھا، وہ نہ تھا کیونکہ اس کے ماس کو کچھ نہ چھوتا تھا سوائے ویڈرز کے چمڑے جیسے احساس اور ٹھنڈک کے..... جیسے اس نے ایک بڑا کنڈوم پہنا ہوا ہو ـــ ڈرٹی اولڈ مین ـــ

برگیتا بھی اسے ہمیشہ مجبور کرتی اور ایک عرصے سے ماس اور پانی کا میل نہ ہوا تھا۔

وہ پانی کی سطح پر ڈیکائے رکھتا گیا یہاں تک کہ ہلکورے لیتا ہوا ایک نیم دائرہ سا بن گیا..... پانی اور سرکنڈے جیسے آباد ہو گئے۔ وہاں دو درجن مختلف نسلوں کی مرغابیاں بے حس و حرکت تیرتی تھیں اور ان پلاسٹک سے بنے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر ان کے ہم نسلوں نے اپنی پرواز منقطع کرنا تھی اور نیچے ان سے ملنے کے لیے اترنا تھا اور نیچے... مشاہد علی کی دونالی بیکال ان کی منتظر تھی..... اطالیہ کے بنے ہوئے ڈیکائے شکل و شباہت میں اتنے مکمل تھے کہ بعض اوقات شکاری بھی دھوکا کھا کر ان پر فائر کر دیتے تھے...

ڈیکائے پھیلا کر وہ واپس کشتی میں آ گیا..

اس نے بیکال اپنے گھٹنوں پر رکھی اور انتظار کرنے لگا... اور اصلی شکار یہی انتظار تھا.. دھند آہستگی سے پانی پر سے اٹھتی تھی اور تحلیل ہوتی جاتی تھی۔

وہ انتظار کر رہا تھا اور فضا میں ٹھنڈک اور گلتی ہوئی گھاس اور بوسیدہ سرکنڈوں کی بو تھی۔

یہ آس پاس کب تک ہے؟ اس میں ہمیشگی تو نہیں اور اس سارے وسیع علاقے بس کہ جس میں قادر آباد بیراج کے پانیوں کے ذخیرے اور ان میں اگے سرکنڈے اور کناروں پر موسمِ سرما کے سندیسے دیتی کاہی کے لمبے بھٹے دار پھولوں کی سفیدی اور دریائے ناب پر سے شرلاتے بھرتی ہوئی یخ ہواؤں کی سائیں سائیں اور دریا اور بڑے حفاظتی بند کے درمیان پھیلے بیلے کی سیاہ خاموشی اور گہرا بھید اور ـــ میں ہوں تو ان سب میں وجودگی کے کم سے کم لمحے میرے ہیں ـــ مشاہد علی مثیل کے... پانی کی سطح پر ڈولتی یہ رغابیاں دراصل مرغابیاں نہیں ہیں، اپنی ہم نسلوں کے لیے ایک دھوکہ ہیں ایک پھندہ سا... یہ ڈیکائے ہیں زندگی اور پرواز کو ختم کرنے کے لیے...

کم سے کم لمحے میرے ہیں... یہ بوسیدہ اور گلتی ہوئی گھاس کئی برس تک یونہی

کناروں کے ساتھ لپٹے گی اور کبھی ہوا کے زور سے پیچھے ہٹ جائے گی — لیکن یہ ابھی رہے گی — اور میں اس سے بہت پہلے کے لمحوں میں بوسیدہ ہو جاؤں گا — آخر میری قربانی کی کیا ضرورت تھی — میرے بغیر بھی تو سب کچھ جاری و ساری تھا — اور میرے بغیر بھی سب کچھ جاری و ساری رہے گا —

نسل انسانی کا سب سے بڑا کارنامہ — ایک فخر — ایک بلند بانگ آئیڈیل قربانی ہی تو ہے۔ اور قربانی آپ کو کہاں لے جاتی ہے؟... کافرستان کے وہ آلٹر، وہ بڑے بڑے پتھ جن پر لاکھوں بھیڑ بکریاں کٹیں اور ان کا خون بہا — تو پتھر تو پتھر ہی رہا اس پر کیا اثر ہو — یا جن کی قربانی ہوئی — مرضی سے ہاتھ میں پرچم پکڑے ہوئے یا مرضی کے خلاف جنہیں دھکیل دیا گیا ان سب کا End Result کیا ہوا؟

سمیع کا سر سفید ہو گیا ایک رات میں — اسے ایک تین فٹ لمبے اور ایک ف اونچے دراز میں پیک کر کے بند کر دیا گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، سانس کہا ہے، وہ کہاں ہے.. صرف اندھیرے میں وہ کھانستا تھا اور جہاں تھا، وہیں تھا، ہل نہ سکتا اور اس کے ماس میں چیونٹیاں چلتی تھیں اور اس کے دماغ میں بچھو رینگتے تھے... کوئی نہی جانتا کہ اگر کسی کو ایک دراز میں بند کر کے تالا لگا دیا جائے تو اس شخص پر ایک رات میں کیا گزرتی ہے، صرف وہ جانتا ہے جس پر گزری ہو بلکہ وہ بھی نہیں جانتا کیونکہ وہ تو صرف سانس کو کھینچنے اور منہ کھول کر بے آواز چیخنے میں ہی لگا رہتا ہے —

اور سمیع کو جب ساواک والوں نے اس دراز میں سے نکالا تو اس کا سارا سر ہو چکا تھا۔ تو اب سمیع سڑکوں پر گھومتا ہے اور اسے کوئی بھی نہیں پوچھتا کہ تمہارا سر کیسے ہو گیا — اس نے بھی آئیڈیلز کے لیے قربانی دی —

شاہی قلعہ کی گہرائی میں جو کوٹھڑیاں تھیں وہاں بھی آئیڈیلز آئے... اور چونا من کے تہ خانوں میں بھی ہمتوں والے آئے اور اٹک قلعے کی سختیوں کو جھیلنے والے بھی تھے.. لیکن End Result کیا ہوا —

سچ کیا ہے اور ایک بہتر دنیا کا خواب کیا ہے اور کیا اس خواب کے لیے جدوجہ جائز ہے.. اور کس کا کیا سچ ہے؟ کونسا سچ؟... یہ... یہ.. یا... یہ سچ؟...

تمام جنگوں کا End Result کیا ہوا؟.. تھنگ — تھنگ — ڈسٹ ٹو ڈسٹ خاک در خاک اور راکھ راکھ میں —؟

پانی کی قربت کی یخ اس کی ہڈیوں میں اترنے لگی... کیا اتنا وقت ہے کہ دو گھونٹ کافی کے حلق سے اتار لیے جائیں؟... ہاں اتنا وقت ہونا چاہیے — اس نے فلاسک کو تھیلے میں سے کھینچ لیا۔ کافی گرم تھی اور اس کی تمباکو ایسی نشہ دار مہک گلتی گھاس کی بُو سے مل کر اس کے آس پاس پھیلنے لگی۔ کافی کا ذائقہ الگ تھا... یورپی قوموں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی کافی میں ہمیشہ ذائقہ الگ ہوتا تھا حالانکہ کافی اور دودھ وہی ہوتا تھا جن سے وہ خود کافی بناتا تھا اور پھر بھی برگیتا کے ہاتھوں کی کافی میں ایک گرم کڑواہٹ ہوتی تھی... لیکن برگیتا تو یورپی نہیں تھی... وہ تو پاکستانی تھی — کیا وہ پاکستانی تھی؟

اس سے کچھ فاصلے پر سرکنڈوں میں کچھ حرکت ہوئی جیسے کوئی اُن کے اندر اُنہیں پچھاڑتا تھا... خدا کرے کہ ایک دو ہی ہوں — اگر یہ زیادہ ہوئے تو خواہ مخواہ ادھم مچائیں گے اور مرغابی کم از کم میرے علاقے میں تو نہیں اترے گی — سرکنڈے تھوڑی دیر بعد اپنی اپنی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ہاں وہ ایک دو ہی تھے جو پانی پی کر چلے گئے۔

اور پھر ایک اور سرسراہٹ ہوئی... اور اس کے پورے بدن کا نظام جہاں جو کچھ تھا ساکت ہو گیا — پروں کی سرسراہٹ ایک تواتر کے ساتھ اس کے کانوں میں آنے لگی۔ نیچے سیاہ ڈھب اور نیم سیاہ پانی اور سرکنڈے تھے اور اوپر آسمان پر روشنی کے ساتھ ساتھ مرغابیوں کی قطاریں چلی آ رہی تھیں... ان کی پرواز کی شان دیکھنے کے لائق تھی.. وہ ابھی بہت بلند تھیں، اس کے نشانے سے باہر لیکن اس نے اپنے آپ کو تیار کر لیا.. بیکال کی نالی آسمان کی جانب ہوئی اور اس نے اپنے کندھے کو ہلا کر بندوق کے بٹ کو فٹ کیا.. پانی کی سطح پر ساکن پلاسٹک کی مرغابیوں میں بھی گویا جان پڑ گئی اور وہ دھیرے دھیرے ہلنے لگیں، گویا ان کو جو آسمان پر تھیں، بلانے لگیں اور وہ جو آسمان پر تھیں انہوں نے نیچے دیکھا، نیچے جہاں کئی کلومیٹر کے علاقے میں قادر آباد بیراج کے ساکن پانی اور سرکنڈے تھے اور ن میں ایک کنارے کے نزدیک ان کی ہم جولیاں تیرتی تھیں... انہوں نے جو آسمان پر یں پرواز کا مومنٹم توڑا اور سرکنڈوں کی سیدھ میں نیچے اترنے لگیں... اور بس یہی وہ لمحہ ا... مشاہد نے سب سے اگلی مرغابی کے سر سے تقریباً چھ انچ آگے نشانہ باندھ کر فائر کیا اور روق کو مرغابی کے ساتھ ساتھ حرکت میں رکھا تاکہ فائر مکمل ہو جائے... پھر ایک اور فائر ا اور اس نے بندوق نیچے کر لی... ایک مرغابی عین اس کے سامنے آ کر گری لیکن وہ مر ا تھی اور ایک پتھر کی طرح گری.. کچھ فاصلے پر سرکنڈوں کے اندر چھپاک چھپاک کی

آواز آئی اور اس نے مرغابیوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کو اپنے بدن پر محسوس کیا۔ اس نے بندوق کشتی میں رکھی اور جلدی سے پانی میں اتر گیا... سرکنڈوں کے اندر ابھی تک خاصی تاریکی تھی.. اور وہاں مرغابیاں تڑپ رہی تھیں... اس نے پہلی مرغابی پر ہاتھ رکھا اس کی پرواز کی حدت اس کے پروں سے ابھی تک خارج ہو رہی تھی اور اس کا گوشت گرم تھا...

سرکنڈوں سے پرے دریائے چناب کے درمیان میں واقع ریت کے ایک بڑے ٹاپو کی طرف سے متعدد فائر ہوئے اور یہ فائر جس بے ترتیبی سے ہوئے مشاہد نے جان کہ زاہد کالیا اور ڈاکٹر ارشد وہاں پہنچ چکے ہیں — اس نے بندوق کو پھر سے لوڈ کیا اور کچھ سوچ کر اسے تھیلوں پر رکھ دیا۔ چار مرغابیاں کافی تھیں.. ان میں سے ایک شیولر بڑے جسم کی جس کا کھانا گندا ہوتا ہے کیونکہ وہ خود بھی برا کھاتی ہے اور تین نیل سر تھیں مرغابیوں کی چالاک ترین نسل اور کھانے میں بھی بے حد نفیس — یہ کافی تھیں....

آج بارش کے بعد پہلا دن تھا — پچھلے کئی روز سے یہاں سرما کی بارشوں کا تھا اور اسی لیے آسمان مرغابیوں سے سیاہ ہو رہا تھا.. وہ بھی کئی دنوں کے بعد پرواز کے نکلی تھیں.. نیچے اگرچہ نیم تاریکی تھی لیکن وہاں اس بلندی پر ان کے پروں پر پہلی کرنیں تھیں اور وہ ایک مسلسل شائیں شائیں کی آواز سے فضا کو چیرتی یونانی دیومالا سنہری پرندوں کی طرح حرکت کر رہی تھیں — اور ان میں سے چار کشتی کے پیند بے جان پڑی تھیں اور ان کا خون پروں میں سیاہ ہو چکا تھا... زندگی کا End Result کیا — یہی ہے۔

اس نے خوراک کا تھیلا کھول کر اس میں سے سینڈوچ نکالے اور انہیں — سے کھانے لگا۔ برگیتا میں سویڈش پن بہت تھا، وہ تقریباً کچے گوشت کے ٹھنڈے سینڈ بناتی تھی اور انہیں بس نگلا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے کبھی شکایت نہیں کی تھ

آج سویرے وہ تقریباً ڈیڑھ بجے کے قریب لاہور سے چلا تھا اور اس ڈھل میں، دسمبر کی راتوں میں برگیتا کی گرم قربت چھوڑنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا لیکن کے لیے وہ یہ جبر بھی کر لیتا تھا۔ اس کے بدن کی حدت گوجرانوالہ پہنچ کر کم ہوئی، کے آس پاس مدھم ہوئی اور پھر علی پور تک پہنچتے پہنچتے وہ برگیتا سے آزاد ہو چکا تھا نہر کے کنارے جیپ چلاتے ہوئے جب وہ بیراج تک پہنچا تھا تو وہ سب کچھ ماضی تھ

چھوڑ کر آ گئے تھے اور مستقبل صرف قادر آباد کے پانی اور سرکنڈے تھے.... اور جب کوئی شخص سرکنڈوں میں پوشیدہ کشتی میں بندوق گھٹنوں پر رکھے آسمان پر نظریں جمائے گہری توجہ سے سنتا ہے تو — ایک شکار اُس کے اندر ہو رہا ہوتا ہے جو باہر کے شکار سے زیادہ وسیع اور گہرا ہوتا ہے... اور بہت سارے لوگ باہر کے شکار کے لیے نہیں، اندر کے شکار کے لیے، شکار پر جاتے ہیں کہ وہاں ایک سناٹا ہو گا — گلتی گھاس کی بُو ہو گی اور انتظار ہو گا.. مشاہد علی کے اندر کا شکار کم ہو گیا تھا... اور آج اسے احساس ہوا تھا کہ باہر کے شکار کے ساتھ بھی اس کا لگاؤ گھٹتا جا رہا تھا۔

مٹی کے بند کے اوپر ان کی جیپ کھڑی تھی۔ بل کھاتے ہوئے بلند فصیل نما بند پر جہاں تک نظر جاتی تھی کچھ نہ تھا صرف ان کی جیپ کھڑی تھی۔

بند کے دائیں طرف ہریاول کی فصلیں تھیں، مویشیوں کے چارے کا شلغم، اور گندم کے ہرے ہرے بوٹے جو ابھی سر نکال رہے تھے۔ ان کے پیچھے گنّے کے وسیع کھیت تھے جو سیلاب کی صورت میں بقیہ فصلوں کو بچاتے تھے۔ ان سے پرے کاہی سفید ہوتی تھی اور پھر دریائی جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ دریا یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر سردیوں کے آغاز میں بے شمار کونجیں اترتی تھیں کیونکہ وہاں ریت بہت تھی اور نرم تھی۔ جنگل میں جو کالیاں اور ساہن پال والوں کے ڈیرے تھے۔ اس علاقے کی ہریالی کی مثالیں پورے پنجاب میں دی جاتی تھیں اور اسی لیے یہاں ڈھور ڈنگر رکھنے کا زیادہ رواج تھا... رانجھا انہی جنگلوں میں چاکر ہوا تھا۔

زاہد کالیا اور ڈاکٹر ارشد جیپ میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس نے اپنے تھیلے کندھے سے اتار کر جیپ میں رکھے اور پھر جیسے کچھ شرمندگی کے ساتھ چاروں مرغابیوں کو سَر سے اونچا کیا اور سَر ہلا کر انہیں بھی جیپ کے فرش پر پھینک دیا۔

"صرف چار؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔

"دو درجن — دو درجن — " زاہد کالیے نے اپنی دونوں انگلیاں اس کی آنکھوں کے آگے نچا کر کہا۔

ڈاکٹر ارشد چپکے سے اپنی کافی پیتا رہا۔

اس نے جیپ سٹارٹ کر دی۔

"مشاہد —" ڈاکٹر ارشد نے اس کے کندھے کو تھپکا "تمہارا گاؤں بھی تو کہ
ادھر ہی ہے —"

"ہاں —" مشاہد نے سر ہلایا۔

صبح کی دھوپ جنگل کے درختوں اور کھیتوں پر جزیروں کی صورت میں رو
تھی.. جیپ کی رفتار اگرچہ تیز تھی لیکن حالیہ بارشوں کی وجہ سے دھول بالکل نہیں اٹھ ر
تھی اور فضا بے حد صاف اور نتھری ہوئی تھی۔ قادر آباد کے ذخیرے کے پانی تاحدِ نظر پ
ہوئے تھے اور ان میں سرکنڈوں کے جھُنڈ تھے۔ پانیوں پر سینکڑوں مرغابیاں یوں تیرتی تھ
جیسے اصلی نہ ہوں ڈیکائے ہوں... اور اس طرح کی درجنوں ٹکڑیاں تھیں جو دسمبر
دھوپ میں اپنے آپ کو گرماتی تھیں۔ بند کے نیچے جہاں تک پانی آ رہے تھے وہاں کن
کے بڑے بڑے پھول تھے جو جہازی سائز پتوں میں سے ڈنٹھل اُٹھائے بند پر جاتی اس ج
کو تکتے جاتے تھے۔ یہیں پر انہوں نے بوڑھے جم کاربٹ کو دیکھا اور وہ انہیں اس س
میں دوسری مرتبہ نظر آیا تھا۔

"ہیلو جم —" مشاہد نے جیپ روک کر اسے پکارا.. اس نے نہیں سنا.. زاہد کا
نے خوب گلا پھاڑ کر متعدد بار "اوئے جم کاربٹ اوئے جم کاربٹ" کے نعرے لگائے۔
نیچے بہت نیچے تھے اور وہاں تک آواز پہنچتی کم تھی اور ظاہر ہے وہ سنتا بھی کم تھا۔
کالیے کی آواز اس تک پہنچ گئی اور اس نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا اور پھر نہا
پرجوش انداز میں ہاتھ ہلایا... اس کے بوڑھے ملازم نے بھی اوپر دیکھا لیکن وہ زیادہ دیر
نہ دیکھ سکا کیونکہ وہ بندوق اور متعدد تھیلوں کے بوجھ سے جھکا جاتا تھا... جم کاربٹ
دائیں ہاتھ کے پنجے سے دو مرغابیاں لٹک رہی تھیں۔

مشاہد نے ہینڈ بریک اٹھا کر جیپ کو پھر سے سٹارٹ کر دیا۔

"کبھی جم کاربٹ کو ملنا چاہیے —" ڈاکٹر ارشد نے کہا۔

"آہو یار —" کالیے نے سر ہلایا.. "پتہ تو کرنا چاہیے کہ یہ ہے کون۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا — اب یہ ہے کہ ہم جہاں بھی شکار کو جاتے
ہمیں اس کی تلاش رہتی ہے اور اگر وہ نظر آ جائے تو ہم کتنے خوش ہوتے ہیں...
باقاعدہ ایک منظر ہے جو ہمارے دلوں کو گہری مسرت سے بھر دیتا ہے۔ تفصیل میں ج

اور جاننے کی کیا ضرورت ہے —"

"گڈ اولڈ جم کاربٹ —" ڈاکٹر ارشد پہلی بار مسکرایا۔

بند کے ساتھ ایک قبرستان دکھائی دیا اور اس سے پرے ایک گاؤں کے گھر اور
صحن تھے۔ ان میں کہیں کہیں دھوپ تھی۔

"اس قبرستان میں کوئی ایک قبر میرے دادا کی ہے — اور میں نہیں جانتا کہ
کونسی ہے.. — اور کوئی ایک قبر میرے پردادا کی ہے اور... میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اگر
قادر آباد میں شکار کے دوران مجھے کچھ ہو جائے تو کیا تم مجھے یہیں اسی قبرستان میں دفن کر
کے لاہور چلے جاؤ گے — تم جانتے ہو کہ مجھے اپنے گاؤں کی گلیوں میں گئے ہوئے دس
برس سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے؟"

"تمہیں کبھی خواہش نہیں ہوئی؟"

"نہیں —" مشاہد نے سر جھٹکا۔ "یہاں میرا کوئی نہیں۔ صرف یہ قبریں ہیں..
ور قبروں کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر ان پر پھول چڑھانے والا اور فاتحہ پڑھنے والا کوئی ہے یا
یں ہے۔ بس وہ تھوڑی سی زمین ہے چند بیگھے...." اس نے جیپ کو بیک کر کے دوبارہ
ادر آباد کی طرف موڑ لیا —

گھنا جنگل اور کاہی کی سفیدی اب ان کے بائیں جانب ہو گئی تھی۔ یکدم اس نے
یپ روک دی۔ اس کے ساتھیوں نے اسے سوالیہ آنکھوں سے دیکھا..

"کیا تم بھی سن سکتے ہو —" وہ جنگل کو تکتا تھا اور سننے کی کوشش کرتا تھا..

"کہیں فائر ہوا ہے؟" کالیے نے پوچھا۔

"نہیں — کسی بھینسے کے ڈکرانے کی آواز ہے —"

"ہو گی، ضرور ہو گی —" ڈاکٹر ارشد نے کہا "لیکن ہمیں اب چلنا چاہیے —
ے بٹ خیلہ پہنچنا ہے اور اسے اسلام آباد — ہمیں چلنا چاہیے۔"

گوجرانوالہ سے دو رویہ سڑک کا آغاز ہوا تو اس کے تنے ہوئے اعصاب کچھ
سکون ہوئے اور اس نے گردن ڈھیلی کر کے ونڈ شیلڈ سے اوپر پاپلر کے درختوں میں
ے تیزی سے گذرتے آسمان کو دیکھا۔ دھوپ ابھی وہیں تھی درختوں کی چوٹیوں پر اور
ک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی.. برما کے محاذ کی یادگار اس کی پرانی وِلیز جیپ

بالاکوٹ کے مستریوں نے ری کنڈیشنڈ کی تھی اور یہ ہموار شاہراہوں کے لیے نہیں تھی اس کے انجن کو آسودگی تب حاصل ہوتی تھی جب اسے ہل چلائے کھیتوں اور پہا ندیوں کی خشک گذرگاہوں میں ڈال دیا جاتا تھا.. بہرحال دسمبر کی اس صبح میں لاہور جا والی ہموار سڑک پر بھی اس کے انجن کی آواز ایک نخریلی بلی کی طرح غراتی چلی جاتی تھی دونوں جانب کھیت تیزی سے گھٹ رہے تھے، جہاں صنعتی عمارتیں نہیں تھیں وہاں چار دیواریاں تھیں جن کے اندر ابھی تو چارے کے کھیت تھے لیکن وہاں اُن انڈسٹریز بورڈ لگ چکے تھے جن کی بدہیئت اور بے کردار عمارتیں وزارت صنعت میں کسی سفار کی منتظر تھیں۔

اس نے سڑک سے نظریں ہٹائیں اور بائیں ہاتھ پر دیکھا... کہُر سے ماری خشک اور کھُردری گھاس کے چند ٹکڑے کلر اٹھی زمین کی وسعت پر صبح کی دھوپ میں تک ٹھٹھرے ہوئے لگتے تھے۔ ان سے چند کھیت پرے ایک سیلابی پل کی درجنوں محرا کے اوپر لاہور جانے والی کوئی پسنجر ٹرین جیسے صبح کی دھوپ سے ست ہو رہی تھی۔ ٹرین کی رفتار کچھ دیر سے اس کی جیپ کے ساتھ ہم آہنگ ہو چکی تھی اور وہ ا دوسرے کی نظر میں ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔

کالیا اور ڈاکٹر اس وقت لالہ موسیٰ کے قریب پہنچ چکے ہوں گے... اس نے کی رفتار آہستہ کر دی تاکہ لاہور جانے والی ٹرین اوجھل ہو کر اس لینڈ سکیپ کو خالی دے جسے وہ اس کے قدرتی رنگ میں ہی دیکھنا چاہتا تھا.... جوہڑوں کے کناروں پر کاہی سفید سٹے نامعلوم ہوا سے حرکت میں آتے تھے اور سفید بگلے قریب سے گذرتی جیپ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکتے تھے اور پھر شانت ہو جاتے تھے۔ سڑک سے ایک کچا راستہ نیچے تھا اور پھر وہاں تک دکھائی دیتا تھا جہاں پر ایک نئی فیکٹری زیر تعمیر تھی۔ مشاہد نے روکی تو اس کے کان خاموشی کے سناٹے میں آ گئے اور اس نے سر جھٹک کر اپنے آ نارمل کیا۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ٹھہرے ہوئے پانی کے جوہڑ دور تک چلے جاتے اور ان کے کناروں پر خشک گھاس اور سوکھے ہوئے سرکنڈے تھے۔ پانی میں بوسیدہ گھاس اور بوٹیوں کی بُو جب اس کے نتھنوں میں آئی تو جیسے وہ چوکنا ہوا کہ اب وہ کشتی میں صبح کے اندھیرے میں شکار کے لیے جاتا ہے۔ ابھی ان کا موسم نہیں تھا اپریل کے دنوں میں یہ جوہڑ سفید اور گلابی کنول سے ڈھکے جاتے تھے اور ایسے ڈھکے

تھے کہ ان پر ننگے پاؤں چلنے کو جی چاہتا تھا۔ پر انہیں کوئی نہیں دیکھتا تھا، ان کے پُرسکون اور دل کو گرفت میں لے لینے والے حُسن کے گیت کسی نے نہیں گائے... صرف اس لیے کہ یہ اوجھل تھے... ٹرینیں تیزی سے گزر جاتیں اور شاہراہ یہاں سے کچھ فاصلے پر تھی — صرف مشاہد تھا جو ہمیشہ یہاں تھوڑی دیر کے لیے رُک کر پھر اپنا سفر جاری رکھتا۔ کنول کے یہ تختے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلتے تھے... تو کیا ان کے حُسن کے گیت کسی نے اس لیے نہیں گائے کہ یہ ذرا اوجھل تھے؟... نہیں ان کی توصیف یوں نہ ہوئی کہ یہ سادھوکے جیسے قصبے کے آس پاس تھے.. اگر کنول کے یہی تختے جھیل ونڈرمیر کے کناروں پر ہوتے تو ورڈزورتھ کو اپنے "ڈیفوڈلز" دکھائی ہی نہ دیتے اور وہ اے ہوسٹ آف گولڈن ڈیفوڈلز کی بجائے اے ہوسٹ آف پنک لوٹسز تحریر کرتا۔ ریلوے لائن کے ساتھ، کاہی کے نیچے، صبح کی ہوا میں کپکپاتے اور رقص کرتے... اے ہوسٹ آف پنک لوٹسز...

لیکن آج رات نہیں جوزفین — ابھی تو دسمبر ہے.. مارچ کے آخر میں ایک انبوہ گلابی کنول کا تمہارے لیے.. ابھی ان کا موسم نہیں ہے۔ اور موسم کس کا ہے جوزفین؟ زوال کا... آج صبح دو بج کر سولہ منٹ پر جب وہ شیو کر رہا تھا تو یکدم اس کے مُنہ میں ایک بھوٹا سا پتھر کہیں سے لڑھکتا آیا اور اس نے اسے بیسن میں اُگل دیا... وہ حیرت سے سکتے بں آیا کہ یہ اس کی اپنی داڑھ تھی جو بہت دنوں سے ہل رہی تھی.. اسے بیسن کی سفید سطح پر ایک گدلے اور بدوضع موتی کی طرح پڑی داڑھ کو دیکھ کر بے حد دکھ ہوا تھا... اس نے بچاس برس تک میرے ذائقوں میں میرا ساتھ دیا تھا، یہ میرے بدن کا ایک حصہ تھی اور ب میرے سامنے پڑی ہے — اس نے زبان سے اس حصے کو ٹٹولا جو خالی ہو چکا تھا... وہ ار بار مُنہ بھینچتا تھا کیونکہ اسے اس خلا کی عادت نہیں ہو رہی تھی — تو یہ زوال کا پہلا شارہ تھا جو آج صبح دو بج کر سولہ منٹ پر بیسن کی سفید سطح پر پڑا تھا... بس موسم اسی کا ہے وزفین... ایک انبوہ گلابی کنول کا، ابھی نہیں — یا شاید کبھی نہیں۔

مشاہد علی مثیل نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے کیا... ان پر جُھریاں تھیں اور گوشت کی پکڑ ڈھیلی پڑ چکی تھی... اس کے ہاتھوں اور مُردہ مرغابی کے پنجوں میں کوئی فرق ہ تھا۔

"شکار کیسا رہا؟"

"چار —"

"چار کیا؟"

"چار مرغابیاں... ایک شیولر... اور تین نیل سر..."

"لیکن تم خوش نہیں ہو۔"

"نہیں، میں خوش نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

درخت کسی ایک قسم کے نہیں تھے۔ وہ اونچے، پستہ قد، پھیلے ہوئے، منحنی سیدھے، گھنے یا چھدرے تھے لیکن سب کے سب پرانے تھے۔ ایک جھنڈ تھا جس جامن، بھیڑے، کچنار، شیشم، دھریک اور املتاس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے تھے، ص پرندوں کو ان کی پہچان تھی۔ وہ سب ان کے اندھیرے میں رہتے تھے اور باہر سے د نہیں دیتے تھے.. دھوبن چڑیاں بہت تھیں، ہُدہُد بھی تھے اور کوئلیں بھی ایسی تھی کہ وہ بہت کم آتی تھیں۔ تیز دھوپوں والی جون کی دوپہروں میں املتاس کی پیلاہٹ کا انبار سے الگ ہو جاتا... اس کے زرد گچھے چینی لالٹینوں کی طرح ہوا سے جھولتے رہتے... درختوں میں سات کمروں والی کوٹھی واقع تھی.. اسے سات کمروں والی کوٹھی اس لـ جاتا تھا کہ اس کے.... سات کمرے تھے... اور ان میں سے ایک طویل کمرہ دالان کے ساتھ چلا گیا تھا اور اس دالان سے جن درختوں کے تنے نظر آتے تھے ان پر اب دھوپ ذرا کم تھی... دسمبر میں دھوپ ان کی چوٹیوں پر اُترتی اور اُترتے اُترتے رُک اور پھر وہیں سے رخصت ہو جاتی۔ طویل کمرہ ان دونوں کا تھا۔

برگیتا برکت علی ایزبرگ نے مشیل کو حیرت سے دیکھا اور کہا، تم مجھے اتنی ح

سے کیوں دیکھ رہے ہو؟

"کیونکہ خوشی کا تعلق تم سے ہے —"

"ہم پانچ برس سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، کیا اس عرصے میں تمہاری بے یقینی ختم نہیں ہوئی.."

"نہیں —"

"تمہاری آنکھوں میں بے یقینی نہیں، حیرت ہے — کیوں؟"

"پابلو نرودا نے سری لنکا کی ایک بھنگن کے پورے بدن کو دیکھا تو وہ اسے ایک سیاہ وینس کی طرح نظر آئی.. اور نرودا کا کہنا ہے کہ جب میں اس سے مُحبت کر رہا تھا تو وہ مجھے حیرت سے تکتی تھی کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے —"

اس نے برگیتا کے بدن کو یکدم ڈھیلے پڑتے اور ٹھنڈے ہوتے محسوس کیا.. وہ جو مدھم حرکتوں میں تھی بالکل ساکت ہو گئی۔ اس نے اسے آہستہ سے اپنے آپ سے الگ کیا اور بستر کی سفید چادر میں ہو گئی۔

"تم نے مجھے پہلی بار تو نہیں دیکھا کہ حیرت سے دیکھتے تھے.." چادر کی سفیدی میں س کے بدن کی سیاہی اتنی گہری تھی کہ وہاں وہاں رات ہوتی تھی جہاں جہاں وہ تھی اور ہاں جہاں وہ تھی وہاں وہ چادر سے سنبھلتی نہ تھی۔

"نہیں۔ لیکن میں اپنی حیرت کو قابو میں نہیں رکھ سکتا جب بھی تمہیں دیکھتا وں۔ میں تمہارے تنے ہوئے تناسب کو بھول جاتا ہوں ہر مرتبہ — اور یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ انسان بدن کو دیکھتا زیادہ ہے اور..."

برگیتا کا پورا بدن جال میں جکڑے کسی وحشی کی طرح اُس بے اختیار ہنسی سے چادر ب کسمسایا جسے اس نے مشکل سے دبایا "تم اپنی عمر کے بارے میں ضرورت سے زیادہ شس ہو رہے ہو.. میں نے تو کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی.."

"آج صبح دو بج کر سولہ منٹ پر جب میں شیو کر رہا تھا تو میری ہلتی ہوئی داڑھ رے مُنہ میں آ گئی... اور اب وہاں خلاء ہے اور مجھے اس کی عادت نہیں ہو رہی... مجھے ب لگتا ہے کہ جو لفظ میرے مُنہ سے نکلتے ہیں وہ کچھ قابو میں نہیں رہتے... کیا تم نے یہ یلی بھی محسوس نہیں کی؟"

"نہیں —" وہ اس کے ساتھ آ لگی۔ "لیکن وہ خلاء ہے کہاں — دکھاؤ۔"

مشاہد نے منہ کھول دیا۔ برگیتا کی آنکھیں اس کے منہ کے قریب ہو گئیں

"روشنی کم ہے.. مجھے تو نظر نہیں آتا۔"

"دیکھو — میں بھی بھول جاتا ہوں کہ کہاں ہے لیکن زبان پھیرتا ہوں تو پھر دو داڑھوں کے درمیان اٹک جاتی ہے۔"

"یہ تو بہت آسان طریقہ ہے — اب میں خود تلاش کر لوں گی۔"

برگیتا سویڈش ہونے کے باوجود اردو اور خاص طور پر پنجابی میں بے حد رواں تھی۔ وہ اپنا مطلب مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کرنے پر قادر تھی لیکن کس لفظ پر زور د ہے اور کس لفظ کو سرسری طریقے سے کہہ کر آگے بڑھنا ہے اس پر وہ بھٹک جاتی تھی او یوں اس کے کئی فقرے عجیب و غریب معانی کے حامل ہو جاتے.... اس کا لہجہ بہرطو سویڈش تھا اور وہ اب بھی ہاں یا نہ کہتے ہوئے ایک ہچکی کے ساتھ اپنا سانس بدن کے اند کھینچتی.. پورے یورپ میں سویڈز کی یہی پہچان تھی کہ وہ فقرے کے اختتام پر یا سرہلا ہوئے ایک مشکل سا اور مختصر سا سانس لیتے جیسے رُک گیا ہو اور بعض لڑکیوں میں یہ عادت عجیب سی کشش کی حامل ہو جاتی...

وہ بہت دیر کے بعد اس سے الگ ہوئی اور پھر ایک رُکے ہوئے سانس کے سا کہنے لگی۔

"میری کرسمس مشیل —"

مشاہد سنّاٹے میں آ گیا اور اس کے پورے بدن سے یکدم پشیمانی کا پسینہ پھو لگا.. اس نے ایک بار پھر فراموش کر دیا تھا۔ اسے یاد ہی نہ تھا۔ اسے آج صبح یاد تھا ا اب... اسے یاد ہی نہ تھا "اوہ آئی ایم سوری ڈارلنگ.... پلیز فارگِو می.. آئی فارگوٹ.. آ پلین فارگوٹ..."

"مجھے معلوم تھا کہ تم بھول چکے ہو... ویسے میں نے انتظار کیا، بہت انتظار کی آج جب تم شکار سے لوٹے تھے تو جیپ کے انجن کی آواز سے سارے پرندے پہلے سہم خاموش ہوئے اور پھر پہلے سے بھی زیادہ شور مچانے لگے... تم بہت چپکے سے احتیاط اندر آئے تاکہ میں جاگ نہ جاؤں، میں نے تب بھی انتظار کیا کہ تم آ کر مجھے چومو گے کہو گے، میری کرسمس برگیتا..."

"چومنے کا کام تو میں اب بھی کر سکتا ہوں —" وہ ابھی تک شرمندہ ہوتا چلا ج

تھا..

"نہ.. اب بہت دیر ہو چکی ہے.."

"بہرحال.. میری کرسمس برگیتا.. تم کہیں جانا چاہتی ہو؟"

"وہیں جہاں ہم ہر کرسمس کو جاتے ہیں — اور کہیں نہیں۔"

"وہاں تو ہم جائیں گے.." مشاہد ابھی تک نارمل نہیں ہو سکا تھا۔ "اور کرسمس ٹری کا کوئی بندوبست ہوا؟"

"نہیں —" وہ ہنسنے لگی "یہاں صرف مورپنکھ کے پودے ملتے ہیں اور وہ کسی طور بھی کرسمس ٹری نہیں ہوتے.. یا پھر کئی لوگ مری اور نتھیا گلی سے چوری چھپے چیڑ کے نوجوان درخت اکھاڑ لاتے ہیں جو کہ شرمناک ہے.. ویسے تو چیڑ بھی کرسمس ٹری نہیں ہوتے..."

"تو پھر؟"

"تو پھر —" اس نے خصوصی سویڈش ہچکی بھری "تو پھر.. میں سوچوں گی... شاید سات کمروں والی کوٹھی کا کوئی ایک بلند درخت اس کام کے لیے موزوں ہو... کوئی بھی درخت کرسمس ٹری ہو سکتا ہے... یا نہیں ہو سکتا؟"

"ہو سکتا ہے —"

چادر سے باہر ہو کر وہ کھڑکی کے شیشے سے ناک لگا کر کھڑی ہو گئی "مجھے ابھی تک اس صاف موسموں والی روشن کرسمس کی عادت نہیں ہو سکی... یوتے بورگ میں تو کرسمس کا دن اکثر دھند میں لپٹا گذر جاتا ہے اور یہی اس کی کشش ہوتی تھی۔ پتہ نہیں آج وہاں کیسا موسم ہو گا۔ پاپا راؤنی کیا کر رہے ہوں گے، مجھے یقین ہے وہ سارا دن اپنی موٹر بوٹ کو مرمت کرنے میں گذار دیں گے... اور ماما اُلا، مجھے یقین ہے کسی اور مرد کے ساتھ چلی جائیں گی... یہی کچھ ہوتا تھا یوتے بورگ میں..." اس نے کھڑکی کے پٹ پورے کھول دیئے۔ سرد ہوا کی کاٹ اندر آ کر اس کے بدن پر پھیلی اور اس کے کچھ حصے تھرّائے۔

"حماقت نہیں کرو برگیتا.." مشاہد کی نظریں اس کے بدن سے ہٹتی نہ تھیں، نرودا کی ایک سیاہ بدن کے لیے فیسی نیشن اس کی سمجھ میں آتی تھی... "سردی ہے... کھڑکی بند کر دو.."

برگیتا نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا بلکہ درختوں کے تنوں تک آئی ہوئی دُھوپ پر نظریں جمائے اس نے کھڑکی کی سِل پر پاؤں رکھا اور برآمدے میں کود گئی۔ اور وہاں سے اس نے گردن کو بل دے کر پیچھے دیکھا — "مشاہد... میں کچھ دُھوپ کچھ تازہ ہوا لینا چاہتی ہوں۔"

وہ بے حد بیزار ہوا۔ وہ ہمیشہ بیزار ہوتا تھا۔ یہ عورت کیوں نہیں سمجھتی... درختوں سے پرے چار دیواری ہے اور کوئی بھی اندر جھانک سکتا ہے، اندر آ سکتا ہے — اس نے شتابی سے اپنی بوسیدہ نیلی جین چڑھائی اور کمرے سے باہر آ گیا — ہیٹر کی گرمی سے آسودہ کیے ہوئے اس کے جسم سے دسمبر کی سرد کرچیوں والی ہوا ٹکرائی اور اس نے ایک جھُرجھُری سی لی.. اسے سویٹر پہن کر باہر آنا چاہیے تھا، یہ عمر رسک لینے والی نہیں تھی چاہے آپ اس کے بارے میں کانشس ہوں یا نہ ہوں۔

"اب تم مجھے ایک لیکچر دو گے —" وہ اتنے قدرتی طریقے سے اس کی جانب آہستہ آہستہ قدم رکھتی آئی جیسے وہ کسی خاص موقع کے لیے پراپرلی ڈریسڈ ہو، پیرّ کارڈن کے شام کے لباس میں شاید۔ "لیکن تم مجھے کنونس نہیں کر سکتے.. کبھی نہیں... اگر آسمان بادلوں سے خالی ہو.. اور دھوپ ہو تو... انسان بند کمروں سے باہر نکل کر کھُلی فضا میں اپنے بدن کو سانس کیوں نہ لینے دے... ہمارا جو سمر ہاؤس تھا یوٹے بورگ کے قریب جنگل میں اور تم وہاں جا چکے ہو تو وہاں ہم جب بھی گئے اور یہ بہت کم ہوتا تھا لیکن جب بھی دُھوپ نکلی تو ہم سب باہر آ جاتے تھے تاکہ ہمارے جسم کھُل سکیں، سانس لے سکیں۔ پاپا اور ماما بھی۔ پاپا اسی طرح مشین سے گھاس کاٹتے تھے اور ماما جھیل میں نہاتی رہتی تھیں — اسی طرح جس طرح میں ہوں — اس میں کیا خرابی ہے؟"

"اس مسئلے پر گفتگو فضول ہے —"

"ہاں بالکل فضول ہے —" برگیتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی چھاتیوں پر رکھا — "تم اب بھی قید میں ہو.. تمہارے ٹیبوز اور قبائلی یقین اتنے گہرے ہیں کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے تمہاری لبرل ازم خلاص ہو جاتی ہے... اور تم قبائلی کے قبائلی ہی رہتے ہو... اور یا تمہاری باجیاں آئی تھیں —"

"کہاں؟" مشاہد نے اپنا ہاتھ چھڑا کر کوٹھی کے اس پھاٹک کی طرف سہم کر د جواب بوسیدہ ہو کر ٹیڑھا ہو چکا تھا اور اگر کوئی شخص قدرے جھک کر اس کے اندر جھا

تو وہ ان دونوں کو بآسانی دیکھ سکتا تھا — وہ جیسے بھی تھے اور جہاں بھی تھے..

"صبح سویرے — مجھے میری کرسمس کہنے آئی تھیں... اِزنٹ دیٹ سویٹ —"

"صرف اس لیے آئی تھیں؟"

"ہاں اور حسبِ عادت میں بھی منتظر تھی اور انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا، وہ خُوب دھواں دار طریقے سے روئیں اور ایک دوسرے کو آنسو اور ناکیں پونچھنے کے لیے ٹشوز سپلائی کرتی رہیں... اور جب وہ خُوب رو چکیں تو انہوں نے حسب عادت مجھ سے نہایت اُلفت اور چاہ سے پوچھا کہ کیا میں کرسمس گزارنے کے لیے کاموئی نہیں جا رہی اپنے میکے اپنے رشتہ داروں کے پاس —"

"آئی ایم سوری برگیتا —"

"نہیں تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ کاموئی کا حوالہ دیئے بغیر چلی جاتیں تو مجھے سخت مایوسی ہوتی —" وہ درختوں سے ذرا پرے ہٹی جہاں دھوپ تھی۔ اوپر پتّوں میں کوئی پرندہ ایک عجیب گہری اور پژمردہ آواز میں بولتا تھا جیسے کوئی مریض آخری سانس لے رہا ہو... ہا... ہا آ... "اس کی آواز دھوکے میں ڈالتی ہے... ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہاں پتّوں میں کوئی پرندہ ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور ہو... کچھ اور ہو —"

"ہے تو پرندہ کچھ اور کیا ہو گا لیکن میں اسے جانتا نہیں —"

"شکاری کو تو جاننا چاہیے —"

"ہاں — باجیوں نے صرف کاموئی کا حوالہ دیا؟"

برگیتا کی ہنسی تیز تھی اِتنی کہ وہ پرندہ چُپ ہو گیا۔ "اُنہوں نے وہ حوالہ بھی دیا اور آج میں نے اُنہیں چُپ کرا دیا وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی تھیں اور سرہلاتی تھیں... وہ آئندہ نہیں پوچھیں گی — میں نے اُن کی تسلی کر دی.. اب نہیں پوچھیں گی۔"

"کیسے تسلی کر دی؟"

"بس ایسے ہی —"

"تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟ دسمبر ہے اور... ہوا خاصی سرد ہے... اندر چلو" مشاہد نے بہت ضبط کیا لیکن اُس کے جسم نے بے اختیار کانپنا شروع کر دیا "چلو اب آ جاؤ..."

"آؤچ —" برگیتا ایک ہلکی چیخ کے ساتھ کہرے سے جلی ہوئی خشک گھاس پر بیٹھ

گئی.. وہ مشاہد کے آگے آگے چل رہی تھی اور اب وہ مُنہ پرے کیے بیٹھی تھی اور اپنے تلوے کو ٹٹولتی تھی... ایک سیاہ ناگ کا پھیلا ہوا پھن تھا جو جھکا ہوا تھا... اور اُس سیاہ پھیلاؤ سے اس کی نظر نہ ہٹتی تھی... یہ ہوس کب ختم ہو گی... دس برس پیشتر وہ صرف دیکھنے پر اکتفا نہ کرتا، ہرگز نہ کرتا لیکن اب وہ صرف دیکھتا تھا تو یہ ہوس کب ختم ہو گی...

"شریف مالی سے کہو کہ گھاس میں سے کنکر چن دیا کرے —" وہ اُٹھی اور برآمدے کی جانب بڑھنے لگی جہاں وہ کھڑکی ابھی تک کُھلی تھی۔ سِل پر قدم رکھنے سے اُسے کچھ یاد آیا اور وہ مشاہد کے پاس لوٹ آئی — "مردان از ہیئر —"

"مردان؟" اس کے لہجے میں دسمبر کی دھوپ کی نرم گرماہٹ تھی جیسے وہ گلیشیر تھا اور اب اُس دھوپ کی گرمی سے پگھلتا تھا "وہ کب آیا؟"

"جب تم ہنٹ کے لیے نکلے ہو بس اُنی وقت.. ابھی تمھاری جیپ کے انجن کی آواز دُور ہو رہی تھی کہ وہ آ گیا —"

"کدھر ہے؟"

"اُدھر، جہاں وہ ہوتا ہے۔"

اُدھر سات کمروں والی کوٹھی کا وہ حصہ تھا جسے اور تو اور مالی بھی اس کوٹھی کا حصہ نہ سمجھتا تھا۔ درختوں کے جھُنڈ سے پرے شیشم کے دو تناور پیڑ تھے اور ان کے سائے میں چار دیواری کے ایک کونے میں صرف ایک دُور سے مسمار شدہ کمرہ تھا جو کبھی نوکروں کے کام آتا تھا، پھر کوٹھی کے دوسرے سرے پر نئے کوارٹر بن گئے اور یہ ایک کمرہ حاملہ بلیوں اور آوارہ کتوروں کی آماجگاہ بن گیا... نہ صرف یہ کہ اس کے ٹوٹے ہوئے بوسیدہ کواڑوں تک سرکنڈے پہنچتے تھے بلکہ اس کی چھت پر بھی گھنی گھاس تھی جو اب خشک ہو کر اینٹوں پر سے لٹکتی تھی... کمرے کا فرش کچا تھا اور بارشوں میں اس کی چھت سے وافر پانی نیچے آ اور اُن جنگلی بوٹوں کے لیے جو اس کے فرش میں سے پھوٹتے رہتے تھے مسرت کا باعث بنتا... مردان علی جب بھی نمودار ہوتا، یہیں ٹھہرتا۔

"تم اندر چلو — اور کچھ پہن لو، میں اُسے مل کر آتا ہوں —"

سیلن زدہ کچے فرش میں سے نکلتے بوٹوں اور گھاس کی باریک پتیوں کے اوپر وہ گُچھا ہو کر ایک بچے کی طرح سویا ہوا تھا۔ اُس کے سرہانے اُس کا چھوٹا سا رُک سیک تھا،

کا سامان، سلیپنگ بیگ، ایک شلوار قمیض، کورے کاغذ اور چند بال پوائنٹ اور ایک کیمرہ... اور رُک سیک کے برابر میں سیاہ ربڑ کے موٹے تلے والے سفری بوٹ تھے جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ تسموں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔

"مردان" وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اُس نے جھُک کر اُسکے کان میں کہا... اور وہ جیسے اِسی آواز کا منتظر تھا۔ اُس نے صرف ایک آنکھ کھولی اور مسکرا دیا۔ "ہیلو بھائی جان" اور اپنے دونوں بازو اُسکی جانب پھیلا دیئے... مشاہد اُس کے ساتھ لپٹ گیا اور وہ دونوں اُن دنوں کی طرح آرام سے پہلو بہ پہلو لیٹ گئے جب اُن کی ماں اُنہیں ایک ہی چارپائی پر سلا کر چلی جاتی تھی۔ مشاہد کبھی اُس سے الگ ہو کر اُسے جی بھر کے دیکھتا تھا اور پھر لپٹ جاتا تھا... اُس نے اپنے وقتوں میں بہت سارے لوگوں کے ساتھ مُحبت کے جذبات کا اقرار کیا تھا، ان میں مرد اور عورتیں سبھی شامل تھے بلکہ برگیتا بھی شامل تھی۔ برگیتا کے لیے وہ جو کچھ محسوس کرتا تھا اُسے وہ رُندھے ہوئے گلے کے بغیر لفظ نہیں دے پاتا تھا... شاید اُس نے برگیتا کے لیے وہ تمام شدتیں محسوس کیں جو اُس نے الگ الگ درجنوں خواتین کے لیے محسوس کیں اور پھر بھی زیادہ — برگیتا کے ساتھ اس کا لگاؤ نارمل ذہنی سطح پر نہ تھا، اس میں ابنارملٹی کا ایک واضح شائبہ تھا.. وہ اُسے بے قابو کر دیتی تھی لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو دیکھ کر پگھل جانے والا جذبہ صرف مردان کے لیے محسوس کیا تھا.... ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی تک ایک ہی ناڑو سے بندھے ہوئے ہیں... اُسے دیکھ کر وہ برگیتا اور سات کمروں والی کوٹھی سے غافل ہو جاتا — اس کے باوجود کہ وہ کبھی کبھار اُسے پہچاننے سے انکاری ہو جاتا.... مشاہد اُس کے کان میں اسی طرح سوئے ہوئے سرگوشی کرتا — مردان — اور وہ جاگ کر کہتا "تم کون ہو۔ دفع ہو جاؤ۔" اور مشاہد جان جاتا اور خاموشی سے اپنے آپ کو سنبھالتا آنکھیں نہ جھپکتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتا... اور پھر انتظار کرتا... اور کچھ دیر بعد وہ ایک مسرت سے سُرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا اور کہتا "بھائی جان —" وہ ابنارمل تو تھا لیکن اتنا نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے تھے۔

"مردان کیا تم حیران پریشان؟" مشاہد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھائی جان —" اس نے اسی ردھم میں کہا "نہ صرف حیران پریشان بلکہ ننگل بیابان۔"

"اور کدھر سے آئے ہو تم حیران پریشان؟ —"

مردان نے اپنے بڑے بھائی کی جانب دیکھا اور جواب نہیں دیا... اور اُس کے دیکھنے میں وہ شرارت اور شرمندگی تھی جو کبھی اُس کے بچپن میں اُسکی آنکھوں میں آتی تھی جب وہ گرمیوں کی دوپہروں میں آوارہ گردی کر کے واپس آتا اور اُس کے پیچھے پیچھے رسّی یا کسی چیتھڑے سے بندھا کوئی آوارہ کُتورا گھسٹتا چلا آتا تھا.... اور وہ کہتا۔

"بھائی جان یہ ڈبّو ہے —"

"اگر یہ ڈبّو ہے تو میں کیا کروں؟" مشاہد غصے میں آ جاتا۔

"بھائی جان یہ وہاں ایک نالی میں بیٹھا تھا اور مجھے ترس آ گیا۔ بھائی جان یہ وہا
ایک کتے کی زندگی بسر کر رہا تھا — کیا ہم اِسے ایک بہتر زندگی نہیں دے سکتے؟"...

مشاہد کا غصہ سرد ہو جاتا کہ اس بچے کے ذہن میں ایسی باتیں کہاں سے آ جا
ہیں۔ وہ ڈبّو بھی رکھ لیا جاتا۔ اور جب گھر میں ہر طرف ڈبّو ہی ڈبّو ہو جاتے تو ایک روز ا
کی ماں انہیں ایک مرتبہ پھر کتّوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتی اور اُنہیں گھر سے نکا
باہر کرتی... ڈبّوؤں کو تبھی گھر سے خارج کیا جاتا جب دونوں بھائی کہیں گئے ہوتے اور
واپسی پر وہ اُن کی جدائی میں ایک دوسرے سے لپٹ کر دیر تک روتے رہتے۔ آج
اُس کی آنکھوں میں وہی شرارت اور شرمندگی تھی۔ وہ مشاہد سے چھ برس چھوٹا تھا لیک
اس کے گھنے بالوں میں سیاہی اب کم کم دکھائی دیتی تھی اور اگر وہ دو چار روز شیو نہیں
تھا تو اُس کی داڑھی یکسر سفید نظر آنے لگتی۔ ہاں اُس کے چہرے کی سادگی اور بھولپن
زمانے نے متاثر نہیں کیا تھا اور مشاہد جب بھی اُس کی جانب دیکھتا اُسے سفید بال دکھائی
دیتے صرف اس کا بچپن دکھائی دیتا —

"سکول میں دسمبر کی چھٹیاں تھیں بھائی جان —" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اُسکی ب
ہوئی داڑھی کی سفیدی میں سبز گھاس کے تنکے اٹکے ہوئے تھے۔ "میں نے سوچا آ
اور بھابھی کو میری کرسمس کہا جائے.. میں نے آپ کے لیے کلفٹن سے ایک بُوکے
خریدا لیکن وہ بہاولپور پہنچتے پہنچتے مرجھا گیا — آئی ایم سوری بھائی جان —"

"کوئی بات نہیں —" مشاہد نے ایک ایسا قہقہہ لگایا جس کے لیے صرف خو
ضرورت ہوتی ہے "پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں بہاولپور اُتر گیا اور وہاں سے منڈی یزمان اور پھر صحرا... دسمبر کی

خاموشی میں صحرا کی راتیں بھائی جان... اور دریائے گھاگھرا کی خشک گذرگاہ میں صحرا کی راتیں — اور پھر ایک رات مجھے خیال آیا کہ مجھے کرسمس سے پیشتر لاہور پہنچنا چاہیے.. لیکن میرا حساب غلط ہو گیا... میں پہلے نہیں پہنچ سکا.. سوری بھائی جان۔"

"کوئی بات نہیں مردان —"

"اور بھائی جان صحرا واقعی جنگل بیابان اور میں وہاں حیران اور پریشان.. اور وہاں تو صرف اللہ نگہبان —"

مشاہد پھر دل کھول کر ہنسا اور اُس کی آواز درختوں کے جھنڈ سے پرے طویل کمرے کے اندر تک گئی جہاں برگیتا نے اُسے سنا اور وہ جانتی تھی کہ جو خوشی مردان اُس کے خاوند کو دیتا تھا وہ اُسکے نصیب میں نہ تھی.. لیکن وہ مردان سے جیلس نہیں تھی..

"میں یہاں دو بجے صبح پہنچا۔ دیوار پھلانگ کر اندر آیا آپ کے کمرے کا دروازہ کھول کر "میری کرسمس" کا نعرہ لگایا تو صرف بھابھی وہاں تھیں اور وہ بہت خوش ہوئیں.. لیکن بھائی جان آپ خوش نہیں — کیوں؟"

"تم نے کچھ کھایا بھی کہ نہیں —"

"میں نے یزمان منڈی سے مکّی کے مرونڈے خریدے تھے، نہایت خستہ اور تازہ دیسی گڑ کی مہک والے... آخری دو مرونڈے میں نے آپ کی آمد سے صرف ایک گھنٹہ پہلے کھائے تھے، بچائے آپ کے لیے تھے لیکن لاہور کا پانی لکڑ ہضم، پتھر ہضم اور مجھے پھر بھوک لگ گئی... بھائی جان آپ خوش نہیں، کیوں؟"

"اس لیے کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

"چار —" مردان نے گردن میں بل دے کر ایک حیران بچے کی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں — ایک شیولر — اور تین نیل سر۔"

اِس بار مردان دل کھول کر ہنسا اور اب اُس کی آواز جھنڈ سے پرے طویل کمرے کے اندر تک گئی جہاں برگیتا بستر پر اوندھی پڑی کان لگائے سنتی تھی... "بھائی جان وہ جو ایک نامعلوم لکیر ہے باریک سی تو اُس کے ایک جانب کل مخلوق ہے رب کی اور دوسری جانب اور بہت، بہت دور نہیں بس لکیر کے ذرا اُدھر، ایک سنٹی میٹر اُدھر، اُدھر کچھ ہم جیسے ہیں.. آپ تو لکیر کے اِدھر نہیں تھے بقیہ مخلوق کے ساتھ؟... اور آج کہہ رہے ہیں

کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں — کیا ہو گیا ہے بھائی جان؟"

"تمہارا خیال تھا کہ میں لکیر کے اِدھر ہوں.. میں تو ہمیشہ کا اُدھر ہوں، تمہارے ساتھ۔ میں رکھ رکھاؤ میں اُلجھا رہا۔ توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش میں ایک ایسی زندگی تشکیل دی جو کوئی اور بسر کرتا رہا اور میں الگ تھلگ ہو کر ایک فاصلے سے اپنے آپ کو وہ زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور مجھے حیرت ہوتی تھی کہ یہ کون ہے جو میری زندگی بسر کر رہا ہے۔ میں بڑا بیٹا تھا اور مجھے ایک مثالی بیٹا بننا تھا، مجھے بہت سارے لوگوں کی توقعات پر پورا اُترنا تھا... صرف ماں باپ اور بہن بھائی نہیں بلکہ پوری برادری اور نسل انسانی کی توقعات پر پورا اُترنا تھا... یہ رول میرے لیے لکھا گیا تھا لیکن میں بُرا اداکار تھا، ہمیشہ اپنی لائنیں بھول جاتا اور اگر لائنیں ذہن پر زور دے کر یاد کر لیتا تو چہرے کا تاثر کچھ اور ہو جاتا.. خوشی کے مکالمے ادا کرتے ہوئے اکثر اوقات میرے چہرے پر موت کی زردی ہوتی۔ تم بہتر رہے... تمہارے لیے کوئی رول نہیں تھا، تم اورجنل ہو سکتے تھے... لیکن یہ طے ہے کہ میں بھی لکیر کے اُس پار ہوں تمہارے ساتھ... شاید تم سے بھی پرے، بہت پرے۔ لیکن میں اپنے رول سے مکمل طور پر باہر نہیں آ سکتا —"

"اور وہ چار مرغابیوں والی کیا بات تھی؟"

"بس یہی کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

اور وہ دونوں ہنسے اور ہنستے گئے اور ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگے... برگیتا ان کی ہنسی مدھم ہو کر پہنچتی گئی اور اسے یہ بُری لگی۔ وہ الگ الگ ہنس سکتے تھے اور اُسے جیلس ہونے کا خیال تک نہ آتا... لیکن وہ اکٹھے کیوں ہنس رہے ہیں... یہ اُسے بُرا لگا۔

"تمہاری ٹانگ کا کیا حال ہے مردان؟"

"یہ مجھے کہیں جانے سے نہیں روکتی —" مردان نے اپنی ٹانگ پر ہتھیلی پھیر کر اُسے تھپکا — "نہیں یہ مجھے کہیں بھی جانے سے نہیں روکتی... ہاں یہ تو ہوتا رہتا ہے جب ہوا میں یخ بڑھتی ہے تو یہ ذرا تکلیف دیتی ہے۔ سردیوں کا موسم ڈھکے چھپے پوشیدہ زخموں کے لیے اچھا نہیں ہوتا.. اور دسمبر کا مہینہ یوں بھی مجھ پر بھاری گزرتا۔ آپ جانتے ہیں —"

"ہاں میں جانتا ہوں —"

"جانتے ہیں تو شی شی..." مردان نے شرارت سے مسکرا کر لبوں پر اُنگلی رکھ لی

"شی شی چُپ رہیے.. کسی کو بتانا نہیں۔"

"میں حلف اُٹھاتا ہوں کہ میں ہمیشہ چُپ رہوں گا اور چُپ رہنے کے سوا اور کچھ نہیں کروں گا کہ اسی میں میری عافیت ہے —" مشاہد نے ہتھیلی پھیلا کر ہاتھ اٹھا دیا "میں حلف اُٹھاتا ہوں۔"

"بھائی جان —" یہ مردان کی آواز تھی، لیکن کہیں دور سے آتی تھی۔ مشاہد نے سر جھٹک کر کسی خدشے کے خوف سے چونک کر اُس کی جانب دیکھا — "بھائی جان — پلیز میری مدد کیجیے۔" مردان کا سانس بھاری ہو رہا تھا اور وہ بمشکل بولتا تھا "پلیز... آپ جانتے ہیں کہ..." مشاہد نے پہلے اُسے دونوں بازوؤں میں تھاما اور پھر اپنے ساتھ لگا لیا... "مردان.... تم پرواہ نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں... یہ دسمبر بھی گذر جائے گا، میں وعدہ کرتا ہوں..."

مردان بہت مدھم آواز میں بول رہا تھا جیسے ہچکیاں لے رہا ہو اور اُس کا بدن اُس کچے فرش والے کمرے کی یخ ٹھنڈک میں ہولے ہولے کانپتا تھا اور مشاہد اُس کے بدن کو تھپکتا تھا جیسے اُسے سلانے کی کوشش میں ہو اور اُس کی آواز مدھم ہوتی چلی جاتی تھی.... ور پھر یکدم اُس نے اپنے آپ کو مشاہد کے بازوؤں سے الگ کیا، تھوڑی دیر سر جھکائے شرمندہ سا بیٹھا رہا اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگا "بھائی جان.. ہاؤ سٹیوپڈ آف می.."

"نہیں نہیں —" مشاہد نے زور زور سے سر ہلایا "نہیں مردان.."

"اور بھائی جان —" مردان کی آواز اور چہرہ کچھ دیر پہلے کی کیفیت میں لوٹ آئے "شہر میونخ میں آج کرسمس ہے —"

"شہر میونخ میں — شہر لاہور میں بھی آج کرسمس ہے مائی ڈیئر مردان —"

"نہ نہ.." مردان اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی پھیکی پھٹی نیلی جین پر سے گھاس کے تنکے جھاڑنے لگا — "شہر میونخ میں آج کرسمس ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ اور بھابھی ہر کرسمس کو برائے ہلکی پھلکی چہل قدمی اور تفریح دریائے راوی کی طرف کوچ کرتے ہیں تو بسم اللہ کوچ کیجیے ہم یہاں بقدرے ظرف مزید استراحت فرماتے ہیں —"

"تم بھی ساتھ چلو گے —"

"نہیں بھائی جان —"

"تم چلو گے —"

"بھابھی، شہر میونخ میں آج کرسمس ہے ——" مردان نے مُنہ پر ہاتھ رکھ شرلاٹے بھرتی ہوئی ولیز جیپ میں چہرے پر سرد تھپیڑے ہوا میں اور نہر کے کنارے دَ میں کہا۔

برگیتا سفید کشمیری شال میں اپنے آپ کو سنبھالتی تھی کہ وہ بلاؤز اور نیلی جین تھی اور یہ زمانے ایسے تھے کہ ان میں شال ضروری تھی اور شال کے نیچے جو کچھ بھی ہو ضروری تھا۔ وہ اپنے دیور کی بات سن کر مسکرائی لیکن ذرا سی اُلجھ گئی کہ صرف شہر میں ہی آج کیوں کرسمس ہے۔ مشاہد زبان سے داڑھ کے خلاء کو محسوس کر رہا تھا اور لا کی اُس ہوا کو اپنے بدن میں اُتارتا تھا جس کے لیے اُس نے بہت شہر اور بہت چھوڑے تھے۔

"سنیں بھابھی، صرف آپ کے کانوں کے لیے ——" مردان پھر زور سے

"سنیں ——

—— آج کرسمس ہے
شہر میونخ میں آج کرسمس ہے۔
فاصلوں کی کمند سے آزاد
میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے۔
چار سُو، جس طرف کوئی دیکھے
برف گرتی ہے، ساز بجتے ہیں۔"

"یقیناً مجید امجد ——" مشاہد نے سر ہلایا۔

"اور کون بھائی جان اور کون —— فاصلوں کی کمند سے آزاد اور میرا دل ہے کہ میونخ ہے ——"

"تم شبِ رفتہ سے نکل نہیں پائے۔"

"شبِ رفتہ سے... اور شبِ رفتہ کے بعد سے... میں نکل کر جانا نہیں چاہتا —— فاصلوں کی کمند سے آزاد بھائی جان —— جنگل بیابان اور حیران پریشان بھائی جان ——"

دونوں ہنسنے لگے، ایسے کہ اور کوئی نہ ہو، جیپ ساکن ہو، ہوا بند ہو، اور کوئی نہ ہو —— وہ دونوں ہنسنے لگے اور برگیتا کو برا لگا اور اُسی لمحے اُن دونوں کو بھی احساس ہوا کہ ایک تیسرا بھی ہے۔ "بھابھی یوٹے بورگ میں بھی کرسمس کے روز برف گرتی تھی ——؟"

"ہاں ——" برگیتا نے صرف یہی کہا۔

جیپ ایچی سن کالج کے پُل پر سے مال روڈ پر آگئی اور سُستی سے بمشکل اور رُک رُک کر حرکت کرتے ہوئے ٹریفک کے اژدھے کا ایک حصہ بن گئی۔ پیپل اور جامن کے بزرگ درختوں میں سے دھوپ کے جزیرے اور چھاؤں کی خلیجیں نیچے آتی تھیں اور رینگتی ہوئی کاروں کی چھتوں پر بچھنے کی کوشش میں گرتی جاتی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر پرل کانٹی نینٹل کی ستھری اور دیدہ زیب عمارت تھی.. مردان نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اُسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا —— یہیں... آج سے کتنے برس پیشتر؟... ہاں یہیں... نہیں وہ اُس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹریفک اگرچہ سُست تھی لیکن وہ ابھی یہیں تھے اور ابھی اُن کے بائیں جانب باغِ جناح کے جھُنڈ اور سبز علاقے تھے جن پر ہلکی سی دسمبر کی سفیدی ٹھہری ہوئی تھی۔ آج یہاں بہت لوگ تھے۔ اُس سے آگے چڑیا گھر کے بڑے دروازے کے آس پاس سستے اور بھڑکیلے لباسوں میں، غبارے ہاتھ میں، تیز میک اپ جو سیاہ چہروں پر چمکتا تھا۔ ہائی ہیلز میں ٹھپ ٹھپ چلتی ایسی عورتیں جنہیں سیدھا ہو کر چلنے کی عادت نہیں ہو رہی تھی۔ آج اُن کی بھی ہیپی کرسمس تھی۔

"نہیں میری کرسمس ٹو یو ——"

"سیم ٹو یو نہیں ——"

برگیتا نے مشاہد کی جانب دیکھا۔ وہ سامنے چیئرنگ کراس کے چوک کی طرف دیکھتا جیپ چلا رہا تھا —— کیا میں ان لوگوں میں سے ہوں؟ برگیتا نے سیاہ فام منحنی بچوں کے ایک گروہ کو دیکھا جو آئس کریم کے ایک ٹھیلے کے آس پاس کھڑے تھے.... وہ بہت زیادہ صاف نہیں تھے لیکن اُن سب کے کپڑے نئے تھے اور بے حد شوخ تھے، اُن کی بھی کرسمس تھی... کیا میں واقعی ان لوگوں میں سے ہوں؟

ریگل چوک کے قریب ٹریفک بالکل جامد ہو چکی تھی۔ صرف موٹر سائیکل سوار اور سائیکلوں والے اس ہجوم میں سے زگ زیگ چکر کاٹتے کسی نہ کسی طرح نکلتے جا رہے تھے۔ لوگ باگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا مسلسل ہارن بجا رہے تھے۔

مشاہد نے دائیں طرف دیکھا نہیں صرف ایک روبوٹ کی طرح چہرہ اُدھر کو جھٹک کر کہا "مردان لکشمی مینشن ——"

"ہاں بھائی جان ——" مردان کی آواز ٹریفک کے شور پر تھوڑی دیر کے لیے حاوی ہوئی۔

لکشمی مینشن یا موجودہ احمد مینشن جس کا چہرہ مال روڈ پر کھلتا تھا ڈِنگا سنگھ بلڈنگ کے بعد اس علاقے کی قدیم کولونیل فن تعمیر کی نمائندہ عمارت تھی۔ اس کے دائیں جانب بیڈن روڈ تھی اور بائیں جانب ہال روڈ اس کے تین منزلہ فلیٹ ایریا کے پہلو میں بچھی ہوئی تھی۔ مشاہد اور مردان کے لیے یہ عمارت ان کا بچپن تھی —— بیڈن روڈ کے ساتھ لگتا ہوا حصّہ تو کافی عرصہ پیشتر مسمار کر کے وہاں ایک ماڈرن جیولری مارکیٹ کے علاوہ ملک شیک اور ڈرائی فروٹ کی دوکانیں تعمیر کر دی گئی تھیں۔ جیولری مارکیٹ میں ڈبی بازار اور سوہا بازار کے نیم خواندہ لیکن شدید دولت مند سُنار شفٹ کر گئے اور بقیہ دوکانیں اُن ریڑھی والوں نے خرید لیں جو اس سے پیشتر بیڈن روڈ کے فٹ پاتھوں پر کاروبار کرتے تھے۔ اب کچھ عرصہ سے احمد مینشن کا چہرہ ڈیپ فریزر بنانے والی ایک فرم کے جہازی سائز بورڈ تلے اوجھل ہو گیا تھا۔ بورڈ پر ڈیپ فریزر کے ساتھ کولہوں پر ہاتھ رکھے ایک نخرے خاتون دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شہر کا سب سے بڑا سائن بورڈ ہے اور یہ لکشمی مینشن کی خوش بختی ہے کہ اسے یہاں آویزاں کیا گیا ہے.... یہ وہ لوگ تھے جو بورڈ کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے تھے... بورڈ کے پیچھے نامعلوم اور چُپ چاپ طریقے سے ایسے کہ دھول کا ایک ذرہ بھی فضا میں بلند نہ ہو اس تاریخی عمارت کو مسمار کیا جا رہا تھا... تاکہ یہاں بھی ایک پلازا تعمیر کیا جا سکے... اس سے پیشتر جب اس عمارت کو گرانے کی کوشش کی گئی تو مینشن کے مکینوں نے اور اہل لاہور نے شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ بُل ڈوزر واپس چلے گئے۔ اب شہر کے سب سے بڑے سائن بورڈ کو وہاں آویزاں کر دیا گیا تھا... دھول کا ایک ذرہ بھی فضا میں بلند نہ ہوتا تھا۔

"بھائی جان..." مردان آگے ہو کر بولا —— "کیا ہے جو ممکنات میں نہیں ہے... تھمے ہوئے وقت کے جزیرے بھی تو ممکن ہیں، جیسے مینشن کے کلاک ٹاور کا ساکت گھڑیال... تھمے ہوئے وقت میں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم دائیں جانب ہال روڈ پر اتر کر مینشن کے اندر چلے جائیں اور وہاں —— وہی دنیا ہو —— منٹو صاحب کھڑکھڑاتے کھڑے پاجامے اور کرتے میں تانگے سے اُتر رہے ہوں اور اوئے مشاہد کے بچے آج بھی اگر تم نے میرے فلیٹ کی کھڑکی کا شیشہ توڑا ہے تو میں تمہیں پکڑ کر صفیہ کے حوالے کر دوں گا —— مولانا اپنا سولا ہیٹ اور گروچو مارکس مونچھیں سنبھالتے انصاری ہوٹل سے نکل رہے ہیں... اشفاق صاحب جی ایم اثر کو ملنے کے لیے آ رہے ہیں اور اثر صاحب... اور رتی پے ماسٹر یاد ہے بھائی جان؟... اور سمیعہ..."

ٹریفک یکدم رواں ہو گئی اور وہ ریگل چوک سے آگے نکل گئے۔

"یہ سمیعہ کون تھی؟" برگیتا نے مشاہد سے نہیں پیچھے مڑ کر مردان سے پوچھا۔

"تھی ——" مشاہد نے کہا۔

جی پی او کے چوک میں ٹریفک کا اژدہام تھا لیکن حرکت میں تھا۔

"اور یہی ہے وہ شہرہ آفاق پوسٹ آفس جہاں راجندر سنگھ بیدی ڈاک کے لفافوں پر مہریں لگایا کرتا تھا ——" مردان آج کسی ڈالروں پر کمینگی کی نظر رکھنے والے ٹورسٹ گائڈ کی طرح چہک رہا تھا —— "اور اس سے پیشتر خواتین و حضرات ہم ریگل چوک سے ذرا پہلے پینوراما سنٹر کی عمارت کے سامنے سے گذرے تھے جہاں ایک زمانے میں روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا دفتر واقع تھا اور بس اسی دفتر میں "جنگل بُک" اور "کِم" والا رڈیارڈ کپلنگ کام کیا کرتا تھا جو کوئی بھی کہانی تحریر کرنے سے پیشتر پہلے صفحے پر اُسکا نام لکھتا تھا پھر "رِٹن بائی رڈیارڈ کپلنگ" تحریر کرتا تھا اور اس کے نیچے سواستیکا کا نشان بناتا تھا —— ہمیشہ —— جیسے جان ماسٹرز، جی ہاں وہی بھوانی جنکشن اور ایوا گارڈنر والا جان ماسٹرز کہانی کے پہلے صفحے پر پنجاب کے پانچ دریا اور سورج اور دو برفپوش چوٹیاں بناتا تھا —— جی ہاں ہمیشہ... اسی کو تو اِڈیوسنکریسیز کہتے ہیں... ابھی ہم عجائب گھر کے سامنے رکھی بھنگیوں کی توپ کو دیکھیں گے... اور یہ وہ والے بھنگی نہیں ہیں جنہیں آپ نے ابھی اس چڑیا گھر کے آس پاس "میری کرسمس نیں" کہتے ہوئے سنا ہے ——"

برگیتا کے چہرے کا رنگ بدلا لیکن اُس نے مڑ کر مردان کی طرف نہیں دیکھا اور

اِس کے باوجود مردان کو احساس ہو گیا — "سوری بھابھی آئی ڈِڈ ناٹ مین اِٹ..."
برگیتا نے مسکراتے ہوئے لب سکیڑے "پلیز کانٹ نیو مسٹر مردان — تمہیں بڑا ٹِپ ملے گا —"

مشاہد نے سب کچھ جان لیا اور خاموشی سے جیپ چلاتا رہا۔

شرمندگی اور خجالت کے ساتھ اس نے پھر اپنا بیان شروع کیا لیکن اب اُس شوخی اور زور نہ تھا صرف مجبوری تھی — "تو اسی توپ کے اوپر کپلنگ کا کِم بیٹھا تھا... اور کپلنگ نے بادشاہی مسجد کے میناروں پر بیٹھ کر قدیم لاہور کے چھجے اور چوبارے اور مینارے دیکھے اور شاعری کی — بس آج کا کنڈکٹڈ ٹور ختم —"

"براوو" برگیتا نے خوش دلی سے تالی بجائی — "اور اگر تم بھنگیوں کی توپ بھنگیوں کی توپ کہتے ہو تو اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں جانتی ہوں کہ بھنگی وہ والے نہیں میری کرسمس والے بلکہ سکھوں کا ایک ٹرائب ہے —"

"سوری بھابھی —" مشاہد ایک کچھوے کی طرح گردن نیچی کر کے نشست میں دھنس جانا چاہتا تھا —

"تم گورنمنٹ کالج کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے مردان —" مشاہد گردن کو بل دے کر مردان سے پوچھا۔

"نہیں —" اس کا جواب آیا۔

"اور گڈ اولڈ مسلم ماڈل ہائی سکول — ہمارا الماماتر۔"

"نہیں —" اُس نے پھر کہا "اب میں نہیں بولوں گا۔ بلکہ داتا صاحب کے کے پہلو میں سے گذرتے ہوئے بھی چپ رہوں گا —"

"اور اِس زرد سہ منزلہ پرانے مکان کے بارے میں —" دھوپ میں سرکلر کے فٹ پاتھ پر پرانے کپڑوں، بوٹوں اور اونی دستانوں کی مارکیٹ پھیلی ہوئی تھی اور مکان لکڑیوں کے ایک ٹال کے سامنے بے وقعت اور معمولی سا دکھائی دے رہا تھا۔

"نہیں — میں کچھ نہیں کہوں گا —"

"کس کا مکان تھا؟" برگیتا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مکان کے برابر میں عیسائیو ایک وسیع قبرستان چلا جا رہا تھا۔

"عبدالرحمن چغتائی کا —" مشاہد نے کہا۔ "بے حد الگ تھلگ رہنے

آرٹسٹ۔"

"یا شاید بے حد الگ تھلگ رکھا جانے والا آرٹسٹ..." مردان اپنی شرمندگی بھول کر نارمل ہو رہا تھا اور دسمبر کی دھوپ میں دور ہوتے زرد مکان کو مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا "شنید ہے کہ انہیں جان بوجھ کر لوگوں سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا — کہانیاں ہیں اس کے بارے میں —"

"برگیتا — ذرا غور سے سننا — تمہارے کچھ سوالوں کے جواب اس میں ہیں —" مشاہد نے سٹیرنگ سے ایک ہاتھ اُٹھا کر اُس کی ران کو تھپکا۔ "بہت سے ادیب تھے جنہوں نے لاہور کے لوگوں اور روایات کے بارے میں لکھا، اِن میں مولوی محمد سعید بھی تھے.. اور ذرا سنو وہ اپنی کتاب کے انتساب میں کہتے ہیں، یہ کتنا بڑا اعزاز اور سرخوشی تھی لاہور میں اُن زمانوں میں قیام کرنا جب ملک کا سب سے بڑا خطیب، عطا اللہ شاہ بخاری، مشرق کا سب سے بڑا شاعر، اقبال اور دنیا کا سب سے بڑا پہلوان، گاماں وہاں رہتے تھے..."

"کسی بھی بستی سے اُلفت رکھنے کے لیے کسی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی —" برگیتا بولی "تم نے لاہور کے لیے بہت سی بستیوں کو چھوڑا... تم کہیں اور آباد نہیں ہوئے اور ہو سکتے تھے کہیں بہتر طور پر..."

"میں نے شاید کچھ لوگوں کو بھی چھوڑا — لاہور کے لیے —"

"ہاں —" برگیتا قہقہہ مار کر ہنس دی اور اُسکے اس قہقہے نے دو موٹر سائیکل سواروں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ فٹ پاتھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچے کیونکہ دسمبر کی دھوپ میں برگیتا کی سیاہ جلد ایک گرمی پہ آئے ہوئے جانور کی طرح مہکتی تھی اور لشکتی تھی۔ "ہاں.. میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ تمہاری تاریخ تو میری پیدائش سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔"

فصیل جو کب کی ڈھے چکی تھی، باغ جو کب کے اُجڑ چکے تھے اُن کے اندر تخت لہور تھا اور اس کی ممٹیوں اور چوباروں پر جھکے آسمان میں خوش رنگ پتنگیں اور گڈیاں ہولے ہولے اوپر اٹھتی تھیں، پتنگیں کندھے مارتے ہوئے اور گڈے گڈیاں شرلاٹے بھرتے ہوئے... جو کٹ چکی تھیں وہ ہلکورے لیتے ہوئے قوموں کے تنزّل کے گراف کی طرح نیچے ہی نیچے جا رہی تھیں اور اِسی آسمان میں کبوتروں کی ٹکڑیاں مستی میں ہوا کو کاٹتی گرتی تھیں اور سنبھل کر اوپر اُٹھنے لگتی تھیں۔ لاہور کے دل والے سرخوشی میں شور

کرتے تھے جو فضا میں مسلسل بلند ہوتا تھا اور پھر کبوتروں کی ٹکڑیوں کے ساتھ گرتا ت
آج سرکاری سطح پر چھٹی تھی... حضرت عیسیٰؑ کی نہیں قائداعظم... کی سالگرہ کی خ
میں۔

برگیتا نے پیچھے مڑ کر مردان کو دیکھا جو لاہور شہر کے آسمان کو تکے جا رہا تھا۔

"مردان... میں تمہاری کومنٹری کو انجائے کر رہی تھی.. پلیز پھر سے شروع کر دو پلیز —"

"ہاں ڈرائیور کو جگانے کے لیے باتیں کرتے جائیے —" مشاہد مسکرایا۔

"جناب ہم بہت غلط جگہ پر اپنی کومنٹری کا آغاز کرنے لگے ہیں۔ یہ دائیں جا لاہور کی ممنوعہ گلیاں ہیں... جسے عرف عام میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے مجھ ایسا شریف شخ زبان پر نہیں لا سکتا لیکن نقل کفر والی بات ہے ان گلیوں کو ساجن کی گلیاں کہہ لیجئے ہیرامنڈی کہہ لیجئے —"

"اور مشاہد مجھے یہاں لے کر نہیں آیا۔ میں نے اسے اتنا کہا لیکن یہ کہتا ہے ک گلیاں شریفوں کے لیے نہیں ہے حالانکہ میں تو شریف نہیں ہوں، مشرق کے کسی معیار سے شریف نہیں ہوں بلکہ..." برگیتا نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر ہچکی بھری۔

"تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں —"

"مردان میں تمہارے ساتھ کسی روز آؤں گی... تم کتنے روز کے لیے آئے ہو؟

"چند روز کے لیے —"

"تو پھر میری تمہاری ڈیٹ ہے، ڈانسنگ گرلز آف لاہور کے ساتھ ایک ڈیٹ پان اور موتیے کے ہاروں کے ساتھ مکمل ڈیٹ — یہ وعدہ ہے؟"

"ہاں بھابھی — اور... بادشاہی مسجد تو آپ ہر دو چار ماہ کے بعد دیکھ لیتی ہیں جب بھی آپ کا کوئی دوست سویڈن سے آتا ہے تو فہرست وہی ہوتی ہے شالامار، جہانگیر کا مقب بادشاہی مسجد.. اور شاہی قلعہ —"

"لیکن یہ فہرست بدل دی گئی ہے۔ آئندہ سے بادشاہی مسجد کے بعد دی ڈانسنگ گرلز..."

اُن کی جیپ بوڑھے راوی کے پاس آ چکی تھی... راوی جو ادھر تھا سوکھ چکا تھ اب وہاں ایک پُل تھا جس کے نیچے سے کچھ بھی نہ بہتا تھا.. بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ

دیواروں سے لگ کر بہنے والا راوی اب ان سے دور چلا گیا تھا..

"اور تاریخ آپ کے سامنے ہے بلکہ آپ کے دائیں ہاتھ پر ہے مینار پاکستان کی صورت میں.. ایسے ایسے باکمال دانشور اور فلسفی اس مینار کی تعمیر میں ملوث ہوئے کہ کیا عرض کروں اور انہوں نے اسے بہت عرصہ تک یادگار پاکستان کا نام دیئے رکھا، دانشور اور فلسفی جو تھے پھر... بھائی جان جیپ روک دیں... پلیز.."

مشاہد نے بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے مینار پاکستان کی طرف دیکھا اور مردان کی جانب دیکھے بغیر وہ جان گیا کہ اُس کا رنگ نچڑ چکا ہے اور اُس کا بدن ویسے ہی کانپ رہا ہے جیسے آج سات کمروں والی کوٹھی کے غیر آباد کچے فرش والے کمرے میں کانپتا تھا... "تم کچھ پیو گے؟"

"نہیں —"

"کیا بات ہے مردان —" برگیتا فکرمندی سے اٹھی اور جیپ سے اُتر کر اُس کے قریب ہو گئی "تم ٹھیک ہو ناں؟"

"ہاں بھابھی — پلیز فکر نہ کریں..."

وہ سامنے تاریخ کا کراس روڈ ہے... کدھر جانا ہے...اِدھر ہم اُدھر تم —"

فاصلوں کی کمند سے آزاد —

پلیز بھائی جان، اُس نے منّت کی تھی۔

اور مشاہد نے کہا تھا، دیکھو مردان تم ایک آرمی آفیسر ہو اور تمہارے چہرے مُہرے سے اور چال ڈھال سے جیسے تم کھٹ کھٹ چلتے ہو دور سے پتہ چلتا ہے کہ تم سویلین نہیں ہو... ایک پولیٹیکل ریلی میں تمہارا کیا کام؟

جانے دیں بھائی جان یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ تو ملکی معاملات بن دلچسپی لے سکتے ہیں لیکن میں صرف وردی میں ہونے کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے کھڑا رہوں... اگر میں نے ملک کا دفاع کرنا ہے تو مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اس ملک میں کیا ہو رہا ہے — پلیز بھائی جان —

ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کی لابی میں گہما گہمی کے ساتھ سراسیمگی بھی تھی۔ کچھ تھا جو فضا میں تھا۔ چہرے جو وہاں تھے کچھ چوکنے تھے جیسے ہر آہٹ پر کان رکھتے ہوں۔ چھت

تک پہنچتی فرنچ ونڈوز کے بھاری پردے پھندنوں والی ڈوریوں سے بندھے ہوئے تھے ا دھوپ ان میزوں پر ٹھہری ہوئی تھی جہاں لوگ چائے کی چسکی لیتے ہوئے پیالی کی جا نہیں اُن دو لفٹوں کی جانب دیکھتے تھے جو مسلسل اوپر نیچے آ جا رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک سیٹی میں بیٹھ گئے... کافی بار بریزری کو جانے والے برآمدے میں کچھ لوگ بے سے ٹہلتے تھے۔ شاید حفیظ پیرزادہ، شاید شیرپاؤ... شاید... وہاں اُن میں سے بیشتر تھے جنہ نے کوریڈورز آف پاور میں قدم رکھا... منسٹرز، گورنرز... ایڈوائزرز... اینڈ وہاٹ ناٹ لیکن ابھی وہ منتظر تھے کیونکہ آج فیصلہ ہونا تھا... اُس نے ان دو لفٹوں میں سے کسی ایک نیچے آنا تھا۔ وقت ہو چکا تھا۔ ورکرز خبر دے رہے تھے کہ مینار پاکستان کے آس پاس ا ریکارڈ کراؤڈ جمع ہو چکا ہے اور نعرے لگا لگا کر ان کے گلے رندھ چکے ہیں۔ فی الحال انٹر نینٹل کے کوریڈور میں ٹہلتے ہوئے یہ لوگ اپنی گھڑیاں دیکھتے تھے اور بے تابی سے پھونکتے تھے... وہ اوپر کیا کر رہا ہے؟... اُنہیں یہ پرواہ نہیں تھی کہ لوگ سن رہے ہیں او ایک دوسرے کے قریب سے گذرتے ہوئے بلند اور ایکسائیٹڈ آواز میں کومنٹس دے ر تھے... وہ دیر صرف اس لیے کر رہا ہے کہ وہ لوگوں کے نروز کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے...

پھر ایک لفٹ نیچے آئی۔ مشاہد اور مردان کے عین سامنے.. اُس کے پٹ س ہوئے اور ایک لمحے کے لیے ذوالفقار علی بھٹو جھجکا... کھلے عوامی سوٹ میں، کف ہوئے، اُس کی آنکھیں شاید بے خوابی کے باعث سُرخ تھیں اور وہ کچھ چبا رہا تھا۔ اُس بالکل سامنے دیکھا اور باہر آ گیا۔ مصطفیٰ کھر اور دوسرے لوگ جھکے سروں کے ساتھ سے باہر آئے.. لابی اور برآمدے میں ٹہلتے لوگ ایک میگنٹ کی جانب بے اختیار کھنچے آئے۔ میگنٹ اُن سے بے پرواہ ایک ڈیشنگ پرنس کی طرح ہاتھ ہلاتا صدر درواز طرف چلنے لگا اور یہی وہ لمحہ تھا جب مردان نے مشاہد کا ہاتھ پکڑ کر اُسے تقریباً گھسیٹ بھٹو کے عین پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔ صدر دروازے پر خاصی دیر سے منتظر ایک کا دروازے اتنی تیزی سے کھلے جیسے ہوا کے زور سے کھل گئے ہوں۔ بھٹو کار میں بیٹھنے سفید شٹل کاک برقعے میں ملبوس ایک عورت جانے کہاں سے اُس کے سامنے آ گئی۔ ہاتھ میں ایک عرضی تھی اور وہ بلند آواز میں منت سماجت کر رہی تھی۔ مردان اُس خاصا نزدیک تھا۔ وہ عورت آہ و زاری کر رہی تھی اور میرے صاحب میرے صاحب رہی تھی۔ لیکن یہ وقت ایک منت سماجت کرتی شٹل کاک برقعے میں لپٹی کسی ادھ

عورت کا نہ تھا، ڈیسٹنی کا تھا — تاریخ کے کراس روڈ پر فیصلوں کا تھا.. بھٹو نے اُس عورت کو قدرے دُرشتگی سے پرے کیا اور کار میں بیٹھ گیا... وہ بے حد گہری سوچ میں تھا اور مردان کو یقین تھا کہ وہ وہاں موجود کسی بھی شخص کی موجودگی سے آگاہ نہیں.. اُسکے ذہن میں کچھ اور تھا...

بھٹو کی کار ہوٹل کی راہداری سے نکل کر مال روڈ پر آئی تو مشاہد کی کار عین اُس کے پیچھے تھی۔ کسی کو کیا پتہ کہ وہ کون ہیں لیکن وہ تاریخ کا پیچھا کرنا چاہتے تھے۔ وہ کار جانے کہاں کہاں سے گذر رہی تھی۔ مشاہد کی کار کے پیچھے درجنوں کاریں چلی آ رہی تھیں... راستے میں کہیں کہیں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بھٹو کو دیکھ وہ نعرے بلند کرنے لگتے اور وہ مشاہد اور مردان کو بھی لیڈران سمجھ کر ہاتھ ہلاتے اور مردان اِس ایک لمحے کی سلطانی کو انجائے کرتا اور نہایت محبت اور متانت سے جواب میں ہاتھ ہلاتا... اس سفر کی ایک تصویر ایسی تھی جو اُس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی۔ مینارِ پاکستان قریب آ رہا تھا اور کاروں کے اس کاروان کو لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے بار بار رُکنا پڑ رہا تھا۔ ایک مقام پر کار رکی، بالکل سامنے ایک ملنگ چیتھڑوں میں ملبوس، ایک بڑے مُگدر نما ڈنڈے سے بھنگ گھوٹ رہا تھا۔ اُس نے اُدھر مینارِ پاکستان کی جانب رواں ہجوم کو ایک نظر دیکھا۔ اُس ایک نظر میں وہ کار آئی اور پھر اُس میں سوار وہ پُرکشش شخص نظر آیا جو سب کا چہیتا تھا۔ ملنگ نے اُس کے چہرے کو جانا اور پھر پوری طرح پہچانا اور پھر یکدم کھڑا ہو کر بے اختیار ہو کر والہانہ طور پر ناچنے لگا اور نعرے لگانے لگا — آوے ای آوے.. ساڈھا بھٹو، آوے ای آوے.. ساڈھا بھٹو... اور بھٹو نے ہاتھ ہلا کر اُسے ایک خاص مسکراہٹ سے نوازا... یہ واحد مسکراہٹ تھی جو اُس روز اُس کے لبوں پر آئی... ٹریفک رواں ہوئی اور اب اُن کے سامنے جلسہ گاہ کے اندر جانے والا راستہ تھا جسے ورکرز لوگوں کے ہجوم کے آگے دیوار بن کر بنا رہے تھے اور بھٹو کی کار اُس میں سے گذرتی جا رہی تھی۔

مشاہد ذرا نروس تھا، مردان یہ ہم کہاں جا رہے ہیں..

جہاں بھٹو وہاں ہم — مردان پر لاکھوں کے ہجوم اور اُن کے پُرجوش نعروں کے کرنٹ کا اثر ہو رہا تھا — چلے چلیں بھائی جان۔

بھٹو کی کار ایک بہت بڑے چبوترے کے نیچے جا کر رُک گئی۔ مینارِ پاکستان کے بن سائے میں... اُسے ورکرز کے ایک ہجوم نے گھیر لیا اور وہ چبوترے کی سیڑھیوں پر

چڑھنے لگا۔ جلدی کریں بھائی جان جلدی کریں — مردان چیخنے لگا — ہم بھی ڈائس سکتے ہیں بھٹو کے پیچھے پیچھے...

نہیں — مشاہد وہیں کھڑا ہو گیا — میں ورکرز کے ہاتھوں اپنی درگت نہیں چاہتا.. اور تم بھی یہیں کھڑے رہو...

اُنھوں نے اوپر دیکھا... اُن کے عین اوپر درجنوں مائکس تھے.. اور پھر بھرپ تقریروں کے بعد بھٹو اُن مائکس کے اوپر آ کھڑا ہوا۔ ہاتھ کولہوں پر اور وہ ابھی تک کچھ رہا تھا۔ ہجوم اُسے دیکھ کر بے قابو ہو رہا تھا... اُس کی جڑیں اِس ہجوم میں تھیں.. پھر نے تقریر شروع کی... اُس نے بہت کچھ کہا اور جب ڈائس کے سامنے بیٹھے ہوئے لو جوش میں آ کر کھڑے ہو جاتے اور نعرے لگانے لگتے تو وہ غصّے میں آ کر اُن سے 'بے وقوف بیٹھ جاؤ' — اور بے وقوف فوراً بیٹھ جاتے۔ مردان کو کچھ سمجھ نہیں آ کہ بھٹو کیا کہہ رہا ہے کیونکہ سینکڑوں لاؤڈ سپیکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے نصب اور آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر ہجوم کے شور میں مل کر لفظوں کی پہچا ناممکن بنا رہی تھیں... اُسے یہ اندازہ تھا کہ بھٹو ڈھاکہ میں بلائے جانے والے قومی ا کے اجلاس کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے.. اور پھر اُسے کچھ اندازہ ہوا کہ وہ اس اجلا ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے.. اور شاید یہ بھی کہ اگر کوئی ایم این اے اس اجلاس شامل ہوا تو اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی... ہمیں گارنٹیز چاہئیں... اور پبلک تائید کر تھی کہ مجیب الرحمن کی رعونت اور علیحدگی پسندی کا یہی جواب تھا — گارنٹیز کے مغربی پاکستان کے نمائندے کیوں ڈھاکہ چلے جائیں... اُس کی آستینوں کے بٹن کھلے اور تاریخ اُس کے لفظوں کی منتظر تھی... اُس نے مینار پاکستان کے سائے میں سمند لہروں کی طرح پرجوش ہجوم کی جانب دایاں ہاتھ اُٹھا کر ایک رُندھی ہوئی لیکن صاف او آواز میں کہا — ورنہ... اور پھر دوسرے ہاتھ کی اُنگلی سے اُدھر اشارہ کیا جدھر شاہی تھا اور اُس کے پار کہیں ہندوستان کی وسعت تھی اور اُس سے پرے مشرقی پاکستان تھا۔

فاصلوں کی کمند سے آزاد —

چلیں بھائی جان —

مشاہد نے جیپ سٹارٹ کر دی۔

تاریخ کا کراس روڈ پیچھے رہ گیا۔

برگیتا بند آنکھوں سے اپنے پپوٹوں کے روشن ماس کو دیکھتی تھی اور اُس ماس میں طرح طرح کے رنگ ابھرتے تھے۔ اُس نے چہرہ اُونچا کر کے پپوٹوں کو سورج کے سامنے کیا اور اُسکی بند آنکھیں چندھیا گئیں... آج کرسمس ہے... اور یوٹے بورگ میں کونسا ایسا گھر تھا... دریا پر جھکے ہوئے گھر اور کھیتوں کے سبزے میں گھرے ہوئے گھر.. جس کی خواہش برگیتا نہیں ہوتی تھی۔ وہ لوگ بابا راڈنی کی منتیں کرتے، ان کے لیے چاکلیٹ کیک لے کر آتے — کرسمس کے روز برگیتا کو ہمارے گھر میں بھیج دیجئے... ہمارے سب مہمان اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کرسمس کے دن اُسے دیکھنا اچھا اومن ہو گا ہم اُسے ایک شہزادی کی طرح رکھیں گے — لیکن بابا راڈنی کبھی نہیں مانتے تھے — کرسمس کے دن تو ہرگز نہیں — اور وہ اپنے بے سُرے اور چرخ چوں چرخ چوں بولتے پھٹیچر ہارمونیم پر اسے 'کیسا بابرکت دن ہے' اور 'ساڈھا یسوع مسیح اَج آیا سی' گا گا کر سناتے اور وہ صرف اُن کا دل رکھنے کے لیے یہ دیسی کرسمس گیت سنتی رہتی.. وہ سویڈش تھی اور اُسے اردو اور پنجابی کا بہت کم محاورہ تھا...

مشاہد نے جیپ کے تیز ہارن کو متعدد بار بجایا تو اُس نے آنکھیں کھول دی۔ وہ راوی کے پُل پر پہنچ چکے تھے۔ نیچے ریت کا ایک وسیع علاقہ تھا جس میں مختلف حصوں میں بٹا ہوا راوی بہتا تھا... اُس کا مرکزی بہاؤ کسی عام نہر کی چوڑائی جتنا تھا اور اُس میں بھی روانی بہت غور سے دیکھنے پر رواں ہوتی تھی اور وہ ریت کے ٹاپوؤں میں سے سہم کر نکلتا جاتا تھا۔

چار چیزیں ہیں — اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے۔

مشاہد نے بارہ دری کی طرف دیکھا لیکن ناراضگی سے دیکھا... آثار قدیمہ کے وکروں نے اپنے تئیں بارہ دری کے کھنڈروں کی عظمت رفتہ بحال کر دی تھی اور ایسی حال کی تھی کہ وہ اب کسی صنعتی نمائش میں ایستادہ بجلی کے پنکھوں یا چینی کے برتنوں کا منگاتا سٹال دکھائی دیتی تھی.. نویں نکور... پرانے برتن دے کر نئے برتن لینے والے جوکر ی تک ہمارے آس پاس تھے...

"جلدی سے بابا نذیر دی آرٹسٹ کو تلاش کرو —" مشاہد نے جیپ کی رفتار

سُست کردی..

"کرلیا —" مردان نے انگلی کھڑی کردی.. "ریت میں دھنسی اُس بڑی کشتی کے پاس... ایزل کو گھورتے ہوئے ڈھیلے سپورٹس ہیٹ اور کُرتے شلوار میں وہی تو ہے جسے ؟ بابا نذیر کہتے ہیں.. بھائی جان آپ مجھے یہاں اُتار دیجئے —"

برگیتا نے کچھ ڈانٹ کے انداز میں کہا، "ہمارے ساتھ نہیں چلو گے..."

مشاہد نے جیپ روک لی، "ہم تمہیں واپسی پر پک کرلیں گے.."

"میں خود ہی پہنچ جاؤں گا' بھائی جان —" وہ جیپ سے کُود کر اُتر گیا۔

"بابا نذیر کے پاس گیا ہے؟"

"ہاں —" مشاہد نے جیپ سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

پل کے دونوں سروں پر متعدد اینٹی ایئر کرافٹ گنز اپنی لمبی گردنیں اُٹھا بیوقوف کچھوؤں کی مانند لگ رہی تھیں جنہیں یہ علم نہیں تھا کہ آخر ہم خالی آسمان کو کیو دیکھے چلے جارہے ہیں۔

"پھر جنگ کا خطرہ ہے —؟"

"کب جنگ کا خطرہ نہیں ہوتا... جو کرز آل آف دیم۔"

راوی کے پار ہوتے ہی جیسے لاہور اُن سے کٹ گیا۔ جانیں دِھیئے راوی، نہ آوی تے نہ کوئی جاوی..

شاہدرہ موڑ سے ذرا پہلے مشاہد نے جیپ روک دی — "ہم اب بھی کامونکی سکتے ہیں برگیتا — کوئی حرج نہیں۔"

"نہیں مشیل —" برگیتا اپنے سر کو ہلاتی گئی جیسے ذرا رُکی تو اثبات کا پہلو آئے گا "نہیں — میرا وہاں کوئی نہیں — ہم وہیں چلیں گے جہاں ہر کرسمس کو ج ہیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی —" جیپ شاہدرہ موڑ سے بائیں ہاتھ مڑ گئی۔

شرق پور جانے والی سڑک میں اب بھی پرانے زمانوں کی سستی اور ٹھہراؤ تھا کے آس پاس جو سرسوں کے کھیت اور امرودوں کے باغ تھے اُن میں ایک خاص د تھی جو اُسے دوسری سڑکوں سے الگ کرتی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہمیشہ شائبہ ہوتا کہ شاید بند ہو گئے ہیں کیونکہ آوازیں رُک جاتیں اور صرف جیپ کے انجن کا شور سنائی دیتا۔

نے کشمیری شال کو اپنے سے الگ کیا اور اُسے بغیر تہہ کیے پچھلی نشستوں پر پھینک دیا "یہاں لوگ کُھلی فضا سے بہت جھجکتے ہیں حالانکہ یہی قدرتی ماحول ہے، انسان کا بدن ہوا اور دھوپ کو براہ راست محسوس کرنا چاہتا ہے..."

"ہمارے ہاں کی کُھلی فضا ایسی نہیں کہ یہاں سٹاک ہوم کے مڈسمر نائٹ کے جشن کے انداز میں یونہی بے دریغ گھوما جائے... یہاں بہت کچھ ہے جو ہمیں روکتا ہے۔ ہماری زمین کے اندر اور اوپر بہت کچھ ہے جو رینگتا ہے اور سرسراتا ہے۔ موسم میں شدت بھی ہے لیکن کُھلی فضا میں خوف بہت ہے۔ اس میں ڈر ہے.. ڈر ہے کہ کوئی آجائے گا' کوئی دیکھ لے گا —"

"اس کُھلی فضا میں اور اتنی زبردست آسودہ دھوپ میں سرسوں کے کھیتوں میں.. مشیل ذرا ذہن میں لاؤ کہ گھاس اور پودوں کی ٹھنڈک اور سبزہ جب تمہارے ننگے بدن کے نیچے بچھتے ہیں تو... یہ زبردست ہوگا —"

"ہاں —" مشاہد نے اُس کی خواہش کی تہہ کے مفہوم کو جانا اور مسکرایا۔ "اور یہ بھی زبردست ہوگا کہ ٹڈیاں اور مکوڑے وغیرہ میری پیٹھ پر چل رہے ہوں اور میں اُن کو باربار جھٹکنے کی کوشش کر رہا ہوں —"

شرق پور کی ہریالی اُن کی جیپ پر جھکی رہی اور پھر دھوکہ منڈی کے راستے پر آ گئے۔ تقریباً تیرہ چودہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مشاہد نے جیپ کو نچلے گیئر میں ڈالا ور بائیں جانب موڑ دیا۔ بلوچاں کا گاؤں یہاں سے پانچ کلومیٹر تھا۔ دن ڈھل رہا تھا اور وہ س سمت میں سفر کر رہے تھے اُدھر سے جو ہوا آتی تھی اُس میں خنکی بڑھتی جاتی تھی۔ وچاں کے آگے ایک پرانا برگد جیسے آدھے آسمان کو ڈھک کر پھر نیچے آتا تھا... اس کے مائے میں سے گذرتے اُنہیں دسمبر کی دھوپ کے دھوکے کا احساس ہوا جو یکدم ساتھ وڑتی تھی اور اُس کی جگہ سرد ہوا آتی تھی۔ برگد کے آگے ایک کھلا اور سپاٹ میدان ا — اور اس میدان سے پرے راوی پیلی دھوپ میں اپنے آپ پر نظریں ٹھہرنے نہ یتا تھا..

دوسرے کنارے پر شیر شاہ سوری کے زمانے کا گاؤں سنگا اور اس کی پرانی فصیل رد پانیوں میں سے اٹھتی دھندلاہٹ میں کہیں ظاہر ہوتے تھے اور کہیں گم ہوتے تھے..

چنے کا ایک کھیت بائیں ہاتھ پر آیا۔ جیپ رک گئی کیونکہ آگے صرف ریت تھی..

ریت میں پاؤں دھنستے تھے۔

اور سو میٹر کے فاصلے پر دریا کی روانی تھی... راوی کے پانی تھے۔

— اس دھرتی پر اپنا سایہ کیجئو اے گانگا — یمونا — شتدری — پاروشنی او
سرسوتی۔

اور سو میٹر کے فاصلے پر دریا کے پانی تھے... پاروشنی کے پانی تھے۔

ریت میں پاؤں دھنستے تھے اس لیے مشاہد نے مردان کے بارے میں سوچا کہ ا
ہوا وہ نہیں آیا ورنہ اُسے یہاں چلنے میں بہت دشواری ہوتی۔ اُس کا پاؤں ریت میں بہ
گھستا۔

"تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے تمہاری اُن چار مرغابیوں کا کیا کیا جن
تعلق خوشی سے نہیں تھا —" مشاہد چلتے چلتے رُکا لیکن کچھ کہا نہیں اور پھر چلنے لگا۔

"میں نے اُنہیں رنجیت سنگھ کی پوتی کے ہاں بھجوا دیا تھا —"

"اُسے مرغابیاں پسند ہیں؟"

"پتہ نہیں — مجھے تو ٹھیک طرح سے یہ بھی معلوم نہیں کہ رنجیت سنگھ کی پ
ابھی تک زندہ بھی ہے یا نہیں —"

"بہت کم لوگ اُس کوٹھی کے اندر گئے ہیں —"

"وہاں کچھ چھپایا جا رہا ہے — پتہ نہیں کیا — رات کو بھی روشنی نہیں ہوتی
بے شمار کتے ہیں جو جنگلی حالت میں اُس کے اُجڑے ہوئے لان میں گھومتے رہتے ہیں۔
صرف مس پیر باہر آتی ہے اور... بہرحال میں نے مرغابیاں اُنہیں بھجوا دی ہیں —"

"اور وہ یہ نہیں جانتے کہ ان مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

اس بار چلتے چلتے برگیتا رُکی، شاہد کو دیکھا کہ اُسکے چہرے پر کیا ہے، لاپروائی یا
ٹھہراؤ.. کچھ بھی نہیں تھا — اور وہ چلنے لگی۔

اُن کے پاؤں تلے آتی ریت میں گیلاہٹ کی نمی آنے لگی۔ "میرا خیال ہے
دُور دُور تک کوئی نہیں جو ہمیں دیکھ سکے —" مشاہد نے اپنے چار چفیرے نظر دو
ہوئے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا، وہاں درخت تھے، کھیت اور راستے تھے لیکن کوئی
روح نہ تھا "یہیں ٹھیک ہے —" اُس نے پکنک باسکٹ ریت پر رکھی اور پسینہ پ
ہوئے بیٹھ گیا، ریت اُسکے بدن کے بوجھ سے اِدھر اُدھر سرکی اور پھر وہ اُس میں فٹ ہو

"کچھ لو گی؟" اُس نے باسکٹ میں سے سینڈوچز کا ایک پیکٹ نکالا..

"نہیں — پہلے وہ کام جس کے لیے ہم ہر کرسمس پر یہاں آتے ہیں.." برگیتا
نے اپنے کولہے پر کسے جین کے بٹن کو چھوا اور پھر آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجہ جما کر انتہائی غور
سے چاروں طرف دیکھا "نہیں یہاں کوئی نہیں ہے.." اُسے پنڈلیوں اور رانوں پر کسی ہوئی
جین اتارنے کے لیے خاصا تردّد کرنا پڑا۔

"تم آؤ گے؟"

مشاہد باسکٹ میں سے کچھ تلاش کر رہا تھا جب اُس نے پوچھا کہ تم آؤ گے... اور
وہ اُس پر ایک سیاہ کلاسس آف رہوڈز کی طرح ٹانگیں پھیلائے کھڑی تھی اور سورج کو
روکتی تھی جو اُس کی پشت پر تھا۔ اُس نے اُسکے پورے بدن کو اور ایک ایک پور اور اُبھار کو
حیرت سے دیکھا اور اُس نے اُسے دیکھنے دیا... یہ ایک سیاہ سحر تھا جو وہ اُس پر پھونکتی تھی!

"نہیں میں نہیں آؤں گا — تم ہو آؤ۔"

برگیتا پاؤں ریت میں سے نکالتی ہوئی پانی کی طرف چلنے لگی۔ ان خطوں کے لوگ
دریاؤں اور ندیوں سے کیوں جھجکتے ہیں۔ یہ نہانے کے لیے ہیں اور تیرنے کے لیے ہیں
لیکن یہاں کیا ہوتا ہے؟ مرد کناروں پر بیٹھ کر تربوز کھاتے ہیں اور اُن کے چھلکے پانیوں میں
پھینکتے ہیں اور عورتیں اگر بہت دلیر ہو جائیں تو پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں — پانی
اور کپڑے کا کوئی ساتھ نہیں... انسان پانی میں جائے تو ایسے ہی جائے جیسے وہ جا رہی تھی...
دریا کی باس اُس کے پوروں میں رچ کر اُس کے خون میں شامل ہو رہی تھی۔

اُس نے پہلا قدم پانی میں رکھا تو جھجکتے ہوئے رکھا... اگرچہ وہ اُس کی سرد اور گیلی
کاٹ کے لیے تیار تھی لیکن اِس کے باوجود پانی بہت زیادہ یخ تھے اور وہ تھرتھرائی اور
پورے بدن سے تھرتھرائی۔ پھر دوسرے قدم پر اُسکی یخ بستگی قدرے کم ہوئی اور پھر اُس
کے پاؤں اُس میں ایسے اُٹھنے لگے جیسے وہ عام زمین پر چلتی ہو۔ دس بارہ میٹر کے بعد پانی ذرا
گہرا ہونے لگا اور وہ اُسے اپنے بدن پر چڑھتے اور ٹھنڈک اتارتے محسوس کرتی آگے ہوتی
گئی۔ اور وہاں اتنا پانی تھا کہ وہ اگر بیٹھ جائے تو گردن تک آئے اور اُس میں اپنے آپ کو
دھو سکے تو وہ اُس میں بیٹھ گئی.... وہ مزید آگے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی،
راوی ایسا دریا نہیں تھا جس کی تہہ برابر ہو اور انسان اُس کے اوپر سطح پر تیرتا رہے.. کہیں
وہ کمر تک آتا تھا اور کہیں یکلخت سینکڑوں میٹر گہرا ہو جاتا تھا...

اُس نے اپنی ناک دریا کی سطح پر رکھی اور دوسرے کنارے کو دیکھا۔ ننگا گاؤ کی پرانی فصیل کے گرد اُترتی شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ اور بالکل چُپ تھی۔ پانی چلنے کی سرسراہٹ بھی نہ تھی — پانی برگیتا کی کمزوری تھا۔ یوتے بورگ میں بھی کر کوئی دن ہو گا جب وہ دریائے یوٹا میں کود کر دوسرے کنارے کو ہاتھ لگا کر واپس نہ آ ہو۔ راوی کا پانی یوٹا کی نسبت پھر بھی گرماہٹ لیے ہوتا تھا اور یہاں چُپ تھی اور وہا بندرگاہ کی جانب سے آتے ہوئے سٹیمرز اور جہازوں کے بھدے ڈکراتے ہوئے ہارن۔۔ ا وہاں کا پانی بھی بہت گاڑھا تھا، جانے اُس میں کیا کیا آکر ملتا تھا، آئل، کوڑا کرکٹ، سیورج صنعتی فضلہ لیکن راوی ابھی تک — صاف اور ہلکا اور بدن کو نئی زندگی دینے والا تھا....

اِس دھرتی پر اپنا سایہ کیجئو اے گانگا — یمونا — نتھدری — پاروشنی ا سرسوتی۔

اُس نے ناک کو دونوں اُنگلیوں سے بھینچا اور ڈبکی لگا کر پانی کے اندر گئی اور اُ دنیا میں ہلکی بڑبڑاہٹیں تھیں اور ہر شے اُوپر کو اُٹھ رہی تھی اور وہ سست ہوتی تھی تب اُ کا سانس کم ہوا اور اُس کا سر سطح کے اوپر آگیا... دسمبر کی شام پانیوں کے اندر تک جار تھی اور اُسکی سردی اب برداشت سے باہر ہونے لگی تھی۔

آج صبح مشاہد کی بوڑھی باجیاں اُسے یوں تو کرسمس کی مبارکباد دینے آئی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اُسے اُسکی اوقات یاد دلانے کے لیے آتی ہیں اور دھواں دار رو دھونے اور ایک دوسرے کو آنسو اور ناکیں پونچھنے کے لیے ٹشوز سپلائی کرنے کے دورا اُنہوں نے اپنے باپ چوہدری اللہ داد خان کی آل کے ممکنہ اختتام کے بارے میں نہای دردناک طریقے سے اظہار رائے کیا تھا اور نہایت واضح مگر معزز لہجے میں اِس خدشے اظہار کیا تھا کہ چوہدری اللہ داد خان کی آل کے خاتمے کا واحد سبب برگیتا کا بنجر ہونا ہے۔ ا برگیتا نے ہمیشہ کی طرح اُن کی بات کو ہنس کر ٹال نہیں دیا تھا بلکہ وہ جواب دیا تھا جس نتیجے میں ہر دو باجیاں اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی تھیں اور سرہلاتی تھیں اور یقیناً انہوں آئندہ یہ اعتراض کبھی نہیں کرنا تھا کیونکہ برگیتا نے اُنہیں نہایت کیشول طریقے سے جی ہم بتاتے ہیں کہ آج کیا پکا ہے یا آج موسم بہت اچھا ہے تو اسی طرح اُس نے اُن دونو بتایا تھا کہ تمہارے بھائی جان سے شادی کرنے سے پیشتر میں کم از کم تین مرتبہ پر یگنن ہوئی تھی اور کیا وہ کچھ ابورشن رپورٹس دیکھنا پسند کریں گی؟ —

برگیتا کے پانی میں ڈوبے ہوئے جُسّے کے ساتھ جیسے کوئی سرسراتا سانپ لپٹا اور اُسکی ئی زبانیں اُس کے اُبھار اور پیچ کو چاٹنے لگیں۔ ایک ڈر کی ہچکی اُس کے مُنہ سے نکلی اور ہ نوکدار کانوں والے سیاہ بلے کی طرح ٹھٹکی اور اُس کے ننگے وجود پر خوف سے کانٹے اُبھرے اور وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے ابھاروں پر ٹھہرا پانی دریا میں شپ شپ گرا۔ ہ سرسراتی ہوئی شے اُس کے پیروں سے لپٹ رہی تھی۔ وہ جھکی اور ڈرتے ڈرتے پانی میں وں کے گرد ہاتھ پھیرا — اُس کا ہاتھ پانی سے باہر آیا تو اُس میں ایک بدبودار پلاسٹک ب تھا — ایک سیاہ رنگ کا پلاسٹک شاپنگ بیگ... اور اُسکے ساتھ ہی اُسے پہلی بار ساس ہوا کہ پانی میں تیز بُو بھی تھی... وہ جلدی سے باہر آگئی۔

"کیا ہوا؟" مشاہد نے اُسے اپنی جانب تیزی سے آتے ہوئے دیکھا... "اور ہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"ایک شاپر بیگ — " اُس نے بیگ کا لفظ ایک اُبکائی کے ساتھ ادا کیا "مشیل اوی میں بُو ہے.... پانی صاف نہیں ہے —"

"ان دنوں پانی کم ہیں اور لاہور شہر کا سیورج زیادہ — تمام گندے نالے اسی میں رتے ہیں.... ہمیں ڈاؤن سٹریم نہیں آنا چاہیے تھا —"

"مجھے اپنے آپ سے بُو آ رہی ہے.. ٹائلٹ کی.... پلیز جلدی سے واپس گھر چلو.... ں یہاں نہیں ٹھہر سکتی..." برگیتا بار بار اپنے مُنہ کے آگے ہتھیلی رکھتی تھی جیسے کچھ باہر آ ئے گا اور وہ اسے روکتی تھی اور اُبکائیاں لیتی تھی.. "راوی کو کیا ہو رہا ہے مشیل؟"

وہاں جتنے بھی درخت تھے، چھدرے یا گھنے اور جو سب کے سب پرانے تھے، ن، کچنار، شیشم، دھریک، املتاس وغیرہ تو اُن سب کی ٹہنیوں اور پتوں کے گرد اور اُن ے جھنڈ کے اندر کرسمس لائٹس کہیں دکھائی دیتی تھیں کبھی چھپ جاتی تھیں اور ان کے ے ایک میز تھی دو کرسیاں تھیں اور میز پوری طرح آراستہ تھی صرف خوراک کی کسر ا اور جب مشاہد اور برگیتا کی جیپ دسمبر کی رات میں سات کمروں والی کوٹھی کے اندر خل ہوئی تو برگیتا نے درختوں کو یوں جگمگاتے دیکھا تو اُس نے ایک پُرمسرت خصوصی رش ہچکی بھری — اور اُس لمحے اوپر جامن کی ایک کچی ٹہنی پر مزے سے بیٹھا مردان اور اُس نے جھُک کر برگیتا سے کہا — بھابی، شہر میونخ میں آج کرسمس ہے۔

مردان نے انتظار کیا۔

گرم پگھلی ہوئی موم کے سیال دائرے میں تیرتے چھوٹے سے فیتے کا شعلہ دھواں دینے لگا، سیاہ پوش ہوا، تب اُس نے اُنگلی سے اُسے چھوا.... گرم موم کی ایک اُس کی پور پر بچھی اور دسمبر کی یخ میں فوراً سرد ہو کر اکڑ گئی... اُس نے ران پر رکھے کو اُٹھا کر دوسرے ہاتھ کی اُنگلی پر جمی موم کی اکڑی ہوئی تہہ کو چھوا تو وہ ایک چھلکے کی اُتر گئی.. موم بتیاں بجھنے پر وہ اندھیرا جس میں برگیتا اب کم دکھائی دیتی تھی گھنا اور قریب گیا... ہاں جب بھی وہ مسکراتی اس کے دانت تاریکی کے پردے پر نمایاں ثبت نظر لگتے...

"بھرجائی —"

برگیتا نے ایک ہچکی بھری۔

"آپ خوش ہیں؟"

"ہاں —" اُس کے دانت پھر دکھائی دیے "جامن، کچنار، املتاس کے ان گ ٹریز تلے... کرسمس کی اس رات میں جو اگرچہ سفید نہیں ہے... تمہارے ساتھ... میں ہوں.. جب تم نے آخری موم بتی کی پگھلی ہوئی موم کو چھوا تو اُس کی بہتی ہوئی گر میں نے اپنے پوروں پر بھی محسوس کیا... اور میں... ہاں اِس لمحے تو میں خوش ہوں —

برگیتا نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا.. وہ اُس پر جُھکا کہ وہاں اُس کی اُنگلیوں پر کی شاخوں میں پروئی ہوئی کرسمس لائٹس کی روشنی بہت مدھم تھی... موم کی ایک پتلی ایک چھلکا ابھی تک برگیتا کی اُنگلی پر نظر آتا تھا۔ اُس نے بے یقینی سے اُسے دیکھا "لیکن موم کو تو میں نے چھُوا تھا —"

"اور اُسے محسوس میں نے کیا تھا —"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیونکہ اِس لمحے میں خوش ہوں.."

"اور جو لمحے گذر گئے اور جو آئیں گے اُن میں؟"

"جو گذر گئے وہ تو گذر گئے اُن کی خوشی ناخوشی اِس اندھیرے میں ہے جو درختوں کے نیچے ہمیں دیکھتا ہے اور جو آئیں گے اُن کے بارے میں مَیں ابھی سے کیسے کہہ سکتی ہوں کہ وہ کیسے ہوں گے — یا کہہ سکتی ہوں؟"

برگیتا نے بھی مردان کے دانتوں کو نمایاں ہوتے دیکھا اور اُس کی ہنسی کی آواز کو آج صبح کی طرح اُس نے طویل کمرے میں لیٹے ہوئے سنا.. وہ بے حجاب ہنسی جو مشاہد کی رفاقت میں جنم لیتی تھی اور اُسے حسد میں مبتلا کرتی تھی۔

"ہاں۔ یہ حماقت آمیز سوال تھا —"

"لیکن مجھے ایک بات کا یقین ہے مردان — خوشی کا چار مرغابیوں سے کوئی تعلق نہیں —"

مردان چپ ہو گیا۔ وہ ابھی تک برگیتا کی اُنگلی پر جمے موم کے چھلکے کی اُلجھن میں تھا — اور وہ کچھ دیر یونہی ڈھلتی رات کی سرد شدت میں اپنے آپ میں چپ رہا۔

"چار مرغابیاں؟" بالآخر وہ بولا۔

"ہاں... ایک شیولر اور تین نیل سر —"

"یقیناً —" اُس نے سر ہلانا شروع کر دیا جیسے وہ اِس گتھی کو آسانی سے سلجھا چکا ہو۔

وہاں خودرو گھاس پر، درختوں کے نیچے، کرسمس لائٹس کی ناکافی روشنی میں صرف ایک میز تھی اور دو کرسیاں — اور جب تک مشاہد اور برگیتا اس کے تیار کردہ کرسمس ڈنر پر جھکے رہے اور روسٹ ٹرکی کی خستگی اور برسلز سپراؤٹس کی سبز گھلاوٹ سے لطف اندوز ہوتے رہے وہ اُن کے اصرار کے باوجود ایک مؤدب اور تمیزدار ویٹر کی طرح جُھکا کھڑا رہا اور ہر چند لمحوں کے بعد آگے ہو کر نظریں جھکائے صرف یہ دریافت کرتا کہ — موسیو مجھے اُمید ہے کہ ٹرکی آپ کی پسند کے مطابق ہے اور مادام کیا فرنچ فرائز آپ کی خواہش کے حساب سے کرسپ ہیں... اور پھر اپنے آپ کو اُسی طرح جھکا ہوا نیم تاریکی میں لے آتا۔ برگیتا نے پہلے تو والہانہ مسرت اور محبت سے اُس کی منت سماجت کی کہ وہ اُن کے ساتھ ڈنر میں شریک ہو اور پھر نہایت سنجیدگی سے اُسے ڈانٹا لیکن.. وہ اس معاملے میں پتھر

ہو چکا تھا — نہیں مادام... کرسمس کی اِس رات میں اِس سرسبز اوپن ایئر ریستوران
صرف ایک ٹیبل اور دو کرسیوں کی گنجائش ہے... اور یہ ٹیبل ہمیشہ کے لیے مخصوص
چکی ہے موسیو مشاہد علی اور مادام برگیتا برکت علی ایزبرگ کے لیے — ریزروڈ.. فار
اور میں تو ایک پُرانکسار اور خدمت گذار ویٹر ہوں.. کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ماد
موسیو؟

کھانے کے فوراً بعد مشاہد اٹھ کھڑا ہوا... تم دونوں بیٹھو... میں کچھ تھک چکا ہو
برگیتا کا ہاتھ اُس کے ماتھے کے ساتھ لگا تو وہ فکر مند ہو گئی "بخار تیز ہے۔
تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں —" مشاہد کی آواز میں وہ سختی تھی جس کے سامنے اِنکار کی گنجائش
ہوتی "تم بیٹھو — میں بہت تھک چکا ہوں... میرا دن تم سے بہت پہلے شروع ہوا
قادر آباد کی جھیلوں پر... ایک شیولر اور تین نیل سر... یاد ہے؟" ہاں، آج صبح جب
برگیتا کے پیچھے صرف جین پہنے طویل کمرے سے باہر آ گیا تھا تو اُس کے بدن نے ا
خبردار کیا تھا... بس اسی لیے... اُسے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کی عادت نہیں ہو رہی تھی۔

"بھائی جان —"

"تم ایک معمولی ویٹر ہو۔" اُس نے مردان کے سینے پر اُنگلی رکھ کر اُسے ذر
دھکیلا "اور گاہکوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے" — یہ کہتے ہوئے م
کی آواز کی سختی میں وہ نرمی در آئی جسے برگیتا نے فوراً محسوس کیا تو ایک بار پھر وہ حسد
کچھ جلی... یہ دونوں ایک ایسی بریڈ تھے جو اپنی مُحبت میں کسی کو شریک نہیں کرتی... م
نے بڑے اہتمام سے اپنی خالی نشست پر مردان کو بٹھایا اور پھر سجے سجے چلتا کرسمس لائ
کی ناکافی روشنی سے پرے سات کمروں والی کوٹھی کے برآمدے کی جانب اندھیرے
شامل ہو گیا۔

"تو گویا خوشی کا چار مرغابیوں سے کوئی تعلق نہیں —" وہ بدستور سر ہلا تا ج
تھا۔

"مجھے بھی کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں مردان — یہ تو تمہارے بھائی جان کا فل
ہے — اور تازہ ترین۔ آج صبح ہی ایجاد ہوا ہے —"

"بھرجائی — آپ مجھے معاف کریں گی اگر میں کہوں کہ یہ... فلسفہ میری سمجھ

نہیں آ سکا.. یعنی میں تو حیران پریشان.. بلکہ جنگل بیابان —"

"میں تو تمہیں تب معاف کروں جب یہ میری سمجھ میں آیا ہو —"

شاید وہ دونوں اپنے آپ میں ہو کر بے اختیار مسکرائے اور پھر خاموشی کا ایک
طویل وقفہ جس میں مردان کے ذہن پر موم کے وہ چھلکے تھے جو نہ چھونے کے باوجود برگیتا
کی پوروں پر تھے اور برگیتا کی پوروں میں مشاہد کے ماتھے کی حدت تھی جو اُسے بے چین
کرتی تھی اور اُوپر جامن کی کچی ٹہنیوں میں کوئی پرندہ اُلجھا اور کرسمس لائٹس جھولنے
لگیں۔

وہ دسمبر کی یخ میں.. سرد رات میں اپنے بدنوں میں سمٹتے تھے لیکن ابھی وہ اس
سردی کو سہار سکتے تھے۔

"تم شوبھا کو اِس بار بھی اپنے ساتھ نہیں لائے؟"

"بس نہیں لا سکا —"

"تم مجھ سے.. اور اپنے بھائی جان سے بھی اسے چھپاتے ہو... ہم نے کتنی بار اُسے
دیکھا ہے؟ صرف دو بار... کیا وہ ہمارے بارے میں سوال نہیں کرتی؟"

"وہ..." مردان پھر چپ ہو گیا۔ اُس پر بوجھ آ گیا شوبھا سے اتنے دنوں تک الگ
ہونے کا..

"وہ..." بالآخر اُس نے ایک سرد سانس بھر کر کہا "صرف آپ دونوں کے بارے
میں ہی سوال کرتی ہے.. اِدھر ہوا میں یخ بہت ہے۔ خاص طور پر دسمبر میں.. اور وہ سردی کو
سہار نہیں سکتی۔ کراچی میں کتنی سردی ہوتی ہے؟... اور وہاں جب کبھی قندھاری ہوا کا
ایک جھونکا آئے تو وہ ایک آدھ نہیں متعدد کمبلوں میں دُبک جاتی ہے اور اگر صرف اپنی
کیوٹ ناک باہر نکالے تو وہ بھی سُرخ ہو جاتی ہے —"

"یہ تو کوئی بہانہ نہیں —"

"اور یہ اُس کا فائنل ایئر ہے..."

"ہاں.. یہ بہانہ ہو سکتا ہے.. اگرچہ میں اِسے بھی قبول نہیں کرتی۔"

ملیر کینٹ کی بیرک نمبر تین کے چوبی برآمدے میں ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے اُدھر جدھر
کچے راستے پر سے دُھول اُٹھتی ہے وہ شوبھا اب یہاں تھی جامن، کچنار اور املتاس کے
درختوں تلے مردان کے آس پاس.. "وہ بہت فریجائل ہے بھرجائی... اُس کے ٹوٹنے کا

خدشہ رہتا ہے.. اور اُس کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا ٹوٹتا رہتا ہے.. اور میں جوڑتا رہتا ہوں.. یہ لاہور میں، اپنی ساڑھی میں وہ بہت الگ نظر آتی ہے اور لوگوں کی نظر میں آ جاتی ہے میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آئے... اُن کی نظریں سوال کریں کہ یہ ہے.. کہاں سے آئی ہے —"

"وہ یہاں آ کر... میری طرح شلوار قمیض بھی تو پہن سکتی ہے.. اُس کا فگر زبردست ہے اور وہ اس پنجابی پہناوے میں بہت زبردست لگ سکتی ہے —"

"نہیں —" وہ آہستہ سے بولا "اِس پہناوے سے ناریل کے تیل کی مہک نہ آئے گی... پام کے درختوں کو دوہرا کرنے والی تیز ہوا تھم جائے گی جو چوہدری اللہ داد بوکس کیمرے میں قید ہو کر مجھ تک پہنچی تھی. تم سمجھتی ہو ناں بھرجائی؟"

"نہیں —" برگیتا نے ہچکی بھری۔

"آپ کو سمجھنے میں دشواری ہو گی.. جن کی تاریخ میں گھاؤ ہوتے ہیں صرف سمجھ سکتے ہیں اگر وہ سمجھنا چاہیں تو... اُسے حق حاصل ہے لباس کا... خوراک کا... اور ز کا... میری بنگالی بہت بُری ہے اور وہ تو بنگالی سمجھتی ہی نہیں اور اس کے باوجود میں کوشش کرتا ہوں.. اور پھر وہ بہت ہنستی ہے اور بھرجائی جب شوبھا ہنستی ہے تو..." وہ چپ ہوا بیرک نمبر تین کے چوبی برآمدے میں جہاں بیٹ مین بشیر اُس کے بوٹ پالش کر رہا وہاں... بیرک نمبر دو کے گرینڈ فادر کلاک کے ٹکلی کے قبرستان کے زرد دوپہر پتھروں قید سپاہیوں۔ گل بوٹوں اور نقش و نگار کی قربت میں.. ایک سر پر سے گذرتے اور ا پہیے کھولتے جیٹ کے پُر خراش شور میں — وہ چپ ہوا اور اس دوران برگیتا نے اُس چہرے پر نظریں رکھیں کہ وہ اُن تصویروں سے آشنا ہونا چاہتی تھی جو اُس کے ذہن پردے پر متحرک تھیں اور پھر وہ واپس آیا تو گویا ہوا "وہ ہنستی ہے تو میرے لیے کائنات معدوم ہو جاتی ہے اور صرف شوبھا کا چہرہ رہ جاتا ہے.. باقی سب کچھ دھندلا جاتا — وہ ہنستی ہے اور کہتی ہے — بابا — اور میں جواب میں کچھ بولتا نہیں تو وہ پھر ہے — بابا آپ بولتے کیوں نہیں — اور وہ نہیں جانتی کہ جب وہ "بابا" کا لفظ کہتی تو میرے وجود میں کیسی کیسی رنگا رنگ پھلجھڑیاں پھوٹتی ہیں.. وہ نہیں جانتی۔"

"مردان —" برگیتا نے بہت دیر سے اُس کے میز پر رکھے ساکت ہاتھ پر اپنا رکھا "اتنا شدید لگاؤ انسان کے لیے اچھا نہیں — اولاد کے لیے بھی نہیں — یہ مرض

سکتا ہے..."

"لیکن تاریخ کے گھاؤ میں جتنی نفرت ہے کیا میرا لگاؤ اتنا ہی شدید نہیں..."

"اُس نفرت کے تم ذمہ دار نہیں ہو مردان —"

"میں نہیں تو پھر کون ہے بھرجائی.." مردان کا چہرہ کرسمس لائٹس کی مدھم لَو میں بھی متغیر ہوا "میں یہی تو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ذمہ دار کون ہے — اتنے برس ہو گئے مجھے یہ سوال پوچھتے ہوئے کہ ذمہ دار کون ہے — اور اس سوال کا آغاز میں اس عتراف سے کر رہا ہوں کہ میں بھی ذمہ دار ہوں —"

"کوئی اور بات کرو مردان —"

مردان کو دیکھ کر برگیتا کے سر میں اَن ہونے خیال اور وسوسے کروٹیں لیتے تھے.. یک سرکش سا کاؤ بوائے، پیچیدہ اور پُرکشش لیکن ایسا چائلڈ لائک کہ اُسے دیکھ کر ماں بننے کو جی چاہتا ہے اس کے باوجود کہ یہ مجھ سے دوگنی عمر کا ہے اس کے باوجود — وہ اکثر اُلجھن میں رہتی تھی کہ مشاہد کون ہے اور مردان کیا ہے — اور کس کے بارے میں اُس کے کیا احساسات اخلاقیات کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ ترازو کے دو پلڑے تھے... جو ابر تھے... پر یہ برابر ہونے تو نہیں چاہئیں...

"بھرجائی ذرا اوپر دیکھیں —"

اُس نے اپنا چہرہ شاخوں سے لٹکتی کرسمس لائٹس کی طرف کیا... اور پھر سوچا کہ یوں.. اُس نے اُسے اوپر دیکھنے کے لیے کیوں کہا تھا... اس سے پیشتر کہ وہ پوچھتی مردان نے مسکرا کر "شکریہ" کہا اور پھر اپنی بڑھتی ہوئی داڑھی کھجا کر بولا "بچے نہ ہونے سے کچھ ی تو ہوتی ہے زندگی میں..."

"یہ کیا سوال ہے — جو بھی قدرت کا معمول ہے اس معمول سے ہٹ کر جو رت حال ہو اگرچہ وہ آپ کے اختیار میں نہ ہو تو کمی کا احساس تو ہوتا ہے — عورت بدن کا امتحان بچے کی پیدائش ہے کہ وہ کہاں تک تخلیق کے لیے کھنچ سکتی ہے، سار نا ہے تو میں ابھی اس امتحان سے نہیں گذری تو کمی تو ہو گی لیکن میں نے ابھی اِسے لہ نہیں بنایا.. اپنے لیے یا مشاہد کے لیے — ابھی وقت ہے اور تم نے مجھے اوپر دیکھنے لیے کیوں کہا تھا؟"

"جب آپ اوپر درختوں کی جانب دیکھتی ہیں تو کرسمس لائٹس... آپ کے چہرے پر

پڑتی ہیں.. اور ساز بجتے ہیں اور برف گرتی ہے....؟"

برگیتا پھر سے ہنسی ایک مسرت کے گہرے احساس کے ساتھ اور پھر اُس کے اپنا ہاتھ رکھا اور اُس کا ہاتھ برف ہو رہا تھا "اور کیا یہ شہر میونخ ہے؟"

"ہاں —" اتنی بلند آواز سے اُس نے یہ "ہاں" کہا کہ وہ پرندہ جو تھوڑ پہلے شاخوں میں اُلجھا تھا اور ابھی تک اطمینان سے کسی تاریک ٹہنی پر بیٹھا اُنہیں تکتا پھڑپھڑا کر اُڑا اور پھر اُسی ٹہنی پر براجمان ہو گیا "اور چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی نہیں؟"

"بالکل نہیں —" برگیتا اُس کے پاگل پن میں شریک ہو گئی... مشاہد کا گر ابھی تک اُس کی ہتھیلی پر ثبت تھا... اور اُسے شک ہوا کہ اندھیرے میں مکمل اندھیرے وہ لو دیتا ہو گا.. اور اُس لو دیتی ہتھیلی کے نیچے ابھی تک مردان کا ہاتھ تھا اور وہ ابھ برف تھا "تم سیکس کے بارے میں کیا کرتے ہو مردان؟"

اُس نے چونک کر اپنا ہاتھ لو دیتی ہتھیلی سے کھینچ لیا "وہاٹ ڈو یو مین؟"

"شادی کے بغیر — تمہیں Urge تو ہوتی ہو گی —"

اُس کا چہرہ ناکافی روشنی میں بھی سُرخ ہوتا دکھائی دیا "بھرجائیاں اِس قسم ـ اور معیوب سوال دیوروں سے نہیں پوچھتیں —"

"اور کیا دیور بھرجائیوں سے آنکھ جھپکے بغیر پوچھتے ہیں کہ آپ نے بچے نہیں دیا تو اس سے زندگی میں کیا کمی رہ گئی ہے؟ ہم تمہارے قبائلی تعصب والے اور دیور تو نہیں ہیں — کہ ہیں؟"

"نہیں ہیں —"

"میں تمہارے بارے میں بہت سوچتی ہوں —" برگیتا نے حسب عادت ہچکی بھری "تم اپنی Sexual Urge کو کیسے Manage کرتے ہو؟"

ایک اور خاموشی ان کے درمیان در آئی..

"آئی ایم سوری.. اگر تم اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے ہو تو — نو پر

"مجھے Urge نہیں ہوتی۔" وہ یکدم بولا۔

"یہ کیسے ممکن ہے — تم صحت مند ہو... ایک مرد ہو... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن ہے —" اس بار پھر اُس نے اتنی بلند آواز سے کہا جیسے کہ اُ

"ہاں" کہا تھا کہ وہ شانت پرندہ جو تاریکی کی اوٹ میں آرام کر رہا تھا اپنے پَر پھڑپھڑا کر ایک اور ٹہنی پر منتقل ہو گیا۔ "اُس دسمبر میں... اُس لمحے میں جب اُنہوں نے مُسندر بن کے گھنے سبز اور دلدل بھرے اندھیروں میں ایک اندھا دھند بھاگتے... جب کہ اُسے شعلوں ایسی جلتی جانور آنکھیں دیکھتی تھیں، اُسے... اُس کی شکست خوردہ وحشت کو ایک جال ڈال کر پکڑا تھا.. تو اِس جال کے پہلے لمس نے... مجھے امپوٹنٹ کر دیا تھا — مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے بھرجائی..."

اندھیرے میں بھی برگیتا کی سیاہ جلد نچڑی تو دکھائی دی۔

"آئی ایم سوری مردان —"

"نو پرابلم —" اُس کی آواز میں دکھ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

"یہ تو بہت بڑی ٹریجڈی ہے — ایک مرد کے لیے — آئی ایم سوری —"

مردان کی آواز کی بلندی ہسٹریا کی جانب زینہ بہ زینہ بلند ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھتا تھا لیکن قدرے بے قابو ہو رہا تھا "یہ اُس سے بڑی اور گمبھیر ٹریجڈی تو نہیں جس کی وجہ سے یہ ٹریجڈی ہوئی.. ان کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا — ایک فرد کا اور ایک قوم کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا —"

"میرا خیال ہے ہم کوئی اور بات کریں —"

"میں کتنی اور باتیں کروں بھرجائی —"

"سردی کچھ زیادہ ہو گئی ہے —"

"برگیتا برکت علی ایزبرگ کے لیے ایک سویڈش خاتون کے لیے لاہور کے دسمبر کی ات کا پچھلا پہر ناقابل برداشت ہے — نہیں بھرجائی... مجھے آپ دھوکہ نہ دیں... دسمبر ہم پاکستانیوں نے کتنی ڈھٹائی اور ریت میں سر چھپا کر برداشت کیا ہے آپ کو تو کوئی ابلم نہیں ہونی چاہیے.."

"اگلی بار شوبھا کو اپنے ساتھ لے کر آنا —"

مردان زینہ بہ زینہ نیچے آ گیا "بلیک میل بھرجائی..."

"ہاں۔ محبت میں بلیک میل جائز ہے —"

اُس کے پوروں پر جو موم کی تہہ اکڑی ہوئی تھی وہ پگھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ل کی گرمی نے دسمبر کی یخ کو بھی آسودہ کر دیا.. بیرک نمبر تین کے چوبی برآمدے میں،

کچے راستے پر نظریں جمائے شوبھا اور بیرک نمبر دو کے زرد دھوپ رنگ پتھروں کے۔ اور گُل بوٹے دسمبر کی اس یخ کو آسودہ کرنے لگے "میرے پاس یہ آخری سال ہے فائنل ایئر اور اُس کے بعد ہاؤس جاب شروع... بیٹیوں کو کیسے بیاہتے ہیں میرا کوئی نہیں.. ذات برادری اور قبیلے میں بڑی آسائش رہتی ہے.. آپ اُس پر زُوم اِن کر ج ہیں.. لیکن ایک ایسی لڑکی جس کا کوئی حوالہ.. کوئی قبیلہ نہ ہو اُسے آپ کہاں بیاہتے ہیں بس یہی میری فکرمندی ہے —"

"بشیر... دے بیٹ مین ابھی تک تمہارے ساتھ ہے؟"

"ہاں — پُرانی وفاداریاں آسانی سے نہیں مرتیں.. سویرے میرے بوٹ پ کرتا ہے، کپڑے اِستری کر کے ہینگر پر لٹکاتا ہے اور میری سپورٹس سائیکل کی ڈسٹنگ کر اُسے برآمدے کے ساتھ لگا دیتا ہے.. تب تک کھڑا رہتا ہے جب تک اُس کچے راستے میں نظر آتا رہتا ہوں... میں اُسے سمجھاتا ہوں کہ بشیر آئی ایم ناٹ اِن دے آرمی مور... ایک معمولی سکول ٹیچر ہوں. اور وہ جواب میں محبت سے مسکراتا ہے اور سلیوٹ کر دیتا ہے... وہ شوبھا کا بہت خیال رکھتا ہے —"

"سردی بدن کے اندر تک سرایت کر رہی ہے مردان... درختوں تلے چاہے اُ تمہاری ارینج کی ہوئی کرسمس لائٹس ہی کیوں نہ روشن ہوں... سردی بہت ہوتی ہے. اندر چلیں.."

اور مردان معترض نہ ہوا.. وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے..

"اور آج کی شب اگر تم اپنی بھرجائی کے کہنے پر سات کمروں والی کوٹھی کے ایک کمرے میں بسر کر لو... تو کوئی حرج ہے — وہاں اُس سیلن زدہ کھنڈر میں — در بند نہیں ہوگا، بوسیدہ ہے۔ ہوا آئے گی اور فرش پر گھاس اور کائی ہے —"

"ہاں حرج ہے۔" اُس نے جیسے پُرمسرت ہو کر کہا اور پھر برگیتا کے چوڑے مضبوط کندھوں کا ایسے سہارا لیا جیسے وہ ڈرنک ہو اور چلنے لگا.. "تم میری ڈارلنگ بھ آگاہ ہو کہ اُس دسمبر کے بعد میں ہمیشہ فرش پر سوتا ہوں... اس میں شائد میری تاریخ شامل ہو... میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ پُروقار طریقے سے ایک چارپائی سکوں... پتوں میں کھانا کھانا شاید اِن زمانوں میں پریکٹیکل نہیں ہے.. لیکن زمین پر ممکن ہے..."

پرندے نے جسے نیند کے ہلکورے آ رہے تھے اپنے نیچے میز اور کرسیوں کو خالی دیکھا تو آنکھیں بند کر کے نیند میں گم ہو گیا۔

اندھیرے میں اگرچہ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن مردان کا پاؤں آج کچھ زیادہ گھسٹتا تھا۔

لکشمی مینشن کے سہ منزلہ فلیٹوں کی لمبی مستطیل چھت پر مشاہد کی کھلی آنکھوں پر جو آسمان تھا اُس کی نیم تاریکی میں صرف ریگل چوک کے پار "سٹینڈرڈز" کے اوپن ایئر ریستوران میں سجاوٹ کے قمقموں کی ہلکی روشنی تھی جو اس تاریکی میں آگے ہو کر بجھ جاتی تھی اور اُس کے کانوں میں موسیقی اور تماشائیوں کا ہلکا شور تھا اور اُس شور کے درمیان سڑک کے پار "سٹینڈرڈز" کی چھت پر شہر لاہور کی اکلوتی اور من پسند ڈانسر ایم ناچ رہی تھی۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اُس کے برابر میں مردان گچھا مچھا ہو کر ایسے نیند میں گم تھا جیسے ابھی ماں کے پیٹ میں ہے اور پیدا نہیں ہوا۔ ہال روڈ کی جانب کھلتے ہوئے ا فلیٹوں کی چھت مشترکہ تھی اور اُن سے کچھ فاصلے پر جو چارپائیاں تھیں اُن پر روشن او مہروان کو ہونا چاہئے تھا اور اُن کے ماں باپ کو... دوسری جانب مینشن کے درمیان مے باغیچے کے اردگرد جتنی چھتیں تھیں وہ بھی آباد تھیں... ہوا اُس کی جانب آتی تو اُن چھتو کی کھسر پھسر بھی سنائی دینے لگتی.. وہ ابھی دو برس پیشتر گوالمنڈی کے علاقے سے اُٹھ ادھر لکشمی مینشن کے اِس فلیٹ میں آئے تھے، عزیز و اقارب نے بہت سمجھایا کہ اِد بے آباد اور سنسان علاقوں میں رہائش مناسب نہیں اور یوں بھی مال روڈ کے آس پا صاحب لوگ رہتے ہیں اور دیسی حضرات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہُوا یہی، پہلے روز جب گوالمنڈی والے پرانے مکان سے اُن کا سامان ایک ریڑھے پر لاد کر ا لایا گیا تو وہ سامان کی حفاظت کے لیے گلی میں کھڑا ہو گیا۔ ریڑھا بقیہ سامان لانے کے گوالمنڈی کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور وہ ایک اجنبی اور نامہربان قسم کے علاقے قدرے نروس اور کچھ خوفزدہ اپنے ٹین کے ٹرنکوں اور ٹوٹی ہوئی چارپائیوں کے درمی کھڑا تھا... اُن کی حفاظت کر رہا تھا... تھوڑی دیر بعد اُس کے آس پاس چہل پہل شروع گئی... یہ لڑکے اُسی کی عمر کے تھے یعنی نو دس برس کے لیکن اُن کی چال ڈھال اور و قطع کچھ الگ اور کچھ انگریزی سی تھی۔ وہ اُس کے دھاری دار پاجامے، چپل اور

قمیض کو دیکھتے اور پھر اپنی پتلونوں کی پچھلی جیبوں میں انگوٹھے اُڑس کر سیٹیاں بجاتے.. وہ اُسے کچھ کہتے نہیں تھے، صرف قریب سے گذرتے اور کسی ٹین کے ٹرنک پر طبلہ سا بجا کر گذر جاتے یا کسی چارپائی کی اُدھڑی ہوئی ادوائن کو کھینچ کر اُسی طرح پچھلی جیبوں میں نگوٹھا اُڑس کر سیٹیاں بجاتے ہوئے چلے جاتے... اور وہ آپس میں صرف انگریزی میں بات کرتے تھے... اُن کا خیال تھا کہ یہ چوڑی دھاریوں والے کھلے پاجامے والا پینڈو سا بچہ نگریزی نہیں جانتا... حالانکہ وہ جانتا تھا۔ رنگ محل مشن ہائی سکول کی گوری اور کالی ٹیچرز و جتنی انگریزی آتی تھی کم از کم اتنی تو وہ جانتا تھا... اور ایک مرتبہ جب اُن میں سے ایک ڑکے نے جس کی نیکر گھٹنوں تک لٹکتی تھی اُس کے قریب سے گذرتے ہوئے اُسے. بلڈی فول" کے خطاب سے نوازا اور یہ گالی اُن زمانوں میں یعنی 1950ء میں بے حد مقبول ھی تو مشاہد نے پلٹ کر اُسے ایک عدد جھانپڑ رسید کیا اور اس کے ہمراہ انگریزی میں ایک یی خوشنما گالی جواب کے طور پر دی کہ سیٹیاں بجاتا، اُس کے آس پاس ٹہلتا اور اُس پر اور اُسکے دھاری دار پاجامے پر حقارت سے نظر ڈالتا یہ مسلمان، ہندو، پارسی اور عیسائی کراؤڈ را تتر بتر ہو گیا...

گوالمنڈی اور لکشمی مینشن دو الگ دنیائیں تھیں اور وہ ابھی اس نئی دنیا کے سوم و رواج سے آگاہ نہیں تھا۔

اس دنیا میں سرِشام نوجوان لڑکے مرکزی باغیچے کے چار چفیرے فٹ پاتھ کے اتھ فلیٹوں کو جانے والی سیڑھیوں کے تھڑوں پر بیٹھے فرینک سناٹرا یا بنگ کراسبے کے گیت نہ بگاڑ بگاڑ کر گاتے تھے۔ نان کباب نہیں کھاتے تھے بلکہ ایک کباب کو نان میں لپیٹ کر سے بطور برگر نوش کرتے تھے۔ صرف انگریزی فلمیں دیکھتے تھے اور صرف آخری دن یکھتے تھے کیونکہ آخری تین شوز پر شناختی کارڈ دکھانے پر سٹوڈنٹ کنسیشن مل جاتی تھی ی دس آنے کا ٹکٹ خرید کر سوا روپے میں نشست مل جاتی تھی ـــ لیکن اُن دنوں س آنے بھی کس کے پاس ہوتے تھے۔ لکشمی مینشن کے اس نوجوان کراؤڈ کی ایک اپنی ڈ تھی... ان میں معزز صرف وہی لڑکا سمجھا جاتا تھا جو گیری کوپر یا گلین فورڈ کے سٹائل ں کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا کاؤ بوائے انداز میں چلے اور ہر دوسرے شخص کو "مسٹریو آر آراؤنڈ ہیئر ـــ" کہہ کر مخاطب کرے۔ بہت عرصہ بعد پنجابی فلموں میں یہی فقرہ "نواں یاں ایں سوہنیا" کے طور پر مصطفیٰ قریشی نے رائج کیا۔ ہر لڑکے کا ایک فیورٹ ایکٹریا

ایکٹرس ہوتی تھی اور اُس پر لازم تھا کہ وہ اپنی پسندیدہ اداکارہ یا اداکار کی تصویر جہاں شائع ہو اُس رسالے یا اخبار کو اپنی غربت کے باوجود خریدے اور اُسے کاٹ کر اپنی البم چپکا لے اور پھر شیخی بگھارتے ہوئے اعلان کرے کہ مسٹر آ گاٹ اے نیو پکچر آف ہمنز...

سرِ شام مینشن کے باغیچے کے گرد تھڑے آباد ہو جاتے اور فلیٹوں کی بالکو میں کچی عمر کی لڑکیاں اور اُن کی شیپران خواتین براجمان ہو جاتیں۔ ایک آدھ پھول یا کا اوپر سے آنا اور آپ کے آس پاس لینڈ کر جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوتا... آئیڈیل، امریکی کاؤ بوائز تھے اس لیے پسندیدہ پہناوا تنگ پتلونیں، چیک شرٹس، کھلے میں سکارف اور بڑے بڑے ہیٹ تھے۔ یہ ہیٹ عام طور پر لنڈا بازار سے خریدے اور غالباً دوسری جنگ عظیم میں ایمپائر کے دفاع میں کام آنے والے گورکھا سپاہیوں ہوتے۔ اس ہیٹ کو پہننے والے کا یہ فرض ہوتا کہ وہ اُس کا چھجہ اپنی آنکھوں کے آ جھکا لے کہ اُسے سامنے سے کچھ نظر نہ آئے اور وہ بے شک ٹھوکریں کھاتا پھرے او سے بھی ٹکرائے بصد ادب چھجے کو چھو کر "سوری میم" یا "بیگ یور پارڈن مسٹر — کر آگے بڑھ جائے... اور آگے جا کر پھر ٹھوکر کھائے یا کسی راہ گیر سے ہم آغو جائے... لیکن سٹائل کے لیے قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں...

مشاہد جب ایک ہاتھ میں تھیلا لٹکائے دوسرے میں کانسی کا کٹورہ پکڑے گھر سلف اور دہی لانے کے لیے بیڈن روڈ کی طرف جاتا تو یہ کراؤڈ اُس سے کچھ فاصلے رہتا... اُس جھانپڑ کی وجہ سے... کبھی آپا جی ننھے مردان کو بھی ہمراہ کر دیتیں کہ ب تین روز سے اس تیسری منزل پر قید ہے ذرا سیر کروا لاؤ ورنہ اس کی ٹانگیں ٹیڑ جائیں گی اور وہ کٹورہ مردان کو تھما کر خالی ہاتھ سے اُس کی انگلی پکڑ کر ساتھ لے جاتا دنوں جو کالیاں سے چاچا محمد بخش اُس کے اباجی کی "خبر" لینے آیا۔ اباجی کو تین ماہ سا بخار ہوا تھا اور یہ خبر گاؤں ذرا سہجے سہجے پہنچی تھی اور اب چاچا اپنے بھرا کی "خبر" تھا... مشاہد جانتا تھا کہ گاؤں کے بیشتر رشتے دار اُن کی خیر خبر کے لیے نہیں بلکہ لاہ آؤٹنگ کرنے کے لیے آتے تھے اور اس آؤٹنگ میں چڑیا گھر اور عجائب گھر سر ہوتے تھے... اور یہ ڈیوٹی مشاہد کی تھی — مشاہد بیٹے ذرا چاچے کو چڑیا گھر تو میرے بیٹے — اور مشاہد اِس چاچے کو چڑیا گھر لے جانے کے لیے فلیٹ کی باون س

سے نیچے اُترا اور دونوں بیڈن روڈ کی جانب چلنے لگے... مُجّی کے فلیٹ کی سیڑھیوں کے قریب مینشن کراؤڈ اُنہیں بے حد دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ایک پینڈو بچہ اور اُس کے ہمراہ ایک سچ مچ کا دیہاتی گنوار، کھدر کے کُرتے اور تہمد میں ملبوس، سر پر بھی کھدر کی ایک ڈھیلی سی پگڑی اور پاؤں میں اورینٹل سٹائل کے دیسی نوکدار جوتے... اُن میں سے پیٹر اور پال نے ہمت کی اور اُن کے قریب آ گئے — ہیلو — مشاہد چوکنا ہو گیا۔ شدت کی گرمی اور حبس کے باوجود یہ دونوں حضرات گورکھا ہیٹ پہنے ہوئے تھے اور فیشن کے مطابق اُن کے چھجے اُن کی ناکوں تک آئے ہوئے تھے۔

"ہاؤ ڈی؟" پال نے ہیٹ کے چھجے کو چھو کر ذرا جھک کر چاچے محمد بخش سے کہا۔

چاچے نے ہراساں ہو کر مشاہد کی طرف دیکھا۔

"ہوز دِس گائی؟" پیٹر نے ایک نرم دل کاؤ بوائے کے سٹائل میں پوچھا۔

"یہ میرا انکل ہے" مشاہد نے "انکل" کا لفظ کچھ جارحانہ انداز میں ادا کیا کہ کر لو جو کچھ کرنا ہے۔

"اور یہ انکل کیا کرتا ہے؟"

"اس کی زمین ہے گاؤں میں — اور مال مویشی ہیں —"

"اور کیا اس کے پاس کاؤز بھی ہیں اس... انکل کے پاس؟" پیٹر بھی ہمت کر کے آگے آ گیا۔

"ہاں... ہیں... اور گدھے بھی ہیں اور بھینسیں بھی ہیں اور کاؤز بھی ہیں... تمہیں س سے کیا..." مشاہد کا پارہ چڑھنے لگا لیکن اُدھر پال اور پیٹر یکدم موم ہو گئے، اُنہوں نے پنے ہیٹ سر سے اٹھا کر تھوڑی دیر اُنہیں فضا میں تھامے رکھا پھر اُنہیں سر پر رکھ کر چاچے مد بخش کے آگے جھک گئے "ہاؤ ڈی مسٹر —" اور ہاتھ آگے کر دیئے۔

چاچے نے بھی قدرے خوشگوار موڈ میں راضی ہو کر اُن سے ہاتھ ملا لیا۔

"ڈیو یو نو — ہی اِز آور فرسٹ رئیل کاؤ بوائے —" پال اور پیٹر کی مسرت میں کہیں بھی تضحیک کا کوئی پہلو نہ تھا۔ وہ حقیقتاً اپنی زندگی کا پہلا کاؤ بوائے دیکھ کر بے حد وش ہوئے تھے۔ "اینڈ وہاٹ اِز یور نیم مسٹر؟"

"مشاہد —" اُس نے بیزاری سے جواب دیا اور پھر چاچے محمد بخش کا ہاتھ پکڑ کر اُسے آگے چلنے کو کہا۔

"ہاؤ ڈی مُش —" اب اُن دونوں نے باری باری مشاہد سے ہاتھ ملایا
اپنے ہیٹ سنبھالتے اپنے دوستوں کے پاس چلے گئے..

مشاہد کے لیے مینشن کراؤڈ کی ممبرشپ کا یہ پہلا دن تھا..

چند روز بعد جب مشاہد نے اپنی والدہ کو جنہیں وہ آپا جی کہا کرتا تھا "ہائے
کہہ کر پکارا تو آپا جی سناٹے میں آگئیں۔

مشاہد کی ذات کے کورے کھدر کی سفیدی میں مینشن کا گوڑھا رنگ چڑھ
دھاری دار پاجامہ جو گوالمنڈی کے علاقے میں Ultimate سمجھا جاتا تھا متروک ہو
اُس کی جگہ ہپ پاکٹس والی دو پتلونیں آگئیں البتہ گورکھا ہیٹ کے ساتھ اُس کی م
نہ ہو سکی اور وہ منہ بگاڑ کر "ہاؤ ڈی" بھی نہ کہہ سکا... اِسی دوران اُسے مینشن کرا
ساتھ مکمل یکجہتی کے اظہار کے طور پر اپنے فیورٹ ایکٹر اور ایکٹریس کا انتخاب بھی کر
چنانچہ بے حد گہرے غور و خوض کے بعد قرعۂ فال ایوا گارڈنر اور سٹیورٹ گرینجر
پڑا... ایوا کو وہ "بیئرفٹ کانٹیسا" میں دیکھ چکا تھا اور وہ دنگ رہ گیا کہ کیا کسی خاتون...
اُس عمر میں ابھی بہت جنسی لفظ تھا... تو کیا کسی خاتون کی رنگت اتنی گوری اور دود
سکتی ہے خاص طور پر گردن کے عین نیچے۔ اور پھر "سنوز آف کلی منجاروز" نے فی
دیا.. وہ منظر فیصلہ کُن ثابت ہوا جس میں ایک پیرسین نائٹ کلب کے نیم تاریک
میں اور دھوییں میں گم ایوا کا کشش والا چہرہ ظاہر ہوتا ہے، سُرخ تیز سُرخ ہونٹوں والا چ
وہ اپنی ہسکی آواز میں اپنا سگرٹ سلگانے کے لیے گریگوری پیک کے قریب آتی ہے
منظر نے مینشن کے کراؤڈ کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے تھے اور یہ اثرات گہرے
ہی تھے کہ ان میں سے ہر کاؤ بوائے نے یہ فلم کم از کم پندرہ بیس مرتبہ تو ضرور
تھی.... سٹیورٹ گرینجر کی اداکاری سے زیادہ مشاہد کو اُس کے سفید سائڈ برنز بے حد
آئے تھے... سٹیورٹ کے حق میں یہ فیصلہ اُس کی شمشیر زنی میں مہارت کی وجہ سے
کیا گیا جو فلم "سکاراموش" میں کمال کی تھی.... اب وہ مکمل طور پر مینشن کراؤڈ کا م
چکا تھا... کانسی کے کٹورے میں دہی لانے کا کام چھوٹے مردان کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن
جی آپا جی ہی رہیں کیونکہ جس روز اُس نے اُنہیں "ہائے موم" کہہ کر پکارا تھا اُنہوں
دھواں لگے چمٹے سے اُس کی مرمت کی تھی اور کہا تھا کہ مشو کے بچے خبردار جو آئندہ
چوُڑوں کی زبان میں موم شوم کہا... دونوں کان اکھاڑ دوں گی تیرے... ہا ہائے میرے

انگریزی بولتا ہے۔

بیڈن روڈ کی جانب مینشن میں سے جو چھوٹا سا راستہ نکلتا تھا اُس کی نکڑ پر جوس والے خان کا کھوکھا تھا اور وہاں سے ومٹو اور بنٹے والی سوڈے کی بوتلیں بھی ملتی تھیں۔ اس کھوکھے کے برابر میں شیرازی ہوٹل تھا جہاں اُس نے پہلی بار گروچو مارکس کو دیکھا تھا... ہوا یوں کہ گھر میں آپا جی نے ٹینڈے کریلے قسم کی کوئی واہیات سی سبزی پکا رکھی تھی اور اُس نے اسے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے ناتے وہ کچھ خصوصی مراعات کا حقدار تھا اور اُن میں سے ایک یہ تھی کہ پسند کا کھانا نہ پکنے کی صورت میں وہ بازار سے دو شامی کباب لا کر روٹی اُن کے ساتھ کھا سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے دسترخوان تہہ کر کے نیکر کی جیب میں ڈالا اور اُس گرم اور لُو سے لُوستی دوپہر میں فلیٹ کی باون سیڑھیاں اُتر کر گلی میں آیا اور گلی کے سامنے بیڈن روڈ کے ناکے پر واقع "شیرازی ہوٹل" پہنچ گیا... اور اُسی لمحے گروچو مارکس اپنی دبیز مونچھوں کو سنوارتا شیرازی ہوٹل سے باہر آ رہا تھا۔ وہ اُس کی توقع کے برعکس قدرے لمبے قد کا تھا' وہ بوڑھے انگریزوں کی طرح خاکی رنگ کی ایک ڈھیلی پتلون میں ملبوس تھا اور یہ پتلون گرتی اس لیے نہیں تھی کہ اُس کے ساتھ گیلس لگے ہوئے تھے۔ گروچو کے سر پر ایک سولا ہیٹ تھا جس کے پیچھے پر ہاتھوں کی میل سے بچاؤ کے لیے پلاسٹک کا ایک ٹکڑا آویزاں تھا۔ مشاہد کے چہرے کا رنگ بدل گیا... اوہ گروچو مارکس، یہاں، لکشمی مینشن میں، اوہ کرائسٹ... گروچو کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جسے وہ ٹیکتا ہوا بیڈن روڈ کی جانب چلا گیا۔ شامی کباب خریدتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے "خان صاحب —" اُس نے شیرازی ہوٹل کے مالک کو دسترخوان دیتے ہوئے پوچھا "یہ... یہ جو صاحب تھا تو یہ انگریز تھا؟"

"کیا مالوم... ادھر آتا ہے روٹی کھاتا ہے؟"

"لیکن خاں صاحب... کیا یہ انگریز ہے؟"

"بچہ.. یہ آتا ہے روٹی کھاتا ہے.. جب کوئی بندہ روٹی کھاتا ہے تو کیا پتہ چلتا ہے کہ یہ انگریز ہے جو روٹی کھاتا ہے یا اودھر دیسی ہے جو روٹی کھاتا ہے.. پر روز آتا ہے —"

"کتنے بجے؟"

"دوپہر کو آتا ہے — ایک بجے۔"

مشاہد نے شامی کباب کاؤنٹر پر ہی چھوڑے اور اُڑتا ہوا پیٹر اور پال کے فلیٹ پر

پہنچا- گھنٹی بجائی- اُن کی موم نے بالکونی میں سے جھانکا اور ناگواری سے جھانکا کہ باہر د
تھی اور لُو سے لُو ستی ہوئی تھی- پیٹر اور پال سیڑھیوں سے نیچے آئے اور آتے ہی
اپنے ہیٹوں کے چھجوں کو چھُو کر کہا "ہاؤ ڈی —"

"یار یہ ہاؤ ڈی بعد میں کرلینا... تمھیں پتہ ہے کہ شیرازی ہوٹل میں روزانہ لنچ
لیے کون آتا ہے؟ — گروچو مارکس-"

دونوں "ہاؤ ڈی" بھائی ہنسنے لگے "کم آن مین... گروچو مارکس اِن پاکستان...
اِن لاہور اینڈ اِن... شیرازی ہوٹل... یو آر نٹس-"

اُدھر مشاہد ایک ناراض اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا — "وہ
بھی آئے گا ایک بجے... اینڈ دوئی وِل سی ہو اِز نٹس —"

اگلے روز وہ تینوں شیرازی ہوٹل کے باہر دھوپ میں تعینات ہو گئے-

گروچو مارکس اپنی مونچھیں سنوارتا ہوا ہوٹل سے باہر آیا-

"بلائمی —" پیٹر چیخا "اِٹس ہِم — پال گو برنگ دے آٹوگراف بُک —"

پال نے آٹوگراف بک لانے کے لیے فلیٹ کی جانب دُڑکی لگادی-

گروچو بیڈن روڈ کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا- ہاتھ میں چھڑی اور بغل
ایک فائل، اپنے گیلس کے نیچے انگوٹھے چلاتا ہوا... اور پیٹر اور مشاہد اُس کے پیچھے پیچھ
جب وہ مال روڈ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کے دفتر کے قریب پہنچا تو پال آٹوگراف بک
سے لگائے ہانپتا ہوا آ گیا-

پیٹر اور پال دونوں ذرا ہمت کر کے تیز چلتے ہوئے گروچو کے پاس پہنچے، ایک
ڈگ بھر کر عین اُس کے سامنے آ گئے اور پھر ایک گھگھیائی ہوئی مسکراہٹ کے -
ہیٹ چھُو کر بولے "ہاؤ ڈی مسٹر —"

گروچو کھڑا ہو گیا اور زیرِ مونچھ نہایت پُرمسرت انداز میں مسکرایا-

"آٹوگراف پلیز —" پال نے آٹوگراف بک اُسکی مونچھوں کے عین نیچے کی
کی... گروچو نے لاہور کی گرم دوپہر میں مال روڈ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کی عمارت
سامنے فٹ پاتھ پر اپنے سامنے کھڑے پسینے سے شرابور تین بچوں کو دلچسپی سے دیکھا اور
میں سے دو کے سر پر بڑے بڑے ہیٹ تھے اور تیسرا نیکر میں تھا- گروچو نے آٹوگرا
بک لے کر اُس پر دستخط کیئے اور پھر اُن کے گالوں کو تھپک کر چھڑی ٹیکتا چلا گیا-

پال نے اُسے دُور تک جاتے دیکھا اور پھر آٹوگراف بک کے اُس صفحے کو دیکھا
جس پر گروچو دستخط کر کے گیا تھا، وہاں، صلاح الدین احمد، لکھا تھا...

"ہوز دِس گائی؟" پال نے کندھے سکیڑ کر کہا اور بے حد مایوسی سے کہا-

"آئی ڈونٹ نو —" پیٹر نے جواب دیا-

"مجھے کیا پتہ —" مشاہد نے فوراً کہا — "لیکن اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ یہ
گروچو ہے —"

"صرف اُس نے نام بدل لیا ہے — صلاح الدین احمد اِن ڈیڈ —"

پال اور پیٹر مایوس پسینہ پونچھتے ہوئے واپس چلے گئے ہیں-

رتی پے ماسٹر کے صدر دروازے کا تھڑا مینشن کراؤڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا- دھوپ
ڈھلتی تو کوئی نہ کوئی مسکیٹئر بازار سے کاپی لانے کے بہانے ادھر آ نکلتا، تھڑے پر بیٹھتا تو
سیمنٹ کی گرمی سے بلبلا کر اُٹھتا اور اپنی پشت کو دیر تک سہلاتا فرینک سناٹرا کا کوئی گیت
گانے لگتا... پھر ایک اور "ہاؤ ڈی" اپنی ڈھیلی نیکر سنبھالتا نمودار ہو جاتا اور پہلے مسکیٹئر کو
کھڑا دیکھ کر جان جاتا کہ ابھی تھڑے کے سیمنٹ میں لاہور کی دوپہر موجود ہے اور وہ بھی
دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا- درمیانی باغیچے یا دُھول سے اٹی گراؤنڈ میں ایک قدیم
بڑگد تھا اور اُس کے پیچھے اکمل اور اُسکی بہنوں کا گھر تھا- اُن سے پرے جی ایم اثر رہتے
تھے- اِدھر لاری صاحب تھے یعنی جاوید اور ہاتھی دانت کے والد اور مشاہد کے فلیٹ کے
سامنے بیکری والے بیرٹ اور اُن کی نازک اور معذور بیٹیاں رہتی تھیں- یہ بہت چُپ
چُپ نازک اور لڑکھڑاتی ہوئی لڑکیاں تھیں جنہیں چلتے دیکھ کر ترس بھی آتا تھا اور اُن کی
ت پر رشک بھی آتا تھا اور جب کبھی وہ گلی میں نکلتیں تو سب لوگ ایک لمحے کے لیے
رُک جاتے، سانس نہ لیتے کہ کہیں یہ لمبے سکرٹس اور لمبی سفید باہوں والی لڑکیاں اُن کے
سانس لینے سے گر نہ جائیں- بیرٹ کی بیکری بیڈن روڈ پر تھی اور اُس کے اندر ابھی تک
گھریلو ڈبل روٹی اور برطانوی راج کی مہک ٹھہری ہوئی تھی- خورشید شاہد ہمیشہ بہت بنی
ٹھنی اور بالوں میں پھول سجائے اپنے فلیٹ سے نکلتیں اور سرِ شام ہی نکلتیں- رتی کے
فلیٹ کے برابر میں مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے باقر صاحب تھے اور اُن کے بیٹے اکبر
صاحب تھے جو اُن دنوں مینشن کراؤڈ کے ممبر تھے- باقر صاحب کے عین نیچے تاج کا فلیٹ
تھا اور یہ ایک مکمل طور پر Male رہائش گاہ تھی- اور بائیں جانب گراؤنڈ فلور پر جس

رہائش گاہ کے برآمدے کی تمام کھڑکیوں کے بیشتر شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اُس میں م صاحب رہتے تھے بلکہ منٹو صاحب سوتے تھے اور صفیہ آپا اور اُن کی دو بیٹیاں رہتی تھیں

باغیچے کے گرد اکثر فلیٹوں کی روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔ تمام لڑکے اپنے گھروں جا چکے تھے لیکن مشاہد ابھی تک رتی کے تھڑے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ اس اندھیرے م کس طرح اپنے فلیٹ کی باون سیڑھیاں طے کرے گا کیونکہ سیڑھیوں کا اکلوتا بلب ایک مرتبہ پھر چوری ہو گیا تھا اور مشاہد نے سن رکھا تھا کہ لکشمی مینشن میں "باؤ باٹے" ہو ہیں۔ یہ "باؤ باٹے" کیا ہوتے ہیں اس کے بارے میں اُسکی معلومات مکمل نہ تھیں صرف اُسے اتنا پتہ تھا کہ باؤ باٹے، باؤ باٹے ہوتے ہیں اور لکشمی مینشن میں رہتے ہیں ا اندھیری راتوں میں چھوٹے بچوں کو سیڑھیوں میں پکڑ کر اُنہیں "باؤ" کہہ کر بے ہوش دیتے ہیں چنانچہ ایک تو وہ اپنے دل کو کڑا کرنے کی کوشش میں تھا اور اس کے ساتھ ا آس میں تھا کہ شاید آپا جی پریشان ہو کر ننھے مردان کو اُس کی تلاش میں نیچے بھیج دیں ا پھر وہ مردان کی اُنگلی پکڑ کر کہے کہ تمہیں ڈر تو نہیں لگتا اور اُس کے ساتھ فلیٹ کی باو سیڑھیاں اطمینان سے طے کر لے... اندھیرے میں کوئی اُس کی طرف آیا اور اُس کا سا رک گیا لیکن یہ کوئی باؤ باٹا نہ تھا تاج تھا۔

"اوئے مشاہد ادھر آ یار — ایک سازش ہے۔"

سازش، تاج کا پسندیدہ لفظ تھا اور وہ ہر وقت اسی سوچ میں رہتا کہ کس طرح کو شاندار سازش کی جائے... کوئی بھی دلچسپ چیز یا شخص یا واقعہ اُس کے لیے سازش تھا۔

مشاہد نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اٹھ بیٹھا "لیکن یار آج پھر مجھے تم۔ وہی کام ہے... وہی آوازیں دینے والا —" اور آوازیں دینے والا کام یہ تھا کہ جب اندھیری سیڑھیوں کو طے کرنے کے لیے مردان کو مدد نہ پہنچتی تو وہ کسی دوست گزارش کرتا کہ وہ فلیٹ کے دروازے پر کھڑا ہو کر اُس کا نام پکارتا رہے اور وہ سیڑھیو پر شوٹ لگاتا جواب میں... ہاں جی... ہاں میں سن رہا ہوں کہتا ہوا باؤ باٹوں کو جُل دے کر پہنچ جائے۔

"ٹھیک ہے یار تم آؤ تو سہی۔"

وہ دونوں مینشن کے گھُپ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلتے قریشیوں کے فلیٹ ت

آ گئے جس کے تھڑے پر کوئی بندہ بیٹھا تھا — اُس کا سفید لباس تاریکی میں بھی دکھائی دیتا تھا۔

"منٹو صاحب ہیں۔ ذرا بیمار ہیں۔ ان کو گھر تک چھوڑ آئیں۔ تم اُدھر سے سہارا دو —"

وہ دونوں اُن کے قریب ہوئے، اُنہیں سہارا دیا اور چلنے لگے... سہارا تو انہوں نے خیر کیا دینا تھا وہ بمشکل اُن کی کمر تک آتے تھے لیکن منٹو صاحب نے اُن کے کندھوں پر بے حد نرمی سے ہاتھ رکھا ہوا تھا جیسے وہ اُن کے دوست ہوں۔ اندھیرے میں اُن کی چپل کچھ گھسٹتی تھی اور اُن کا کلف لگا پاجامہ کورے کاغذ کی طرح کھڑکھڑاتا تھا...

"تم کون ہو بچے —" منٹو صاحب سانس لینے کے لیے رکے اور اُن کے سانس میں کچھ تھا جو مشاہد کو پرایا سا لگا۔

"یہ مشاہد ہے منٹو صاحب — نیا آیا ہے مینشن میں.. ہال روڈ کی سائیڈ پر ہے 17 نمبر میں —"

"اچھا بچہ ہے —" منٹو صاحب نے اُس کے کندھے کو دبا کر کہا۔

تاج نے اُن کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو صفیہ آپا فوراً باہر آ گئیں۔ وہ انتظار کر رہی تھیں... گوری چٹی اور ایک خاص بیگانہ معصومیت لیے ہوئے خاتون جن کی عینک بار بار اُن کی ناک پر سے پھسلتی تھی۔

"شاباش بیٹے —" صفیہ آپا نے منٹو صاحب کو وصول کرتے ہوئے تاج سے کہا۔

"یہ مشاہد ہے اور اچھا بچہ ہے —" منٹو صاحب نے اندر جاتے ہوئے صفیہ آپا سے کہا۔ اور اس کے بعد اگلے کئی برسوں میں جب بھی وہ تاج یا کسی اور دوست کے ہمراہ منٹو صاحب کو اُن کے گھر چھوڑنے گیا تو اُنہوں نے ہمیشہ یہی فقرہ کہا "صفیہ یہ مشاہد ہے اور اچھا بچہ ہے —"

لکشمی مینشن کے سہ منزلہ فلیٹوں کی لمبی مستطیل چھت پر مشاہد کی کھلی آنکھوں جو آسمان تھا... وہ بالکل صاف تھا۔ اُس کی نیم تاریکی میں کیا تھا؟ صرف ریگل چوک کے ر "سینڈرز" کے ریستوران میں سجاوٹ کے قمقموں کی ہلکی روشنی تھی یا موسیقی تھی

اور تماشائیوں کا شور تھا جو اُس تک آتا تھا تو ہلکا ہوتا جاتا تھا.. اور کچھ نہ تھا... اُسے ابھی یقین نہ آتا تھا.. آسمان صاف کیسے ہو سکتا ہے... اُس کے چہرے پر راکھ کیوں نہیں ہے کونسی راکھ ہے جو چہرے پر مل دی جاتی ہے اور جن کے چہرے راکھ سے اٹے ہوئے وہ اُس راکھ کو دیکھ نہیں سکتے... اُنہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ اُن کے چہروں پر راکھ ملی ہے.. اُن کے نین نقش اب وہ نہیں رہے، اُن کی شباہت بدل چکی ہے... سب دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے راکھ سے اٹے ہوئے چہرے دیکھتے ہیں بولتے نہیں۔ ایک دوسرے کو بتاتے نہیں، پوچھتے نہیں کہ اسی کو تو خاموشی کی سازش ہیں۔

ابھی کچھ برس پہلے کی بات تھی... راکھ کی اور لو دیتے ہوئے آسمان کی۔

وہ بھاگ رہا تھا۔ اندھا دھند روتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اُس کا بستہ اُس کے گھٹنے کھٹ کھٹ لگتا تھا اذیت دیتا تھا لیکن وہ رُک نہیں سکتا تھا اور سنسان سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ اُس کی مس نے کہا تھا کہ شہر میں فساد ہو گیا ہے اور صورتِ حال نازک ہے... وہ کیسے پوچھتا کہ یہ صورتِ حال کیا ہوتی ہے اور اگر یہ نازک ہو جائے تو ہے۔ اُس نے مس کے کہنے پر بستہ اُٹھایا اور سکول سے باہر نکل آیا اور باہر تمام بچوں عزیز و اقارب اُنہیں لینے کے لیے آ چکے تھے لیکن دور دور تک اُس کا شناسا کوئی چہرہ نہ دیتا تھا... جب چوک بالکل خالی ہو گیا تو وہ تیز تیز چلنے لگا ایک بچے کے دھڑکتے خوف ساتھ اور سُوکھے ہوئے حلق اور لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ۔ موچی دروازے کے باہر روڈ ویران تھی اور ایک بچے کو وہ ایک بیابان صحرا دکھائی دی جس میں دوکانیں بند اور درخت چپ تھے اور اُس صحرا میں اُس سرکلر روڈ کے عین بیچ ایک شخص ہاتھ پھیلائے لیٹا تھا اور اُس کے سینے میں ایک چھرا پیوست تھا.... جیسے ایک اداکار خودکشی لیٹ گیا ہو ایک بڑے سیٹ پر جس کے پس منظر میں لاہور شہر کے برج اور مینار ہیں۔ نے اس اداکار کو دیکھا تو اُسکی اداکاری پر خوش نہ ہوا بلکہ اور زیادہ وحشت زدہ ہوا اُس نے اپنے اندر سے خون بہت زیادہ نکالا تھا اور اُسے سڑک پر کچھ اس طرح کہ وہ کسی دنیا کا نقشہ سا لگتا تھا۔

گوالمنڈی کے سہ منزلہ مکان کی چھت بہت چھوٹی تھی اور اُس کے کچے چارپائیاں ساتھ ساتھ بچھائی جاتی تھیں اور اُسے بھی وہی ایک آسمان یاد تھا جو اُن چا

کے اوپر لو دیتا تھا۔

کرفیو، گورکھا پلٹن جو جانے کہاں جاتی ہوئی لاہور آ نکلی تھی اور لاہور کے ہندوؤں کو محمد بن قاسم دکھائی دیتی تھی اور مسلمانوں کے لیے وہ راجہ داہر تھی۔ لوٹ مار، آتش زنی، نعرے اور تھری ناٹ تھری بندوقوں کی دل دہلانے والی آوازیں... یہ سٹریٹ تھیٹر مشاہد کے آس پاس پرفارم کر رہا تھا لیکن اس کا سب سے بڑا اداکار وُہی تھا جو موچی دروازے کے باہر اپنے سینے میں خنجر گھونپے ایک نئی دنیا کا نقشہ اپنے ٹھنڈے ہوتے خون کے ساتھ بنائے ہوئے لیٹا تھا — وہ کون تھا — ہندو تھا یا مسلمان تھا یا محض اداکار تھا... اس کا End Result کیا ہوا؟ خاک خاک میں اور... مشاہد کے گھر کے اردگرد ہندو لوگوں کی اکثریت تھی۔ گورو ارجن نگر، کرشنا گلی اور گاندھی سکوئر ایسے علاقے تھے جن میں اُن کی بہوؤں کی ڈولیاں اُتری تھیں جن کے صحنوں میں اُن کے بزرگوں کے جنازے اُٹھے تھے کہ وہ اتنے ہی لاہوری تھے جتنے کہ وہ.. جو اُن کے گھروں کو آگ لگا کر اُنہیں وہاں سے نکل جانے پر مجبور کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ وہ تھے جن کے گھروں کو جالندھر اور امرتسر میں آگ لگا دی گئی اور ان میں سے کچھ بالکل مخبوط الحواس تھے اُن کے قافلے لٹے تھے اُن کی بہنوں کو اُن کے سامنے ننگا کیا گیا تھا اور وہ اندھے ہو چکے تھے اور وہ اگرچہ شیکسپیئر کو نہیں جانتے تھے لیکن اندھے ہو جانے کے باوجود یہ اُن کے مجنوں چہروں پر لکھا تھا کہ مرڈر شل بریڈ مرڈر — جی ہاں قتل، قتل کو جنم دیتا ہے.. تاریخ کے اختتام تک... اور ہمیشہ انصاف کے نام پر.... انصاف جو انسانی تاریخ کا سب سے مہلک اور سب سے پُر فریب لفظ ہے۔

اور مشاہد کے کچے ذہن میں شک کی پنیری اُنہی دنوں میں بوئی گئی تھی۔ اُس کے گھر والے اور لاہور والے شاہ شہید کا قصہ بڑے فخر اور نم آلود آنکھوں کی عقیدت کے ساتھ بیان کرتے۔ کیسے گرو ارجن نگر کے باہر ہندو اور سکھ دوکانداروں نے اپنی دوکانوں کے چوبی دروازوں پر ٹین کی چادریں چڑھا کر اُنہیں آتش زنی سے مکمل طور پر محفوظ کر لیا تھا اور کس طرح رمضان کے مقدس مہینے میں کرفیو کے باوجود شاہ صاحب تھانیدار نے مسلمان نوجوانوں کے ایک گروہ کو ان دوکانوں کے دروازے توڑ کر انہیں لوٹ لینے کی اجازت دی تھی اور خود ہمہ وقت پہرہ دیتے رہے اور اس دوران کسی کافر کی گولی اُن کے سینے کے آرپار ہو گئی اور جب جاں کنی کے عالم میں لوٹ مار کرنے والے نوجوانوں نے اُن کے حلق میں پانی کے چند قطرے ٹپکانے کی کوشش کی تو شاہ صاحب نے اشارے سے منع

کر دیا اور نحیف آواز میں فرمایا "میرا روزہ ہے ——" سبحان اللہ کیا ایمان کی پختگی ہے
اور انہی دنوں میں شاہ عالمی دروازے کے اندر واقع ایک وسیع اور قدیم آبا
آگ لگا دی گئی۔

یہ بھی ایک ناممکن کارنامہ تھا۔ ہندو شاہ عالمی دروازے کو مکمل طور پر بند ک
محصور ہو چکے تھے اور اُس علاقے کے اندر بقول کسے چڑیا بھی نہیں جا سکتی تھی لیک
ایک جاں باز مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ نے جان پر کھیل کر چند مزید جاں بازوں کو شاہ عالم
زیرِ زمین گندے نالے کے ذریعے اندر پہنچایا اور انہوں نے اطمینان سے سکونت
کافروں کے مکانوں اور دوکانوں کو آگ لگا دی۔

شاہ عالمی کئی ہفتوں تک جلتا رہا اور کئی مہینوں تک سلگتا رہا۔

مشاہد اِسی بازار کے راستے سکول جاتا تھا اور یہاں زیادہ تر دوکانیں سُنارو
تھیں جن کی نم ٹھنڈک میں موٹی ہندنیاں اور مسلمان عورتیں زیور گہنے بازوؤں اور
سجائے اپنے آپ کو قدِ آدم آئینوں میں حسرت سے دیکھتی تھیں اور ان زیور
حسرت سے اُتار کر رکھ دیتی تھیں... بازار اتنا تنگ تھا کہ اگر ایک دوکاندار دھوپ سے
کی خاطر اپنا سائبان کھولتا تو وہ سامنے والی دوکان کی پیشانی پر جا لگتا...

دن کے وقت شاہ عالمی جلتا ہوا سنائی دیتا تھا اور رات کو وہ دکھائی دیتا تھا۔

گوالمنڈی کے سہ منزلہ مکان کی کچی چھت بہت چھوٹی تھی... اور اُس پر اُن
جو آسمان تھا وہ مشاہد کو یاد تھا... زندگی کے آخری لمحوں تک اُس کی متحرک سُرخی اُ
آنکھوں کے سامنے رہی۔

اِس تاریک آسمان کے کنارے پر ایک اُفق تھا جو گوالمنڈی کے اُس مکا
خوبصورت جالیوں والے کوٹھے پر سے دکھائی دیتا اور یوں دکھائی دیتا کہ گوردوارجن
شاندار مکان اور اُن کی ممٹیاں... موچی دروازے کی حویلیاں اور اُن کے درمیان م
کے مینار اور مندروں کے کلس اور شہر لاہور کے برج اور مینار سب کے سب ایسے
ہوتے کہ اُن کے پس منظر میں ایک تیز سُرخی پورے اُفق پر، ایک آہستہ آہستہ حرکت
ہوئی سُرخی اُوپر کو اُٹھتی ہوئی، آسمان کی تاریکی کے اندر الگ جاتی ہوئی، ہر جگہ سے، ہ
سے، گوالمنڈی کے اس سہ منزلہ مکان کے کوٹھے پر سے، اپنی چھوٹی سی چارپائی پ
آنکھوں سے لیٹے ہوئے مشاہد پر وہ سُرخی وہ الاؤ اور وہ آگ کی سرسراہٹ اور کبھی

گڑگڑاہٹ جب کوئی بلند عمارت گرتی... تو یہ سب مشاہد کی کُھلی آنکھوں میں اُترتے جاتے
پنی تمام تر گرمی اور حدت کے ساتھ....

لاہور کا آسمان تمام رات روشن رہتا۔ اور اس آسمان پر شاہ عالمی کی جانب سے سیاہ
ندیے اُڑتے ہوئے آتے... ملبوسات اور بہی کھاتے، کتابوں کے جلے ہوئے اوراق آسمان
ایسے سیاہ پرندوں کی طرح بے بسی سے اُڑتے اور شہر لاہور کی چھتوں پر دھیرے دھیرے
یٹھتے جیسے اُن کے پَر کٹ چکے ہوں۔ آسمان کی مسلسل سُرخی میں یہ جلی ہوئی راکھ اُڑتی
رتی...

مشاہد سویرے جب بیدار ہوتا تو اُس کے منہ پر راکھ ہوتی...

یہ کونسی راکھ ہے جو چہرے پر مل دی جاتی ہے اور جن کے چہرے راکھ سے اَٹے
تے ہیں وہ اِس راکھ کو نہیں دیکھ سکتے... ایک دوسرے کے راکھ سے اَٹے ہوئے چہرے
یکھتے ہیں لیکن بولتے نہیں —— کنسپریسی آف سائلنس۔

ایک لُو سے لُوستی جلتی اور پگھلتی دوپہر کے نچڑتے ہوئے آسمان پر جب زبیر بتو کے
ے کبوتر لکشمی مینشن پر اُڈاریاں مار رہے تھے اور خلقِ خدا اپنے گھروں میں بند دروازوں
چکوں کے پیچھے اور خس کی ٹٹیوں کی خنک ٹھنڈک کی پناہ میں سوتی تھی تو مرزا بیٹریوں
لے کی گلی میں کھڑے کمال نے اپنے گلے کی تمام تر غدودوں کو بروئے کار لا کر جب
ئے مشاہد" کا نعرہ لگایا تھا تو غالباً وہ گدھ بھی قدرے ٹھٹکے تھے جو اپنے نیچے لکشمی مینشن
ا رہائش پذیر قریب المرگ پارسیوں کو حسرت بھری اور بھوکی نظروں سے تکتے تھے۔

مشاہد پسینہ پونچھتا اپنے فلیٹ نمبر 17 کی باون سیڑھیاں اُتر کر جب نیچے گلی میں آیا
ل اپنی پھٹی ہوئی پتلون کی ہپ پاکٹس میں دونوں انگوٹھے اُڑسے ایک ایسے کاؤ بوائے کی
ح کھڑا تھا جو draw کرنے کو ہے اور ابھی اُسکے سامنے "ہائی نون" کا گیری کوپر آ جائے
لیکن کمال کے سامنے اپنے فلیٹ کی باون سیڑھیاں اُتر کر مشاہد آ گیا۔

"ہاؤ ڈی" کمال نے اُس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی ——

"ہاؤ ڈی کے بچے میں سویا ہوا تھا یہ کوئی وقت ہے کسی کے گھر جانے کا ——"

"زندگی اتنی بور ہے کہ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں تم سے کچھ گفتگو کی جائے"

"کس کی زندگی؟"

"میری اور تمہاری زندگی — تمہاری عمر اس وقت کتنی ہے؟"

"بس نیکر اور پتلون کے درمیان ہے لیکن تمہیں اس سے کیا؟"

"کبھی تم نے سیکس کے بارے میں سوچا ہے؟"

مشاہد نے کمال کو دیکھا جو اپنی پھٹی ہوئی پتلون کی ہپ پاکٹس میں دونوں اَ
اُڑسے ایک ایسے کاؤبوائے کی طرح کھڑا تھا جو draw کرنے کو ہے۔

اُس نے اپنی ہپ پاکٹس میں انگوٹھے اُڑسے اور کمال کو نظر میں رکھے
آہستہ پیچھے ہٹنے لگا اور پھر نالی کے قریب جب اُس کا پاؤں پھسلنے لگا تو اُس نے منہ ٹیڑ
کے نعرہ لگایا "ڈرا —"

کمال نے سر جھٹک کر اور اپنے ہاتھ کو گھما کر شہادت کی اُنگلی کا رُخ مش
طرف کر دیا "ڈز۔ ڈز — آئی گوٹ یُو —"

"نو... یُو ڈِڈ ناٹ — آئی گاٹ یُو —" مشاہد کو یقین تھا کہ اس پستول
میں وہ جیتا ہے۔

"آؤ کرکٹ کھیلیں۔"

"اس وقت؟ اس دھوپ میں —"

کمال نے اُسے بیزار اور کچھ حقارت آمیز نظروں سے دیکھا کہ یہ کیا اَ
ہے۔

"دھوپ ہے تو کیا ہے یار — وائلڈ ویسٹ میں تو اتنی دھوپ ہوتی ہے ا
کاؤبوائے کو آج تک سن سٹرک نہیں ہوا — اور اگر ہوتا ہے تو ہو جانے دو زندگ
فضول چیز ہے —"

"ہاں —" مشاہد نے سر ہلایا کیونکہ وہ بھی کمال کے فلسفہ بیزاری و بور
متاثر ہو رہا تھا "زندگی کتنی فضول ہے — آؤ یار کرکٹ کھیلیں —"

مینشن کی کچی اور کھڈوں والی گراؤنڈ ایک تنور کی طرح تپ رہی تھی اور ا
کے درمیان وہ دونوں ٹاس کر رہے تھے کہ بیٹنگ پہلے کون کرے گا۔ یہ خوش بختی
کے حصے میں آئی اور وہ Manto End پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں پ
دھارے گر رہے تھے اور اُسے سامنے اُدھر جدھر سے کمال اپنا گیند چمکاتا چلا آ
دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرمی کی لہروں میں ایک سناٹا اور ایک گہری چپ سی تھی

نے ایک لمبا سٹارٹ لیا اور پھر جس وقت اُس نے مناسب جانا بازو گھما کر گیند مشاہد کی طرف پھینک دیا۔ مشاہد نے بڑے سٹائل سے گھٹنا ٹیکا اور لیگ کی جانب بیٹ گھما دیا ایک پھناکے کی آواز مینشن کے گرم سناٹے میں تمام تر کرچیوں کے ساتھ گونجی۔ مشاہد نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اُسی گھٹنا ٹیک پوزیشن میں برقرار رکھا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ مینشن کی بالکونیوں میں متعدد لڑکیاں اُسے رشک آمیز نظروں سے تک رہی ہیں اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اُسے جی بھر کے دیکھ لیں۔ اُن دنوں امتیاز احمد کا گوڈا ٹیک سٹائل لاہوریوں میں بے حد مقبول تھا۔ گیند کسی قسم کا بھی ہوتا باغ جناح میں کرکٹ کے شائقین "گوڈا ٹیک" کے نعرے لگاتے اور امتیاز احمد ان نعروں کے سحر میں آ کر گھٹنا ٹیک کر بلّا گھما دیتے... اگر گیند بلّے کو چھو جاتا تو شاندار لیگ گلانس ہو جاتی ورنہ اکثر ایل بی ڈبلیو ہو کر موصوف ٹھنڈے ٹھنڈے پویلین میں واپس آ جاتے.. ادھر لکشمی مینشن میں بھی یہی سٹائل فالو کیا جاتا تھا۔ گیند اگرچہ آف پر وائڈ جا رہی ہے لیکن بیٹس مین گھٹنا ٹیک کر اُسے لیگ پر ہی کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے — اور مشاہد آج بے حد خوش قسمت رہا تھا کہ اس سٹائل میں گیند اُس کے تلّے کے عین درمیان میں آئی تھی اور زوردار شاٹ کھیلا گیا تھا — مینشن کا سناٹا پہلے کی نسبت زیادہ معلوم ہوا تو اُسے احساس ہوا کہ کمال بالکل غائب ہے اور وہ کڑکتی دھوپ میں گوڈا ٹیکے سٹائل بنائے تنہا کھڑا ہے اور اُسی لمحے ایک کڑکتی ہوئی آواز اُدھر سے آئی جدھر گیند گلانس ہوا تھا — اوئے امتیاز احمد کے بچے — مشاہد کو بے حد دکھ ہوا کہ یہ کون کم عقل اُسے امتیاز احمد کے کھاتے میں ڈال رہا ہے اور اُس نے گرم زمین پر سے بمشکل اپنا گھٹنا اُٹھا کر اُدھر کو ہی دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی اور وہاں برآمدے کے دروازے میں منٹو صاحب کھڑے تھے اور اُبل رہے تھے —

"اوئے اِدھر آ... اِدھر دفع ہو..." مشاہد لرزتا ہوا اُدھر دفع ہوا تو منٹو صاحب نے جھک کر اُس کا کان پکڑ لیا "نشانے لگاتا ہے بے ایمان — بیس شیشوں میں سے صرف تین ہی بچے تھے اور تو نے اُن میں سے بھی ایک توڑ دیا... اوئے توبہ کر۔"

"جناب آپ کان چھوڑیں تو میں توبہ کروں —"

منٹو صاحب نے اُسے گھورا اور پھر اُن کا موڈ کچھ بدلا "آئندہ کرے گا؟"

"نہیں جی —"

"جا پھر دفع ہو جا۔"

مشاہد وہیں کھڑا رہا۔

"جاتا کیوں نہیں؟"

"گیند —"

"نہیں ملے گا گیند —" منٹو صاحب پھر جلال میں آ گئے۔

"ساڑھے چار روپے کا ہے جی — کراؤن کا گیند — تمام بچے چندہ اکٹھا ک
لائے تھے —"

منٹو صاحب فوراً موم ہو گئے۔ اندر گئے اور گیند لے آئے "خبردار جو آئندہ
باقر صاحب والی گلی میں کمال اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ہے ناں زندگی فضول چیز — پہلی گیند پر ہی ٹریجڈی ہو گئی... لیکن شکر
گیند واپس مل گیا ورنہ صفیہ آپا — بھئی بہت جابر خاتون ہیں اُن کے ہاں کم از کم چھ
گیندیں ہوں گی ہماری — بچوں کی بددعائیں لے رہی ہیں خواہ مخواہ.. منٹو صاحب
ہیں یار —"

"اب کیا کریں؟" مشاہد نے پوچھا —

"بہت بور زندگی ہے یار — سوچتے ہیں کہ کیا کریں —"

وہ دونوں باقر صاحب کے تھڑے پر بیٹھ کر سوچنے لگے۔ کڑکتی دھوپ میں
کی گرم توا اینٹوں پر مزے سے بیٹھے سوچنے لگے کہ زندگی بہت بور ہے کیا کریں —

"بکرے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" کمال یکدم اتنا خوش ہوا کہ اُس
ناک مزید چوڑی ہو گئی۔

"کونسے بکرے کے بارے میں؟"

"یہی جو اوپر رہتا ہے — اُسے چھیڑیں؟"

"نہیں یار وہ سویا ہو گا — دوپہر ہے... زیادتی کی بات ہے۔"

"زیادتی تو بکرے کی ہے —" کمال چمک کر بولا "ہم دوستوں کے دو
اپنے دوست کا بدلہ لیں گے — چھیڑیں گے بکرے کو۔"

مینشن کراؤڈ اپنی عمر کی وجہ سے، اپنی حماقت کی وجہ سے قدرے بے
مینشن کے مکینوں کو نہایت نامناسب ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ایک اچھی بھلی مدبر
بطخ کہا جاتا تھا بلکہ تاج کا کہنا تھا کہ وہ جب چلتی ہے تو کسی پریگننٹ ڈک کی طرح چا

بہت بعد میں پتہ چلا کہ بطخ انڈے دیتی ہے... اسی طرح ادھر بُننے برادران تھے.. رُوبی بوچڑ اور جوڑے تھے، لنگڑیاں تھیں، ٹیکسی تھی، ٹاکو تھا۔ ہاتھی دانت بھی تھا اور اِدھر کراؤڈ کے ایک اہم ممبر اکبر کے والد باقر صاحب تھے اور تمام بچگان اُن سے نہایت کدورت رکھتے تھے اور اُنہیں بکرا ہی کہا جاتا تھا۔ وہ جب کبھی نظر آتے کسی نہ کسی کونے کھدرے سے کوئی لڑکا... ایک نہایت دلدوز قسم کا "با آ.." کا نعرہ لگا دیتا۔ باقر صاحب سنتے اور یقیناً پیچ و تاب کھاتے ہوئے چپ چاپ چلے جاتے.. اکثر اُن کے فلیٹ کے صدر دروازے پر چاک سے لکھا ہوا اعلان نظر آتا کہ یہاں بکرے کا تازہ گوشت ملتا ہے اور بقرعید پر رواج تھا کہ قربانی کے بعد بکروں کے سری پائے اُن کے دروازے کے ساتھ ایک عید کارڈ کے ہمراہ آویزاں کر دیئے جاتے. اور کارڈ پر "بابا بلیک شیپ —" لکھا ہوتا.. باقر صاحب سے اتنی زیادہ کدورت کی ایک وجہ ایسی تھی جو صرف ایک بچہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اُنہوں نے ہمارے دوست کی والدہ سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور دوسری شادی کر لی تھی۔ اکبر کے ساتھ اُن کا رویہ خاصا درشت تھا... اور اکبر ہمارا دوست تھا۔

"چھیڑیں گے بکرے کو —" کمال نے پھر کہا۔

فلیٹوں کی عمارت کے درمیان میں ایک چھ سات فٹ چوڑی گلی تھی جس میں سیورج کے پائپ نیچے آتے تھے اور کمروں کی کھڑکیاں بھی ادھر کو کھلتی تھیں.. مشاہد اور کمال ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ منصوبہ یہ تھا کہ اُوپر بکرے کے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف بُوتھی اُٹھا کر دونوں باری باری "با آ... باآ" کے نعرے لگائیں اور یوں زندگی کی بوریت کو اِس گرم دوپہر میں کم کریں... سب سے پہلے مشاہد نے منہ اوپر کیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے ایک عدد "با آ..." کا نعرہ لگایا... اور یہ باآ باآ... مینشن کے گرم سناٹے میں دیر تک گونجتا رہا... پھر کمال نے یہی عمل دوہرایا۔ کمال دراصل سب لڑکوں میں سے بہترین بکرا ایکسپرٹ تھا کیونکہ وہ جب باآ باآ.. کرتا تھا تو جیسے دل کی گہرائیوں میں سے ایک اثر انگیز باآ... نکالتا تھا اور مینشن کے در و دیوار ہلا دیتا تھا۔

"واہ —" مشاہد نے کمال کے باآ.. کی داد دیتے ہوئے کہا "ایک مرتبہ پھر.."

کمال کو اپنے کمالِ فن کی داد ملی تو اُس کا منحنی سینہ پھول گیا اور اُس نے منہ اُوپر اُٹھا کر ایک والہانہ سرخوشی میں مسلسل باآ باآ کرنا شروع کر دیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں

اور وہ کسی اور جہان میں تھا اور بس یہی وہ منحوس گھڑی تھی جب مشاہد نے دیکھا کہ
کی پُشت پر بکرا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے اور کمال اس بڑھتے ہوئے خطر
سے لاعلم بُو تھی اُوپر اُٹھائے باآ باآ کر رہا ہے.. ظاہر ہے بکرے نے اپنے بیڈ روم میں یہ
سنی تھی اور چپکے سے ننگے پاؤں نیچے آیا تھا اور اب اپنے شکار کی جانب بڑھ رہا تھا۔
نے چند بے ربط سے اشارے کیے لیکن کمال کی چونکہ آنکھیں بند تھیں اور وہ
پُرمسرت بُو تھی اوپر اُٹھائے باآ باآ کر رہا تھا اِس لیے اُن کا کچھ اثر نہ ہوا... اب مشا
زندگی بھی خطرے میں تھی چنانچہ وہ ایک اچھے کاؤ بوائے کی طرح اُلٹے قدموں پر پیچھے
گیا اور پھر دُڑکی لگا دی۔ اُسی لمحے کمال کی ایک دلدوز با... سنائی دی اور پھر شاید اُ
گردن دبوچ لی گئی اس لیے.. آ آ... باقی رہ گئی۔

اگلے چند روز کے لیے لکشمی مینشن کی صورت حال بے حد کشیدہ رہی... ک
نے پہلے تو کمال کی بنفس نفیس مرمت کی اور پھر اُسکے والدین سے شکایت کی چنانچ
صاحب نے اپنے اس لائق بیٹے کی گوشمالی کی۔ مشاہد کے ہاں بھی شکایت کا سندیسہ
آپ کا برخوردار محلے کے بزرگوں کے بیڈ رومز کے نیچے کھڑے ہو کر بھری دوپہر میں
کے نعرے لگاتا ہے چنانچہ مشاہد کے اباجی نے بھی اُس کا کان پکڑ کر "کیوں اوئے اُلو"
اور اِس سے زیادہ سخت گیری اُن کے لیے ممکن نہ تھی۔ بس اسی وقوعے کے بعد
سازش ہوئی..

اور یہ سازش تاج نے اِنتہائی خفیہ طریقے سے تیار کی۔

خاتون جسے بطخ کے پُروقار نام سے پکارا جاتا تھا باغبانی کی بے حد دلدادہ تھی
کے فلیٹ کے برآمدے کے سامنے سیڑھیوں پر اور فٹ پاتھ پر درجنوں دیدہ زیب
بوٹوں اور پامز کے گملے سجے تھے۔ بطخ صبح سویرے منہ ہاتھ دھونے سے پیشتر پلاسٹک
ہاتھ میں پکڑے، آنکھیں ملتی، اپنے فلیٹ سے باہر آتی اور اپنے پسندیدہ پودوں پر پانی
کرتی... ایک رات گیارہ بجے کے قریب مینشن کراوڈ کی ایک سیکرٹ میٹنگ ہوئی ا
میٹنگ میں لڑکیاں بھی شامل تھیں اور یہ سب خواتین و حضرات کُبڑے ہو کر دبے پا
کے سبزہ زار میں پہنچے، سب نے ایک ایک گملا اُٹھایا اور اُسے چند فلیٹ دُور منٹو صاح
فلیٹ کے برآمدے کے عین سامنے سیڑھیوں پر سجا دیا۔ پانچ منٹ کے اندر تمام گ
صاحب کے فلیٹ کے سامنے بہار دے رہے تھے لیکن یہ تو رات تھی۔ اگلی صبح پو

منہ اندھیرے تاج کے گھر پہنچ چکا تھا اور برآمدے کے شیشوں میں سے بطخ اور منٹو صاحب کے گھروں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ حسب توقع بطخ آنکھیں ملتی ہوئی پانی کی نالی ہاتھ میں تھامے باہر آئی — باہر گُل و گلزار کی بجائے ایک ویرانہ تھا جو صحرائے گوبی سے مماثلت رکھتا تھا۔ سیڑھیاں اور فٹ پاتھ ننگے پڑے تھے۔ بطخ کا منہ کھل گیا اور اُس نے بے یقینی سے آنکھوں کو متعدد بار جھپکا اور ملا اور پھر اُس نے چاروں اور دیکھا اور اُس کی نظر تیر کی طرح منٹو صاحب کے فلیٹ کی سیڑھیوں کی طرف گئی جہاں اُس کا گُل و گلزار بہار دے رہا تھا۔ بطخ پھنکارتی ہوئی وہاں پہنچی اور ایک ایک گملے کو پہچان کے مراحل سے گذار کر اُس نے اپنے دبیز کولہوں پر ہاتھ رکھے اور "منٹو وے منٹو" کا آوازہ لگایا.. اب یہ وقت منٹو صاحب کے بیدار ہونے کا تو نہ تھا اس لیے اِدھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اِس پر بطخ نے اُن کا دروازہ دھڑ دھڑ کوٹنا شروع کر دیا۔ بالآخر منٹو صاحب اپنے پاجامے کا ازار بند اُڑستے باہر آئے۔ سامنے بطخ کھڑی اُبل رہی تھی اور اُن کی سیڑھیوں پر بہار آئی ہوئی تھی۔ منٹو صاحب شدید حیران اور پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے.. وہ سب جس فاصلے پر تھے اور برآمدے کے شیشوں کی اوٹ میں تھے وہاں سے اُنہیں یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ بطخ اور منٹو صاحب کے درمیان کس قسم کی خوشگوار گفتگو ہوئی البتہ ہوا میں تیرتے جو لفظ اُن تک پہنچے اُن میں — شرم نہیں آتی — ادیب ہو کر گملے چراتے ہو اور میں بالکل بے گناہ ہوں اور... شرمندہ ہوں وغیرہ خاصے واضح تھے۔ اِس لمحے منصوبے کے مطابق وہ سب بے حد سرسری اور بے فکرے انداز میں ٹہلتے ہوئے اُن دونوں تک پہنچے اور گملوں کو واپس اُن کے اصلی مالک کے فلیٹ پر پہنچانے کی آفر کی جو قبول کر لی گئی... منٹو صاحب بے حد احسان مند ہوئے کہ یہ نوجوان لڑکے لڑکیاں کتنے شریف اور کتنے مہذب ہیں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلائی اور بطخ بھی بے حد شکر گزار ہوئی کہ اِن مؤدب بچوں نے رضاکارانہ طور پر اُس کے پیارے گملے واپس اُس کی سیڑھیوں پر رکھ دیئے تھے۔

اُسی شب رات گیارہ بجے مینشن کراوڈ نے حسب سازش دبے پاؤں چپکے سے وہ تمام گملے ایک مرتبہ پھر منٹو صاحب کے فلیٹ کے سامنے سجا دیئے۔

اگلی صبح صورت حال بے حد نازک ہو گئی۔ بطخ منٹو صاحب پر بے اندازہ برس رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہ کیسا اتفاق ہے جو روز ہو جاتا ہے میں پولیس کو اطلاع کروں گی اور اِدھر منٹو صاحب بے حد پشیمان معافیاں مانگتے ہوئے اور معذرت کرتے ہوئے۔

اِس بار بھی وہ سب یونہی ٹہلتے ہوئے ادھر نکل گئے اور اچھے بچوں کی طرح اپنے بڑ
کی مدد کی اور وہ گملے بطخ کے برآمدے تک چھوڑ آئے —

یہ گملا سازش ہمیشہ خفیہ رہی۔ صفیہ آپا نے متعدد بار منٹو صاحب سے دریافت
کہ تم ہر شام قدرے مخمور لوٹتے ہو کہیں اُس حالت میں بطخ کے گملے اُٹھا کر اپنے
نہیں لے آتے اور اگر ایسا کرتے ہو تو کتنی شرم کی بات ہے... اتنے مشہور ادیب ہو ا
اور منٹو صاحب قسمیں کھاتے کہ صفیہ... میں ہر چیز ہو سکتا ہوں گملا چور نہیں ہو سکتا۔

اُنہی دنوں مشاہد منٹو صاحب سے بدگمان ہوا...

اُس نے "موذیل" پڑھی اور بدگمان ہو گیا۔

وہ منٹو صاحب کو شریف آدمی سمجھتا تھا لیکن "موذیل" میں ایک مقام پر اُ
نے موذیل کی بڑی بڑی دودھیا چھاتیوں کا تذکرہ کچھ ایسی تفصیل سے کیا تھا کہ یہ ہو
سکتا تھا کہ اُنہوں نے اتنی بڑی چھاتیاں نہ دیکھی ہوں اور پھر بھی اتنی تفصیل سے اُن کا
لکھا ہو۔ بس یہی بات مشاہد کو کھا گئی — منٹو صاحب نے کہیں نہ کہیں اتنی بڑی چھ
دیکھی تھیں، وہ بے حد جیلس بھی ہوا اور بدگمان بھی... بہت دنوں تک وہ رتی روش
دیگر لڑکیوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا رہا کہ یہ بھی جب بڑی ہوں گی تو کیا موذ
طرح ہوں گی...

"موذیل" کے بعد وہ جب بھی منٹو صاحب کے سامنے آتا تو کچھ شرمندہ سا
جیسے وہ دودھیا منظر منٹو صاحب نے نہیں اُس نے دیکھا تھا اور پھر وہ اُن کی عینک کے
شیشوں کے عقب میں چمکتی آنکھوں کو ذرا غور سے دیکھتا کہ کہیں ان میں ابھی تک
دودھیا رمق موجود تو نہیں... اُن کی ایک عادت اُسے ہمیشہ یاد رہی... وہ جب بھی چل
ہوتے، چاہے ناک کی سیدھ میں، چاہے ذرا اِدھر اُدھر تو اُن کے راستے میں سڑک ہو
پاتھ ہو، کہیں بھی اگر کوئی اینٹ یا پتھر ہوتا تو وہ جھک کر بڑے اہتمام سے اُسے اُٹھا
"پتہ نہیں کس حرامزادے نے..." کہہ کر ایک طرف رکھ دیتے...

اور اُنہی دنوں منٹو صاحب نے مشاہد کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی...
سمیعہ کے خط والا دردناک قصہ تھا۔

سمیعہ ایک گورے رنگ کی اپنی عمر سے کہیں زیادہ بھری بھری کشمیری لڑکی
اپنے والدین سمیت اور نصف درجن چھوٹی بہنوں سمیت مردان کے فلیٹ سے ایک

ایک فلیٹ کی تیسری منزل پر واقع چھوٹی سی برساتی میں رہتی تھی اور وہاں سے برساتی کی
کھڑکی میں سے اگر وہ لوہے کے جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ کر آدھے دھڑ سے باہر لٹک جاتی تو
اُسے گلی کے پار مشاہد کے فلیٹ کی دیوار پر رکھے چپس کے تین گملے نظر آتے اور کبھی
کبھار مشاہد کا سر بھی نظر آ جاتا جو اُس لمحے گلی میں منتظر اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہا
ہوتا... آہستہ آہستہ نیچے گلی میں کوئی دوست نہ بھی ہوتا تو مشاہد گملوں کے بیچ میں سے
خطرناک حد تک آگے آ کر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتا جدھر سمیعہ رہتی تھی... مشاہد ایک
جھینپو اور کچھ ڈرپوک سا بچہ تھا اور سمیعہ یہ جان چکی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر اُس نے
اِس دُبلے سے گندمی رنگ والے بچے کو اپنی جانب متوجہ کرنا ہے تو اُسے پہل کرنا ہو گی۔
چنانچہ ایک روز جب وہ دونوں اپنی اپنی کھڑکی اور گملوں والی دیوار کے بیچ میں سے نیچے گلی
کی جانب عشق پیچاں کی جنگلی بیلوں کی طرح جھول رہے تھے تو سمیعہ نے اپنے آپ کو
صرف ایک ہاتھ سے سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مشاہد کو سلام کر دیا... مشاہد کا
رنگ فق ہو گیا۔ اُس نے ایک ہندوستانی فلم میں اس قسم کا ایک منظر دیکھا تھا کہ ہیروئن
ہیرو کو دیکھ کر باقاعدہ ایک عدد سلیوٹ مارتی ہے اور یوں رومان کا آغاز ہو جاتا ہے اور وہ
دونوں ڈوئٹ گانا گانے لگتے ہیں.. مشاہد فوراً پیچھے ہو گیا۔ اُس کا دِل دھکا دھک چلنے لگا اور
رنگ بدستور فق رہا.. اُس رات اُسے عجیب سے خواب آئے اور اگلی صبح وہ جانتا نہیں تھا
کہ کیسے بستر سے اُٹھے.. سلام ایپی سوڈ کے تیسرے روز اُس کے کسی دوست نے گلی میں
سے اُس کا نام پکارا اور وہ دیوار کے اوپر گملوں میں سے جھانک کر نیچے دیکھنے کو تھا کہ اُسے
پھر سمیعہ دِکھائی دے گئی، حسب سابق لوہے کے جنگلے کو تھامے کھڑکی میں سے لٹکتی ہوئی اور
اس لٹکاہٹ میں اُس کی قمیض کا گلا ایسے کھلا تھا کہ اُسے "سنوز آف کلی منجاروز" کی
ایوا گارڈنر یاد آ گئی... اور اُس کے سارے بدن کا خون انگیٹھی پر چڑھ گیا اور ایک بڑبڑاہٹ
کے ساتھ اُبلنے لگا اور شاید ناک اور کانوں کے راستے یہ گرم خون تھوڑا سا بہہ بھی گیا۔
سمیعہ نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو ایک ہاتھ سے سہار کر اُسے سلام کیا... اور جب وہ اس
سلام کے جواب میں اپنا ایک ہاتھ ماتھے تک لے کر گیا تو دیوار پر سے نیچے گلی میں گرنے کو
تھا اور پھر اپنے نصیب کے زور پر سنبھل گیا...

دوپہر لاہور کی تھی اور ویسی ہی تھی جیسی کہ لاہور کی گرمیوں میں دوپہریں ہوا
کرتی ہیں.. گرم تنور ہوا میں ٹھہری ہوئیں اور اس دوپہر میں مشاہد سکول سے لوٹا۔ پسینے

سے شرابور جب وہ اُس کمرے میں آیا جسے بیٹھک کہا جاتا تھا تو وہاں اُس کی دونوں باجی یعنی باجی باں باں اور باجی بلقیس کے ہمراہ سمیعہ براجمان تھی اُسی کھُلے گلے والی قمیض ساتھ اور اُسی طرح اپنی عمر سے کہیں زیادہ بھری بھری... مشاہد کا رنگ ایک مرتبہ پھر فق گیا... لیکن سمیعہ نے اُسے ایسے دیکھا جیسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ جانے کیسے اُس نے اُن باجیوں کے ساتھ دوستی گانٹھ لی تھی۔ اور جب اُس نے "ہائے بلقیس بہت دیر ہو گئی۔" کہہ کر جانے کی اجازت چاہی تو باجی باں باں نے برآمدے میں پیڑھی پر بیٹھ کر آپا جی چولہے کے سامنے دوپہر کی روٹی کھاتے ہوئے مشاہد کو آواز دی، مشاہد ذرا باجی کو نیچے تک تو چھوڑ آؤ —

اور فلیٹ کی باون سیڑھیوں کے عین درمیان جا کر باجی سمیعہ نے اُس کا ہاتھ د کر کہا تھا "اوئے مجھ سے ڈرتے ہو.." اور مشاہد کی گھگھی بندھ گئی اور جب کھُلی تو نے مریل سی آواز میں کہا "نہیں تو —"

"تو پھر مجھے پیاری کہو —"

"آپ تو میری باجی ہیں —" اُس نے گھگھیا کر کہا۔

"اوئے نہیں — کوئی نہیں میں تمہاری باجی شاجی — کونسی جماعت میں ہو"

"نویں میں باجی —"

"تو میں آٹھویں میں ہوں — تم سے چھوٹی ہوں — کہو ناں پیاری سمیعہ"

اس دوران اوپر سے کسی کے سیڑھیوں سے اُترنے کی آواز آئی اور سمیعہ جلدی سے اُس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک گچھا مچھا ٹکڑا تھما کر کہا "جان جواب دینا —"

عشقیہ خط و کتابت جاری ہو گئی۔

اور کئی ماہ تک جاری رہی.. خط کبھی کسی اینٹ کے نیچے اور کبھی چھوٹے کے ہاتھ...

تو لاہور کی ایک اور دوپہر میں جب وہ دھوپ کی تیزی میں آنکھیں میچے ہاتھ دہی کا کٹورہ تھامے بیڈن روڈ سے آ رہا تھا تو شیرازی ہوٹل کے سامنے یونہی اتفا صاحب نظر آ گئے۔ یہ اُن کے نظر آنے کا وقت تو نہ تھا لیکن وہ نظر آ گئے۔

"سلاما لیکم جی —" اُن کے قریب سے گذرتے ہوئے مشاہد نے اُنہیں سلا

دیکھا اور ابھی وہ گذرنے کو تھا کہ منٹو صاحب نے اُسے جھُک کر کندھے سے پکڑ لیا "یار مشاہد پیسٹری کھاؤ گے؟"

"پیسٹری — ؟" مشاہد کی زبان ذائقوں میں گھل گئی۔ پیسٹری ایک ایسی شے تھی جس کا تذکرہ اُس عہد کے رومانوی افسانوں میں آتا تھا' یہ ایک ایسی خوراک تھی جو لاہور شہر کی فصیلوں سے کم از کم چار پانچ میل باہر صاحب لوگوں کے علاقے میں پائی جاتی تھی اور یا پھر بیڈن روڈ پر واقع بیرٹ پارسی کی نیم تاریک بیکری کہ جس میں برطانوی راج کی بوسیدہ مہک ابھی تک ٹھہری ہوئی تھی کے شیشے کے شوکیسوں میں جلوہ گر ہوتی تھی... پیسٹری... ایک طلسمی شے...

"میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تمہیں پیسٹری کھلائی جائے.. کھاؤ گے؟" منٹو صاحب نے اُسکے چہرے کو پڑھا جس پر "کھاؤں گا کھاؤں گا" لکھا ہوا تھا۔

"ہاں جی کھاؤں گا —"

شیرازی ہوٹل کے اندرون کی ہلکی اور ٹھنڈک والی تاریکی میں گروچو مارکس اپنی مخصوص میز پر بیٹھا چائے کے کپ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ ابھی تک میز پر دھرے سولا ہیٹ کے ٹاپ بٹن کو ٹٹول رہا تھا۔ منٹو صاحب نے گروچو کو مخاطب کر کے کچھ کہا اور گروچو جواب میں اپنی مونچھوں تلے مسکرایا۔

"دو پیسٹری اور ایک چائے —" منٹو صاحب نے ہاتھ لہرا کر ویٹر کو متوجہ کیا لیکن عینک کے شیشوں کے پیچھے اُن کی آنکھیں اپنے سامنے بیٹھے مشاہد پر مرکوز تھیں جو اب اُس لمحے کو کوس رہا تھا جب اُس نے "ہاں جی کھاؤں گا" کہا تھا کیونکہ گھر پر آپا جی دہی کا انتظار کر رہی تھیں اور ادھر منٹو صاحب پتہ نہیں کیوں اُسے اتنی نرم محبت کے ساتھ پیسٹری کھلانا چاہتے تھے۔ اُس زمانے میں بچوں کو خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی کہ اگر کوئی شخص آپ کو کہے کہ "مٹھائی کھاؤ گے؟" تو بالکل نہیں کھانی اور اگر کہے کہ پیارے بچے آؤ ذرا میرے گھر چلتے ہیں تو بالکل تنہا اُس کے گھر بالکل نہیں جانا۔ اِن دونوں آفرز میں نوجوان ہوتے بچوں کے لیے طرح طرح کے خطرات مضمر تھے لیکن منٹو صاحب تو کوئی شخص نہ تھے اور نہ ہی اُن کے بارے میں اس قسم کی افواہیں تھیں تو پھر وہ کیوں پیسٹری کھلا رہے تھے...

تھالی میں سجی دو پیسٹریاں جب میز پر آئیں تو گویا ہر طرف بہار آ گئی اور مشاہد کی

آنکھیں اُن پر چپک گئیں۔

"کھاؤ یار مشاہد — " منٹو صاحب بے حد دوستی سے بول رہے تھے "یہ د تمہارے لیے ہیں" اُس نے گلابی کریم والی پیسٹری پر اُنگلیاں رکھیں تو وہ اُس کی نرم میٹھی ملائمت میں دھنسنے لگیں اور جب یہ پیسٹری اُس کے دانتوں کے درمیان میں آ اس کے آسمانی ذائقے سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں... وہ اپنے گلے میں اُترتے کے میٹھے آبشاروں میں گم آس پاس سے لاتعلق سا ہو گیا اور جب وہ اِس گونا سرخوشی بلندیوں پر تھا تو منٹو صاحب کی آواز آئی — "یہ... سمیعہ کون ہے؟"

اور مشاہد کی اُنگلیاں لرزنے لگیں اور اُس کا منہ کھُل گیا اور اُس کے ہونٹوں کناروں پر لگی گلابی کریم پھیل گئی۔

منٹو صاحب اُس کے سامنے بیٹھے مسکرا رہے تھے اور اُن کے ہاتھ میں اردو کی میں سے پھاڑے ہوئے صفحوں پر لکھا ایک خط تھا "میری جان مشاہد...." منٹو صاحب پڑھنے لگے اور مشاہد کا پورا بدن خوف سے کانپنے لگا۔ وہ اُٹھ کر بھاگ بھی نہیں سک کیونکہ اُس کے ہاتھوں میں دوسری پیسٹری تھی اور اس کی نرمی میں اُس کی اُنگلیاں تک جا چکی تھیں۔

"میں سیالکوٹ گئی ہوئی تھی اس لیے جان خط میں دو دن کی دیر ہو گئی۔ می چاند.. میری جان تم کیسے ہو.. میں نے تمہارے لیے ایک رومال پر پھول بنائے ہیں.. بھیجوں گی مردان کے ہاتھ... مشاہد پیارے ہائے میں تم پر مرتی ہوں..." یہاں آ کر صاحب رُک گئے اور خط کو تہہ کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے کہنے لگے "ذرا یہ تو بتاؤ تم پر کس طرح مرتی ہے؟"

"پتہ نہیں جی — " وہ رونے کی تیاری کرنے لگا۔

"تمہارے اُوپر مرتی ہے نیچے مرتی ہے یا درمیان میں مرتی ہے — " منٹو صا نے بے حد شفقت سے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی — " اُس کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

"دیکھو بیٹے... گھبرانے کی کوئی بات نہیں.. یہ خط تمہیں مل سکتا ہے.. خط؟"

"جی پلیز — آئندہ نہیں کروں گا۔"

"نہیں نہیں کرو ضرور، آئندہ بھی کرو لیکن صرف مجھے یہ بتا دو کہ تم کیا کرتے ہو؟"

"کہاں جی؟"

"کہاں نہیں — سمیعہ کے ساتھ... کیا کرتے ہو؟"

"کچھ نہیں جی — " یہ منٹو صاحب کس قسم کے سوال پوچھ رہے ہیں....

"چلو میرا تم سے ایک وعدہ ہے، پکا وعدہ — تم مجھے اپنی اور سمیعہ کی کہانی سنا دو... تم کیسے ملتے ہو۔ مل کر کیا کرتے ہو.. اور اگر پرانے خط تمہارے پاس ہوں... اور وہ ہوں گے تو وہ دے دو میں پڑھ کر واپس کر دوں گا... اور اُن کے ساتھ یہ والا خط بھی — " اُنہوں نے کُرتے کی جیب تھپک کر کہا۔

"میں جاؤں جی — " مشاہد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

"اور اگر یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم سمیعہ کو مل کر کیا کرتے ہو تو یہ خط تمہارے والد صاحب کو پہنچ جائے گا — " اور یہ کہتے ہوئے اُسے منٹو صاحب بہت بُرے لگے... بُرے سے بھی بہت زیادہ بُرے لگے.. یہ تو اتنے اچھے تھے اِن کو کیا ہو گیا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ منٹو صاحب مختلف لوگوں کو دوست بناتے ہیں اور پھر کسی کمزور لمحے میں سنائی ہوئی زندگی کی کہانی کو ایک افسانے میں بدل دیتے ہیں۔ اور وہ افسانہ پچیس روپے میں فروخت ہوتا ہے اور.... اُسے یقین تھا کہ اُس کی اور سمیعہ کی کہانی بھی افسانے میں بدلے گی اور پھر ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ... لوہے کے جنگلے کو تھام کر گلی میں لٹکنے والی بھری بھری لڑکی اور چپس کے گملوں میں سے سر نکال کر اُدھر دیکھنے والا لڑکا.. مشاہد پسینے میں بھیگ گیا

"آئندہ نہیں کروں گا جی..."

"کیا؟"

"کچھ بھی نہیں — "

"نہیں آئندہ تم کیا نہیں کرو گے — " منٹو صاحب کا سر اُس کے قریب آتا گیا اور اب اُس کے جھینپو اور ڈرپوک چہرے اور منٹو صاحب کی عینک کے درمیان صرف ایک لرزتی ہوئی پیسٹری تھی جس کی نرمی میں اُس کی جو اُنگلیاں تھیں اُن پر بھی پسینہ آ رہا تھا۔

"کچھ نہیں جی — " گرمی بہت تھی اور پیسٹری اُس کی اُنگلیوں میں موم کی طرح

نرم ہو کر دو حصوں میں لٹکی اور میز پر گر گئی۔

"تم صرف یہ بتا دو کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اوپر کرتے ہو، نیچے کرتے ہو، درمیان میں کرتے ہو؟ —"

مشاہد کچھ کچھ سمجھا کہ منٹو صاحب کیا کہہ رہے اور اُس کے کانوں کی لویں سُرخ گئیں اور بدن ٹھنڈا ہو گیا — وہ اپنے بارے میں تو کچھ کچھ جانتا تھا اور اپنے جسم آگاہ تھا اور اکثر وہ صبح سویرے دیر تک بستر میں لیٹا رہتا کہ سب لوگ چلے جائیں تو اُٹھے.. کبھی تو حالات ذرا آکورڈ سے ہوتے اور کبھی آکورڈ ہونے کے بعد حبس موسموں کی چپ چِپ ایسے ہوتے۔ لیکن اُس نے آج تک اپنے بہت ہی جنگلی خوابوں بھی سمیعہ کو کسی پوزیشن میں نہیں سوچا تھا — سوچتا بھی کیسے وہ تو ابھی تک یہی سمجھتا کہ بطخیں بھی پریگننٹ ہوتی ہیں... اور ادھر منٹو صاحب سخت بُرے آدمی، اس دن میں، شیرازی ہوٹل میں، جب کہ پیسٹری میز پر گر چکی تھی اور اُس کی اُنگلیوں پر لگی کریم ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی — اُنھوں نے اوپر نیچے اور درمیان کی رٹ لگا رکھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں جو کہ موٹی موٹی تھیں آنسو آ گئے... پہلا آنسو پیسٹری کے آدھے ٹکڑے پر گرا —

"اوئے —" منٹو صاحب نے صرف اتنا کہا اور ذرا حیران ہوئے۔

"میں جاؤں جی —"

اور بالکل غیر متوقع طور پر منٹو صاحب نے کہا — "جاؤ —"

"پلیز جی —" اُس نے دہی والا کٹورا اُٹھاتے ہوئے کہا "خط دے دیں —"

"جب بتاؤ گے کہ سمیعہ کے ساتھ کیا کرتے ہو تب ملے گا۔ ابھی یہ یہیں رہے" اُنھوں نے کُرتے کی جیب کو تھپکا جس میں، مشاہد پیارے میں تم پر مرتی ہوں — اُس پہنچ سے دور ہو چکا تھا۔

وہ روتا ہوا، اُنگلیاں چاٹتا ہوا گھر واپس چلا گیا اور آپا جی سے کہہ دیا کہ گرمی تھی اس لیے آج دہی جم نہیں سکا —

وہ اب مستقل خدشوں میں گھرا رہتا اور اُسے بخار سا محسوس ہوتا۔ جب کبھی آپا جی یا ابا جی کا سامنا کرتا تو اُن کی نظروں میں، مشاہد پیارے میں تم پر مرتی ہوں، تلاش کرتا... اُسے یقین تھا کہ وہ دنیا کا بدقسمت ترین لڑکا ہے —

اُسے منٹو صاحب سے نفرت ہو گئی۔ بڑی شدید قسم کی —

اُن دنوں ریگل چوک سے چیئرنگ کراس تک کی شاموں میں، چینی ہا پسن شوز لنڈن ہاؤس کے سُوٹوں اور رینکن کی ٹائیوں میں — گولڈ فلیک کے ٹینوں میں اور آیرن مور کے تمباکو میں — فراسٹی مالٹی آئس کریم میں، راجہ وائن سٹور میں، سٹینڈرڈز کی چھت پر، ایم یاسین خان کی بیکری میں، امپیریل شوز اور مینزل ریکٹس اور زیدی فوٹو گرافر کے اندر اور مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے صاحب لوگوں اور — لکشمی مینشن کے کراؤڈ کی زندگی میں یکدم ہلچل سی مچ گئی۔ زندگی وہ نہ رہی جو کہ گرم دوپہروں میں، میٹنی شوز اور فلیٹوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر گذرتی تھی —

پہلے تو اطمینان اور ٹھہراؤ تھا۔

بیرٹ کی نازک اور لڑکھڑاتی بیٹیاں، روشن اور پے ماسٹر خاندان پارسی تہواروں کے موقع پر اپنے گھروں کی سیڑھیوں کو رنگین چاکوں کے سفوف سے بنائے ہوئے بیل بوٹوں سے سجاتے... فرش پر ٹھپّے لگا کر بہت دل کو کھینچنے والے نقش و نگار بناتے اور لوگ کئی روز تک ان منقّش سیڑھیوں پر بیٹھنے سے گریز کرتے رہتے اور پھر وہ دھوپ سے مدھم ہو جاتے یا بارش سفوف کے ذرّے بہا لے جاتی... پتلی پتنگ عیسائی لڑکی لوما کا ماموں ہیرس اگرچہ شاہد کے بلاک میں رہتا تھا لیکن اُس کی اصل رہائش ایف جے کنگ بار میں ہوتی تھی۔ اس شراب خانے کا عقبی دروازہ مینشن میں کھلتا تھا لیکن داخلہ ہال روڈ کی جانب تھا۔ ایف جے کنگ بار مینشن کراؤڈ کی بہت فیورٹ تھی.. صرف اس لئے کہ اس کا داخلہ کاؤ بوائے رز کی طرح کا تھا — سینے کی سطح پر دو ایسے پٹ جو دھکیلنے سے کھل جاتے اور پھر اپنے پرنگوں کے زور پر واپس آ جاتے — لیکن کراؤڈ میں سے اُس کے اندر کوئی نہیں گیا تھا۔ یک بار پیٹر اور ہیرس نے اپنے گورکھا ہیٹ ترچھے کر کے اِس کے داخلے کے سامنے تصویر ھنچوانے کی کوشش کی لیکن اُن کے ڈیڈی نے دیکھ لیا اور ڈیڈی عین اُس وقت بار میں سے نکل رہے تھے تو اُنھوں نے ان دونوں کو خوب بیٹنگ دی کہ باسٹرڈز آج فوٹو کھنچواتے کل اندر چلے جاؤ گے —

ماموں ہیرس ایف جے کنگ بار میں ہال روڈ کی جانب سے داخل ہوتا اور نہایت زز چال سے داخل ہوتا اور پھر مینشن کی گلی میں کھلتے عقبی دروازے میں سے دھکے دے

کر باہر نکال دیا جاتا — کیونکہ ماموں ہیرس اپنی ڈرنک ہولڈ نہیں کر سکتا تھا اور پھر میں کھڑے ہو کر شور مچاتا کہ آؤ اور مجھے مارو — چنانچہ مینشن کے باشندے اُس کی معصوم خواہش کا احترام کرتے اور اُسے مشترکہ طور پر زدوکوب کرتے.. اور یہ روزا معمول تھا۔

اُن دنوں ٹڈی دل بہت آتے تھے۔ صرف کھُلی آبادیوں اور کھیتوں پر ہی شہروں کے آسمان بھی اُن سے ڈھک جاتے تھے اور جب کبھی ٹڈیوں کے یہ بادل لاہو آسمان کی روشنی پر اپنی متحرک سیاہ چادر ڈالتے تو مشاہد کے فلیٹ کے عین سامنے رہنے لاری خاندان ہاتھوں میں بیڈمنٹن ریکٹ پکڑے چھت پر آ جاتا اور اُچھل اُچھل کر ٹڈی شکار کرنے لگتا۔ شام کو ان ٹڈیوں کو سرسوں کے تیل میں فرائی کرنے سے جو بُو مشاہ فلیٹ کے اندر تک جاتی تو اُس کی آپا جی ناک پر ململ کا دوپٹہ ڈالے اُن مہاجروں کو کو جو دیسی گھی کی بجائے کھانے میں تیل استعمال کرتے تھے اور جو ٹڈیوں ایسی مکروہ شوق سے نوش کرتے تھے... ویسے لاری خاندان کے دو بچے ہاتھی دانت اور ٹومیٹو اُس دوست تھے — بہت برس بعد جب بڑے لاری صاحب ایک شام اُن کے فلیٹ کا درو تادیر کھٹکھٹاتے رہے اور جب اُس کے اباجی نے دروازہ کھول کر بڑے غصے سے کہا کہ فرمایئے تو اُنھوں نے ایک کارڈ اُن کو تھماتے ہوئے کہا تھا... ماشاء اللہ سے ہاتھی دانت شادی کر رہا ہوں، ضرور تشریف لایئے گا — ہاتھی دانت آپ کا بھی تو بچہ ہے۔

اباجی نے لاری صاحب کو دیکھ کر اس لیے غصے کا اظہار کیا تھا کیونکہ وہ شام جب بھی مینشن لوٹتے تو قدرے ٹُن ہوتے اور اکثر دوسروں کے دروازوں پر دستک کر کہتے، ہاتھی دانت کی اماں دروازہ کھولو — لاری صاحب آ گئے ہیں۔

مظہر شاہ صاحب سلطان اور سلطانہ کے فلیٹ کے نیچے واقع ایک گیراج میں پذیر تھے... اور مینشن کراؤڈ خاص طور پر اُن پر نظر رکھتا تھا کیونکہ گرم دوپہروں میں جب سُو ہو کا عالم ہوتا تھا تو کوئلہ چننے والی خانہ بدوش لڑکیاں اُن کے گیراج کے نواح میں حیرت انگیز طور پر غائب ہو جاتیں.. بلکہ ایک غائب ہو جاتی اور ایک باہر بیٹھ کر انتظار اِنہی شاہ صاحب کے ساتھ ایک خاص وقت میں ایک خاص مدت میں منٹو صاحب کی گاڑھی دوستی ہو گئی.. پھر ایک شام اُس گیراج کی مکمل تنہائی میں جس میں دروازے نہیں تھے بیئر کی آخری بوتل کے بعد شاہ صاحب نے اپنے لائف ٹائم

اقرار کر لیا.... میں کابل میں کاروبار کرتا تھا اور وہ شاہی خاندان کی شہزادی تھی — میری پہنچ سے باہر — میرے بس سے باہر اور میں اُس کے عشق میں دیوانہ ہو گیا۔ تب مجھے ایک نسخہ ملا۔ سات رنگ کے پھول، ہفتے کے ساتویں دن میں نے اُسے سنگھا دیئے — اور پھر منٹو صاحب اُس رات...

منٹو صاحب نے یہ کہانی جوں کی توں لکھ کر "نقوش" میں چھپوا دی اور لکشمی مینشن میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا — اچھا تو سات پھولوں والے شاہ جی اس گیراج میں رہتے ہیں — ذرا دستک دے کر اُن سے ملاقات کریں — معاف کیجئے گا آپ ہی وہ شاہ صاحب ہیں جو منٹو کی کہانی —

اور شاہ صاحب برس پڑتے — اوئے میں منٹو کی — میں اُس.... منٹو کو —

ایک عرصے تک منٹو نے شاہ صاحب کے سامنے آنے سے گریز کیا۔

شاہ صاحب بے چارے بدنام ہو گئے تھے اور اب کوئلہ چننے والیوں سے بھی پرہیز کرتے تھے۔

مشاہد کو اس داستان کا علم تھا اور اسی لیے اُس نے شیرازی ہوٹل کی پیسٹریوں کی رشوت کے باوجود سمیعہ کے اوپر نیچے اور درمیان کی کوئی بات منٹو صاحب سے نہیں کی تھی —

ویسے عشق تو اور بھی تھے —

کاروں کی بیٹریاں چارج کرنے والے عاشق مرزا اور دارو کا عشق —

کانی اور صاحب کا عشق — کانی ایک گھریلو سی لڑکی تھی، مسلمان تھی اور صاحب یک مڈل ایجڈ اینگلو انڈین صاحب تھا۔ کرسچن تھا.. یہ ایک عجیب سمجھ میں نہ آنے والا عشق تھا یا شائد گہرے اور فنا کر دینے والے عشق کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ سمجھ میں میں آتا — صاحب کی سائڈ برنز بالکل سفید تھیں اور وہ روزانہ مخمور ہو کر کانی کے گھر کے نیچے جا کھڑا ہوتا — یہ بھائیوں کے لیے بے عزتی کی بات تھی — اور وہ اُسے بہت رتے۔ صاحب اطمینان سے مار کھا لیتا، منہ سے کچھ نہ کہتا — کچھ نہ بولتا اور زخم سہلاتا یک ویران گھر میں چلا جاتا.. اور دوسرے روز پھر آ جاتا۔

کسی نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مسئلہ کانی کے مسلمان اور صاحب کے کرسچن ہونے میں بھی ہو سکتا ہے — مسئلہ صرف عشق کا تھا —

کمال دن رات کنیز کو لَو لیٹر لکھتا۔

اگرچہ صادق لکشمی مینشن کا رکھوالا تھا۔ وہ ہر آنے جانے والے پر کڑی رکھتا۔ مینشن بقول اُس کے ایک خاندان تھا جس میں مسلمان پارسی ہندو اور کرسچین برابر کے حقوق رکھتے تھے.. لیکن کچھ لوگ اُس کی اجازت سے مینشن میں آ جاتے ان میں ایم یاسین خان بیکری والوں کا منحنی سالڑکا سعید تھا جو گفتگو کے دوران "کتنے" بہت استعمال کرتا... میرے کتنے چیز کے ڈبے ہیں — میرے کتنے کچھ سیکرٹس ہیں وغیرہ وہ اپنی دوکان سے، دادا سے چوری چوری انگریزی چاکلیٹ اور خوراک کے ٹین لاتا مینشن کراؤڈ اُس کا بے حد شکر گذار ہوتا۔ بیڈن روڈ کی جانب سے مشتاق واکو بھی آ چاندنی راتوں میں جب وہ ہیمنت کمار کے رنگ میں "یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں" مینشن کی بالکونیاں آباد ہو جاتیں اور اُن سے پھولوں کے گجرے نیچے گرتے — گائیکی کے خون میں تھی۔ وہ ہمیں بتایا کرتا تھا کہ میرے بڑے بھائی بہت زبردست موسیقا اور قسمت آزمائی کے لیے بمبئی چلے گئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنا فلمی نام خیام رکھ لیا ہے

روشن کے بھائی فیروز کو سب لوگ فیروز ہنسی کہتے تھے.. وہ ہنستا بہت تھا۔

ٹریور جس کی رگوں میں سو فیصدی خالص یارکشائری خون دوڑتا تھا مینشن کا گورا بچہ تھا اور اُس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔

اُنہی دنوں ہال روڈ پر رہنے والے روِندر نے اپنا نام افتخار رکھ کر مسلمان ہو اعلان کر دیا.. اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ اب اُس کے باپو اور تمام ہندو رشتے دارو جائداد پر اُس کا حق ہے..

مال روڈ پر جب پہلی بار سُرخ ڈبل ڈیکر بس کا نزول ہوا تو ریگل کے تانگہ سٹینڈ کھڑے تانگوں کے شانت گھوڑے اُسے دیکھ کر ہراساں ہو گئے اور ہنہنانے لگے — خورشید شاہد کی بناوٹ اور سجاوٹ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور اُن کے جانا لگا رہتا تھا..

دوپہر کو ہال روڈ ایسے ویران ہوتی جیسے صحرائے گوبی کے کنارے پر واقع ہو مال روڈ پر بھی کوئی تانگہ بہت مدت بعد گذرتا اور گھوڑے کے گلے میں گھنٹیوں کی چھن چھن دیر تک گرم لُو میں معلق رہتی۔

بس لاہور کے یہی وہ دن تھے — جب ریگل چوک سے چیئرنگ کراس کی

میں.. مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے صاحب لوگوں کی زندگی وہ نہ رہی جو کہ گرم دوپہروں میں — مٹنی شوز اور فلیٹوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر گذرتی تھی — لکشمی مینشن کے کراؤڈ کی زندگی میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

لاہور کے اسی اطمینان اور ٹھہراؤ اور سادہ دلی میں ایک گاڑی بھوانی جنکشن
رُکی —

اس ریل گاڑی میں اُن سب کے، خاص طور پر مینشن کراؤڈ کے خواب۔
اُنہوں نے کلی منجاروز کی برفوں کے سائے میں دیکھے تھے۔ اس میں ایک کومل پاؤں
— ننگے پاؤں والی کوٹیسا تھی۔ ہیمنگ وے کے ناول "فِی اسٹا" کی ہیروئن تھی جو
کے میلہ سان فرمان میں ایک بُل فائٹر کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو برباد کر
— اِسی گاڑی میں "سکاراموچ" تھا اور "وائلڈ نارتھ" تھا —

مشاہد سکول سے پیدل واپس آ رہا تھا — پیدل اس لیے کہ وہ اب تک تین
ریلے سائیکلیں گُم کر چکا تھا اور اُس کے اباجی نے کہا تھا کہ جب تک تم خود سائیکل
نہیں سیکھ جاتے تمہیں چوتھی سائیکل نہیں مل سکتی۔

وہ اُن لوگوں کو دنیا کے قابل ترین افراد گردانتا تھا جو ایک دو پہیوں والی
سائیکل پر سوار ہو کر مسلسل پیڈل بھی مارتے تھے اور ہینڈل کا دھیان بھی رکھتے تھے
— سڑک پر آنے جانے والی دوسری سائیکلوں اور تانگوں سے بچتے بھی تھے اور
دھڑام سے گرتے نہیں تھے.. وہ اُنہیں انتہائی احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اُس
ماموں علی احمد نے اُسے متعدد بار منٹو پارک میں لے جا کر سائیکل چلانے کے رموز
آشنا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن — مشاہد کو یقین تھا کہ وہ مرتے دم تک یہ کام نہ
سکتا۔

تو پھر وہ اُن تین سائیکلوں کو کیا کرتا تھا جو باری باری اُس نے گُم کر دی تھیں
اس کا جواب بہت سادہ ہے — اُس نے ڈرائیور رکھ لیے تھے۔
وہ صبح سویرے آپا جی کے ہاتھ کا بنا ہوا دیسی گھی کا تہہ دار پراٹھا کھا کر فلیٹ
نیچے آتا تو وہاں، ڈرائیور نمبر ایک — کمال — اُس کا منتظر ہوتا...

سکول میں چھٹی ہوتی تو اُس کا ہم جماعت نسیم اُس سے پہلے سائیکل سٹینڈ پر پہنچ کر ایک نیلے رنگ کے غلیظ رومال سے سائیکل کا ڈنڈا صاف کر رہا ہوتا — یہ ڈرائیور نمبر دو تھا — دراصل انہی ڈرائیوروں کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ سائیکلیں پے در پے چوری ہو گئیں۔

چنانچہ مشاہد مسلم ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب سے دو درجن بید اپنی ہتھیلیوں پر وصول کر کے پیدل واپس آ رہا تھا — اور چھوٹا مردان بھی اُس کے ہمراہ تھا... آپا جی زبردستی اُسے ساتھ بھیج دیتیں اور اُن کا وہی خدشہ کہ تیسری منزل پر واقع فلیٹ میں مسلسل رہنے سے بچے کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو جائیں گی — اِس لیے مشاہد بیٹے اِسے کبھی کبھار ساتھ لے جایا کرو تا کہ اِس کی ٹانگیں کھلتی رہیں۔

قابل فہم طور پر دو درجن بید کھانے کے بعد، پیدل چلتے ہوئے اور مردان کو ہمراہ گھسیٹتے ہوئے مشاہد کا مزاج کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔

ریگل بس شاپ کے قریب مال روڈ کے ویران فٹ پاتھ پر — ایک غیر ملکی جوڑا چلا آ رہا تھا۔ مشاہد نے بغیر تجسس کے اُن کی جانب ایک نگاہ کی اور اُس کے دِل کو دھچکا سا لگا — جیسے ٹرین میں بیٹھے ہوئے یکلخت بریک لگنے سے جسم کو لگتا ہے... وہ اس نیلی آنکھوں والی بلند قامت اور بے حد دودھیا پنڈلیوں والی عورت کو جانتا تھا اور بہت قریب سے جانتا تھا۔ اتنی دیر میں وہ قریب سے گذر گئی... اُس کے ذہن میں ایک اُلجھاؤ سا تھا۔ وہ ہو بہو وہی لگتی تھی لیکن — یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

فلیٹ کے دروازے کے قریب پہنچ کر مشاہد نے اپنا بستہ مردان کے حوالے کیا اور اُسے فوری طور پر تیسری منزل تک جانے والی باون سیڑھیوں کو طے کرنے پر معمور کیا اور خود تیز تیز چلتا مینشن کی گراؤنڈ میں آ گیا — کراؤڈ یہاں پہلے سے موجود تھا —

"ناہ —" پیٹر نے اپنا گورکھا ہیٹ مزید ترچھا کر کے منہ بگاڑ کر کہا۔

"نو وے —" ہیرس نے چٹکی بجائی —

کمال بھی پہنچ گیا — نہیں یار —

"ناہ۔ ناہ —" پیٹر سخت بیزار تھا۔ "تم نے پہلے بھی ایک مرتبہ مال پر دوڑ لگوائی تھی کہ جی گروچو مارکس جا رہا ہے — مِسٹ اگر وہ وہی ہو جو تم کہتے ہو تو کرائسٹ میں ڈِنگا سنگھ بلڈنگ کے سنہری کلس پر جا بیٹھوں گا — اور تمہیں پتہ ہے وہ کلس کتنا شارپ

ہے۔"

"مجھے وہی لگتی ہے —" مشاہد نے اب قدرے بجھے دل سے کہا کیونکہ
اُس کلس پر بیٹھنے کا رِسک لے سکتا تھا تو وہ یقیناً وہ نہیں تھی — کوئی اور تھی۔

"ہے گائیز —" کمال نے اپنی ڈھیلی نیکر میں انگوٹھے اُڑس کر اسے اپنے کولہوں پر قائم رکھنے کی کوشش کی "کم آن — لیٹ اَس چیک اِٹ مین —"

ان چاروں مسکیٹیرز نے احتیاطاً آٹوگراف بکس بھی جیبوں میں ڈال لیں ا سپاٹ کی جانب روانہ ہو گئے جہاں بقول مُش وہ آخری مرتبہ ایک لمبے تڑنگے مش انگریز کی بانہوں میں بانہیں ڈالے نیلی آنکھوں کے ساتھ ہنستی ہوئی دیکھی گئی تھی۔

مال روڈ پر سائے طویل ہو چکے تھے اور اب سڑک عبور کرنے کے لیے بائیں ایک مرتبہ دیکھنا ضروری تھا —

ظاہر ہے وہ اُس سپاٹ پر تو نہیں تھی۔

"اُن کا رُخ ہائی کورٹ کی جانب تھا —" مُش نے کہا اور وہ چاروں نادان طرح ہر شے سونگھتے ہوئے چلتے گئے۔ ہر دوکان کے اندر جھانکتے ہوئے اور ہر ذی نظر میں رکھتے ہوئے... اور پھر انہوں نے اُسے دیکھ لیا اور اُن سب کو بھی ایک دھچکا وہ وہی لگتی تھی۔ وہ امپیریل شوز کے نیم تاریک اور طویل شوروم میں لمبی اور نفیس ایک دوسرے کے اوپر دھرے ہولے ہولے ہلا رہی تھی اور زری کے کام والے کھُسّے دیکھ رہی تھی۔ وہ چاروں جھکے جھکے اُس نیم تاریکی میں چلے جیسے کسی معبد ہیں اور اپنی اپنی آٹوگراف بکس کھول کر اُس کے سامنے کھڑے ہو گئے "آٹ پلیز —"

اُس نے پہلے تو سخت ناگواری سے اس دخل اندازی کو محسوس کیا اور سامنے چار بیوقوف سے بچے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

اُس نے اپنی خوبصورت ران پر مشاہد کی آٹوگراف بُک رکھی اور مشاہد وقت اپنی آٹوگراف بک تھام رکھی تھی اور اسی لیے اُس کی چھوٹی اُنگلی اُس کی ران دیر رہی جتنی دیر میں اُس نے اپنا نام لکھا — ایوا گارڈنر — وہ وہی تھی۔ اُن چار دیکھا کہ امپیریل شوز کی چھت میں سے دُھند اُتر رہی ہے اور اُس کی سفیدی میں چپلیں، زری کے کھُسّے روپوش ہو رہے ہیں اور اُس لمحے اُس نے ایک سگرٹ۔

کراشٹ وہ اُسی طرح کش لگا رہی تھی جیسے "سنوز آف کلی منجاروز" میں پیرس کے ایک نائٹ کلب میں گریگوری پیک کو انہی نیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے لگاتی تھی۔ اب یہ چاروں گریگوری پیک تھے نیکریں پہنے ہوئے اور ترچھے گورکھا ہیٹس میں... مسکراتے ہوئے اور کبھی کبھار ناک سے شُوں شُوں کرتے ہوئے... تب اُس نے ایک اور کش لگایا اور دھواں اُن کے چہروں پر چھوڑ کر کہا "وَیل رَن الانگ بوائیز —" اور بوائیز کو یکدم ہوش آگیا —

"ہاؤ ڈی میم —" کمال نے اپنے گورکھا ہیٹ کے چھجے کو چھو کر کہا۔

وہ ہنس دی اور ہاتھ آگے کر دیا "ہاؤ ڈی —"

باقی تینوں حضرات نے بھی باری باری ہاؤ ڈی میم — کہا اور میم سے ہاتھ ملایا۔

وہ چاروں امپیریل شوز سے باہر آئے تو اُنہیں مال روڈ پر چہل قدمی کرتے ہوئے تمام لوگ کیڑے مکوڑے لگے۔

"مین اُس نے میری طرف ویسے ہی دیکھا تھا جیسے وہ پیک کو دیکھتی تھی —" کمال نے اپنا چھوٹا سا سینہ پھلا دیا "میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے محبت میں مبتلا ہو گئی ہے"

یہ سٹیٹ منٹ مکمل سنجیدگی سے دی گئی تھی۔

"ناہ —" پیٹر نے اُس کے کندھے جھنجھوڑے "تمہیں پتہ ہے کہ مجھ سے ہینڈ شیک کرتے ہوئے اُس نے میرا ہاتھ ذرا سا دبایا تھا — آنسٹ ٹُو گاڈ —"

مشاہد بھی آسمانوں پر تھا "اگر ایوا مجھے کہتی کہ یہ سگرٹ پی لو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں سگرٹ پی جاتا —"

"چھوڑو مین — اُس روز جاوید اشر نے تمہیں اپنے ڈیڈی کی برانڈی چکھانے کی کوشش کی تھی اور تم نے سونگھ کر چھوڑ دی تھی —"

"وہ تو شراب ہوتی ہے —"

"ناہ —" کمال نے اپنی چپٹی ناک چڑھائی "اِٹس اے ڈرنک مین —"

"ہے گائیز —" پیٹر نے اپنا ہاتھ آگے کر کے ہتھیلی پھیلائی اور پھر اُسے ناک کے ساتھ لگایا — "کیا تم نے اپنے ہاتھ سونگھے ہیں — مین اِن میں سینٹ کی سمیل ہے یار"

سب نے فوراً اپنے اپنے ہاتھ ناک سے لگائے — ایک ہلکی سی دُھندلے خوابوں کی سی مہک تھی... کسی سینٹ کی — جو ایوا گارڈنر کے بدن سے منتقل ہو کر ان کے ہاتھوں

میں آ گئی تھی۔ یہ مہک اُس شب اُن کے خوابوں کے دھندلکوں کے اندر تک گُ
کی بجائے وہ تھے جو کلی منجاروز کی برفوں کے سائے تلے اُسے یاد کرتے تھے اور وہ
در خواب سگرٹ کا کش لگا کر اُن کے چہرے پر چھوڑتی تھی۔ اور اُس کے پورے ب
وہی مہک تھی۔ اگلی صبح وہ پھر نم موسموں میں تھے اور بستروں میں سے نکلتے ہوئے
تھے۔

اور اگلی صبح لاہور کے بُرج میناروں اور سارے باسیوں کو خبر ہو چکی تھی
ماسٹرز کے ناول "بھوانی جنکشن" کی فلم بندی کے لیے ہالی وڈ کی ایک ٹیم شہر میں
اور ایوا گارڈنر اور سٹیورٹ گرینجر شہر میں ہیں — "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے
فرنٹ پیج دیا اور اُن کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں بڑے اہتمام سے شائع کیں۔ پر
معیار اتنا اعلیٰ تھا کہ کیپشن پڑھے بغیر یہ جاننا مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے ایوا کو
اور سٹیورٹ کونسا ہے —

اور ہاں یہی چار مسکیٹئرز لاہور کے کولونیل لیفٹ اوور فلیٹیز ہوٹل میں ا
آٹوگراف بکس سے لیس ہو کر پہنچے اور لان میں چار بجے کی چائے نوش کرتے ہو
سائڈ برنز والے ڈیشنگ اور ہسکی آواز والے گرینجر کے سامنے "ہاؤ ڈی مسٹر —
ہوئے کھڑے ہو گئے۔ گرینجر نے نہ صرف یہ کہ اُن کے ساتھ باہمی دلچسپی کے ا
تبادلۂ خیال کیا بلکہ آٹوگراف دینے کے علاوہ اُنہیں ایک ایک کپ چائے کا بھی پیش ک
"دیٹ اِز مائٹی نائس آف یو مسٹر —" اُنہوں نے رخصت ہوتے ہوئے ج
اُس کا شکریہ ادا کیا۔ گرینجر کی گہری اور پاٹ دار ہنسی اُنہیں ہوٹل کے گیٹ تک چھ
آئی —

اگلے چند روز اُنہوں نے بھوانی جنکشن کی ٹیم کا پیچھا کرنے میں گذارے —
اُنہیں جب بھی موقع ملتا وہ ایوا کے سامنے آ کر فوراً ہیٹ کے چھجے کو چھو
ڈی میم —" کہتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ گرینجر کو بھی دن میں کم از کم تین چار
"ہاؤ ڈی مسٹر" سے واسطہ پڑ جاتا...

یہ اُن کی دانش مندی تھی کہ ایک خاص لمحے میں اُنہیں یہ احساس ہو گیا
اُنہوں نے ایک مرتبہ اور ایوا کے سامنے جا کر "ہاؤ ڈی میم" کہا تو وہ اُنہیں جھانپڑ
کرے گی اور ایک دو نہیں بلکہ متعدد — ادھر گرینجر صاحب کا بھی ناک میں دم آ چکا

اور وہ بھی طیش میں آ سکتے تھے — وہ اُن کا پیچھا تو بدستور کرتے رہے لیکن اس احتیاط
کے ساتھ کہ اب اُن کی نظروں میں نہ آئیں۔

بھوانی جنکشن کی آمد نے لاہور ریلوے سٹیشن کا چہرہ مُہرہ بدل دیا۔ عمارت کے
ماتھے پر تانگہ سٹینڈ کے عین اوپر "لاہور" کی بجائے "بھوانی جنکشن" پینٹ کر دیا گیا۔ جہاں
جہاں سائن بورڈ تھے اُن پر بھی اس نامانوس شہر کا نام لکھا گیا۔ پلیٹ فارموں پر ایکسٹرا اداکار
لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی دھوتیاں اور نہرو ٹوپیاں پہن کر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے رہتے۔
نہرو اگرچہ اتنا پسندیدہ نہ تھا لیکن اُس جیسی ٹوپی پہن کر چند ڈالر بنا لینے میں کیا حرج تھا۔

ایک روز لکشمی مینشن کے عین سامنے ایک عمارت کو آگ لگا دی گئی... بھوانی
جنکشن کا ایک منظر — پریشان حال دُھویں میں کھانستی ایوا گارڈنر چھت پر بھاگ رہی ہے
اور مدد کو پکار رہی ہے... ادھر پورا مینشن اس اوپن ایئر ڈرامے کو دیکھنے کے لیے کوٹھوں پر
اُمڈا ہوا ہے.. مشاہد اپنے فلیٹ کی چھت پر، منڈیر کے اوپر جھکا ہوا ایوا کی الیہ اداکاری کو
ایک عجیب اُداسی کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ گلی کے پار سمیعہ کو بھی چھت پر آنے کا موقع مل
گیا ہے اور وہ بار بار مشاہد کو اشارے کر رہی ہے لیکن وہ تو مگن ہے — پورے بدن کی
یوا کے سامنے بھلا سمیعہ بے چاری کی کیا حیثیت — اُس کی حیثیت تو ابھی پوری طرح
ڈویلپ بھی نہیں ہوئی تھی۔

بھوانی جنکشن کی ٹیم چند ہفتوں بعد شوٹنگ مکمل کر کے ہالی وڈ واپس چلی گئی۔

لاہور شہر ایک مدت تک اس صدمے سے سنبھل نہ سکا۔

اس کے آسمان میں روشنی کم ہو گئی۔

مال روڈ پر چلنے والے تانگوں کے گھوڑے اب قدرے سُست ہو گئے۔

تم ہندو ہو تو ہندوستان کیوں نہیں چلے جاتے بُندو رام؟ —

بُندو رام ہنسا — وہ اس سوال کو سُن کر ہمیشہ ہنستا تھا اور یہ سوال رنگ محل مشن
اسکول سے واپس آتے ہوئے بچوں میں سے کوئی ایک بچہ روزانہ پوچھتا تھا...

اُس کے بوڑھے دانت میلے تھے اور کہیں تھے اور کہیں نہیں تھے اور اُن پر تمباکو
زردی تھی... کوئی بچہ اُس کی بودی پکڑ کر ہولے سے کھینچتا... اُسے تکلیف دینے کے
نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ اُترتی ہے یا نہیں.. ذرا بندو رام کو چھیڑنے کے لیے۔

بُندو رام اس پر بھی ہنستا —— اور اپنی بودی کو دیر تک سہلاتا رہتا۔

پاکستان بن چکا تھا۔ شاہ عالمی کی عظیم آگ جس نے لاہور کے آسمان کو کئی رو
تک سُرخ کیے رکھا تھا اور جلے ہوئے بہی کھاتوں، کتابوں اور کپڑوں کے پَر کٹے سیاہ پرند
اُڑائے تھے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ رنگ محل چوک سے لے کر تقریباً پون میل
فاصلے پر واقع شاہ عالمی چوک تک جو قدیم رہائش گاہیں، حویلیاں، عبادت گاہیں اور دوکا
تھیں —— اب وہاں نہیں تھیں۔ اُن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اونچے نیچے ٹیلوں اور ملبے
ڈھیروں کا ایک سلسلہ تھا جن میں چھوٹی اینٹ کی کوئی ایک دیوار کہیں نظر آ جاتی.. کو
منقش دروازہ جلی ہوئی حالت میں کسی ڈھیر میں سے جیسے باہر آنا چاہتا ہو۔ مشن سکول
بیشتر بچوں کا محبوب مشغلہ ان ڈھیروں پر چڑھنا اور دُھول میں اَٹ جانا اور پھر اپنی ماؤں
مار کھانا تھا۔ ملبے کے ان بلند ڈھیروں میں سب سے نمایاں وہ آہنی تجوریاں تھیں جن
آگ اثرانداز نہ ہو سکی تھی اور وہ عجیب آڑے ترچھے زاویوں میں ساکت ہو چکی تھیں
مشاہد کسی ٹیلے کے بیچ میں سے چلتا ہوا اُوپر دیکھتا تو اُوپر کوئی نہ کوئی تجوری ایسے نظر
جیسے ڈوبنے سے پیشتر جہاز ترچھا ہو جاتا ہے —— شاہ عالمی کے ملبے میں نمایاں یہ ڈوبتے
اس لیے ابھی تک وہاں تھے کہ اُس زمانے میں اتنی بھاری چیز کو کسی دوسری جگہ
کرنے کے لیے کوئی مشینری موجود نہ تھی۔ اور ان کھنڈروں میں کوئی ریڑھا یا ٹرک د
لے آنا ممکن نہ تھا۔ لوگ نہایت دل جمعی سے ان کھنڈروں میں بیٹھے لوہے کی سلاخو
کھرپیوں کی مدد سے مٹی کو کھودتے رہتے.. یہاں کبھی سُنیارے تھے، سونے والے تھے
کبھی کوئی چُوڑی نکل آتی اور کبھی کوئی جلی ہوئی بندیا —— اور کبھی کوئی جلا ہوا ہاتھ..

یار یہ شکل سے تو کُچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون ہے تو
ہندوؤں کو جا کر چھریاں مارتے ہیں تو یہ کیسے پتہ کرتے ہیں ——

زاہد کالیا جس کا باپ پھیری لگا کر کلیے برتن بیچتا تھا اندرون شہر کا رہنے والا
تیز طرار بچہ تھا اور بہت علم والا تھا اور یقیناً اُسے بہت سے ہاتھ لگ چکے تھے اور مشا
سمجھ میں جو کچھ نہ آتا تھا وہ اُسی سے پوچھتا تھا۔

یہ پتہ ہے کس طرح پتہ کرتے ہیں کہ یہ ہندو یا ہے مسلمان؟

کس طرح؟

اُس کی پُھلو دیکھ کر ——

نہیں یار —— مشاہد شرما گیا۔

ہاں بھائی ہماری پُھلو کٹی ہوتی ہے اور ان کی ویسے کی ویسی ہوتی ہے۔ بے شک چیک کر لو۔ مشاہد کو چیک کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ آگاہ تھا۔ یہ بہت دن پہلے کا وقوعہ نہیں تھا کہ اُسے ابراہیم نائی کے سامنے گھر کی چھت پر دو اینٹوں پر بٹھا کر کہا گیا تھا اور کہنے سے پہلے اُسترے کو ایک خاص زاویے پر معلق کیا گیا تھا اور کہا یہ گیا تھا کہ مشاہد اُوپر دیکھو چیل گدھا اُٹھائے جا رہی ہے —— اور مشاہد بے چارے نے بے اختیار اُوپر دیکھا تھا اور اُسی لمحے نیچے سے کام تمام کر دیا گیا تھا ——

اُسے چیک کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی —— وہ آگاہ تھا۔

شاہ عالمی کو جن جیالوں نے جلایا تھا وہ اِس معجزے پر سر دُھنتے تھے کہ بازار کے عین درمیان میں لال مسجد کو آگ نے چھُوا تک نہیں تھا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ آگ اس مسجد کی دیواروں کو چھُو کر پیچھے ہو گئی تھی.. ویسے شاہ عالمی چوک میں ایک نہایت دیدہ زیب سنہری کلس والا مندر بھی آگ سے بچ گیا تھا لیکن یہ تو کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی...

مشاہد سکول سے واپسی پر شاہ عالمی کے کھنڈروں میں کوہ پیمائی کرتا جب اس مندر کے قریب پہنچتا تو وہاں رُک جاتا.. جلے ہوئے مکانوں اور ایک بے آباد چوک کو اُس مندر کی عمارت ایک توازن دیتی تھی.. وہ دیر تک سر اُٹھائے اُس کے سنہری کلس کو دیکھتا رہتا اور پھر مجرم سا محسوس کرتا اور جھینپ جاتا۔ اس چوک سے ذرا آگے وہ مسجد تھی جسے ایمان کی حرارت والوں نے شب بھر میں بنا ڈالا تھا ——

مسجد اور اُس مندر کے علاوہ رنگ محل چوک سے ذرا پہلے محمود کے ایاز کی قبر کے قریب ایک گلی کا چھوٹا سا حصہ ابھی تک موجود تھا۔ دو چار مکانوں کے ماتھے ابھی تک قائم تھے لیکن ان ماتھوں میں جو دروازے اور کھڑکیاں تھیں اُن میں صرف آسمان تھا.. اُن کے پیچھے کچھ نہ تھا.. جیسے کسی فلم کا سیٹ لگا ہو اور شوٹنگ مکمل ہونے پر ویران ہو گیا ہو۔

بُندو رام اِسی گلی میں ایک ٹوٹی کھٹارا چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا رہتا تھا.. صرف ایک دھوتی میں ملبوس —— اور بُندو رام تم تو ہندو ہو تو پھر ہندوستان کیوں نہیں جاتے... اور وہ اپنے تمباکو کی زردی والے دانتوں کے ساتھ ہنسنے لگتا —— اوئے یہ میرے گھر کا دروازہ ہے میں تو اس کے اندر بھی نہیں جا سکتا ہندوستان کیسے جاؤں —— ذرا دھکیل کر دیکھو. شاباشے۔

اور کوئی بچہ آگے بڑھ کر دروازے کو دھکیلتا تو کہیں سے کوئی اینٹ نیچے آ
اور وہ پیچھے ہٹ جاتا۔

اِس کے پیچھے کچھ نہیں ہے ——ببندو خوش ہو کر کہتا —— پر میں نے راکھی تو
ہے ناں اپنے گھر کی ——

پورے لاہور میں شائد وہ اکیلا ہندو تھا جو اُس گلی میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پی
—— باقی سب جا چکے تھے —— اور اُن کی جگہ لینے کو اُدھر سے لوگ آ چکے تھے۔

اور اُن کی جگہ لینے کو جو لوگ اِدھر آ چکے تھے اُنہیں پناہ گیر کہا جاتا تھا۔

اُن پناہ گیروں کی شکلیں ایسی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا اداکار اُن جیسی ش
بنانے پر قادر نہیں تھا —— ہزاروں برسوں سے کسی گھر میں رہنا۔ آس پاس کے ویرانو
قبروں سے آباد کرنا —— پھر اُن گھروں کو ایک تنکا اُٹھائے بغیر چھوڑنا —— پھر بھوک دُکھ
بیماری اٹھا کر چلتے جانا اور اپنی ماؤں کو —— بیٹیوں کو بھی ننگے بدن دیکھنا، بہت کچھ دیکھنا
کچھ نہ کر سکنا —— بچوں کو کرپانوں میں پروئے دیکھنا اور کچھ نہ کر سکنا —— بھوک
بیچارگی اور موت سے بے شرم ہو جانا... تب جا کر کچھ کچھ ویسی شکل بنتی ہے جو ان
گیروں کی تھی —— یہ تو بنائے نہ بنے ——

یہ پناہ گیر ہر صبح گوالمنڈی میں واقع چوہدری اللہ داد خان کے گھر کی بالکونی تلے
ہو جاتے اور اُوپر دیکھنے لگتے۔ اُن تک خبر پہنچتی تھی کہ اللہ داد کے پاس کرشنا گلی، گو
ارجن نگر اور گاندھی سکوئر میں ہندوؤں اور سکھوں کے مقفل مکانوں کی چابیاں مو
ہیں۔

بالکونی میں چک کے ساتھ لگی آپا جی اُن کو دیکھتیں اور وہیں سے غسل خانے
نہاتے اللہ داد کو آواز دیتیں "میں نے کہا —— وہ آ گئے ہیں۔"

اور چوہدری اللہ داد خان جن کو پانی سے اور نہانے دھونے سے مریضانہ حد
لگاؤ تھا ڈونگا رکھ کر بالٹی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر پر اُنڈیل لیتے اور کہتے "اوہ تیرا
ہو جائے ——"

آپا جی جب بہت غصے میں آتیں تو مشاہد کو چُوڑا، گگڑا اور پناہ گیر کے القابا
سے نوازتیں اور ابا جی اوّل تو ٹھنڈے مزاج میں ہی رہتے اور اگر مجبوراً اُنہیں ناراض
پڑتا تو وہ گھور کر کہتے "اوہ تیرا بھلا ہو جائے ——" وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے تھے۔

اُن کے پاس چابیاں نہیں تھیں —— ایک چھوٹی سی ہتھوڑی تھی جس میں خوبی
تھی کہ وہ ہر قسم اور ہر سائز کے تالے کو کھول سکتی تھی۔ ایک خاص زاویے سے ایک
لکی سی ضرب اور تالے کی زبان باہر آ جاتی اور مُنہ کھل جاتا۔

اللہ داد دی بیگ پائپر ہتھوڑی ہاتھ میں لیے آگے آگے اور ہجوم پناہ گیراں پیچھے
پیچھے —— کرشناں گلی صرف ایک گلی نہ تھی، ریلوے روڈ، بانساں والا بازار اور چیمبرلین روڈ
کے درمیان رہائشی مکانوں، حویلیوں اور گوداموں کا ایک بہت بڑا سینڈوچ تھی جس میں
ر آبادی ہندوؤں کی تھی۔ فسادات کے آغاز میں اُنہوں نے اِس علاقے سے باہر آنے
الے تمام راستوں کو لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے مضبوط دروازوں سے مہر بند کر دیا
ا —— اُنہیں یقین تھا کہ لاہور ہندوستان کا حصہ بنے گا اور وہ اس یقین کے تحت اپنی
توں پر سے آس پاس کی مسلمان آبادی پر وقتاً فوقتاً فائرنگ بھی کرتے رہتے تھے ——
ن لاہور، پاکستان ہوا اور اس لاہور میں کرشناں گلی کا جزیرہ کب تک محفوظ رہتا —— ہندو
بادی اپنے گھر چھوڑنے لگی، وہ رات کی تاریکی میں اپنے آبائی محلے سے نکلتے ایک اور
ن کے ساتھ کہ وہ واپس آئیں گے۔

کرشناں گلی کا پورا علاقہ اب ویران تھا۔ بہت کم لوگ اس کے اندر جاتے تھے۔ ہر
روازے پر تالا دکھائی دیتا۔

اللہ داد اور پناہ گیر جب کرشناں گلی کے اندر پہلا قدم رکھتے تو سب کے سب چُپ
جاتے... اُنہیں ہر دم یہی خدشہ رہتا کہ آہنی دروازے اُن کے پیچھے بند ہو جائیں گے یا
آ جائیں گے اور کہیں گے کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو لیکن ہتھوڑی کی پہلی ضرب سے،
لے تالے کا منہ کھلنے تک یہ سہم رہتا اور پھر اُن سب کو اپنے گھر یاد آ جاتے اور پھر اُن
روں کو دیکھنے لگتے جو اُن کے ہو سکتے تھے۔

رواج یہ تھا اور وہ سب جانتے تھے کہ جب اللہ داد تالا توڑے گا تو پھر پیچھے مڑ کر
م کو ایک نظر دیکھے گا۔ اور اُس ایک نظر میں جان جائے گا کہ اُن میں سے کس نے کیسے
ے دُکھ جھیلے ہیں، کون ہے جو ایک ایسا ہی گھر اُدھر چھوڑ کر آیا ہے اور وہ صرف اُسی کو
ارہ کرتا کہ آگے آ جاؤ یہ گھر تمہارا ہے۔

جتنے بھی جھجک والے تھے جو ہجوم میں ظاہر ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور
ن کے پیچھے بے چارگی اور شرمندگی سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے چلتے تھے اللہ داد

پہلے انہیں آباد کرتا — اور وہ ان گھروں میں ایسے جاتے جیسے بن بلائے مہمان ہو مجبوراً ایک دو راتیں بسر کرنے کے لیے آ گئے ہوں۔

لیکن ایسے بھی تھے جو مکانوں کی آرائش اور بناوٹ دیکھ کر خوفزدہ ہو جا اندر جانے سے انکار کر دیتے۔

اور کچھ اُن میں فاتحین کی طرح داخل ہوتے جیسے وہ اُن کی کھوئی ہوئی جا جس میں وہ واپس آئے ہیں۔

مشاہد کو اجازت تو نہ تھی لیکن وہ بھی اکثر پناہ گیروں میں شامل ہو کر اپ کے پیچھے پیچھے چلا جاتا —

پہلی بار جب وہ ایک ایسے مکان کے اندر گیا تو ٹھٹک گیا۔ باورچی خانے ک میں چند ادھ جلی لکڑیاں تھیں۔ چولہے پر ایک ہانڈی دھری تھی۔ گھڑوں میں پانی تھا کونے میں کوڑے کرکٹ کی ایک چھوٹی سی ڈھیری تھی اور پاس ہی ایک گنجا سا جھا جانے سے پیشتر انہوں نے صحن میں جھاڑو دیا تھا۔ اُس کے مکینوں کی سانسیں ابھی میں تھیں.. اُسے محسوس ہوا جیسے وہ مخل ہوا ہے —

جیسے ہزاروں برس پرانا کسی فرعون کا ایک زیر زمین مقبرہ دریافت ہوتا۔ آسائشوں کے تمام سامان — وہی ہوا جس میں انہوں نے سانس لیے تھے۔ چرا بجھاتے ہوئے دیوار کی کالک پر انگلیوں کے نشان — اُن کے جو ابھی وہاں تھے۔

ایک کارنس پر کروشیے سے بنے ہوئے بہت بھلے لگتے ہوئے نئے نئے غلاف وہ اُن میں سے ایک اٹھا لایا اور آپا جی کو دے دیا۔ انہوں نے اسے ریڈیو کے اوپر شام کو اباجی آئے تو گھر کی سینکڑوں چیزوں میں سے وہ غلاف الگ ہو کر اُن کی نظر آ گیا "یہ کہاں سے آیا ہے؟"

"مشاہد لے کر آیا تھا —"

"مشاہد کہاں سے لائے تھے؟"

"ہندوؤں کے گھر سے جی — اب نہیں لاؤں گا۔"

"تمہیں پتہ ہے کہ یہ لُوٹ مار کا مال ہے —"

"جی —"

"تمہیں پتہ ہے لیکن تمہاری ماں کو نہیں پتہ —"

انہوں نے آپا جی سے کچھ نہیں کہا۔ باورچی خانے سے چمٹا لائے اور کروشیے کے غلاف کو اُس کے ساتھ پکڑ کر اُس چولہے میں ڈال دیا جس پر آلو گوشت کی ہنڈیا بڑبڑا رہی تھی۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پناہ گیر دلیر ہوتے گئے اور انہوں نے تالے خود ہی توڑنے شروع کر دیئے.... ایک باباجی اپنی دو تباہ حال بیٹیوں سمیت ایک مکان میں گئے.... شام کو اُن کی بیٹیوں نے نہایت چمچماتے ہوئے زرق برق لباس پہن رکھے تھے اور خوب لپ سٹک لگا رکھی تھی — باباجی ایک شاندار حقہ پی رہے تھے اور مسلسل کھانستے تھے۔ اللہ داد نے حال پوچھا تو باباجی کہنے لگے، بس بیٹا اس لیے کھانسی آ رہی ہے کہ تمباکو پینے کی عادت نہیں ہے۔

اللہ داد حیران ہوئے کہ پھر پیتے کیوں ہو؟

باباجی نے مکان کے اندر اشارہ کر کے کہا، اس کے اندر دو کمرے چھتوں تک تمباکو سے بھرے ہوئے نکل آئے ہیں۔ اب پینا شروع کروں گا تو کہیں جا کر ختم ہو گا۔

ایک بڑی بی کے گھر میں فلش سسٹم جو ابھی اُن زمانوں میں کم کم تھا، بر آمد ہو گیا۔ انہوں نے بے دھیانی میں زنجیر پکڑ لی اور جب ایک شور شرابے سے پانی آیا تو گھبرا کر گلی میں آ گئیں کہ "ادھر چینی کی ہانڈی میں سیلاب آوے ہے۔"

کچھ ایسے تھے جو گھروں میں مجرموں کی طرح بیٹھتے تھے۔ کسی شے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے... وہ بھی اس یقین سے آئے تھے کہ واپس جائیں گے۔ وہ ایسے ہی بھرے پُرے گھر چھوڑ کر آئے تھے... اور اب ان گھروں میں داخل ہو کر اُن میں بے یقینی کا دکھ آیا تھا۔

چند ہفتوں میں ایک بھی مقفل گھر باقی نہ بچا۔ بلند آواز سے آہ و زاری کرنے والے اکثر ایک گھر سے دوسرے گھر میں — اور دوسرے میں سے سب کچھ سمیٹ کر تیسرے گھر میں منتقل ہوتے جاتے اور پیچھے رہنے والے جو خاموش رہتے تھے اُن کے حصے میں فٹ پاتھ آئے تھے۔

اکتوبر کے آغاز میں ہوا یکدم سرد ہو گئی۔

والٹن کیمپ اور لاہور سٹیشن کے اردگرد لاکھوں لوگ بے سروساماں پڑے تھے..

اللہ داد اب اُنہی پناہ گیروں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے کہ آپ کے پاس تو ہے... کوئی کمبل، کوئی رضائی تلائی — کوئی کھیس اُن کے لیے جو ننگے آسمان تلے ہیں۔
ہاں اب پناہ گیروں کو مہاجرین کہا جانے لگا تھا۔

کریدتے کریدتے کچھ بھی نکل سکتا تھا۔

یہ شاہ عالمی کے ماضی کے ساتھ 'لکن میٹی' کھیلنے کے مترادف تھا۔

وہاں حویلیوں، مندروں اور تاریک گلیوں بازاروں کی بجائے سرما کے آ دھوپ میں تاحد نظر کھنڈر تھے۔ چھوٹے بڑے ٹیلے — جل کر تباہ ہونے والی عمارت حجم کے مطابق.... اگر ایک حویلی تھی تو اُس کا کھنڈر بلند اور اگر کسی غریب کی کٹیا او عالمی میں صرف دولت والے ہی نہیں عام لوگ بھی رہتے تھے اور غریب کی کٹیا کا چھ ٹیلا — اگر اس منظر کو فضا سے دیکھا جاتا تو یہ کچھ کچھ ہیروشیما کا حصہ لگتا — لیکن بقیہ حصہ کسی حد تک سلامت تھا.. صرف شاہ عالمی کا نشان مٹا تھا۔

ان کھنڈروں میں ایک گلی کا ماتھا تھا جس میں مُبندو رام کی چارپائی اور حقہ تھا۔
لال مسجد اور اس کی بلند سیڑھیاں تھیں اور اس کے آس پاس ویرانی تھی۔

یا پھر بانساں والے بازار والے چوک میں سُنہری کلس والا مندر تھا۔

یا پھر ٹیلے تھے جن میں سے کرسمس آئی لینڈ کے دیو پیکر پتھریلے اجسام کی آہنی تجوریاں دور سے نظر آتی تھیں۔

ان ٹیلوں کو کُریدتے کُریدتے کچھ بھی نکل سکتا تھا۔

مشاہد نہایت احتیاط سے اُنہیں کریدتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ گھر پہنچنے پر آپا ج کے ناخن چیک کریں گی اور اُن میں پھنسی ہوئی نیم سیاہ مٹی سے اندازہ لگالیں گی کہ و بھی شاہ عالمی کے ملبے میں سے چیزیں تلاش کرتا رہا ہے اور اُن کے لیے بھی اس کر معیوب بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ اُن کا بیٹا "لوٹ مار" کی چیزیں تلاش رہے — پناہ گیروں اور گگڑوں کی طرح..

چنانچہ وہ احتیاط کرتا تھا —

یہ ناممکن تھا کہ کوئی بھی بچہ مشن سکول سے باہر آکر سیدھا گھر چلا جائے۔ ش کے ٹیلے اُن کے لیے ٹریژر آئی لینڈ تھے۔ وہ اس آئی لینڈ میں خزانے تلاش کرنے بیٹھ

ت اور زمانے سے غافل ہو جاتے۔

نکلتا بہت کچھ تھا لیکن ایسا کم نکلتا جو رکھنے سنبھالنے کے لائق ہوتا۔ پیتل کی پچکی ی گڈویاں، بہی کھاتوں کے جلے ہوئے گتے، دیئے، مٹی کے ٹوٹے ہوئے بت اور ایسا ت کچھ جس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا ہے۔

ایک چھوٹا سا ڈھیر ایسی چیزوں کا مشاہد کے ساتھ بڑا ہوتا جاتا تھا — اور پھر مٹی میں ب ذرہ لشکا۔ مشاہد نے اُس کے آس پاس کی مٹی پرے کی تو وہاں ایک سنہری کنگن کی لائی کا کچھ حصہ تھا۔ اُس کے ماتھے پر بے پناہ پسینہ پھوٹا — یہ اُس کا پہلا خزانہ تھا۔

مشاہد خوشی سے بے دھیان ٹھوکریں کھاتا ہوا ٹیلے سے نیچے اُترا اور آس پاس ت غور سے دیکھنے کے بعد کہ کسی نے اُسے دیکھا تو نہیں اُس نے کنگن کو جیب سے نکال اپنی آنکھوں کے سامنے کیا — اصل مسئلہ اِسے چھپا کر رکھنا اور راز رکھنا تھا۔ وہ لوٹ کے مال کے بارے میں اپنے اباجی کے جذبات سے آگاہ تھا۔ اُس نے کنگن کو جیب میں ا کر اپنی ہتھیلی اُس پر رکھی، کنگن کی گولائی اُس کی ہتھیلی میں بریل کی عبارت کی طرح ا ہوئی۔

سامنے مُبندو رام کی گلی تھی۔ کسی فلم کا ٹوٹا ہوا سیٹ، کھلے کواڑ، کھڑکیاں اور روشن ا جن میں آسمان اور مٹی کے ڈھیر۔ آج یہ گلی زیادہ ویران تھی۔ سکول کے بچے ادھر ہو کر جا چکے تھے اور مشاہد ٹیلے پر بیٹھا وقت سے لاپرواہ ہوا تھا اور اُسے دیر ہو چکی مُبندو رام اپنے حقے پر جھکا بیٹھا تھا اور اُس کی چٹیا کے سفید بال ہوا میں اُٹھتے تھے۔ کیا ا کی چُٹیا کھینچی جائے یا اِس سے پوچھا جائے کہ مُبندو رام تم ہندو ہو تو ہندوستان کیوں ا جاتے۔

اِس کی چُٹیا کھینچی جائے۔

وہ گلی کے ساتھ لگ کر اُس کی نظر سے بچ کر چارپائی کے پیچھے گیا۔ بندو رام کی ن کے پیچھے، کندھوں کے درمیان میں بوڑھی پشت میں ایک سبزی کاٹنے والی سستی ری کا دستہ پیوست تھا۔ چھری کے پھل کا تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا تھا اور اُس پر سیاہ ڑھی سی سرخی تھی اور اُس کی چوٹی کے سفید بال ہوا میں اُٹھتے تھے۔

"اوہ تیرا بھلا ہو جائے —" اللہ داد نے اپنے بیٹے کی سُوجی ہوئی آنکھوں اور گرد

ے اپنے چہرے پر آنسوؤں کی گذرگاہوں کو دیکھا اور تشویش سے دیکھا "بھلا یہ
ہے —"

چوہدری اللہ داد ایک سیلف میڈ شخص تھا۔ اور اس کے باوجود وہ دھیما
طبیعت کا تھا.... وہ دراز قد ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تھا اور اُس کے جا
کھانس کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے اور پھر سلام کرتے — ورنہ وہ پاس سے گ
— اُس کی نرم دلی اُس کی بیوی کے لیے ایک آزار تھی۔ اگر اُس نے سٹیشن
فٹ پاتھ پر کسی بوڑھے کو لیٹا ہوا دیکھ لیا ہے تو وہ اذیت میں مبتلا ہو جائے گا۔
بوڑھے نے کھانا کھایا ہے؟ پتہ نہیں رات گذارنے کے لیے اُس کے پاس کوئی گرم
یا نہیں؟ کہیں وہ بیمار تو نہیں — وہ بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہتا اور اُس کی بیوی
کہ آج پھر کوئی بوڑھا ہے، کوئی بچہ ہے کوئی معذور ہے جو اسے سونے نہیں د
آواز دے کر اُسے متوجہ کرتی "میں نے کہا آپ اُٹھیں اور پتہ کر آئیں" کیونکہ
جانتی تھی کہ جب تک وہ جا کر پتہ نہیں کرے گا اُس کی تسلی نہیں ہو گی۔ اگر
آرام سے ہے تو وہ سرہلاتا آئے گا اور فوراً سو جائے گا..... اُس نے اپنے لیے کچھ
تھا، ایک اچھی ملازمت کے باوجود کوئی جائداد نہیں بنائی تھی.. اُس کی جیب میں
دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اُس کی بیوی اگر دھیان نہ رکھتی تو گھریلو استعمال کی اشیاء
میں غائب ہو جاتیں —

جو لوگ اپنے زورِ بازو سے شدید جدوجہد کے بعد اپنے طبقے سے نکلتے ہیں
مقام حاصل کرتے ہیں وہ عام طور پر انسانی ہمدردی سے دور ہو جاتے ہیں۔ بہت
کے اور بدلہ لینے والے ہو جاتے ہیں۔ اگر معاشرے نے اُن کے ساتھ کوئی رعایت
تو وہ اب معاشرے کے ساتھ کوئی رعایت کیوں کریں — ایسے لوگ اپنے بچوں
زندگی سے بھی حسد کرتے ہیں — میں جب چھوٹا تھا تو دس میل پیدل چل کر
تھا — میں جب چھوٹا تھا تو میرے پاس جوتے نہیں ہوتے تھے، میں چٹنی کے سا
کھاتا تھا — اور میں جب چھوٹا تھا تو... وہ اپنی اولاد کو بھی آسائش میں نہیں دیکھ
وہ ہمہ وقت بدلہ لینے کی فکر میں ہوتے ہیں، اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر ثابت
فکر میں ہوتے ہیں اور — یوں بطور انسان ضائع ہو جاتے ہیں — اللہ داد نے
پہنچنے کے لیے بہت مشقت کی تھی، بہت ناروا دُکھ سہے تھے اور فاقے کیے تھے

میں کہیں وہ کسی پارس سے کسی خیال سے چھُو گیا تھا اور نرم ہو گیا تھا — عجیب بات یہ
تھی کہ اُس کے ذہن میں گناہ اور ثواب کا کوئی مذہبی تصور موجود نہ تھا۔ وہ اپنے ثوابوں کو
اُنگلیوں پر گن کر جنت میں اپنے درجوں کا حساب نہیں لگاتا تھا —

"اوہ تیرا بھلا ہو جائے —" اُنہوں نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

"ابّا جی آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ جس چیز کی سمجھ نہ آئے وہ پوچھ لیا کرو — تو یہ
میری سمجھ میں نہیں آرہا — سب کہتے ہیں کہ بُندو رام ہندو تھا وہ دوزخ میں جائے گا
— پر ابّا جی وہ تو گلی میں بیٹھ کر حقہ پیتا تھا اُس نے کبھی کسی کو کچھ نہیں کہا تو وہ کیوں دوزخ
میں جائے گا —"

"بیٹے کیا پتہ کیا ہونا ہے —"

"اور ابّا جی وہ شاہ جی جو تھانیدار تھے — وہ روزہ رکھ کر لُوٹ مار کروا رہے تھے ابّا
جی... وہ... سب لوگ کہتے ہیں وہ جنت میں جائیں گے — کیوں؟"

"سب لوگ جو کہتے ہیں وہ ہمیشہ سچ نہیں ہوتا۔"

"اور ابّا جی ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ سب کے سب کافر جہنم میں جل
جائیں گے تو میں نے پوچھا کہ یہ جو پتہ نہیں کتنے ارب چینی ہیں تو یہ بھی سارے کے
سارے جہنم میں جائیں گے تو مولوی صاحب نے کہا، بالکل — تو میں نے کہا مولوی
صاحب اتنے سارے چینیوں نے کیا قصور کیا ہے — یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب جہنم
میں ڈال دیئے جائیں — جہنم میں تو اتنی جگہ نہیں ہو گی.. اس پر ابا جی پتہ ہے مولوی
صاحب نے مجھے کیا کہا؟ اُنہوں نے چار بید مارے اور کہنے لگے تو خبیث ہے... ابا جی یہ
خبیث کیا ہوتا ہے؟"

چوہدری اللہ داد نے بیٹے کے گال تھپکے اور خوش ہو کر کہا "اوہ تیرا بھلا ہو جائے"

نواڑی پلنگ کے رانگلے پایوں کے درمیان بچی سفید نواڑ پر وہ دونوں کچھ کھسکتے تھے
...ران رکابیوں کو بمشکل سنبھالتے تھے جو ایک ٹھکیے ہوئے دسترخوان پر ڈولتی تھیں۔ اُنہیں
...ل ڈھیلی نواڑ والے پلنگ پر بیٹھنے کا بلکہ بیٹھ کر اپنے آپ کو کھسکنے سے بچانے کا کوئی تجربہ
تھا — اور اس دوران اُنہیں موٹی تنوری روٹی سے نوالہ توڑ کر رکابی میں سے پیاز اور
...وں کے سالن کو انگوٹھے کی مدد سے نوالے کے ساتھ لگا کر منہ تک لے جانا تھا۔

مشاہد نے پہلا نوالا منہ میں ڈالا اور دو چار بار منہ چلانے کے بعد رُک گیا۔
نے مردان کی طرف دیکھا — اُس کے منہ اور ٹھوڑی پر گھی کی چربیلی چمک تھی او
ہلاتا ہوا روٹی اور سالن سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

چاچی رابیاں کا جھالروں والی پنکھی والا ہاتھ آہستہ ہوا اور پھر رُک گ
صدقے، کھاتے کیوں نہیں؟"

"چاچی جی — وہ —"

"ہماری زمین نہیں ہے بیلے کے منہ کے قریب — ادھر جو کھیت ہے
کنک کی روٹی ہے پُتر... ایسا زور ہے اُس زمین کے ٹوٹے میں کہ ہم تو سُوکھی کھا
گھیو والی کا سواد آ جاتا ہے — سالن میں جو گھیو ڈالا ہے وہ بھی اُس بھینس کا ہے
سینگ کمانیں بناتے ہوئے گلے کے نیچے آ کر ملتے ہیں — اور آنڈے بھی گھر کے
— کھاتا کیوں نہیں؟"

"اِس میں — چاچی مجھے اس میں سے بُو آتی ہے —"

"مجھے پتہ ہے تمہیں کس شے کی بُو آتی ہے، مجھے پتہ ہے۔" چاچی ہن
ہوئی اور پھر بہت ہنسی "تمہیں دراصل دیسی گھیو کی مُشک آتی ہے — شہریئے جو
ماں رَجھ گئی بُو کی تو منہ میں ڈالو آپو آپ گلے سے اُترتی جائے گی — شاباشے کھاؤ
مشاہد کا جبڑا ہلنے لگا — لیکن بُو موجود تھی — سڑاند تھی — جیسے چٹیل
میں کوئی مُردار تیز دُھوپ میں پڑا ہو۔

وہ اسے نگل نہیں سکتا تھا۔

چھوٹا مردان سر ہلاتا پچاکے مارتا مزے سے کھانا کھا رہا تھا۔

آپا جی کی لاہور سے یہاں تک کے سفر کی تھکاوٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھ
سر کو دوپٹے سے باندھے کنک کے بھڑولوں والی نیم تاریک کوٹھڑی میں ایک
چارپائی پر لیٹی زور زور سے خراٹے لے رہی تھیں۔ مستقبل کی دونوں "باجیاں"
دائیں بائیں اُن کے جُثّے سے لپٹی سو رہی تھیں۔

اباجی انہیں گاؤں چھوڑ کر واپس لاہور جا چکے تھے۔

لاہور مختلف افواہوں کی زد میں تھا —

گورکھا فوج شہر کے مختلف حصوں میں طاقتور بم چھپا کر گئی ہے جو کسی خا

سارے کے سارے چل جائیں گے اور پورا لاہور شاہ عالمی کے ملبے کی طرح ہو جائے گا۔

نہرو کو لاہور کا بڑا غم ہے اور وہ سکھوں کی مدد سے اس پر حملہ کر دے گا —

پناہ گیر طرح طرح کی بیماریاں لے کر آئے ہیں اور طاعون پھیلنے والی ہے۔

چوہدری اللہ داد کا ذہن ان افواہوں کو قبول نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنے بال بچوں
کی جانب دیکھتا تو بے چین سا محسوس کرتا — انہیں کسی محفوظ جگہ پر ہونا چاہئے — اپنے
گاؤں میں — اپنے کچے آبائی مکان میں۔ ٹھیک ہے انہیں عادت نہیں ہے لیکن چند روز
گذارہ کر لیں گے — یوں بھی اُن کی غیر موجودگی میں وہ دلجمعی سے رفیوجی کیمپوں میں
اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا تھا۔

گاؤں جانے کے لیے ایک خاص منصوبہ بندی کرنی پڑتی تھی — گجرات تک کے
لیے ٹرین کے ٹکٹوں کا حصول، ستارہ کوٹ کے خیردین تانگے والے کو پیشگی اطلاع کہ فلاں
تاریخ کو چوہدری صاحب کا خاندان صبح سویرے ریلوے سٹیشن کے باہر تمہارا انتظار کرے
گا۔ گاؤں کے رشتے داروں کو اطلاع کہ گھر کی صفائی کروا دیں اور چُولہے اور بستروں کا
بندوبست کر دیں اور لالٹین کے شیشے بھی چمکا دیں۔

وہ فجر کے فوراً بعد لاہور سے نکلتے اور ابھی سردیوں کی صبح میں دُھند گجرات کے
سٹیشن پر ٹھہری ہوتی کہ اُن کی ٹرین بھاری لوہے کی گہری گڑگڑاہٹ کے ساتھ شیڈ کے اندر
داخل ہو جاتی...

اس مرتبہ اُن کی ٹرین بہت دیر میں، تقریباً دوپہر کے وقت گجرات پہنچی اور اس کی
ایک وجہ تھی۔

گجرات سے چناب کے کنارے واقع سرسبز اور دریا کی خنکی والے کچے گھروندوں
تک کا تانگے کا سفر ہمیشہ ایڈونچرس ثابت ہوتا۔ راستے میں غنیمت کنجاہی کا قصبہ کنجاہ بھی
آتا اور اُس کی قبر پکی سڑک سے دکھائی دے جاتی۔ سکندر اعظم کے گھوڑے کا مدفن پھالیہ
بھی اسی راہ میں تھا لیکن اصل ایڈونچر بھمبر نالے کی خشک گذرگاہ میں سے خیردین کے
پیلے تانگے اور ناتواں گھوڑے کا خیر خیریت سے گذر جانا ہوتا تھا۔ چوہدری صاحب کا
خاندان بھمبر کی ریت میں سے پاؤں کوشش سے نکال نکال کر چلتے اور دعا کرتے کہ اس
ریت میں زور لگاتے گھوڑے کا "وِدّھر" نہ ٹوٹ جائے۔ اگر یہ وِدّھر ٹوٹ جاتا تو آپا جی
ایک ٹرین کیکر کے نیچے اپنے بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ جاتیں اور پراٹھوں انڈوں والا

دسترخوان کھول کر زمین پر بچھا دیتیں۔ کوئی بھی دیہاتی عورت سر پر بھتہ اُٹھائے آ
میل کے ریڈئس میں سے گذرتی تو آپا جی اُسے "نیں بہن ادھر تو آ —" کی آواز
کر پاس بلاتیں اور پھر اُس کی لسّی کی چاٹی سر سے اُتروا کر سامنے رکھتیں اور اطمینان
بچوں کو پلانے لگتیں... چاٹی خالی ہوتی تو آپا جی اپنے ہاتھوں سے پھر اُس کے سر پر ر
اور کہتیں "لے بہن... تیری مہربانی" — اور ہمیشہ جواب میں اُس عورت نے یہی
— لے مہربانی کس بات کی —

اس دوران خیردین گھوڑے کو تانگے سے الگ کر کے کسی درخت کے
باندھتا اور اُس کے کمزور بدن کے ساتھ بندھی ہوئی زین اور ساز وغیرہ کھول کر کند
ڈالتا اور کسی موچی کی تلاش میں نکل جاتا — تاکہ وڈھر کی مرمت ہو سکے —
جب بھی اس کام کے لیے گیا تو اُس نے یہ جانا کہ شتابی کا کام شیطان کا ہوتا ہے
بہت بجے سے شام تک واپس آتا اور کیکر کے نیچے اونگھتے ہوئے مردان اور مشاہد
دیتا "باؤ جی — گاؤں نہیں چلنا؟"

وہ دریا کی سطح پر سے ٹھنڈی ہونے والی ہوا اور تاروں کی چھاؤں میں گاؤ
اور گھوڑے کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی چھن چھن سے گلیوں میں پھرنے وا
کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ ایک آدھ مرتبہ ضرور بھونکتے۔

پہلے دن کا کھانا چاچی رابیاں کی طرف ہوتا —
نہیں اس کھانے میں ایک سڑاند تھی جیسے مردار دُھوپ میں بُو دیتا ہے —
دھوپ کچھ ڈھلی تو چاچا محمد بخش ان دونوں کو "ہلکی" پر نہلانے کے لیے
جہاں سے درختوں کا جنگل بیلا شروع ہوتا تھا وہیں سے دریا میں سے ایک چھوٹی
نکلتی تھی جو کھیتوں اور کچھ ویران ٹیلوں میں سے گذرتی دو تین میل نیچے جا کر در
شامل ہو جاتی تھی۔ یہ ندی تیز بہت تھی اور چنگے گھبرو جوانوں کے پاؤں بھی اکھاڑ
پانی بھی ڈوبو نہیں تھا صرف کمر تک آتا تھا لیکن اسے عبور کرنے کے لیے بہت
زور درکار ہوتا تھا۔ یہ ندی بہت ٹھنڈی ٹھار تھی اور گرمیوں کی شکر دوپہروں میں
میں ایک ڈبکی لگانے کے بعد بدن کی کپکپی دُور کرنے کے لیے کنارے کی گرم ر
پڑتا تھا —
یہ ہر برس ایک دو بچوں یا کئی بار بڑوں کو بھی بہا لے جاتی اس لیے ا

پاگل کتیا کا نام دیا گیا تھا۔
جو سکھ اور ہندو جو کالیاں چھوڑ کر گئے وہ زندگی کے آخری دموں تک لکھنؤ اور
دہلی ایسے شہروں میں بھی "ہلکی" کی خنکی اور تازگی کو یاد کر کے روتے تھے۔
"ہلکی" کے راستے میں قبریں تھیں۔
مردان چونکہ کھانے کے بعد سو گیا تھا اور اُسے زبردستی جگا کر ساتھ لایا گیا تھا اس
لیے اُس کی آنکھیں ابھی تک سرخ تھیں اور وہ ایک ناگوار شکل بنائے بیزاری سے چلتا
تا۔
اُس نے پیچھے دیکھا اور پھر رُک کر مردان کا انتظار کیا۔ چاچا محمد بخش آگے جا چکا
تا۔
"مردان —" جب وہ قریب آیا تو مشاہد بولا "تمہیں پتہ ہے کہ ہمارے دادا جی
ا قبر ادھر ہے — ان قبروں میں؟"
مردان کو دادا جی کی قبر میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں نیند سے بھری
ئی تھیں۔
"میں بہت چھوٹا تھا جب دادا جی مر گئے تھے —" مشاہد نے بہت بُردباری اور
نش مندی سے سر ہلایا اور اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا جو مشکل سے چلنے کے قابل
ا تھا — اُس کے دیکھنے کی دیر تھی کہ مردان نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے یعنی میں
ک گیا ہوں مجھے اُٹھا لو —
"نہیں ابھی نہیں۔"
مردان نے مُنہ بسورا اور رونے کا بندوبست کرنے لگا۔
"اچھا بابا۔ ادھر آؤ" مشاہد کو اُسے اُٹھانے کے لیے زور لگانا پڑا کیونکہ مردان بہت
ا تازہ اور وزنی بچہ تھا۔ اُٹھانے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو ذرا جُھلایا تاکہ اس وزن
ساتھ سٹارٹ لے سکے اور پھر ہولے ہولے چلنے لگا۔
"ہاں تو — میں بہت چھوٹا تھا جب دادا جی مر گئے تھے —"
اب مردان کو دادا جی کے مرنے کی داستان سننے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔
"ابا جی کو خبر کرنے کے لیے گاؤں سے ایک میراثی گیا تھا۔ اور وہ بہت روئے تھے۔
دادا جی کو اُٹھا کر ادھر لائے تھے تو میں ابا جی کی اُنگلی تھامے اُن کے ساتھ ساتھ چلتا تھا

اور اوپر اُن کی طرف دیکھتا تھا اور وہ روتے تھے۔ اُن کے دوسرے ہاتھ میں چھڑی ٹیک ٹیک کر وہ چلتے تھے۔ تمہیں تو پتہ بھی نہیں ہو گا کیونکہ تم ابھی تھے ہی نہیں پتہ نہیں کہاں تھے —"

چاچا محمد بخش سروٹوں کی چھاؤں میں بیٹھا اُن کا انتظار کر رہا تھا "اوئے اس کو تم نے کیسے اُٹھایا ہوا ہے۔ تم تو خود چھوٹے ہو۔ لاؤ اسے مجھے دے دو۔"

مردان چاچا محمد بخش کے ہاتھوں میں بخوشی منتقل ہو گیا۔

"چاچا جی — ادھر میرے داداجی کی قبر کونسی ہے؟"

"ہیں؟" چاچے کو اس سوال کی توقع نہ تھی۔ "بھائی کی قبر — بس ادھر — شائد وہ ہے جس پر کسی نے مٹی ڈالی ہوئی ہے — میں آیا تھا محرموں میں، م کر گیا تھا پر اب کچھ دماغ کمزور ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہی ہے — ویسے بھائی اللہ پتہ ہے..."

"اُن کو تو پتہ ہو گا۔ اُن کے ابا جی کی جو ہے —"

"شاباشے —" چاچا محمد بخش نے سر ہلایا "دماغ تو بڑا ہو جاتا ہے ناں شہریو کے —"

سورج نیچے ہو چکا تھا اور جہاں جہاں سے "ہلکی" گذرتی تھی وہاں اُس کی ؟ کو روشن ایسے کرتا تھا کہ دیکھنے سے آنکھیں چندھیاتی تھیں۔ چاچے نے پہلے م مضبوطی سے پکڑ کر پانی میں ایک مناسب وقفے کا غوطہ دیا اور جب اُسے باہر نکالا تو و کے لیے پانی بھرے منہ کو کھولے "ہپ ہپ" کرتا تھا۔ اُس کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔

مشاہد کے چہرے پر فکرمندی آئی — اپنے بھائی کے لیے —

"ابھی ٹھیک ہو جائے گا —" چاچے نے اُس کی کمر پر دو چار دھپے رسید

اُس کا سانس چل نکلا۔ اب اُسے سردی لگنے لگی۔

"چل تجھے بھی ایک غوطہ لگواؤں؟"

"نہیں جی — چاچا جی آپ میرا ہاتھ پکڑیں میں خود لگاتا ہوں جی —"

وہ چاچے کا ہاتھ تھامے پانی میں اُترا اور اُس کی ٹھنڈک اور تازگی نے اُ اُسکے بدن کو خوش کر دیا۔ صرف چند لمحوں میں پانی کی یہ ٹھنڈک ناقابل برداشت اور وہ باہر آکر ریت پر بیٹھ گیا —

یہاں بھی ایک بُو تھی۔ سڑاند تھی۔ شائد آس پاس کوئی جانور مرا پڑا تھا۔ وہاں بھی یہی بُو تھی — وہاں کاموں کی سٹیشن پر —

اُن کی ٹرین لاہور سے چلی تو بہت دیر سے گجرات پہنچی تھی — اور اس کی ایک وجہ تھی۔

ٹرین رُک گئی۔

"کونسا سٹیشن ہے؟" آپا جی نے پوچھا تھا۔

ابا جی اپنے اخبار میں مگن تھے، انہوں نے سر اُٹھا کر "پتہ نہیں" کہا اور پھر سر جھکا لیا۔

"پتہ نہیں تو پتہ کریں ناں —" آپا جی نے ذرا سخت لہجے میں کہا کیونکہ وہ ابا جی کو خاصا لاپرواہ سمجھتی تھیں۔

ابا جی نے اُن کے لہجے کی سختی کا بُرا نہیں مانا اور اخبار سمیٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے "میرا خیال ہے کاموں کی ہے — پر ادھر تو سٹاپ نہیں ہے، رُک کیوں گئی ہے — شائد کراس ہے" وہ پھر اخبار پر جھکنے کو تھے کہ آپا جی ذرا اور سخت لہجے میں آ گئیں "شائد کراس ہے — نیچے اُتر کر پتہ نہیں کرتے گارڈ سے کہ کیا معاملہ ہے — ٹرینوں کے حالات جانتے ہو ناں کیا ہو رہا ہے آج کل — اور بچے ساتھ ہیں۔"

ابا جی نے آپا جی کی طرف دیکھا تو وہ اُنہیں گھور رہی تھیں۔ اُنہوں نے اخبار مشاہد کو تھمایا اور نیچے اُتر گئے۔ ٹرین پلیٹ فارم سے باہر کھڑی تھی اس لیے اُنہیں اترنے میں کافی دقت ہوئی۔ ڈبے میں اُن کے علاوہ صرف دو عورتیں تھیں جو اپنی چادروں کو ٹھوڑی تک کھینچ کر چُپ بیٹھی تھیں۔ آپا جی سیاہ برقعے میں تھیں۔

ابا جی واپس آئے تو ان کا رنگ نچڑا ہوا تھا۔

"کراس ہے؟"

"ہاں —" اُنہوں نے عجیب سی آواز میں جواب دیا اور پھر اخبار کھول لیا۔

ف مشاہد نے دیکھا کہ اخبار پر اُن کی اُنگلیاں گرفت نہیں کر رہی تھیں اور لرزتی ں۔

تھوڑی دیر بعد ڈبے آپس میں بھڑے اور ٹرین حرکت میں آ گئی۔ ابا جی اخبار پر یں جمائے بیٹھے رہے۔ وہ سب کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگے۔

"باہر مت دیکھو۔" ابا جی کی ایسی غصیلی اور گرجدار آواز اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

"کیوں پر —؟" آپا جی نے پوچھا۔

"کیونکہ میں کہتا ہوں —"

آپا جی بھی ڈر گئیں اور کھڑکی سے منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔

ٹرین بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی —

مشاہد نے چوری چھپے باہر دیکھا۔ ٹرین کامونکی کے پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ لیکن وہاں ایک اور ٹرین بھی تھی جو کھڑی تھی۔

آٹھ سالہ برکت یا بکو جب کامونکی کے سب سے غلیظ اور گہرے جوہڑ میں ایک ڈبکی لگا کر باہر آیا تو اُس کے سیاہ بدن پر جوہڑ کی تہہ کی تمام تر غلاظت اور گارے کا رواں نیم سیاہ لیپ تھا۔ وہ چُوڑا ہونے کی وجہ سے یوں بھی کالا شاہ تھا لیکن گارے کے غلیظ لیپ نے اُس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اُس کے نتھنوں کانوں اور منہ سے گندگی ایسے دھیرے دھیرے باہر آ رہی تھی جیسے اس کی رگوں میں خون کی بجائے کامونکی کے جوہڑوں کا گارا گردش کرتا ہے۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر دیا جس میں کا ایک کٹورا تھا اور اس میں سے بھی گارا گر رہا تھا۔

"ہاہائے پلیت کر دیا ہے ناں —" ماسی بہشت بی بی آگے آئی اور اس نے کے ایک ٹکڑے سے اُس کٹورے کو پکڑ لیا۔ "بکو ذرا پاک ہو کر شام کو آنا ہمارے میں تمہیں دو روٹیاں دوں گی۔"

برکت مسیح عرف بکو کو "بکو ساہ پکا" بھی کہا جاتا تھا کیونکہ پانی کے نیچے دیر تک کے لیے اُس کا سانس بہت مضبوط تھا۔ وہ اپنے ماں باپ اور لاتعداد بہن بھائیوں کامونکی کی عیسائیوں کی ٹھٹی میں رہتا تھا۔ وہ اگر ایک ہفتہ بھی اپنے کچے کوٹھے سے رہتا تو اُس کی بے بے کو قطعی طور پر علم نہ ہوتا کہ اس کے بچوں میں سے ایک ہے۔ سب بچے اپنی اپنی روٹی کے خود ذمہ دار تھے۔ بکو کو اس کا پکا سانس روٹی بڑے جوہڑ کے اردگرد جو مکان تھے اُن کے مکینوں کو اس کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اکثر جوہڑ میں گھر کی چیزیں پھینک دیتے۔ کبھی کوئی برتن، کھیتی باڑی کا کوئی اوزار

ہوا سے کوٹھوں پر سوکھتے کپڑے بھی اُڑ کر جوہڑ میں چلے جاتے... ایک مرتبہ جوہڑ کے کنارے کپڑے دھوتے ہوئے چاچی مہراں نے گرمی کی شدت سے مجبور ہو کر ذرا آگے ہو کر ایک ڈبکی لگائی تو اُس کی بالی پانی میں گر گئی — اسے بھی بکو نے تلاش کیا اور چاچی مہراں نے اسے انعام کے طور پر ایک پُرانا کھیس دیا تھا۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا تھا جب کامونکی میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کی نظریں اُس پر نہ تھیں اور وہ سب اُس کی جانب بڑی آس اُمید کے ساتھ دیکھتے تھے۔ ایک آٹھ سالہ چُوڑے ننگ دھڑنگ کالے سیاہ بچے کے لیے اس سے بڑا لمحہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ پورا قصبہ اُس کی طرف دیکھتا ہو اور امید بھری نظروں سے دیکھتا ہو۔ بارشوں کے مہینوں میں جوہڑ کا پانی گلیوں کے اندر تک آ جاتا تھا۔ قصبے کے بچے دو تین شہتیروں کو باندھ کر ایک تختہ بنا لیتے اور اُسے جوہڑ میں دھکیل کر چھلانگیں لگاتے ہوئے اُس پر سوار ہو جاتے۔ تختہ اپنی من مرضی سے جوہڑ میں تیرتا رہتا اور بچے اُس پر اُدھم مچاتے رہتے۔ ایک روز اُن کے ہمراہ بابو بھی تھی — ایک نوجوان ہوتی بھرے بدن کی سفید رنگت اور سوہنے نین نقش کی لڑکی — وہ اپنے چاچے کے لیے لسی لے کر جا رہی تھی جب بچوں نے اُسے روک کر تختے پر "ہُوٹا" لینے کو کہا۔ وہ ڈرتی ڈرتی تختے پر چڑھ گئی — تختہ ہوا کے زور سے ڈولتا جوہڑ کے درمیان تک چلا گیا۔ اور پھر کوئی نہیں جانتا کہ کیسے اُلٹ گیا... سب بچے خوشی سے شور مچاتے تیرتے ہوئے کنارے تک آ گئے لیکن بابو غائب تھی — وہ تختہ اُلٹتے ہی نیچے گئی اور جب اُس نے ہاتھ پاؤں چلائے تو وہ جوہڑ کی تہہ میں گارے کی دلدل میں پھنس چکی تھی۔

آس پاس کے دیہات سے بہت تیراک آئے لیکن جوہڑ کے گاڑھے اور غلیظ پانی میں ڈبکی لگاتے ہی اُن کا سانس ختم ہو جاتا۔ صرف ایک تیراک نے باہر آ کر بتایا کہ بابو نیچے گارے میں موجود ہے — اُس نے اُس کا ایک بازو دیکھا تھا۔

تب کسی نے بکو کا نام لیا۔ وہ بہت چھوٹا تھا لیکن اُس کا سانس بہت پکا تھا — بکو نیچے گیا — اتنی دیر نیچے رہا کہ لوگ اُسے نکالنے کے لیے بھی تیاری کرنے لگے۔ وہ باہر آیا تو اُس سے پہلے جوہڑ کی سطح پر گارے کا ایک ڈھیر اُبھرا جس میں سے سفید بازو اور ٹانگیں دکھائی دیتے تھے۔ بابو کے والدین نے اُسے دو ٹوپے کنک اور ایک ٹوپہ گڑ دیا جو گھر پہنچتے ہی اُس کی ماں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

آج جوہڑ سے باہر اچھو ترکھان کا بیٹا چراغ دین اُس کا منتظر تھا۔

"تم سے ایک کام ہے بکّو —"

"ہاں جی — آہو جی — بتائیں جی —" اُس نے بڑے اہتمام سے
اور ناک سے گارا پونچھا اور پھر جوہڑ کے پانی کے کچھ چھینٹے اپنے بدن پر ڈال کر ا
ہوئی تمتی سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا۔

"تمہارا ساہ کتنا پکّا ہے؟"

"واہ واہ پکّا ہے جی — چھپڑ میں کچھ گرا ہے جی؟"

"نہیں —"

اس "نہیں" نے بکو کو لاجواب کر دیا۔ بھلا جوہڑ کے علاوہ اس کا پکا سانس کہا
آ سکتا تھا۔

"تمہیں ٹیشن پر لے کے جانا ہے تھوڑی دیر کے لیے —"

"ٹیشن پر جی —"

"ہاں —"

"پر ٹیشن پر تو جی —"

"اسی لیے تو لے کر جانا ہے — دیکھتے ہیں تمہارا ساہ کتنی دیر چلتا ہے —"

ٹیشن پر — کاموکی سٹیشن پر دو روز پیشتر ایک ٹرین روکی گئی تھی — اس
میں اپنے گھر چھوڑ کر جانے والے تھے۔ اور گھروں میں بوڑھے، بچے، جوان — عو
اور مرد سبھی ہوتے ہیں اس ٹرین میں بھی تھے —

لیکن وہ اب نہیں تھے۔

اب پچھلے دو روز سے وہ ٹرین ویران پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اُس میں بوڑ
بچے، جوان — عورتیں اور مرد سبھی گلتے سڑتے بدبو دے رہے تھے اور تیز دھوپ
کچھ جو پلیٹ فارم پر پڑے تھے وہ عجیب مزاحیہ زاویوں میں اکڑے ہوئے تھے —
کب کا خشک ہو چکا تھا —

لاشوں کی سڑاند پلیٹ فارم سے اُٹھ کر قصبے کے گھروں کے اندر تک جاتی تھی۔

"ہاں جی — بتائیں جی" سٹیشن جب نظر آیا تو بکو نے چراغ دین سے کہا جو نا
کے اُوپر پگڑی کا پلو ڈالے اُبکائیاں روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک مریل سا کتا اپنے وزن سے کہیں زیادہ کی کوئی شے گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا اور ا

شے کا ایک چھوٹا سا سر اور دو خون آلود آنکھیں بھی تھیں۔

"بکو — پلیٹ فارم پر جہاں بتی گودام کی کیبن ہے ناں؟ — جس کے ساتھ پانی
کے مٹ ہوتے تھے — وہاں — وہاں ایک موٹی ہندنی مائی کی لاش ہے۔ اُس نے ایک
بے گھیر کا سرخ گھگھرا پہنا ہوا ہے — تو جا اور جا کر کسی نہ کسی طرح وہ سرخ گھگھرا
اُتار کر لے آ —"

"نہ جی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اوئے وہ تو مری ہوئی ہے — ڈر کس بات سے لگتا ہے —"

"وہ اُٹھ کر مجھے کھا جائے گی جی — کیا پتہ وہ مری نہ ہو۔"

چراغ دین نے پگڑی کا پلو اپنے منہ سے ہٹایا اور ہنسنے لگا۔ فوری طور پر ہی شدید
بُو نے اُسے یہ پلو پھر سے ناک اور منہ پر رکھنے پر مجبور کر دیا۔ "مری نہ ہو؟ — سب
رے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے ایک ایک کو بڑے آرام سے قتل کیا تھا — جنہوں نے
اگنے کی کوشش کی اُن کو اُنہوں نے پلیٹ فارم پر یا پرے لائنوں پر جا پکڑا — یہ موٹی مائی
ا بھاگ نکلی تھی اسی لیے بتی گودام کے پاس پڑی ہوئی ہے — جا شاباشے۔"

اس نے پہلی بار پلیٹ فارم سے پرے لاہور والے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ وہاں
ے اور ٹرین رُکی ہوئی تھی۔ لیکن اُس میں لوگ تھے اور زندہ تھے۔ بہت عجب بات ہے
۔ دونوں ٹرینوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں ویرانی ہے اور کوئی نظر نہیں آتا اور اس
، باوجود لاہور سے آنے والی ٹرین مردہ نہیں لگتی — اور یہ ٹرین بغیر انجن کے جیسے سر
، بغیر ایک لاش... یہ زندہ نہیں لگتی —

"جا بھی بکو — وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"پر — تم آپ لے آؤ جی مجھے ڈر لگتا ہے۔" بکو ایک ڈراکل بچہ نہیں تھا لیکن
ان پلیٹ فارم پر پڑی ایک لاش کے پاس جانے سے جھجکتا تھا۔

"میں لا سکتا تو تمہیں ترلے کر کے ساتھ کیوں لاتا — اُدھر بہت بُو ہے۔ سڑاند
.... میں نے آج سویرے کوشش کی تھی لیکن مجھے اُلٹی آ گئی — تیرا سانس پکا ہے
تو سانس روک کر جا جیسے جوہڑ کی تہہ میں جاتا ہے اور گھگھرا اُتار لا — تجھے سو روپیہ
ا گا —"

"سو روپیہ؟" بکو کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں "میں ابھی گیا جی اور ابھی

آیا...“ اُس نے عادت کے مطابق اپنی تمتی اتار کر کندھے پر رکھی۔ ایک گہرا سانس پلیٹ فارم کا رُخ کر لیا۔

لاہور سے آنے والی ٹرین بہت آہستگی سے کاموکی کے پلیٹ فارم میں دا رہی تھی۔ مشاہد نے چوری چھپے دیکھا، وہاں ایک اور ٹرین بھی تھی جو کھڑی دروازوں اور کھڑکیوں میں کچھ لوگ تھے جو عجیب انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کھلے تھے اور اکثر کے کپڑے سرخ رنگ کے تھے۔ ان کے بازو کھڑکیوں سے باہر لٹکے تھے اور اسی لمحے ایک شدید سڑاند نے اُن سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جو برداشت ہوتی تھی۔ اُس نے اباجی کی طرف دیکھا جو اُنہیں ’باہر مت دیکھو‘ کا حکم دے کر خ بنے باہر دیکھ رہے تھے اور اُن کی نیلی آنکھوں میں بہت آنسو تھے جو روکنے سے ر تھے۔

باہر، گذرتی ٹرین میں سے اُس نے دیکھا کہ ایک سیاہ ننگ دھڑنگ بچہ کسی سارے سرخ رنگ کے بھاری کپڑے کو پلیٹ فارم پر گھسیٹتا چلا جا رہا ہے —

اُن کے سروں پر سے مرغابیوں کی ایک ڈار نیچی ہو کر قادر آباد کی طرف ا تھی — سردیوں کے شروع ہونے کے نشان۔

بیلے کے اندر سے ایک آواز اُن تک آئی، جیسے ایک بھینسا... ڈکراتا ہو۔

مشاہد نے ایک مرتبہ پھر چاچے محمد بخش کا ہاتھ پکڑ کر ہلکی میں ڈبکی لگائی اور د نے اس کے بدن کو جو سکھایا تھا اور چنگاریاں سی بھر دی تھیں وہ بجھ گئیں اور ٹھنڈک نے اسے آسودہ کر دیا۔

لیکن وہ بُو یہاں بھی موجود تھی — اِس ہلکی میں، جو چناب سے آ رہی تھ کے پانیوں میں بھی موجود تھی —

عشقے دا اِک پلنگ نواڑی — وے اساں چاننیاں وِچ ڈاہیا...

لکشمی مینشن کے سہ منزلہ فلیٹوں کی لمبی مستطیل چھت پر مشاہد کی کھلی آنکھ جو آسمان تھا —

گرمیوں کے دوران آپاجی نے اُنہیں کبھی فلیٹ کے اندر کمروں میں س دیا۔ بے شک پنکھے لگے ہوئے ہیں پر ہوا تو وُہی رہتی ہے ناں بیٹے.. اور پنکھے کے پر دل

گرم ہو کر جب ساری رات چہرے پر پڑتی ہے تو اُسے جھلسا کر رنگ کالا کر دیتی ہے — ناں بیٹے چھت پر سویا کرو — اتنے سوہنے رنگ ہیں میرے بیٹوں کے — خراب تو نہیں کرنے۔

اور اُن کے بستر ہمیشہ سفید اور شفاف ہوتے۔ آپاجی کے نزدیک رنگ دار بستر اور لباس صرف پناہ گیروں اور گگڑوں کے ہوتے تھے...

اگر رات چاندنی ہوتی تو چادروں اور کھیسوں میں سے تازہ کپاس کی مہک کچھ زیادہ آنے لگتی۔ وہ اپنی تیکھی ناک کو بار بار تازہ دُھلے ہوئے کھدّی کے سفید کھیس کی کھُردری سطح پر رگڑتا اور گہرے سانسوں کے ساتھ کپاس کی خوشبو کو اپنے اندر اُتارتا۔

ابھی لاہور کا آسمان موجود تھا اور اُسے ڈیزل اور بدبو دار گیسوں اور آلودگی نے اوجھل نہیں کیا تھا اور اسی لیے چاندنی کا پھیلاؤ شہر پر جھکے سارے گنبد کو بھرتا تھا اور روشن کرتا تھا۔

رات چنیں دی چاننی تے پُونی ورگاں کاں —

میاں محمد نے وہ کیسی چاندنی دیکھی ہو گی جس میں ایک کوّا داخل ہوا تو کپاس کی پُونی کی طرف سفید ہو گیا۔

اُس نے کروٹ بدل کر مردان کی چارپائی کی جانب دیکھا۔ وہ اب بڑا ہو چکا تھا اس لیے الگ چارپائی پر سوتا تھا۔ مردان گہری نیند میں تھا۔ کچھ دور باجیوں کی چارپائیاں تھیں.. آپاجی ابھی نیچے تھیں، وہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اوپر آتی تھیں۔ اور اباجی اپنے عملے کے ساتھ ٹُور پر گئے ہوئے تھے۔ اسی لیے اُن کا سفید نواڑی پلنگ اُس کے حصے میں آیا تھا... عشقے دا اِک پلنگ نواڑی۔

اب اُنہیں یاد بھی نہ تھا کہ وہ کبھی گوالمنڈی میں رہا کرتے تھے۔ اُنہیں لکشمی مینشن میں آئے ہوئے ایک طویل عرصہ بیت چکا تھا۔

اس نے سرہانے تلے ہتھیلی کو آگے کیا — کنگن کی گولائی اس کی ہتھیلی میں بریل کی عبارت کی طرح منتقل ہوئی۔ کتنے برس ہو گئے تھے اس کنگن کو — وہ جانتا تھا کہ کتنے برس.. ہر سال یوم آزادی کے موقع پر مال روڈ پر فوج کی پریڈ ہوتی جس میں ٹرک، توپیں اور ٹینک مال کی تارکول کا ستیاناس کرتے ہوئے دندناتے ہوئے ایک گہری گرج کی تسلی کے ساتھ گذرتے کہ وہ سارا ہجوم جو کوٹھوں اور ممٹیوں پر کھڑا اس پریڈ کا منتظر ہوتا اُن کے لیے

یہ تسلی دل کو خوش کرتی تھی کہ ہماری اپنی فوج ہے اور اس میں ٹینک بھی ہیں جن گڑگڑاہٹ سے دل دہلتے ہیں اور یہ ملک تاقیامت قائم رہے گا... ساری مال روڈ سج جا صبح سویرے اُن تمام لوگوں کے گھروں میں مہمان آنے لگتے جن کی چھتوں اور کھڑکیوں مال روڈ پر گذرتی پریڈ کا نظارہ ہو سکتا تھا... اُن کی چھت پر بھی خوب ہجوم ہوتا اور آپا کسی بھی مہمان کو سوڈا واٹر پلائے بغیر جانے نہ دیتیں اور اگر پریڈ دیر سے ختم ہوتی تو فو طور پر چاولوں کا دیگچہ چڑھا دیا جاتا۔

چودہ اگست کو گذرے ابھی چند روز ہوئے تھے اور ابھی تک اُنہوں نے پاک پرچم اُتار کر صندوق میں نہیں رکھا تھا۔

مشاہد کا خیال تھا کہ مردان گہری نیند میں ہے لیکن اُس کی آنکھیں کھلی تھیں ا وہ جھنڈے کو تکے جا رہا تھا۔ چودہ اگست کی پریڈ ابھی تک اُس کے اندر ہو رہی تھی... ٹھ ٹھپ کرتے ہوئے بھاری بوٹ اور گڑگڑاتے ہوئے ٹینک — ملک کو بچانے والے... اگر فوجی بن جاؤں تو کتنا مزہ آئے — یہاں سے، آپا جی مجھے بھی پریڈ کرتے ہوئے دیکھ اور سارے مہمانوں کو بار بار بتائیں... یہ میرا مردان ہے.. ہاں ہاں سارے ایک جیسے ہیں لیکن وہ جو دوسری قطار میں ہے — کتنا مزہ آئے...

کنگن ابھی تک خفیہ چلا آ رہا تھا۔ بعض دنوں میں وہ بہت بے چین ہوتا کہ کہ یہ جُرم تو نہیں، کہیں یہ لوٹ مار کا مال تو نہیں۔ اُن کے اباجی ہمیشہ کہتے تھے کہ جس جم نے لوٹ مار کے مال کو ہاتھ لگایا ہے وہ اور اُس کی آل اولاد ہمیشہ حرام کھاتی رہے گی ا یہی لوگ ہوں گے جو بالآخر پاکستان کو کھا جائیں گے — مشاہد پاکستان کو بالکل نہیں کھ چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کنگن کو بھی اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آج رات بھی ریگل چوک کے پار "سٹینڈرڈز" کے اوپن ایئر ریستوران موسیقی اور تماشائیوں کا ہلکا شور اُٹھتا تھا اور شہر لاہور کی اکلوتی اور من پسند ڈانسر ا-نجلا تھی۔

بہت برس بعد آج اسے لاہور کا وہ آسمان یاد آیا تھا جو شاہ عالمی کے جلنے کی سرخی کی طرح دہکتا تھا۔ جس میں عمارتوں اور گھروں کے گرنے کی ملفوف سی گڑ سنائی دیتی تھی اور جلے ہوئے کاغذ سیاہ پرکٹے پرندوں کی طرح ڈولتے ہوئے آتے اُس کے سفید کھیں کو سیاہ کرتے تھے — ریگل سینما کے میٹنی شو میں، اندھیرے

سکرین پر اُس نے اُسی آسمان کو ایک مرتبہ پھر دیکھا تھا — ویسے ہی سرخی میں نہایا ہوا اور سرخی بھی ایسی جو جامد نہ تھی لرزتی تھی اور یہاں بھی عمارتیں جن کو آگ لگائی گئی تھی گر رہی تھیں اور زمین بوس ہونے پر بجھے بجھے دھماکوں کی آواز آتی تھی — پورے ہال میں وہ واحد تماشائی تھا جو اس عظیم الشان منظر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے کپکپا رہا تھا اور ایک چھوٹے سے بچے کی طرح ڈر رہا تھا اور آج بھی وہ یہ منظر ختم ہونے سے پیشتر ہال سے باہر آگیا تھا۔ آج وہ تیسری مرتبہ یہ فلم دیکھنے گیا تھا۔ اُسے اتنی زیادہ آزادی تو نہیں دی گئی تھی کہ وہ مسلسل ایک ہی فلم دیکھتا چلا جائے لیکن مشاہد ماں باپ کی جانب سے دی گئی تھوڑی سی ڈھیل کو ذرا اور فاصلے تک لے جاتا — گرمیوں میں خاص طور پر کھانے کے بعد بیٹھک کے دروازے اور کھڑکی کو خس کی چکوں سے ڈھانک دیا جاتا۔ اباجی کئی بار پوری دوپہر اُن پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے رہتے اور کبھی فوراً ہی بور ہو کر سو جاتے اور جب بھی وہ سوتے مشاہد بہت آسانی کے ساتھ فلیٹ کے عین سامنے واقع ریگل سینما میں میٹنی دیکھ کر اطمینان سے واپس آ جاتا —

آج اُس نے "کاؤ واڈِس" کا میٹنی شو تیسری مرتبہ دیکھا تھا اور تیسری مرتبہ آگ منظر کے اختتام سے پہلے اُٹھ آیا تھا۔

یہ روم کے جلنے کا منظر تھا۔

پیٹر اسٹی نوف رومن شہنشاہ نیرو کے کردار میں — اور روم جل رہا ہے اور وہ ساز بجا رہا ہے۔ اور روم کا آسمان، لاہور کا آسمان تھا — جب شاہ عالمی جل رہا تھا... میں مشابہت بہت تھی — کئی بار مشاہد نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا لیکن پردۂ سکرین لتے ہوئے شہر سے راکھ نہیں اُٹھا کرتی۔

لکشمی مینشن اب وہ نہیں رہا تھا جو کہ پہلے تھا۔

اس کی بوسیدہ اینٹوں، گرد آلود گراؤنڈ اور بالکونیوں میں بیٹھی لڑکیوں میں تبدیلی آ تھی۔ اُس پر جو وقت گذرا تھا وہ اُسے تبدیل کر گیا تھا۔ فلیٹوں کی سیڑھیوں کے تھڑوں لڑکے کم بیٹھتے تھے۔ بیٹھتے تھے تو ذرا شرمندہ ہو کر اور اُس آزادی سے بالکونیوں کی نہیں دیکھتے تھے جیسے دیکھا کرتے تھے۔ جین پیٹرز، ایوا گارڈنر اور گریگوری پیک کی روں کے البم.... ہاؤ ڈی مسٹر.... کم آن ڈرا — اور چاندنی راتوں کے گانے جب

بالکونیوں سے گجرے گرتے تھے... یہ سب کچھ ماضی ہو رہا تھا — تمام مسکیٹرز بچپن سے نکل کر جوانی کی حِدّت میں داخل ہو رہے تھے اور انہیں اپنے بدلتے جسموں پر ا تھا۔ مشاہد اور کمال گورنمنٹ کالج میں جا چکے تھے اور وہ اب سنجیدہ اور بالغ نظر آ کوشش کرتے تھے۔

سمیعہ پہلے سے زیادہ بھر چکی تھی اور کوٹھا ملاقاتوں کے دوران اُس کے گور میں سے ایک وحشی مہک مشاہد کے پپوٹوں کو بھاری کر دیتی اور وہ بھولپن میں کبھی سکا کہ یہ مہک سمیعہ کے اُوپر سے آ رہی ہے، نیچے سے آ رہی ہے یا درمیان میں رہی ہے۔

یہ مہک اُس کا پیچھا کرتی — صفدر میر انگریزی ادب پڑھاتے ہوئے جوش جاتے اور شیکسپیئر کی لائنوں پر جھومتے ہوئے کلاس روم سے باہر برآمدے میں چلے اور اُنہیں علم نہ ہوتا کہ وہ کہاں ہیں... اور سمیعہ کی مہک، گیلی اور گرم شیکسپیئر کی سے چپک جاتی۔ قیوم نظر کی گرجدار آواز اوپن ایئر تھیٹر میں گونجتی — وہ میراو کے اشعار کی تصویریں بناتے تو اُن تصویروں میں سمیعہ کی گولائیاں اُبھرنے لگتیں... کے ساتھ کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ "کچھ" کیسے کیا جاتا ہے — کے نہیں بدن کی بے تابی کے بے بس کر دینے والے دن تھے —

ہاں لکشمی مینشن اب وہ نہیں رہا تھا جو کہ پہلے تھا.. اس لیے کہ منٹو صاحب نہیں تھے.. اُن کے ساتھ آخری واردات "نالی ایپی سوڈ" کہلاتی تھی اور اس مینشن کراوڈ ملوّث تھا۔

مینشن کراوڈ میں روایت تھی کہ جب کسی بھی ممبر کو کوئی بھی عجیب سی دستیاب ہوتی تو اُسے سب کے سامنے پیش کر کے یہ سوچا جاتا کہ اس کے ساتھ ہے — کس قسم کی واردات ہو سکتی ہے۔ رتّی پے ماسٹر کو کہیں سائیکل کی ٹیوب ہاتھ لگ گئی اور اِسے ایک تھڑے پر رکھ کر پورے کراوڈ نے غور و خوض کیا کیا مصرف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کراوڈ کے جو بہترین دماغ تھے اُنہوں نے فیصلہ کیا درمیان میں سے کاٹ کر سیدھا کیا جائے۔ اس کے بعد ایک سرے پر گانٹھ لگا کر سرے سے اس میں خوب پانی بھرا جائے — یہاں تک تو صورت حال واضح تھی کے بعد کیا کیا جائے — یہ واضح نہ تھا — اس گتھی کو حسب معمول تاج نے

منٹو صاحب کے ایک بیڈ روم کی کھڑکیاں پچھلی گلی میں کھلتی تھیں لیکن اُنہیں بالکل نہیں کھولا جاتا تھا اور باقاعدہ مقفل رکھا جاتا تھا۔ اُن دنوں کمروں کے فرش سُرخ اینٹوں کے ہوتے تھے اور اُنہیں باقاعدگی سے دھویا جاتا تھا اور اُن کی سُرخی نکھرتی چلی جاتی تھی۔ پانی کے نکاس کے لیے ایک دو انچ قطر کا سُوراخ بھی رکھا جاتا تھا — منٹو صاحب کے متذکرہ بیڈ روم کے فرش کی سطح پر ایک ایسا ہی سوراخ تھا جو پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ ایک شب اُس نادر ٹیوب میں پانی بھرا گیا اور پھر اُسے دھیرے دھیرے زور لگا کر اُس سُوراخ کے راستے منٹو صاحب کے بیڈ روم کے اندر تک لے جایا گیا۔ اب پوزیشن کچھ یوں تھی کہ پانی سے بھری ہوئی ٹیوب کا وہ سِرا جس پر گانٹھ لگی ہے بیڈ روم کے تقریباً درمیان میں پہنچ چکا ہے اور دوسرا سرا تاج کے ہاتھ میں ہے۔ اور تاج صاحب ٹیوب کو مُٹھیاں بھرتے ہوئے پانی کا پریشر اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ دوسرے سِرے کی گانٹھ کُھل جاتی ہے اور سارا پانی منٹو صاحب کے بیڈ رُوم میں.. اس واردات کے بعد ٹیوب کھینچ لی گئی اور سب خواتین و حضرات اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور یہ واردات تقریباً ہر رات دوہرائی جاتی —

ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ صفیہ آپا نے فلیٹ کے آگے زردے کی دیگ چڑھا رکھی ہے اور اہل مینشن کو بتا رہی ہیں کہ ہاہائے میں نے جو صبح اٹھ کر دیکھا تو فرش پر پانی ہی پانی.. میں نے سوچا منٹو صاحب نے کر دیا ہے — اُن کو جھڑکا تو کہنے لگے صفیہ مجھ سے قسم لے لو میں نے یہ نہیں کیا — خیر میں نے وہاں بوری پھروائی اور خشک کیا — لیکن اگلی صبح پھر فرش پر پانی — کھڑکیاں ساری بند۔ دروازوں میں بھی چٹخنیاں چڑھی ہوئیں پھر فرش خشک کر دیا اور اگلی صبح.... تب کسی نے بتایا کہ صفیہ بند کمرے میں کوئی آتا جاتا نہیں۔ راستہ کوئی نہیں تو بس جلدی سے زردے کی دیگ چڑھا..جنّوں بھوتوں کی کارستانی ہے — میرا تو "تراہ" نکل گیا.... مسجد میں کہہ کر آئی ہوں کہ قرآن ختم کریں.. دیگ بھی چڑھائی ہے — اللہ رحم کرے...

مینشن کراوڈ نے اس روز جی بھر کے زردہ کھایا اور اس تھیس سے مکمل اتفاق کیا کہ یہ جنّوں بھوتوں کی کارستانی ہے۔

اُس رات ایک مرتبہ پھر جب پانی سے بھری ہوئی ٹیوب منٹو صاحب کے بیڈ رُوم میں داخل کی گئی اور اُسے پچکایا جا رہا تھا تاکہ دوسرے سِرے کی گانٹھ کُھل جائے تو محسوس ہوا کہ دوسری جانب سے بھی کسی نے اُسے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ اب ادھر سے

زور لگا رہا ہے اور ادھر سے پتہ نہیں کون زور لگا رہا ہے اور تب منٹو صاحب کی آو
گرج کے ساتھ آئی — اوئے جن بھوتو تمہاری میں ماں کی... اور تمام جن بھوت
ہوئے اپنے گھروں کو سرپٹ بھاگے اور اپنی ماؤں کی گودوں میں جا دبکے — اور
تک اپنے گھروں سے باہر آنے کی جرأت نہ کی۔

منٹو صاحب کو مینشن کراؤڈ کی یہ شرارت زیادہ پسند نہ آئی اور وہ اُن
عرصہ ناراض رہے اور جو کبھی کوئی سلام کرنے کی جرأت کر لیتا تو اُسے "تیری
بھوت کی..." کی ڈانٹ پڑ جاتی۔ پھر مینشن کراؤڈ نے عالمی اولمپک مقابلوں کی طرز
"مینشن اولمپک" کا انعقاد کیا اور منٹو صاحب کی منت سماجت کر کے اُنہیں مہمان خص
رُتبہ دیا گیا۔ اُن کے بیٹھنے کے لیے تین چار میزوں کو اوپر نیچے رکھ کر ایک بلند پلیٹ
سا بنایا گیا۔ منٹو صاحب کو بڑی مشکل سے اس کے اوپر بٹھایا گیا اور چار لڑکوں
سے نچلی میز کے پائے تھامے رکھے تاکہ یہ بلند مچان نیچے نہ آ جائے.. منٹو صاحب جو
تھے اب راضی ہو گئے اور جب تقریر کرنے کے لیے اُٹھے تو ڈولنے لگے اور مچان
نیچے آنے کو تھے کہ کراؤڈ نے اُنہیں راستے میں ہی دبوچ لیا — لیکن ان وارداتوں
بہت دن ہو گئے تھے... اب تو بُنّوں نے بھی اُچھل اُچھل کر بیڈ منٹن کھیلنا چھوڑ دیا تھا
کو پتلون سلانے کے لیے اپنا خاندانی درزی چھوڑ کر ایک اور درزی تلاش کرنا پڑا
خاندانی درزی صرف نیکریں بنانے میں ماہر تھا اور اگر پتلون بناتا تو بس نیکر کو ذرا لمب
— اور تاج اب فیشن ایبل ہو چکا تھا.. مُجّی کے فلیٹ کے قریب کوئی ملک معراج
چکے تھے۔ ادھر جاوید اثر والد صاحب کی الماری میں سے ایک ایسی دوائی اکثر نکال کر
جس سے سر گھومتا تھا اور جو بہت کڑوی تھی — اور جسے برانڈی کہتے تھے — اثر
دوسری شادی کر چکے تھے اور ایک رات مینشن میں ایمبولینس کے موٹر کی آواز
کو جگا دیا.. کہا جاتا ہے کہ اثر صاحب اور اُن کی دوسری بیگم نے دوائی زیادہ پی لی اور
بے ہوش ہو گئے —

منٹو صاحب بھی اب بہت بیمار رہتے تھے۔ لیکن اُنہیں روزی کمانے
روزانہ ناشروں کے چکر لگانے پڑتے تھے اور جب کبھی اُن کا تانگہ مینشن میں داخل
مشاہد آگے ہو کر انہیں سلام کرتا اور وہ اس کے کندھے کا سہارا لے کر گھر کی جان
لگتے —"مشاہد بہت اچھا بچہ ہے —" وہ کہتے اور پھر فوراً معذرت کرنے لگتے

نہیں.. بچہ کہاں ہے اب تو جوان ہو گیا ہے۔ پتلون پہنتا ہے۔"

لیکن ہر روز وہ مشاہد کے کندھے پر بوجھ زیادہ ڈالتے اور اُن کی ٹانگوں میں نقاہت اور لرزش زیادہ ہوتی۔

اُن کے فلیٹ کے عین سامنے گراؤنڈ میں کیکر کا ایک سوکھا ہوا تنا تھا۔ ایک واردات یہ بھی ہوتی کہ اُس تنے پر مٹی کا تیل چھڑک کر اُسے آگ لگانے کی کوشش کی جاتی۔ آگ تو خیر کیا لگتی وہ سلگنے لگتا اور اکثر ہوا کا رُخ ایسا ہوتا کہ سارا دھواں منٹو صاحب کی کھڑکیوں کی طرف جاتا اور وہ باہر آ کر کہتے "اوئے تم نے میرے اندر سے جن نکالنے ہیں؟"

آخری بار اُس نے منٹو صاحب کو اُس تنے کے پاس دیکھا۔

وہ کھانس رہے تھے اور اُس گھریلو ملازم کو ہدایات دے رہے تھے جو کیکر کے تنے کو ایک کدال کی مدد سے زمین میں سے نکال رہا تھا۔

مشاہد، مردان کی اُنگلی تھامے آپا جی کے لیے دہی لینے بیڈن روڈ جا رہا تھا..

"مشاہد —" اُنہوں نے بمشکل آواز دی۔

مشاہد تو خود بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے وہ فوراً اُن کے پاس پہنچ گیا۔

"تم اچھے بچے ہو مشاہد —" اُنہوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، جیسے تانگے سے اُترے ہوں اور سہارا لینا چاہتے ہوں۔ "کیکر کا یہ سوکھا ہوا تنا بدنما لگتا تھا.. اور یوں بھی..." وہ بری طرح کھانسنے لگے۔ اُن کی کھانسی کی آواز نے مردان کو ڈرا دیا اور اُس نے شاہد کی اُنگلی کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اُنہوں نے جلد ہی سانس پر قابو پا لیا۔

"آپا جی کے لیے دہی لینے جا رہا ہوں جی —"

"شاباش، تم اچھے بچے ہو مشاہد —"

ملازم نے تنے کے گرد کی زمین کو کدال سے نرم کر لیا تھا اور اب وہ اُسے جھٹکا مار ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم بھی زور لگاؤ —"

مشاہد نے دہی والا کٹورہ زمین پر رکھ دیا اور تنے کو دھکیلنے لگا — تھوڑی ہی دیر وہ زمین پر تھا۔ اُس کا اوپر والا حصہ سیاہ ہو چکا تھا۔

"میں جاؤں جی —"

"ہاں —" انہوں نے ہاتھ آگے کر دیا اور اُن کا ہاتھ جل رہا تھا۔

مشاہد کو اب بھی آٹوگراف جمع کرنے کا خبط تھا۔ اُس کی آٹوگراف بک پر ا
پاکستان، ویسٹ انڈیز اور ایم سی سی کے کھلاڑی تھے۔ مس یونیورس تھی —
مودودی تھے۔ سٹیورٹ گرینجر اور ایوا گارڈنر تو تھے ہی — اور پچھلے دنوں ہارس
کیٹل شو کے موقع پر لاہور پریس کلب کے سامنے اُس نے پرنس علی خان اور وقار
نون کو سپاٹ کر لیا تھا۔ پرنس علی خان سے اُس نے نہ صرف اپنی آٹوگراف بک پر د
لیے بلکہ اُن کے آگے ریٹا ہیورتھ کی ایک تصویر بھی کر دی۔ "اس پر بھی سر —"
پرنس نے اپنی ایکٹرس بیوی کی تصویر دیکھی اور اِس انداز میں دیکھی کہ وہ فلم "سلو
میں آخری رقص کر رہی ہے تو پرنس کو یہ نیم برہنہ تصویر بالکل پسند نہ آئی اور انہوں
مشاہد کو ایک قہر آلود نظر سے نوازا اور آگے بڑھ گئے۔۔

کیا منٹو صاحب اتنے اہم ہیں کہ پرنس علی خان اور ایوا گارڈنر کے ساتھ اُن
آٹوگراف بھی لیے جائیں۔۔

اُس نے جیب میں سے آٹوگراف بک نکالی اور جھجکتے ہوئے اُن کے آگے ک

"آٹوگراف پلیز —"

منٹو صاحب چونک گئے۔ پریشان سے ہو گئے "میرے آٹوگراف —" پھر ا
نے اپنا چشمہ درست کیا اور تنے پر پاؤں رکھ کر آٹوگراف بک کو گھٹنے پر بیلنس کیا او
لکھ کر دستخط کر دیے۔

"شکریہ جی —" مشاہد نے آٹوگراف بک جیب میں ٹھونسی اور کٹورہ اُٹھا ک
لگا۔۔

"بھائی جان اُنگلی —" مردان نے شور مچا دیا۔ مشاہد نے اُنگلی آگے کر دی
مردان اُسے تھام کر پُرامن ہو گیا۔

"اور مشاہد ایک بات سنو —"

"جی —" وہ رُک گیا۔

"ادھر میرے پاس آؤ —"

وہ اُن کے پاس چلا گیا۔

"میں نے وہ خط... وہی خط.. اُسی روز پھاڑ کر پھینک دیا تھا — فکر نہ کرنا" اور یہ
کہتے ہوئے اُن کی آنکھیں چشمے کے پیچھے شرارت سے چمکیں — مشاہد کے سینے پر سے
یک بوجھ سا اُتر گیا۔ کتنے برس پہلے منٹو صاحب نے اُس پیسٹری کھلائی تھی — وقت کیسے
گذرتا ہے — آہٹ بھی نہیں ہوتی۔ آپ وہیں کھڑے رہتے ہیں اور وہ گذر جاتا ہے۔
شاید آپ گذر جاتے ہو... اور وہ کھڑا رہتا ہے۔

"اب میں جاؤں جی —"

"ہاں — تم جاؤ" وہ پھر کھانس رہے تھے۔

دونوں بھائی منہ موڑ کر چلنے لگے۔

انصاری ہوٹل کے قریب پہنچ کر اُس نے پیچھے دیکھا — منٹو صاحب نظروں سے
جھل ہو چکے تھے۔ وہ رہ نہ سکا۔ آٹوگراف بک جیب سے نکال کر وہ اُس کے ورق پلٹتا
ہا — پھر رُک گیا۔۔

"جب حُسن تھا تو آئینے نہیں تھے
اب آئینے ہیں پر حُسن کہاں —"
سعادت حسن منٹو

لکشمی مینشن کے سہ منزلہ فلیٹوں کی لمبی مستطیل چھت پر مشاہد کی کھلی آنکھوں
د آسمان تھا —

لاہور کا آسمان —

روم کا آسمان —

"عشقے دا اک پلنگ نواڑی۔ وے اساں چانناں وچ ڈاہیا....

"مُردے کی طرف دھیان دیں خواتین و حضرات —"

"نہیں — مُردے انتظار کر سکتے ہیں، زندہ نہیں —" ستار نقوی ایک با
سی ہنسی ہنسا "زندوں کی طرف دھیان دیں خواتین و حضرات —"

"چلیے زندوں کی طرف دھیان کر لیتے ہیں — کیا تکلیف ہے زندوں کو؟"
احمد لاش پر جھکا رہا، سر نہیں اُٹھایا، وہیں سے بولا۔

"زندوں کو تو ہی تکلیفیں ہوتی ہیں جانِ من۔ مُردے تو خاک کی چادر اوڑ
مزے کرتے ہیں —" دانش نے بھی ایک بیان جاری کرنا مناسب سمجھا۔

صباحت بیگم کی ناک اگرچہ اب تک ڈی کمپوز ہوتے مُردوں اور فارملین کی
عادی ہو چکی تھی لیکن پھر بھی اُس نے اِس ناک کو قدرے چڑھایا "ارے دانش مزے
کر رہے ہو ایمان سے.. اتنا اچھا بازو ہے تمہارے پاس، بالکل اصلی حالت میں۔ میرے
میں جو معدہ آیا ہے تو بالکل برباد شدہ کیفیت میں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا سسٹم کا... کمبخت
چاقو بھی کھانا تھا تو میرے والے حصے میں —"

"یارا آپ ذرا خاموشی سے ڈائی سیکشن نہیں کر سکتے —" رحمان گل نے
مائنڈ کرتے ہوئے تیوری چڑھائی "ادھر میں چیرا لگاتا ہوں تو تم لوگ شور کرتے ہو اد
ٹھیک سے نہیں لگتا — پروفیسر مشتاق نے دیکھ لیا تو ایمان سے کان پکڑوا دے گا۔
اوئے رحمان گل یہ تو مُردہ تھا اس لیے ایسے کٹ پر چپ رہا۔ مریض کو لگائے گا تو وہ
سے اُٹھ کر جھانپڑ لگا دے گا — یارا شور مور نہ کرو۔"

"واہ —" صباحت زبان سے پٹاخہ سا بجا کر بولی۔

رحمان گل نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور مسلسل دیکھا "کیا دا

"پروفیسر مشتاق مریض کو کیسا زبردست چیرتے ہیں —" وہ جھومتی ہوئی بو
کسی شعر پر سر دُھنتی ہو" ایسی لائن لگاتے ہیں — یوں، جیسے فُٹے پرکار کے ساتھ

فیثا غورث حل کر رہے ہوں — آرٹسٹ آدمی ہے بھئی، مائیکل اینجلو کی طرح سٹروک
لگاتا ہے — واہ" اُس نے پھر پٹاخہ بجایا اور اُسی طرح جھومتی ہوئی اپنے معدے پر جھک
گئی۔

"یہ مائیکل اینجلو کا نام کس نے لیا ہے؟" اظہار اعوان نے سر اُٹھا کر تمام طالب
علموں کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے لیا ہے —" صباحت نے سینے پر دھپ لگاتے ہوئے کہا "اظہار اعوان
اگر تم فتح جنگ جیسے پسماندہ علاقے سے آ کر مائیکل اینجلو کا نام لے سکتے ہو تو ہم بھی لے
سکتے ہیں۔"

"میں کم از کم فتح جنگ سے تو آیا ہوں۔ تم تو کہیں سے بھی نہیں آئے —"

سب کے سانس رُک گئے۔ وہ دم سادھے صباحت یا ستار نقوی کے ردِ عمل کے
نظار میں رہے لیکن اُدھر سے جواب نہ آیا۔

کچھ دیر بعد دانش نے ایک طرف کھڑے لچکیلے بدن کے کمند علی خان کو پکارا —
"تم کیوں نہیں آ رہے؟"

"میرے لیے کچھ باقی ہی نہیں بچا — پورے مُردے کے حصے بخرے ہو چکے
ں... اس لیے میں اگلے مُردے کا انتظار کر رہا ہوں اور میں اُسے ڈائی سیکشن ہال میں داخل
وتے ہی دبوچ لوں گا وہ پورے کا پورا میرا ہو گا میں ابھی سے انتباہ کر رہا ہوں..."

نور الہدیٰ پہلی بار بولی "کراچی میں بجلی اور پانی کی کمی ہو سکتی ہے — مُردوں کی
یں، ابھی آتا ہو گا۔"

"ویسے یارا یہ جو مائیکل اینجلو تھا تو یہ تو ہم نے بھی پڑھا تھا کہ بچپن میں کچن کا
چُھری مُری لے کر رات کو ایک گرجے میں جاتا تھا اور ادھر جو فقیروں کا لاوارث لاشیں
تا تھا اُن کا چیر پھاڑ کرتا تھا — ایسے اُس نے اناٹمی سیکھا اور پھر بُت مُت بنایا —"

"رحمان گل ذرا دیکھو ہم کیسے خوش نصیب لوگ ہیں — اُس غریب کو فقیروں کی
شیں ملتی تھیں جب کہ ہم — ہمارے پاس کیا شاندار ورائٹی ہے — ہر قسم کے لسانی،
لی اور مذہبی مُردے وافر تعداد میں ہمہ وقت دستیاب ہوتے رہتے ہیں —"

"ویسے یہ — کون تھا؟" فارملین میں Soak کی ہوئی سنگِ مرمر کی میز پر پڑی لاش
جانب دیکھے بغیر شوبھا نے پوچھا۔

سب اپنے اپنے فریم میں شل ہو گئے کہ شوبھا نے یہ کیا سوال پوچھا ہے —

"اگر عوام الناس میرے تجزیئے کو اپنی اپنی ذات پر منطبق نہ کریں تو عرض کروں —" کمند علی لچکتا ہوا بولا "اگر تو یہ حضرت جو اس وقت کئی پھٹی حالت ٹیبل پر اکڑے پڑے ہیں ہونٹ لال لال رکھتے ہیں اور اپنی پچکاری سے مخاطب کا چ کیا کرتے تھے اور حلق ایسا رکھتے ہیں کہ "ق" پھنس پھنس کر نکلتا تھا تو واضح طور ہیں جنہیں عرف عام میں تلیر بھی کہا جاتا ہے — یعنی میرے بھائی بند ہیں —"

"میرے بھی —" ستار نقوی نے بچوں کی طرح ہاتھ کھڑا کر کے شور مچایا۔

"میرے بھی تو ہیں —" صباحت مسکرانے لگی "لیکن یہ طے نہیں پایا کہ مادہ کو کیا کہتے ہیں کیونکہ میں تو وہ ہوں —"

"جی تو آپ اپنا تجزیہ جاری رکھئے —" دانش بے حد محظوظ ہو رہا تھا۔

"اور اگر موصوف کے منہ سے نسوار کی لپٹیں آ رہی ہیں اور ان کے ہوئے کپڑوں کے قریب سے گذرتا ہوا کوئی لال بیگ دس سیکنڈ میں اوندھا ہو کر چلانی شروع کر دے تو...."

"آئی پروٹسٹ —" رحمان گل سر ہلاتا ہوا ہنسنے لگا "یارا مجھ سے قسم آج تک نسوار کھایا ہو —"

"اور مجھ سے قسم لے لو اگر میں نے آج تک پان کھایا ہو —" کمند بولا۔

"باقی، ذاتی سیکشن میں کروں گا —" رحمان گل نے دانش کو ایک مرتبہ سے دیکھا۔

"یارا اگر یہ ہر وقت سوتا موتا ہے اور نشہ کرتا ہے تو یہ سندھی مانو ہے؟ نور الہدیٰ پروٹسٹ کرنے کا ضرورت نہیں ہے —"

"کیوں ضرورت نہیں — ہمیشہ Unkindest Cut سندھیوں کو لگتا اتنے بُست نہیں ہیں —"

"ایسے شغل مُغل ہو رہا ہے نور —"

"ہمارے لیے کیا حکم ہے، ہم باقی رہ گئے ہیں جنابِ عالی —" داؤد احمد کر پوچھا۔

"ہاں تم اور اظہار اعوان باقی رہ گئے ہو —" اظہار نے ایک مرتبہ پھر خشمگیں نگاہوں سے سب کو دیکھا اور بطور خاص رحمان گل کو دیکھا لیکن وہ جاری رہا "بھئی ان صاحب کے منہ سے اگر لسی کی بُو آئے۔ کپڑوں کو گوبر لگا ہو اور ذرا ڈھگے ہوں تو کیا ہوں گے — ادھر کراچی میں نعرہ لگتا ہے ناں پاکستان سے کیا پایا۔ چوپایا، چوپایا... تو بس یہ پنجاب کا بات ہے یارا —"

"نور الہدیٰ —" اظہار نے عینک اُتار کر اوور آل میں رکھی اور اُس کے قریب چلا گیا "کیا خیال ہے Unkindest Cut کے بارے میں — یہ سندھیوں کو نہیں ہمیشہ پنجابیوں کو لگتا ہے..."

"جیسا کہ رحمان گل نے کہا تھا، شغل مُغل ہو رہا ہے یارا —"

"شغل مُغل نہ ہو رہا ہوتا تو مجھے کوئی تلیر کہہ کر دکھاتا میں اُس کا ٹینٹوا نہ دبا دیتا۔" ستار نقوی جانتا تھا کہ اظہار کے دل کو ہر بات لگ جاتی ہے۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو نہ کر سکتا تھا اور نہ سن سکتا تھا... "اظہار بھائی میں نے تو آج تک تلیر دیکھا بھی نہیں کہ کیسا ہوتا ہے اور پھر بھی میں ہوں — آپ جو کچھ ہو آپ نے دیکھا تو ہے ناں؟"

اظہار مسکرانے لگا "لیکن یار مجھے بُرا لگتا ہے —"

"ذرا سب لوگ ادھر پلٹ پڑیں — بُرا تو مجھے لگتا ہے —" شوبھا مسلسل دائیں سے بائیں جھولنے کے انداز میں سر ہلا رہی تھی "سب کی شناخت ہو گئی لیکن میں کہاں ہوں.. شوبھا مردان کون ہے اور کہاں ہے —"

دانش نے اپنے گھنے گھنگھریالے مکرانی بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرنے کی کوشش کی۔ اُس کی آواز میں کم پانی والے کنوئیں کی گونج سی تھی اور ابھی وہ ذاتی سیکشن کے قریب کھڑا تھا لیکن جب وہ چلتا تھا تو اُس کا پاؤں قدرے گھسٹتا تھا "اور... د...د... دانش کہاں ہے؟ یہ... یہ... کہاں کا رہنے والا ہے... اسے بھی تو کچھ کہو... تلیر کہو۔ ڈھگا کہو... اس کی شناخت بھی تو ہونی چاہیے —"

"چلئے ہم آپ کو اونٹ بھائی جان کا خطاب دیئے دیتے ہیں..." کمند علی خاں خوشدلی سے بولا "بلوچ بھائی اب تو آپ خوش ہیں؟"

"اونٹ بھائی جان کے لیے Kindest Cut of them all..." اظہار نے صرف اپنے آپ سے کہا۔

شوبھا اب بھی کسی ملنگ کی طرح جھومنے کے انداز میں دائیں سے بائیں ہ
چلی جا رہی تھی "میں نے گذارش کی تھی کہ سب لوگ میری جانب ذرا پلٹ پڑیں
کا فیصلہ ہو گیا لیکن میں منتظر ہوں —"

"تم جانتی ہو کہ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن تم اسے بار
چاہتی ہو..." اظہار کی آواز صرف شوبھا سنتی تھی "تم ہم میں سے نہیں ہو۔"

"میں شوبھا مردان ہوں —"

"جو بھی ہو — ہم میں سے نہیں ہو۔"

شوبھا کی آنکھیں بھرنے لگیں۔

"شغل مُغل ہو رہا ہے شوبھا —" رحمان گل ایک بزرگ کی تھکتی ہوئی
آواز میں کہنے لگا "اس ملک میں ہر طرف شغل مُغل ہو رہا ہے —"

"مُردے کی طرف دھیان دیں خواتین و حضرات —" داؤد احمد نے پھر
سے اعلان کیا۔ "اور ذاتی سیکشن سے فارغ ہو کر فارملین میں ڈبویا ہوا کپڑا مُردے کے
زخم پر ضرور رکھ دیجیے گا جو آپ کے ذاتی سیکشن چاقو کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا ہے
پلیز — ورنہ مُردہ مزید اکڑ جائے گا.... اور اللہ تعالیٰ کو تکبر پسند نہیں۔"

"بابا —"

اُس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ دری پر گچھا مچھا ہو کر ایک بچے کی طرح سویا ہوا
مردان اگر جاگ رہا ہوتا اور اُس کی طرف دیکھ رہا ہوتا تو بھی سُن نہ پاتا — اُس کے
سرہانے اُس کا چھوٹا سا رُک سیک پڑا تھا اور برابر میں سیاہ ربڑ کے موٹے تلے والے سفری
بوٹ تھے جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ تسموں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ بوٹوں پر دھول
تھی اور اُن میں اُڑسی ہوئی جرابوں میں سے مردان کے پسینے کی بو آتی تھی۔

"بابا۔" وہ اُس کے پاس بیٹھ گئی اور اُس نے جھک کر اُس کے کان میں کہا — اور
وہ جیسے اسی آواز کا منتظر تھا۔ اُس نے صرف ایک آنکھ کھولی اور مسکرا دیا — "ہیلو شوبھا"
اور اپنے دونوں بازو اُس کی جانب پھیلا دیے۔ شوبھا اپنا منہ اُس کے کان سے ماتھے تک
لے آئی اور اُسے چُوما، سفر کی دُھول اور تھکاوٹ اُس کے ہونٹوں میں اُتری اور وہ بھیگتی
آنکھوں کے ساتھ مسکرائی... صرف ابر اور ہوا کیا چیز ہے نہیں بلکہ انسان اور رگوں میں
دوڑتے ہوئے لہو کے آپ قائل ہیں یا نہیں لیکن یہ کیا ہے.. یہ... یہ جو اس انسان کے
تن میں بنانے والے نے کیا کیا گوشے بنائے ہیں جو کسی شکل کو دیکھ کر نرم ہوتے ہیں،
بھیگتے ہیں اور یہ احساس جب بدن میں چل رہا ہوتا ہے تو وہ کیفیت کیسے کسی بیان میں آ
تی ہے۔ شوبھا کے لیے مردان صرف ایک باپ نہ تھا ایک باغ بہاراں تھا جس میں سدا
بلبل بولتی تھی اور وہ سدا اس میں رہتی تھی۔

اُس نے دیر تک اپنے ماتھے پر شوبھا کے ہونٹوں کی نمی کی خوش نصیبی کو محسوس
کیا اور پھر اُٹھا اور اُس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا "مجھے دیکھ کر تم تو حیران پریشان
اور جنگل بیابان... ہیں شوبھا" اُس نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر گہری اُلفت سے جھنجھوڑا اور
ہنسنے لگی۔ اور اُس کی ہنسی کمرے سے نکل کر دور تک گئی اور اگر یہ سات کمروں والی
کوٹھی ہوتی تو اُس کی آواز سے شیشم اور جامن میں بیٹھے پرندے دم بھر کے لیے ٹھٹکتے۔

ہاں یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں ایک مشابہت تھی — مشاہد کی اُس ہنسی میں... جب وہ
کو دیکھتا تھا اور اِس ہنسی میں — جب شوبھا اُسے دیکھتی تھی — کیا ایک ہی ؟
مُحبت میں گرفتار ایک نوجوان لڑکی اور ایک مڈل ایجڈ شخص کی آواز مسرت کے لمح
ایک جیسی ہو جاتی ہے —

"ہاں بابا! میں تو حیران پریشان — میں اور بیٹ مین بشیر آج صبح باہر بیٹھ
دیر تک بیٹھے رہے آپ کا انتظار کرتے رہے۔ پھر مجھے کالج سے دیر ہو رہی تھی ا
چلی گئی۔"

"پتہ ہے مجھے دیر کیوں ہوئی؟" مردان کے چہرے پر کہیں بھی اب نیندیا ت
کا شائبہ تک نہ تھا۔ اُس نے رُک سیک کا سٹریپ کھولا اور اُسے دری پر اُلٹا دیا... جیسے
میلے سے چھوٹی چھوٹی دل کو لبھانے والی چیزیں لاتے ہیں ایسی بہت ساری چیزیں دری
گئیں... "یہ سب تمہارے لیے ہے —" سوہن حلوے کے پیکٹ، لکڑی کی
مدھانی، گھگو گھوڑے، افغانی زیور اور رنگین دھاگوں والے لمبے لمبے پراندے۔

"یہ کہاں سے لائے ہیں؟" شوبھا نے ان چیزوں کی طرف دیکھے بغیر پوچھا کیا
صرف مردان کے چہرے پر برستی خوشی کو دیکھ رہی تھی۔

"پتہ ہے مجھے دیر کیوں ہوئی؟ اس کی وجہ سے —" اُس نے اس ڈھیر
ایک نہایت نفاست والے کام کا کُھسہ اُٹھایا... اس کی صناعی پر حیرت ہوتی تھی او
پاؤں میں پہننے کو جی نہیں چاہتا تھا "خانیوال میں کراس تھا۔ ٹرین دیر تک رُکی رہی
اُس وقت جب ٹرین حرکت میں آئی اور میں یونہی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تو میں
دیکھا؟.. ایک سٹال پر بہت سارے کُھسے سجے ہوئے اور میں نے سوچا میں بھی کتنا
ہوں پورا ایک گھنٹہ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتا رہا اور یہ سٹال مجھے نظر ہی نہیں آ
اور میرے ذہن میں ایک تصویر آئی کہ تمہارے پاؤں میں یہ خوش رنگ کُھسے ہ
چلتی نہیں ہو کہ یہ خراب نہ ہو جائے — بس میں ٹرین سے اُتر گیا —"

"چلتی ٹرین سے —؟" شوبھا کی آنکھیں ڈر سے سیاہ ہو گئیں۔

"ہاں — چلتی ٹرین سے۔"

"بابا آپ کیوں اپنا خیال نہیں رکھتے۔ کیوں اس قسم کی حماقتیں کرتے
شوبھا غصے میں آ گئی "آپ کا ایک پاؤں بھی — اگر اُترتے ہوئے کچھ ہو جاتا تو.."

"کچھ نہیں ہوا —" مردان نے خوش ہو کر کہا لیکن خوشی کے اظہار میں ایک ہلکا
ا خوف بھی تھا۔ "بس میں نے یہ کُھسہ خریدا اور پھر اگلی ٹرین کا انتظار کیا — جو سات
ھنٹے بعد آئی — بھئی ناراضگی ختم، ہیں شوبھا — نہیں تو میں حیران پریشان —" اُس
نے جیسے منت کی اور شوبھا فوراً موم ہو گئی اور پھر ہنسنے لگی — ہاں مسرت کے لمحوں میں
ب ہی شخص کی مُحبت میں گرفتار ایک نوجوان لڑکی اور ایک مڈل ایجڈ شخص کی آواز ایک
ی ہو جاتی ہے۔

"واہ جی واہ —" یکدم مردان نے اپنی تیکھی ناک سے ہوا کو اِدھر اُدھر شوبھا کے
یب ہو کر سونگھا "بھئی کیسی زبردست خوشبو لگا رکھی ہے — واہ جی واہ۔"

"آئی ایم سوری بابا —" شوبھا خواہ مخواہ شرمندہ ہونے لگی "آج پھر ڈائی سیکشن
پیریڈ تھا۔ فارملین کی بُو ہے جس سے لاش کو Soak کرتے ہیں.."

"بوچڑ برادری کا کیا حال ہے؟"

"بچرز آر اِن بیسٹ آف سپرٹس... اظہار، رحمان، نور الہدیٰ، دانش، کمند علی،
وُد، آل دے بچرز —"

بچرز آل آف دَیم — بچرز — ہُو واز دے بچر آف ایسٹ.... پاکستان —
؟

"بابا — آپ ٹھیک تو ہیں؟"

مردان کی بڑبڑاہٹ میں صرف "ہاں" کا لفظ سنائی دیا۔

"بابا۔ چاچا مشاہد کیسے ہیں؟"

"مشاہد —" مردان واپس آ گیا "ہاں... اُس کا خیال ہے کہ چار مرغابیوں کا خوشی
، کوئی تعلق نہیں —"

"یہ چاچا مشاہد کا خیال ہے؟"

"اِن ڈیڈ —"

"اور اُن کا خیال ہے کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

"بالکل — ایک شیولر اور تین نیل سر۔"

"کیا تین مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق ہے؟"

مردان گردن کھجاتے ہوئے مسکرایا — "پتہ نہیں — لیکن ایک شوبھا کا خوشی

سے بہت گہرا تعلق ہے۔"

"اور چاچی برگیتا؟"

"اِس بار وہ مجھے تھوڑی سی ناخوش محسوس ہوئیں — اُن کی بے دھڑک اور یک لخت اظہار کی باتیں کھنچی کھنچی سی لگتی تھیں۔ مشاہد بھائی جان بہت چُ قسم کے دن گزارتے ہیں۔ زیادہ میل ملاپ بھی نہیں — مشاہد ڈاکٹر ارشد کی ش رہے تھے — شکار — کوئی ایک آدھ ٹی وی پلے، سات کمروں والی کوٹھی برگیتا... اور برگیتا تمہارا بہت پوچھتی تھیں.. اگلی بار اگر تم میرے ساتھ نہ ہوئیں سے بات بھی نہیں کریں گی —"

"گڈ فار یُو —"

"اور... ڈاکٹر ارشد کی شادی ہو رہی ہے بالآخر..."

"گڈ فار ہم —"

اُس کے ہڈ پیر ابھی تک مضبوط دکھائی دیتے تھے لیکن اُس کا گوشت ڈھلا اور کانوں کے اوپر ایک سفید جھالر کے سوا سر پہ صفائی تھی اور وہ کافی دیر سے ٹرے دروازے میں کھڑا تھا اُس لمحے کے انتظار میں جب باپ بیٹی کے مکالمے میں خاموشی کا آئے اور وہ کہے — کپتان صاحب میں اندر آ جاؤں — اور فوری طو سے جواب آنا تھا کہ بیٹ مین بشیر میں اب کپتان نہیں ہوں... تم میرا نام بلایا کرو بیٹ مین بشیر نے ٹرے رکھ کر بے حد فخر سے اُسے سیلوٹ کرتے ہوئے کہنا تھا کپتان صاحب۔

اور یہی کچھ ہوا۔

"میں جناب خاص طور پر اپنی بیٹی کے لیے کامونکی منڈی گیا اور وہاں گ کے پھاوا ہو گیا، باسمتی کی ہر قسم دستیاب تھی، لیکن چاولوں کا موٹا توٹا کسی کے پا — اور پھر... ایک آڑھتی کے پاس ایک تھیلا نکل آیا.." نہایت فاتحانہ انداز نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اعلان کیا۔

ٹرے میں موٹے چاولوں کا ایک ملغوبہ سا تھا اور سالن کے ڈونگے میں شو مچھلی کی نمکین مہک تھی۔

شوبھا بے دلی سے کھانے لگی۔ مردان کو جیسے زندگی میں پہلی بار کوئی نعم

ہوئی ہو۔

"کچھ بنگال کا ٹچ آیا بی بی جی؟" بیٹ مین بشیر اپنے پکوان کی داد کے لیے منتظر چہرہ لیے اُسے دیکھ رہا تھا "ادھر مچھلی کی وہ قسم نہیں ملتی جو ہمارے جیسور میں ملتی تھی.. اس لیے شوربہ گاڑھا نہیں ہوتا.. ٹھیک ہے بی بی؟"

"ہاں —" اور اُسی لمحے شوبھا کی ناک درد سے پچکی کیونکہ اُس کی پوروں میں ہیں ایک کانٹے کی چبھن داخل ہوئی۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی شوبھا نے بشیر کو باہر جانے کے لیے کہا اور پھر ایک رد کی شدت پر قابو پا لینے والے مریض کی طرح مردان کو دیکھنے لگی۔ کچھ کہے بغیر۔ دیکھتے ی اور مردان نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے "تم درست کہتی ہو لیکن.... مجھ سے رہا یں جاتا... آئی کانٹ ہیلپ اِٹ... بس میرا دِل رکھ لیا کرو۔"

"آپ مجھے وہ کچھ بنا رہے ہیں جو میں نہیں ہوں —"

"میں نے کہا تو ہے کہ تم درست کہتی ہو لیکن..."

"پہلے میں آپ کی خوشی کا خیال رکھتی تھی.. میں سوچتی تھی کہ اگر میں مچھلی بھات اُبکائیاں لیتے ہوئے نگل لوں تو میرے بابا کا چہرہ چمکے گا، اُن کے گالوں میں سرخی اُترے گی - اب ساڑھی کا رواج نہیں ہے اور آپ Insist کریں گے کہ میں وہی پرانے ڈیزائنز شوخ رنگوں کی اکڑی ہوئی ٹشو کی ساڑھیاں پہنوں اور اپنے دوست بچرز کو اپنے آپ ایک عجیب انداز میں مسکراتے دیکھوں... بابا آپ کو کتنا شوق ہے کہ میں بنگالی بولوں... اپنے شوق اور رویوں کی بھینٹ نہ چڑھائیں... پلیز بابا۔" مردان زبردستی مسکرانے کی شش کر رہا تھا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اُسے کوئی رنج نہیں ہوا اور وہ بالکل ایک ہلکے اور بے پرواہ انداز سے اُس کی باتیں سن رہا ہے اور جونہی اُس کی مسکراہٹ بجھنے لگی ھانے اُس کے گالوں پر ایک پُرشور بوسہ دیا اور پھر کہنے لگی "پلیز بابا..."

"بابا وری مچ پلیزڈ —" مردان کی آواز میں ابھی دُکھ تھا... کہیں کہیں۔

"لیکن یہ تمہارا حق ہے شوبھا..."

"نہیں۔ آپ کا ماضی مجھے یہ حق دے کر سُرخرو ہونا چاہتا ہے.. بوجھ کم کرنا چاہتا لیکن یہ میرا حق نہیں ہے — میرا حق اس ملک پر ہے اور وہ آپ مجھے دے نہیں ہے۔ آپ کے رویے کی وجہ سے میرے بچرز مجھے کہتے ہیں کہ تم ہم میں سے نہیں

ہو... کیوں نہیں ہوں جی — صرف اس لیے کہ آپ بات بے بات پر مجھے بنگالی کرتے رہتے ہیں.... اگر آپ ایسا نہ کرتے تو... میں بھی اتنی ہی پاکستانی تھی جتنی صبا نورالہدیٰ اور اب میں ایک عجوبہ ہوں.. پلیز بابا...“

”بوجھ تو میں کم کرنا چاہتا ہوں شوبھا پیارے... لیکن کم ہو گا نہیں.. کیونکہ مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —“ اور یہ کہہ کر وہ خود بھی ہنسنے لگا اور اُ ہنسی میں شوبھا کے سفید نکور دانتوں کی کھنکھناہٹ بھی شامل ہو گئی۔

”یہ کس قسم کی سینس آف ہیومر ہے بابا — ایمان سے آپ ایک عجیب و اور وہ کیا کہتے ہیں کہ محیرالعقول قسم کی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں — چار مرغابیاں ا — کیا آپ کی پوری فیملی ماشاءاللہ سے میٹر ہے — یعنی گھومی ہوئی ہے؟“

”نہیں صرف ہم دونوں — باجیاں تو بہت نارمل اور بہت پھونک پھونک کر رکھنے والی چیزیں ہیں- بظاہر تو وہ ازحد پریشان رہتی ہیں کہ مشاہد کی کوئی اولاد نہیں چوہدری اللہ داد کی نسل سات کمروں والی کوٹھی میں ہی ختم ہو جائے گی لیکن.... ا اندر اُن کی آس اُمید یہی ہے کہ بھائی جان یونہی تنہا تنہا رخصت ہو جائیں اور پھر د سے آنکھیں پونچھتی ہوئی آئیں اور سات کمروں والی کوٹھی پر قابض ہو جائیں —“

”اور آپ —“

”مجھے دلچسپی نہیں- نہ سات کمروں والی کوٹھی سے اور نہ گاؤں والی زمین- ہاں کبھی کبھی ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے پینٹ ہوتا چلا جاتا ہے اور اُس میں کے دو بہت بلند درخت ہیں اور اُن کے پتے ہوا کے زور سے تالیاں بجاتے ہیں، ہیں اور مجھ پر گرتے ہیں اور میں ایک بان کی چارپائی پر اُن کے سائے میں لیٹا ہوا ہ ایک کچا کوٹھا ہے، ایک ہینڈ پمپ ہے.... اُس کے پانی کی دھار موٹی اور ٹھنڈی ٹھار سردیوں میں اُس سے بھاپ نکلتی ہے اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بدن پر سو سویرے پڑتی ہے تو اُسے آسودگی دیتی ہے — لیکن کبھی کبھی...“

”آپ مرغیاں بھول گئے ہیں بابا —“

”ہاں —“ مردان نے سر ہلایا اور شوبھا کی آنکھوں میں دیکھا اور وہی منظ پینٹ ہو رہا تھا ”ہاں — مرغیاں بھی ہوں گی-“

”تو آپ کو دلچسپی ہے ناں گاؤں والی زمین سے — نہر کے کنارے جو آپ

ہے وہی آپ کے ذہن میں آتا ہے ناں —“

”ہاں... ایک ایکڑ زمین کے گرد اگر کچی چار دیواری کر لی جائے اور شیشم کے دو درخت... تم جانتی ہو کہ شیشم بہت تیزی سے بڑھتا ہے.. اُچیاں لمیاں ٹاہلیاں... تو بس دو تین سال کے اندر وہ چھاؤں کر دیں گی...“

”جانے دیں بابا...“

”کیوں جانے دیں...“

”یہ آپ کی فینٹسی ہے.. پتہ ہے وہاں مچھر کتنا اور کس سائز کا ہوتا ہے... کھانا کون پکا کرے گا... کپڑے کون دھوئے گا — اور...“ شوبھا جو نہر کنارے دو شیشم کے درختوں تلے بان کی چارپائی تھیوری کو بہت سن چکی تھی اور تنگ آ چکی تھی ایک طویل بحث کرنے کے موڈ میں تھی... ”اور رات کے وقت وہاں اندھیرا ہو گا — لالٹین کی روشنی میں دیکھنے کے لیے آج سے سو برس پہلے کی آنکھیں درکار ہیں ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا... قریبی بیلے یں آپ ہی نے بتایا تھا کہ گیدڑ اور سؤر بہت ہیں تو وہ رات کے وقت بولیں گے — بولیں گے کہ نہیں بولیں گے؟“

”بولیں گے —“ بہت شرمندہ ہوتے ہوئے اُس نے کہا۔

”اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ وہاں ایک بھینس بھی پالیں گے —“

”بھینس پالی نہیں رکھی جاتی ہے —“

”رکھی جانے سے بھی بھینس تو بھینس ہی رہتی ہے ناں — ادھر بہت کم دکھائی دیتی ہیں کراچی میں — لیکن جب کبھی کہیں نظر آ جائے تو میں تو بس پلٹ پڑتی ہوں-“

”بھئی تم کیوں اتنی سنجیدہ ہوتی چلی جا رہی ہو اس دو شیشم کے درخت اور بان کی چارپائی تھیوری کے بارے میں؟... ایک تو میں ذرا اپنا دل پشوری کرتا ہوں تو تم بھی میرا دل رکھ لیا کرو — اور اس کا تم سے تعلق؟.. تم تو وہاں نہیں ہو گی بھینس اور مرغیوں کی رکھوالی پر — یہ سب منصوبہ بندی اُس لمحے کے بعد کی ہے جب تم ہیپی لی میریڈ ہو جاؤ گی...“

”اور جب میں ہیپی لی میریڈ ہو جاؤں گی تو میرا آپ کا تعلق واسطہ ختم ہو جائے گا اور میں اس کے بعد یعنی ہیپی لی میریڈ ہونے کے بعد کبھی آپ سے نہیں ملوں گی...“

”یہ کیا کہتی ہو —“

"اگر ملوں گی تو وہیں آؤں گی — نہر کے کنارے بیلے والی زمین کے قر
شیشم کے دو درخت اور بان کی چارپائی.... مرغیاں اور بھینس.... تو پھر میرا تعلق اس تھ
سے ہوا یا نہیں؟"

"تم ضرورت سے زیادہ پریکٹیکل ہو شوبھا — ہر انسان موجودہ ہوا اور زما
پرے ہونا چاہتا ہے... وہ اپنی چاردیواری سے الگ ہو کر کسی اور سائے میں بیٹھنا تو چا
ناں.. وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے؟ شاید اُس میں فنا کی تمنا کا اخیر آ رہا ہوتا ہے... کبھی غو
جب کسی جانور میں، پرندے میں فنا کی ٹھنڈک وہاں تک سرایت کر جاتی ہے جہاں
واپس نہیں آ سکتی تو اُسے علم ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ الگ ہو کر کسی تنہا اور پُرسکون
جا بیٹھتا ہے اور اُس کا وجود دُکھ سے بھاری ہو رہا ہوتا ہے — وہ آنکھیں نہیں ملاتا
ملاتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ جو میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھتے، میں تم سے الگ
ہوں.. نہر کے کنارے، بیلے والی زمین کے قریب..."

وہ اُٹھی اور اُس کے جھکے ہوئے کندھوں پر اپنی بانہہ رکھ دی اور اُس کا ایک
دبایا تو مردان نے اُس کی طرف دیکھا "آپ کدھر چلے گئے ہو بابا... فنا کی ٹھنڈ
روزانہ میرا واسطہ پڑتا ہے، فارملین کی بُو میرے نتھنے پہچانتے ہیں... میں اس شیشم
درختوں والی تھیوری کے بارے میں زیادہ سیریس تو نہیں تھی۔ لیکن آپ کدھر چلے
میں موت کی ملاقات کو پہچانتی ہوں اور وہ آپ کے آس پاس سینکڑوں کلومیٹر تک
نہیں ہے، اگر ہوتی تو مجھے دکھائی دیتی —"

"وہ ہے —"

"نہیں.. ایک اور فینٹسی.."

مردان نے گردن گھما کر کندھوں پر رکھے شوبھا کے بازو کو دیکھا۔ کھڑکی
سرما کی ہلکی دھوپ جو آتی تھی تو اُس کی پیلاہٹ سے اُس کے چھوٹے چھوٹے
روشن ہوتے تھے "یہ ٹھنڈک مجھ میں نہیں ہوا میں ہے —"

وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے اُٹھی۔

"نہیں۔ صرف اس کمرے میں ہی نہیں باہر بھی ہے — ایک ٹھنڈک
کا آغاز ہو چکا ہے اور یہ وہاں تک پہنچے گی جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ گوشت
بار یخ ہو جائے تو زندگی کی حدت دوبارہ نہیں آ سکتی —"

"You are a pessimist Baba."

"نہیں میں pessimist ہرگز نہیں ہوں... میں تو خواہ مخواہ کا optimist ہوں..
لیکن میں کیا کروں کہ وہ ٹھنڈک میں نے محسوس کر لی ہے۔ میرا بدن مجھے بتاتا ہے کہ آغاز
ہو چکا ہے — شیشم کے دو درخت اور بان کی چارپائی تھیوری صرف میرے لیے نہیں
ہے... میں بھی دوسروں سے آنکھیں نہیں ملاتا۔ اگر ملاؤں گا تو وہ جان جائیں گے کہ جو
میں دیکھ رہا ہوں وہ نہیں دیکھتے..."

"آپا نازنین اور عارفین روزانہ فون کرتی تھیں —"

"ہیں..." مردان کو جھٹکا سا لگا۔ نازنین اور عارفین کے شہتیر دھڑام سے اُس پر آ
گرے اور شوبھا ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ جب بھی وہ قدرے بھٹک جاتا تھا تو اُسے واپس لانے
کے لیے شوبھا اسی طرح کرتی تھی... وہ کہیں دور پہنچا ہوتا اور وہ کہتی اس مرتبہ بجلی کا بل
بہت زیادہ آیا ہے ذرا میٹر تو چیک کریں — یا پھر — سبزی والا آج پھر سبزی کے ساتھ
دھنیہ اور ادرک دے کر نہیں گیا —

"وہ کہتی تھیں جس روز بابا لوٹیں اُسی شام ہمارے ہاں آنا ہے — اور بابا یہ
نازنین تھیں یا عارفین میں ہمیشہ بھول جاتی ہوں —"

"اب تو میں خود بھی بھول جاتا ہوں —" مردان نے ہونٹوں کے کونوں میں آئی
ہوئی نمی کو اُنگلی سے صاف کیا اور مسکرانے لگا "ایک اور بات جو میں بھول چکا تھا۔ لاہور
میں برف گر رہی تھی اور ساز بج رہے تھے جب میں نے بابا نذیر احمد کے فلاپی ہیٹ والے
سر کو ایک کینوس پر جھکے دیکھا اور وہ راوی کی ریت پر کھڑا کامران کی بارہ دری کو پینٹ کر
رہا تھا..."

"لاہور میں برف گر رہی تھی؟"

"ہاں... وہاں کرسمس تھی صرف اسی لیے میرے لیے جس طرف میں دیکھتا تھا
برف گرتی تھی اور ساز بجتے تھے..." مردان اُٹھا اُس کا بدن اُس طور سیدھا نہ ہوا جیسے کہ وہ
پچھلے زمانوں میں بے تکان اور ملائمت کے ساتھ سیدھا ہوتا تھا۔ اُس کے اندر کہیں کہیں
رکاوٹ کی سخت گلٹیاں تھیں۔ دیوار کے ساتھ براؤن پیپر میں لپٹی پینٹنگ کسی کی نظر میں
نہ آئی تھی۔ مردان نے کوشش کے ساتھ اپنے پاؤں کو گھسٹنے سے بچایا اور پینٹنگ تک
گیا۔ جھکا اور اُسے اُٹھا کر براؤن پیپر سے الگ کر کے دیکھنے لگا... جیسے وہ ایک روشن آئینہ

دیکھتا ہو۔ اُس کا چہرہ تصویر میں جو کچھ دیکھتا تھا اُس سے دمکتا تھا۔ اُس نے جُھک
دیوار کے ساتھ لگا دی اور پیچھے ہٹ گیا — "یہ بھی تمہارے لیے ہے —"

پرانا ملیر کینٹ کب کا اُجڑ چکا تھا سوائے ایک کونے میں پڑی تین برطانو
بیرکوں کے جن میں گورا لوگ کبھی رہائش پذیر نہیں ہوئے تھے، یہ کسی سپلائی
گودام کا حصہ تھیں اور اسی لیے ان میں الگ الگ کمروں یا غسل خانوں کا کوئی
تھا۔ انہیں رہائش کے قابل بنانے کے لیے لکڑی اور ہارڈ بورڈ سے پارٹیشن کر
غسل خانے بعد میں تعمیر کیے گئے لیکن اتنے عارضی کہ دروازوں کی جگہ ابھی تک
کے تختے نصب تھے جو تیز اور نمکین ہوا کے زور سے سارا وقت چرچراتے تھے
بیٹھنے والے کو انہیں مضبوطی سے تھامے رکھنا پڑتا تھا۔ ان کی واحد خوبی ان کا ہو
تھا۔ ایک بیرک میں کسی نامعلوم فوجی افسر کا سامان عرصہ دراز سے دُھول جمع کر
نمی جذب کر رہا تھا۔ لکڑی کی درزوں میں سے ایک آنکھ صرف یہ دیکھ سکتی تھ
پرانے گرینڈ فادر کلاک ہیں اور وہ ظاہر ہے بند پڑے ہیں۔ فرش پر کلموڑہ سما
خاندانوں کی قبروں کے شاندار تعویز اور بیل بوٹوں والے پتھروں کی کئی سلیں رکھی
میں کم از کم دو قبروں کے پتھر مکمل تھے۔ صرف اُن کے نیچے ہڈیاں نہیں تھیں
مکمل قبریں تھیں۔ یہ مکلی کے قبرستان کا ایک حصہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھٹھہ
دنیا کے اس سب سے بڑے قبرستان کی پشت پر صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر کا فر
تھا اور ممبر کی پجارو گاڑی کو ذرا اوپر سے ہو کر فارم تک جانا پڑتا تھا او
inconvenient تھا۔ ممبر چونکہ حکومتی اور عوامی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے
انہیں قطعی دِقّت نہیں ہوئی جب اُن کے بُل ڈوزر نے تقریباً تیس کے قریب
مقبروں کو بل ڈوز کر کے فارم تک کا راستہ ذرا Convenient کر لیا.... اگرچہ ان
اکثر مقبرے، ڈھلتی دھوپ کی زردی ایسے پتھروں سے مزین، جن پر بیل بوٹوں
سیاہی، گھوڑے اور دیگر جانور نقش ہیں، حکمرانوں کے تھے لیکن — مُردہ حک
ہڈیوں سے زندہ حکمرانوں کی پجارو کے ٹائروں کی Convenience زیادہ اہم ہے
نامعلوم فوجی افسر کا گذر ادھر سے ہوا تو انہیں اپنے تاریخی ورثے کی تباہی پر بے حا
اور وہ ان پتھروں کو ایک ٹرک میں ڈال کر اس بیرک میں لے آئے۔ بعد میں

یمہ والوں نے ان پتھروں کو تحویل میں لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اُن کے پاس انہیں
ٹور کرنے کے لیے جگہ نہ تھی اور یوں بھی ان نامعلوم فوجی افسر پر نوادرات کو چوری
رنے کا مقدمہ بن سکتا تھا۔ اپنے گھر وہ اس لیے نہ لے جا سکے کہ اُن کی بیگم پر قبروں کے
ر دیکھ کر غشی کا دورہ پڑ گیا تھا چنانچہ وہ یہیں تھے اس پرانی بیرک میں، دُھول اور نمی کے
اتھ اور گرینڈ فادر کلاکس کی خاموش رفاقت میں —
دوسری بیرک بالکل خالی پڑی تھی۔ اگرچہ ادھر بہت کم بارش ہوتی تھی لیکن جب
ی ہوتی، ٹین کی چھت میں زنگ سے بنے ہوئے بڑے بڑے سوراخوں میں سے پانی
بشاروں کی صورت اندر آتا اور مہینوں تک اُس کے قریب سے گذرنے والوں کو ایسے
ہڑوں کی بو آتی جن میں پانی کیچڑ میں بدلنے سے مچھلیاں مرجاتی ہیں۔
ان بیرکوں کے آگے نئی چھاؤنی کا وسیع کامپلیکس تھا اور ان کے پیچھے — ایک نیم
رائی لینڈ سکیپ تھی جس کے آخر میں ایک طویل فاصلے پر کچھ عمارتیں ہوا میں جھلملاتی
ی نظر آتی تھیں... یہاں صرف وہ پہنچ سکتا تھا جس کو مجبوری ہو ورنہ کاغذ پر لکھے پتے کو
یکھتے ہوئے یہاں پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔ اور یہاں کا پتا تھا بھی نہیں — ملیر کینٹ کے آخر
ی واقع تین بیرکوں میں سے ایک بیرک، تو کوئی پتا نہ تھا۔ یہاں تک صرف ایک کچا راستہ
اتا تھا۔ اور اُس پر شوبھا کی پرانی فوکسی آتی تھی بلکہ کبھی آتی تھی اور کبھی کھڑی ہو جاتی
ی اور پھر مردان اُس کی بیٹری کی تاریں جوڑ کر اُسے سٹارٹ کر کے لے آتا تھا۔ اور کبھی
ردان کی سپورٹس سائیکل آتی تھی — بیٹ مین بشیر بھی ایک مدت سے اسی راستے پر آتا
اتھا۔

کراچی کے نویں نکور قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اُترنے والے جیٹ اس
بن کے عین اوپر آکر اپنے ٹائر پنجوں کی طرح نکالنے لگتے تھے۔
اُترتے جیٹ کے انجن کی گونج سے کیبن کے تختے لرزنے لگتے... دیوار کے تختوں
ساتھ لگی تصویر بھی لرزی اور اُس پر پینٹ کی ہوئی لینڈ سکیپ میں جیسے زندگی سانس
نے لگی...پانی بہتا ہوا محسوس ہوا۔
مردان پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا — ہاں، یہ بھی تمہارے لیے ہے۔
آبی رنگوں میں راوی کے پانیوں کی پینٹنگ تھی۔ دسمبر کا گدلا آسمان اور بجھی
ی سرد دھوپ۔ کامران کی بارہ دری کے حفاظتی پشتے کے ساتھ لگ کر بہتا ہوا راوی۔

پشتے پر وہ نشان بھی نظر آتے تھے جہاں تک گرمیوں میں پانی بلند ہوتا تھا۔ ان دنوں بہت نیچی ہو جاتی تھی۔ کچھ حصوں میں کشتیوں کے تلے ریت میں دھنس جاتے تھے۔ نذیر پانی کو کچھ اس طرح مصور کرتا تھا کہ کاغذ گیلا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ اُس کے مداحوں کہنا تھا کہ وہ کینوس پر سٹروک لگانے کے بعد پانی کو کہتا تھا کہ تو پانی ہو جا اور اس میں روا آجاتی تھی۔ وہ بہنے لگتا تھا۔ شوبھا کو پانی کی تصویریں پسند تھیں اور ایک عرصے سے وہ نذیر کی کوئی پینٹنگ own کرنا چاہتی تھی.... اُس نے تصویر کو بہت دیر تک دیکھا اور پھر مردان کی طرف نگاہ کی اور سر کو ذرا سا ہلایا۔

"تھینک یو بابا —"

مردان وہیں کھڑا رہا —

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں — اُن میں سے ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس — اور وادی سوات کا ایک سلیٹی منظر ہے — اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے — اور...

اور کیا واقعی چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں؟

ڈیفنس کے اُس مینشن نما گھر کے پورچ میں جسے باہر کی دیوار کے ساتھ سرسبز کٹاؤ والے پتوں کے ناریل درختوں کی وجہ سے ناریل والا گھر کہا جاتا تھا قدیم ماڈلز کی لیکن تقریباً شو روم کنڈیشن کی دو کاریں آگے پیچھے اینٹوں کے چبوتروں پر ایک عرصے سے Rest in peace کر رہی تھیں۔ ہر دوپہر بڑی باقاعدگی سے پورے چار بجے ایک ناتواں سا شخص صابن، پالش اور سفید ٹاکیاں اُٹھائے چپکے سے گیٹ کھول کر اندر آتا، لان کے نل پر ربڑ پائپ فٹ کر کے اِن کاروں کو دھوتا، پالش کر کے خوب چمکاتا، خشک کرتا اور پورے چھ بجے گیلی ٹاکیاں ایک پلاسٹک بیگ میں ڈال کر گیٹ کھولتا اور چلا جاتا — وہ پچھلے انیس برس سے اس روٹین پر عمل پیرا تھا۔ ایک بار وہ سوا پانچ بجے پہنچا تھا کیونکہ اُس کی بیوی کا جنازہ چار بجے اُٹھنا تھا اور بار بار گھڑی دیکھنے کے باوجود اُسے پورے پانچ بجے سے پہلے دفنایا نہیں جا سکا تھا — رمضان شریف میں اگر افطار کا وقت اس روٹین کے درمیان میں آجاتا تو وہ روزہ بھی یہیں کھول کر گھر لوٹتا — ان دو کاروں کے ماڈل بھی انیس برس پیشتر کے تھے.... اتنے ہی برس جتنے برس سے اس گھر کے مکین دوسروں سے لاتعلق ہوئے تھے۔

مردان نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھلا تھا۔ وہ فون کر چکا تھا کہ وہ اور شوبھا پورے ساڑھے چھ بجے آئیں گے — اسی لیے دروازہ کھلا تھا۔ گیٹ پر یا صدر دروازے پر کوئی کال بیل نہ تھی کیونکہ کال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ چند ایک جو آتے تھے فون کر کے وقت بتا دیتے تھے اور اُس وقت سے دو منٹ پیشتر دروازہ کھول دیا جاتا تھا۔

پہلی منزل کے مرکزی دروازے سے مکمل قوسوں کی شکل میں زینے نیچے ہال تک آتے تھے۔ دوہرے پردے کھنچے ہوئے تھے اور صرف دو صوفوں پر سے سفید کور اُٹھا کر اُن بیٹھنے کی گویا اجازت دی گئی تھی۔ بلند چھت سے بظاہر ایک کمزور سی زنجیر سے لٹکتا فانوس روشن تھا لیکن اُس میں صرف چار بلب تھے، باقی بلب بجلی بچانے کی غرض سے اُتار کر ڈبوں میں محفوظ کر لیے گئے تھے۔ شوبھا سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی ایک کھڑکی تک گئی اور پردہ

ہٹا دیا۔ یہاں سے نظر آنے والا باغ کا حصہ بھی تراش خراش اور لے آؤٹ کی
سے مکمل توجہ کا پتا دیتا تھا۔ صوفوں کے پہلو میں تپائی پر ایک بھاری ٹی کوزی کے نیچے
ٹاکی چائے دانی گرمی سے پسینے میں نہائی ہوئی لگتی تھی۔ شوبھا نے حسبِ معمول
بنائی۔

اور چائے کے آخری گھونٹ کے ساتھ ہی حسبِ معمول بیگم بابر اندر آگئیں
ایسے آئیں جیسے ایک نابینا شخص احتیاط سے ہاتھوں سے دیکھتا ہوا اور آوازوں
دھرے چلتا آتا ہے۔ وہ خاصی طویل قامت تھیں لیکن ان کی فربہی نے اُن کا قد
تھا۔ اُن کی رنگت بہت ستھری اور سفید تھی۔ عینک کا شیشہ اتنا دبیز تھا کہ اُن کی آنکھ
بجائے صرف پتلیاں سی حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ ساڑھی ان کی جوانی میں
فیشن ایبل لباس سمجھا جاتا تھا اور اب جب کہ یہ تقریباً متروک ہو رہی تھی بیگم بابر
کسی اور پہناوے میں نہیں دیکھا گیا تھا۔

"بیٹھو مردان —" اُنھوں نے ہاتھ کے اشارے سے تعظیم کے لیے اٹھ
مردان کو وہیں روک دیا اور مردان جانتا تھا کہ کس زاویے پر پہنچتے ہی بیگم بابر اُسے
مردان" کہیں گی چنانچہ مردان بیٹھ گیا۔

بیگم بابر نے شوبھا کی طرف دیکھا جو سلام کرنے کے انتظار میں اپنی مسکراہٹ
اختتام پر پہنچ رہی تھی۔

"مردان یہ تم نے بہت اچھا کیا بیٹے — مبارک ہو" اُنھوں نے شوبھا کی
اُنگلی سیدھی کرکے اُسے مزید غور سے دیکھا۔

مردان فوراً جان گیا کہ آنٹی بابر حسبِ معمول بھٹک رہی ہیں، کچھ گمشدہ
وہ پتہ نہیں کس کو کیا سمجھ رہی ہیں۔

"کس چیز کی مبارک دے رہی ہیں آنٹی؟"

"بھئی تم نے شادی جو کرلی — بہت اچھا کیا۔"

"یہ شوبھا ہے آنٹی — میری بیٹی۔"

"ہائے۔ ہائے" بیگم بابر نے سینے پر ماتم کرنے کے انداز میں ہتھیلی مارتے
افسوس کا اظہار کیا۔ "بالکل ہے — میں اپنی بیٹی کو نہیں پہچانتی؟ ادھر آؤ بیٹی —"
مسکراتی ہوئی آگے آئی اور بیگم بابر سے سر پر ایک تھپکی پیار وصول کرکے واپس ہو گ

بیگم بابر قطعی طور پر مخبوط الحواس نہیں تھیں.. وہ حواس میں تھیں لیکن اُن کے
حواس پر ان کی عمر کے پچھتر برس اور کچھ واقعات اثرانداز ہوئے تھے۔ وہ بھول جاتی
تھیں... فارگٹ فل تھیں — مخبوط الحواس نہیں تھیں۔

"میں نے سُنا تھا کہ تم لاہور گئے تھے۔ کب آئے اور شوبھا کو اُس کھٹارہ بیرک میں
ند کرکے کیوں چلے گئے — ہمارے ہاں چھوڑ جاتا تھا — شادی تو غالباً تم نے ابھی نہیں
کی؟"

"نہیں جی —"

شوبھا ذرا آگے ہو کر بولی اور ذرا سرگوشی میں بولی "بابا میرا خیال ہے کہ آنٹی بابر
ے مل کر میں ایک کنسپریسی کروں اور آپ کی شادی کردی جائے —"

"اِس ملک میں مزید کنسپریسیوں کی گنجائش نہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"ہنستے کیوں ہو مردان؟" آنٹی بابر نے فوراً دریافت کیا اور پھر شوبھا کی جانب متوجہ
گئیں "میرا خیال ہے تم نے اِسے کچھ کہا ہے؟"

"جی آنٹی — میں بھی اس خیال کی حامی ہوں کہ بابا کی اب شادی ہو جانی
ہیے۔"

"ہائیں اس کی شادی نہیں ہوئی؟" بیگم بابر بہت فکرمند سنجیدگی کے ساتھ کہنے
لیں "تو پھر یہ بیٹی کہاں سے آگئی —"

"یہ بیٹی —" مردان نے ایک ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا "یہ پتہ نہیں کہاں سے آ
ئی..."

بیگم بابر نے اُن سے چائے کے بارے میں دریافت کیا کہ گرم تھی یا کہ نہیں،
دان سے پوچھا کہ اُس کا سکول کب کھل رہا ہے۔ پھر "لڑکیوں" کے بارے میں باتیں
رنے لگیں، ایک مرتبہ پھر اُن کو شک ہوا کہ مردان نے شادی کرلی ہے اور اُن کو بتایا تک
ں، پھر وہ کافی دیر تک شوبھا کی شادی کے حوالے سے فکرمند رہیں اور پھر "میں ذرا
لگھ لوں" کہہ کر فوری طور پر سو گئیں۔ اُسی کرسی پر اور اُسی حالت میں — صرف اُن
بلند آہنگ خراٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہیں۔

بیگم بابر دن یا رات کے کسی بھی وقت صرف تیس سیکنڈ کے اندر اندر کسی بھی
مدت کے لیے سو سکتی تھیں۔ یہ اُن کا کمال تھا.. نیند اُن کی بندی تھی۔ مردان نے

اُن کی جانب دیکھا — وہ اُس روز بھی اسی طرح سو رہی تھیں... چند سرخ دھبے ا
سفید ساڑھی پر تھے ورنہ وہ اسی طرح سو رہی تھیں۔

شوبھا بھی اُن کو دیکھ رہی تھی — یہ حواس باختہ سی عورت کیا اُسے ماؤں سے
کر محبوب رکھتی ہے یا عینک کے دیوار شیشوں کے پیچھے جو آنکھیں روپوش ہیں اُن میں
کے لیے ایک ناپسندیدگی ہے جو نفرت کو اپنے دماغ سے دھکیلنے کی کوشش میں جز
ہے... اُن آنکھوں میں سب کچھ ہے جو اُنھوں نے دیکھا ہوا ہے لیکن سرے کا پتہ
چلتا، گنجل بہت ہیں، کہاں سے آغاز ہوا تھا اور اختتام کا دھاگہ کدھر کو جا رہا ہے۔
دھاگہ انیس برس کی مسافت طے کرنے کے باوجود پہلے دن کی طرح پکا پیڈا ہے یا اُ
تار بوسیدہ ہو کر الگ ہونے کو ہیں؟.... یہ سب کچھ دیوار شیشوں کے پیچھے تھا، اور وہا
خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایک آہٹ ہوئی اوپر پہلی منزل کی لینڈنگ پر اور شوبھا نے متوقع نظروں سے
دیکھا... وہاں دونوں ''لڑکیاں'' کھڑی تھیں۔ اُنھوں نے بہت آہستگی سے ہاتھ ہلا کر شو
خوش آمدید کہا، اتنی آہستگی سے جیسے خواب میں ہوں اور پھر وہ زینے سے اُترنے لگ
نازنین بابر زری کے سرخ رنگ کے چست پاجامے اور ٹشو کے گولڈن کُرتے میں،
میں سلیم شاہی جوتی اور سرخ دوپٹہ جو اُس کے پیچھے زینہ زینہ گھسٹتا آ رہا تھا۔ عارفی
اُس کے برابر میں تھی، ٹشو کے بڑے گھیروالے غرارے اور دَبکے کے کام والے د
میں — وہ نازی سپاہیوں کی طرح ایک تواتر اور تسلسل کے ساتھ قدم ملاتی نیچے آ
تھیں۔

مردان کے کانوں میں اُن کے قدموں کی چاپ آ رہی تھی اور قریب آ رہی
وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اُس نے ہمیشہ اُن کی جانب دیکھنے سے اجتناب کیا اور جب
غیرارادی طور پر اُس کی نظر اُن پر پڑ گئی تو اُس کے کانوں کی لویں گرم ہو جاتیں اور ایک
احساسِ شرمندگی سے اس کا پورا بدن پسینے سے بھیگنے لگتا۔ اُنھوں نے جو کچھ بھی زیب
کیا ہوتا وہ اُسے کبھی نظر نہ آتا...

وہ دونوں اُس کی عمر کے آس پاس ہی تھیں لیکن وقت کی ہوا نے اُن کے
کو بہت اتھل پتھل کیا تھا اس کے باوجود کہ وہ ہمیشہ اونچی چھتوں والی وسیع رہائش
میں ''محفوظ'' پڑی رہیں۔ جیسے ٹوکری میں دیر تک پڑے رہنے والے سیب پر بھی جھ

جاتی ہیں۔

ان دونوں نے باری باری شوبھا کے آگے اپنے گال کیے اور اُن پر بوسے وصول کر
کے جواب میں اُسے بھی چوما۔

مردان نظریں جھکائے بیٹھا رہا اور عارفین کے ''کیسے ہو مردان؟'' کے جواب میں
وہ غیرواضح الفاظ میں کچھ بڑبڑایا۔

شوبھا کے رُخسار پر عارفین کی شاکنگ پنک لپ سٹک کا نشان صرف اس وقت
دکھائی دیتا جب وہ گردن گھما کر مردان کی جانب دیکھتی... اور فانوس کے دوسرے بلب کی
روشنی کی زد میں آ جاتی۔

بوڑھی ہڈیوں کی تھکاوٹ کا سرور، ایک بے مقصد زندگی کی اُکتاہٹ بھری نیند، اور
اس نیند میں لڑکیوں کی آوازیں، پھر اونگھنا، پھر مشکل سے آنکھیں کھول کر موٹے شیشوں
کے پار کچھ ہیولے دیکھنا... بیگم بابر نہ نیند میں تھیں نہ بیدار تھیں... وہ کچھ بھی نہ تھیں،
لیکن اب بھی انہیں دوسری منزل کے سٹورز میں پیک کیے ہوئے ڈِنر سیٹس، ڈیپ فریزرز،
فرنیچر، ملبوسات، قالینوں، ڈریسنگ گاؤنز، طوطوں کے لیے چاندی کے پنجروں اور اُن
سینکڑوں اشیاء کی ایک ایک تفصیل یاد تھی جو عارفین کے لیے تھے اور تیسری منزل کے
سٹور میں ہر اُس شے کی ڈپلیکیٹ تھی جو دوسری منزل کے سٹور میں موجود تھی، یہ سب
کچھ نازنین کے لیے تھا۔ بہار کے پہلے دنوں میں یہ تمام سامان باہر نکالا جاتا، اس کی ڈسٹنگ
کر کے دوبارہ پیک کیا جاتا اور کارٹنز پر نمبر لگا کر اُن کی فہرست بنا کر پھر سے سٹور کر دیا
جاتا۔ اس لمحے میں جب وہ نیند میں نہیں تھیں، بیدار نہیں تھیں.. وہ اپنے ذہن کے
کینوس پر کسی ایک ڈنر سیٹ کی کوارٹر پلیٹ پر بنے ہوئے کسی ایک پھول کی پتّی کی تفصیل
پینٹ کر سکتی تھیں۔ کٹلری کے فلاں سیٹ میں سوئٹس کے لیے جو چمچے ہیں اُن کی شیپ کیا
ہے اور فلاں رنگ کی رضائی میں کتنے سیر روئی ہے — یہ سب کچھ نقش تھا — اور یہ جو
مردان ہے، نظر تو آ رہا ہے لیکن.... یہ اب بھی عارفین کے سامنے نظر جھکا کر بات کرتا
ہے، اِس کی طرف دیکھتا نہیں.... جواری جب سب کچھ ہار جاتا ہے تو ایک ناممکن خیال
اُسے بار بار ستاتا ہے.... اگر وقت ذرا پیچھے چلا جائے صرف اُس لمحے تک جب میں جوئے
کی میز پر بیٹھنے والا تھا اور اُس وقت میرے پاس سب کچھ تھا... دولت، گھر، زمینیں، عزت
نفس... تو میں اس میز پر نہ بیٹھوں اور یہ سب کچھ اب بھی میرے پاس ہو — نہیں اگر

وقت پیچھے چلا جائے تو بھی حیات کے اس جوئے کا End Result یہی ہونا تھا... وہ مردا کیسے قبول کرلیتیں، ایک معمولی کپتان کو جو کوئی بھی میڈیا کر لڑکا ہو سکتا تھا اور وہاں ق ہی میڈیاکرز کو کیا جاتا تھا... عارفین اُس کے لیے بہت بلند اور بہت پرے تھی... شاید ہتھیار ڈال دیتیں اگر عارفین کی باگیں عشق بہت تناؤ میں رکھتا اور اُس کے نتھنے چڑ آتے اور وہ اُس کی الفت میں بہت ہی مبتلا ہو جاتی... پر ایسا نہیں تھا، وہ کوسے گرم پا طرح تھی، مردان نہ تو اُس کے احساسات کو برانگیختہ کرتا تھا اور نہ ہی مکمل طور پر چھوڑتا تھا... حیات کے اس جوئے کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ ہاں مردان نظر تو آ رہا ہے اور یہ ا بھی عارفین کے سامنے نظر جُھکا کر بات کرتا ہے۔ یقیناً اسے خیال ہے کہ میں سو چکی ہ اور میرے خراٹے اس بات کی دلیل ہیں لیکن خراٹے تو میں خود بھی سن رہی ہوں... لا اینڈ کلیئر.... اور اس کا خیال ہے کہ میں نے اُس روز اسے کھڑکی میں سے اندر آتے ہ دیکھا تھا....

عارفین ننگی پڑی تھی۔

اُس کی ٹانگیں کُھلی ہوئی تھیں ان کے اوپر چھوٹا سا سبز پرچم پڑا ہوا تھا۔ گاڑھا اور گہر رنگ کا خون جو چاند تارے کی سفیدی میں سرایت کر رہا تھا، عام خون نہ تھا...

مردان اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ اس کی پہچان چہرے کی محتاج تھی... اور یہا ایک اجنبی بدن تھا۔ وہ ذرا آگے ہوا، جُھکا، چہرے کو دیکھا اور پیچھے ہو گیا۔

ظہیر الدین بابر کا گھر مرجع خلائق تھا۔ نوجوان فوجی افسر اپنے اپنے چکوال، گجرات اور صوابی سے دور ایک ہوسٹائل اینوائرمنٹ میں غیر محفوظ محسوس کرتے ہوئے د مکھیوں کی طرح آتے تھے۔ اور وہاں اُنہیں چائے کے ساتھ ہمدردی ملتی تھی جو اداس توڑ تھی۔ اور وہاں لڑکیوں کی آوازیں تھیں اور اُن کی خوش گفتاری میں کانونٹ کے دل مٹھی میں بھر لینے والے لہجے تھے۔ بیگم بابر تھیں جو ہر لڑکے کا نام ہر پانچ منٹ کے بعد پوچھتیں اور پھر "یو آر ویلکم لیڈ" کہتیں۔ بابر سول سروس کے آخری برسوں میں تھے جیسور کی پوسٹنگ کو "پُنش پوسٹنگ" کے طور پر برداشت کر رہے تھے۔ ان کا آرکیٹیک

روزانہ کراچی سے کال کر کے اُن سے اُن کی زیرِ تعمیر کوٹھی کے باتھ رومز کی ڈائمنشنز کے ارے میں دریافت کرتا۔ ظاہر ہے ریٹائرمنٹ کے بعد اُنہوں نے کراچی میں سیٹل ہونا تھا کہ ہی تہذیب یافتہ رویہ تھا۔ سروسز میں وہ مشرقی پاکستان کے کوٹہ میں سے آئے تھے صرف س لیے کہ Natives اتنے بریلینٹ نہیں تھے ذرا ڈل وِٹڈ تھے اور بابر بہاری ہونے کے وجود اپنے سبارڈی نیٹس سے باقاعدہ بنگالی میں "تو می کیمون آچھو" پوچھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ نہایت انکساری سے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی زبان کو بنگالی ماحول کے باوجود لودہ نہیں ہونے دیا۔ مردان اپنے فیلو آفیسر کیپٹن گل ریز کے ہمراہ جھجکتے ہوئے ایک بار نٹی بابر کی رہائش گاہ پر آیا اور پھر ریگولر ہو گیا۔

باہر بہت بدامنی تھی لیکن آنٹی بابر کے گھر سکھ چین تھا اور ایک چھوٹا سا مغربی ستان آباد تھا... نوجوان افسروں کے چہرے باتیں کرتے کرتے سرخ ہو جاتے، اُن میں سے ایک عارفین یا نازنین یا دونوں پر فدا تھا... گھر سے دور وہ اُن کی جانب دیکھتے تو اُن کی نھیں ڈبڈبانے لگتیں۔ وہ "آرڈر آف دی ڈے" ڈسکس کرتے لیکن اُن کی نظریں ادھر ہی اُٹھتی رہتیں... یار تم امیجن نہیں کرسکتے کہ کرنل خان نے آج کیا کہا... اُس نے کہا مشرقی پاکستان کی پرابلم صرف ہندو ہے۔ ایلمینیٹ دے باسٹرڈ اینڈ — نو پرابلم... یو نو ل خان صرف پچھلے ہفتے ڈھاکہ پہنچے تو آفٹرنون میں اُنہوں نے شہر کا ایک راؤنڈ کیا۔ ی پر اُنہوں نے کہا کہ یارا ادھر تو میں جدھر گیا ادھر ہندو مندو ہے۔ دھوتی موتی میں یارا میں نے ایک برسٹ سے چار پانچ ہندو مندو مار دیا — تو ادھر میس میں ایک نَٹ تھا، وہ کہنے لگا، کرنل صاحب ادھر سب مسلمان ہے اور جن کو آپ نے برسٹ مارا ہے ی شاید مسلمان تھے تو کرنل بہت ہنسا... کہنے لگا دیکھو میجر، کرنل خان کے سامنے اگر کوئی کے موافق دھوتی موتی پہن کر پھرے گا تو یارا بس ہندو مندو ہو گا —

پہلے روز جب مردان کیپٹن گل ریز کے ہمراہ آنٹی بابر کے ہاں آیا تو تازہ ترین ڈر آف دی ڈے" زیرِ بحث تھا۔

"سر یہ تو اسلام کا مسئلہ ہے۔ قرآن میں آیا ہے مشرک کافر تمہارے دوست ہو سکتے سر... میں سمجھتا ہوں کہ یہ آرڈر آف دی ڈے ذرا دیر سے آیا ہے۔ آئی و سر کہ اوپر انتظامیہ میں جو لوگ ہیں وہ محب وطن نہیں ہیں سر... سر ہمیں آپ لبرٹی تو بنگال پرابلم اِن نو ٹائم سالو ہو جائے سر... دے آر کاورڈز سر... اونلی اِنڈیا مائنڈ یو..."

"لیکن لیفٹیننٹ... پرابلم تو ہے... اب حکم یہ ہے کہ جدھر سے کانوائے
ادھر راستے میں جتنے گاؤں ہیں تو اُن میں جو ہندو گھر ہیں اُن کو... جلا دیا جائے
لوگ... لیکن لیفٹیننٹ... ادھر بنگال میں جو باسٹرڈ ہیں وہ سب ایک جیسے گھروں
ہیں... کیسے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہندو گھر ہے.. اور یہ مسلمان؟"

"ایمان کا جذبہ ہونا چاہئے سر... پتہ چل جاتا ہے۔ مومن کی تلوار کبھی
نہیں اُٹھ سکتی۔"

اس بیان پر تمام حاضرین نے نوجوان لیفٹیننٹ کی جانب ستائش بھری ن
دیکھا اور نوجوان لیفٹیننٹ نے عارفین اور نازنین کی جانب دیکھا جو اِک شا
سے اُس کی طرف متوجہ تھیں...

چنانچہ ظہیرالدین بابر کا گھر مرجع خلائق تھا۔

باہر بدامنی بہت تھی۔

بنیادی مقصد یہی تھا کہ وہ سب ایک جیسے گھروں میں رہتے تھے، دھوت
تھے اور تھنی کے موافق پتلے دُبلے تھے۔ بہرحال آرڈر کے مطابق اُنہوں نے
پڑتے چند دیہات کو نذرِ آتش کرنا تھا۔

"سر یہ جو کر اپنے گھاس پھونس سے بنائے ہوئے جھونپڑوں کو گھر کہ
ٹیل یو سر میں نے ان کے گھروں میں ہارمونیم دیکھے ہیں.. اور ان کی لڑکیاں ڈا
سر.. میں نے خود دیکھا ہے تو پھر ہاؤ کین دے بی مسلمز... سر آئی کین سویئر کہ
ہندو ہے سر... آئی کین فیل اِٹ سر..."

بارش بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی اس لیے آگ لگانے میں آ
ننگ دھڑنگ اور کالے شاہ بچے چیونٹوں کی طرح جلتے جھونپڑوں میں سے
نکلتے... اور اُن کی مائیں جن کے پیٹ ننگے تھے اور جو ایک نامانوس زبان میں کچھ
اُن کے سامنے آتیں تو وہ اُن کی چھاتیوں کی طرف متوجہ ہو جاتے...

کیپٹن مردان خان راؤنڈ لگانے کے بعد اپنے یونٹ کو واپس آ رہا
جانب جہاں جنگل کا اختتام ہوا تھا ایک تالاب کے کنارے جھاڑیوں میں کچھ
— اُس کے جوان چوکنے ہو گئے اور جیپوں سے اُتر کر اُن جھاڑیوں میں
رسیدہ پتوں کی طرح لرزتے زرد چہروں والے دھوتی پوش تین منحنی سے

ئے...

"مُکتی باہنی سر —" صوبیدار اللہ یار نے شن ہو کر کہا۔

اُس کے جوانوں نے ہتھیاروں کی نالیاں سیدھی کر لیں —

"آر یو شور؟" مردان نے پوچھا۔

"آہو جی — ان مردودوں کی شکل سے پتہ چل جاتا ہے — شوٹ کر دوں
ز..."

"چیک کر لو یار —"

"کرتا ہوں سر —" صوبیدار اللہ یار نے تین مختصر جھٹکوں سے اُن تینوں کی
دھوتیاں اُتار دیں.. وہ منحنی چوہوں کی طرح ڈرنے لگے اور سکڑنے لگے..

"ہاں صوبیدار صاحب —" مردان کچھ فاصلے پر تھا اور جیپ سے نیچے اُترنے کا
کلف نہیں لینا چاہتا تھا "چیک کر لیا —"

"سر —" صوبیدار نے ان تینوں کے درمیان کو ذرا غور سے جھک کر دیکھا "سر
پتہ نہیں چل رہا۔ اِن ماں یاؤں کا کچھ پتہ نہیں چلتا —"

"جلدی کرو — ادھر ایمبوش نہ ہو جائے —"

"سر ان کی بہت سکڑی ہوئی ہیں۔ کچھ معلوم نہیں پڑتا کہ کٹی ہوئی ہیں یا اصلی
ت میں ہیں..."

"اِن باسٹرڈز سے پوچھو یار کہ کیا ہیں..."

"یہ ماں یائے نہ اردو بولتے ہیں سر... ہماری قومی زبان اور... پتہ نہیں کیا بولتے
لیکن سر کلمہ پڑھتے ہیں بار بار —"

"کلمہ تو ادھر سارے ہندو بھی پڑھ سکتے ہیں سر —" ایک لیفٹیننٹ نے اپنا تجربہ
کیا "دے آر مُکتی باہنی سر —"

"شوٹ دیم —"

یونٹ میں پہنچتے ہی اُسے بہت ساری خبریں ملیں۔ مُکتی باہنی نے بہاری آبادی کو ملیا
کر دیا تھا۔

صبح کے دس بجے تھے لیکن آنٹی بابر کے وسیع بنگلے میں خاموشی تھی۔ ملازم غائب
اور کتوں کا راتب پڑا تھا۔ زنجیریں موجود تھیں لیکن وہ نہیں تھے۔ مردان

دروازوں کو دھکیلا۔ وہ اندر سے بند تھے۔ وہ ایک کھڑکی کے پٹ کھول کر اندر کود گ
آنٹی بابر ایک راکنگ چیئر میں — اپنی پسندیدہ سفید ساڑھی میں — اور
نتھنوں میں سے خراٹوں کی گہری آواز — آنکھوں پر دیوار شیشوں کی عینک —
کی سفیدی پر کہیں کہیں سُرخ دھبے تھے۔ وہ سوئی ہوئی تھیں — بس اسی طرح ج
ہیں۔

وہ دوسرے کمرے میں گیا — بابر صاحب کی سٹڈی میں — اُن کے دونو
اور دونوں ٹانگیں الگ الگ — بک شیلف میں کسی ورک آف آرٹ کی طرح
— ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر کے برابر میں ایک بازو — دس
زرتشترا کے قریب دوسرا ہاتھ... ایک ٹانگ بالکل پرفیکٹ حالت میں فسانۂ آزاد
اور دوسری دیوانِ غالب کے صفحات پر — اُن کا دھڑ سٹڈی ٹیبل پر کسی صدارتی
میں ڈائننگ ٹیبل پر سجے سالم بکرے کی مانند تھا — جس نے بھی انہیں کاٹا تھا نہایت
سے کاٹا تھا — کہیں کوئی دھاگہ یا تار لٹکتا نہیں تھا —

اور اُس لونگ روم کی پوری دیوار کی شیشہ کھڑکی میں سے بوڑھی گنگا کی
اور ویرانی نظر آتی تھی وہاں عارفین ننگی پڑی تھی۔
ایک سبز پرچم جہاں سے آدم جنم لیتا ہے۔
عارفین کی چھاتیاں جن پر "جئے بنگلہ" پینٹ کیا گیا تھا۔ جئے کا ایک نقطہ او
دوسرا نقطہ پینٹ کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اُبھاروں کے اختتام پر نپل یوں
ہو رہے تھے۔ اُس کی باچھوں سے خون کی لکیریں گردن تک آتی تھیں اور جم جاتی
عارفین کا سانس چلتا تھا، کیونکہ پرچم ہولے ہولے اوپر نیچے ہوتا تھا۔

نازنین باتھ روم میں پڑی تھی۔ ٹب کے اندر — اور اُسے بھی حب ا
جذبے سے سرشار کر دیا گیا تھا۔ ایک سبز پرچم لیکن چاند ستارے کو سُرخ کرتا ہوا ا
اپنا تھا۔

مردان سنک کے اوپر دوہرا ہو گیا اور قے کرنے لگا۔
باسٹرڈز باسٹرڈز —

———

نسان پٹرول کا شیشہ ایک ہموار آہستگی سے نیچے آنے لگا اور اُس کے اندر جو ایک
ی اور گرم آسودگی تھی اُس میں اُسی آہستگی سے سرد، کٹیلی اور منتظر ہوا کی یخ بستگی
ل ہونے لگی۔ گندے مندے، غلیظ ناخنوں والے ٹھٹھرتے سفید اور سردی سے نچڑے
ئے متعدد چھوٹے چھوٹے ہاتھ بھی اندر آئے جو جنگلی نرگس کے پھولوں کو اُس کی ناک
آگے ہلانے لگے —

اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ نرگس کی مہک میں جو بہت سرد سندیسہ تھا وہ اُس
اندر جا کر بند در کھولنے لگا اور اُن میں وادیٔ سوات کے ایک سلیٹی منظر کی ہوائیں
لگیں۔

رات کی بارش نے پاپلر کے تنوں اور خالی شاخوں میں رچ رچ کر انہیں سیاہ کر دیا
ر وہ سلیٹی آسمان سے الگ کوئلے سے کھنچے ہوئے لگتے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب
رخت بہت دور تک جاتے تھے۔ اُن کی گاڑی بٹ خیلہ سے نکلی تو مشاہد نے کہا —
ہم اُس لینڈ سکیپ کو دیکھیں گے جس میں سلیٹی رنگ بہت ہے اور اُس میں صرف
ں کی کٹوریوں کی پیلاہٹ ہو گی جو الگ ہو گی۔ جونہی پاپلر کے ٹنڈ منڈ درختوں میں
لی سڑک پر وہ آئے تو انہیں تین بچے دکھائی دیئے... اُن کے ہاتھوں میں نرگس کے
ھے جو وہ آس پاس کے کھیتوں میں سے جہاں وہ کہیں کہیں اِدھر گھاس میں اُدھر کسی
لی کے کنارے ان موسموں میں منہ نکالتے تھے چُن کر لائے تھے... نسان پٹرول اُن کے
ے ہوئی تو وہ جھجکتے ہوئے آگے ہوئے، متوقع سُرخ اور سرد چہروں کے ساتھ اور
وں کی کرختگی کے آثار لیے وہ نرگس کے پھول اُن کی ونڈ شیلڈ کے آگے پیلی کٹوریاں
فید پنکھڑیاں لہرانے لگے۔
"روک لو —"
کالیے نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

برگیتا کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ کوئی بھی شخص صبح سے شام تک
زرکے مالاکنڈ پاس کو پار کر کے بٹ خیلہ کے آگے پاپلر سے گھرے ہوئے راستے پر چند
دن کے لیے صرف اس لیے جائے کہ وہاں ہر شے سلیٹی رنگ کی ہے اور وہاں سڑک
ے کنارے چھوٹے چھوٹے چِٹّے گورے بچے نرگس کے پھول ہاتھوں میں لیے منتظر ہوں
ے — اُن سے پھول خریدے، اپنی ولیز جیپ کی پچھلی نشست پر رکھے اور چند گھرے
انس لے کر آل دے وے واپس لاہور آ جائے — تقریباً چوبیس گھنٹے کی مسافت کے
د — برگیتا کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی برگیتا جو مشاہد کو سمجھتی تھی۔

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں —

شکار، قادر آباد کے آس پاس — کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے
ادی اور وادیٔ سوات کا یہ منظر — یہ سلیٹی منظر — اور چوک چکلہ — لیکن یہ تو بعد
ں بلائے گا...

چار چیزیں ہیں —

درختوں کے ہاتھ خالی ہیں۔

"لیکن یار یہ بہن یا ڈاکٹر کہاں گیا۔ اوئے مشاہد یہ عمر ہے شادی کرانے کی —"
الیا یقیناً اپنے بدن میں حدت ہی حدت لہریں لیتی ہوئی وہسکی کی ترنگ میں تھا "اس عمر میں
ندے کو تو بیوی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہاں محلے والوں کو ہوتا ہے۔"

مشاہد سے رہا نہ گیا اور وہ ہنسنے لگا "اوئے کالیے تو بکواس نہ کر۔"

"میں تو بچپن سے ہی بکواس کر رہا ہوں۔ میرے ابے نے مجھے ساتھ لگا لیا کہ بچو
لی برتنوں کا چھابا اٹھا کر چلتا جاتا ہوں اور تو وقفے وقفے کے ساتھ "آ بھانڈے لا — پتل
ے کٹورے، کٹوریاں تے تھالیاں لا — آ بھانڈے لا —" ذرا پکارتا چلا جا — اور
شاہدی تجھے رنگ محل مشن ہائی سکول کے زمانے یاد ہیں بہن یا — تو آگے آگے اور میں
رے پیچھے پیچھے.. میں تجھ پر عاشق تھا۔ اے میرے پُت پینڈو میں تجھ پر عاشق تھا... قسم
ے تیرے ہڈ پیر مجھ سے مضبوط نہ ہوتے تو میں نے تجھے وَرت دینا تھا —"

"اوئے کالیے تو بکواس نہ کر یار —" مشاہد نے پھر کہا اور پھر ہنسا۔

"پتہ ہے میری قسمت کو کس نے جگایا اور جگا کر کہا اُٹھ پُتّر کالا شاہ کاکو آ گیا
ہے؟... گرجی شاہو کی ایک دیسی میم نے۔ کہنے لگی، دیکھو تم پرانا پرانا برتن لاؤ ہم خرید تا

مشاہد نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرنے کے بٹن پر ہتھیلی جما دی۔ نسان پٹر
ایک ہموار آہستگی سے...

منتظر ہوا کی یخ بستگی اور نرگس کی سرد مہک نے اس بار بھی اُسے اپنے
الگ کر دیا...

"یار اس بہن یا کھڑکی کو بند کرو سارا نشہ ہرن ہو رہا ہے — یہ نشہ ہرا
ہے؟... گدھا کیوں نہیں ہوتا —" کالیے نے اپنی ہپ فلاسک کے پیندے
ایک پوری تسلی کرنے والا گھونٹ بھرا۔ اور پھر ہرن اور گدھے کے حوالے سے
بے حد محظوظ ہوا جیسا کہ بلیک لیبل وہسکی کی تین چوتھائی بوتل پینے کے بعد انز
ہونے لگتا ہے۔ مشاہد باہر جا چکا تھا، سڑک کے کنارے وہ متعدد بچوں میں گھرا
ایک کو دس کا ایک ایک نوٹ دے کر اُن سے نرگس کے گُچھے خرید رہا تھا۔

"بہن یا رومانٹک۔" کالیا بڑبڑایا اور ایک مست لہر کے ساتھ گاڑی
گیا۔ "بہن یا سردی —" وہ پھر کانپتے کانپتے بڑبڑایا "مجھے کوئی پرواہ نہیں ہو
کی سردی کی۔ لیکن یہ جو ہمارا یار ہے ڈاکٹر — اس کے غسل خانے اتنے ٹھ
ہیں کہ صبح ذرا کموڈ پر بیٹھو تو یار ایٹھی سارا دن سرد رہتی ہے اور اُس پر کموڈ کا
بنا رہتا ہے نیلے رنگ میں — کیوں؟" کالیا پھر محظوظ ہونے لگا اور مشاہد کے
کھڑا ہو گیا "ہاں جی... کہاں ہے ڈاکٹر —؟"

ایک گزرے منظر تھا — جس میں سب کچھ گرے کے مختلف شیڈز
دسمبر کے سرد اور یخ سکوت میں ایک سڑک جس کے دونوں جا
کلومیٹر تک پاپلر کے خالی درخت سلیٹی آسمان پر اپنی شاخیں لکیرتے جا
راستے کے آس پاس دور تک خالی کھیت اور جہاں پہاڑیاں تھیں اُن کے سا
رنگ کے جنگل جن میں جاپانی پھل، بادام اور آڑو کے درخت جن پر ایک
تو جُدا ایسے موسموں میں ہوا جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں — اے ایذرا
درمیان دریائے سوات خاموشی سے بہتا تھا — اگر اُسے اِس دوری سے
خاموشی سے بہتا تھا۔ اور اُس پانی کا رنگ بھی گرے تھا۔

اور اس سلیٹی لینڈ سکیپ کی سردی میں جنگلی نرگس کی مہک —

— لو جی.. اُن دنوں شہر لاہور میں پرانا پرانا برتن کا کوئی گھاٹا نہ تھا — ہم نے برتن سیدھے گڑھی شاہو- پھر کام چل نکلا- بہت دنوں کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہم تو ایلیٹ ہیں — آہو...." کالیے نے ہپ فلاسک نکالی اور اُس کی پشت پر تھپکی یوں د نوزائیدہ بچے کو تھپکتے ہیں کہ فوراً سانس چلے اور رونا شروع کر دے لیکن کالیے فلاسک جتنا رو سکتی تھی رو چکی تھی — "بہن یا ڈاکٹر کہاں ہے؟"

"چک درہ پل کے ادھر بائیں ہاتھ پر جو وے سائڈ ہوٹل ہے دریا کے وہاں ہو گا —"

"میں تمہیں تجربے کی بات بتاتا ہوں مشاہدی —" کالیا بے حد ناراض "اس عمر میں انسان شادی کرے تو محلے والے بہت فائدے میں رہتے ہیں اور میر تجربہ ہے اے ڈارلنگ مشیل — جاپان اور امریکہ سے آتے ہیں تمہارے یہ میوزیم اور کہتے ہیں مسٹر کالیا ذرا یہ پیس تو آتھنٹیکیٹ کر دو — تو میں اُس بُت کو تمہارے وَرک آف آرٹ کو ذرا اس طرح چھوتا ہوں" کالیے نے اپنی ہتھیلی فلاسک پر ایسے پھیرا جیسے وہ جسم رکھتی ہو "اور تجربے سے جان جاتا ہوں کہ یہ اصل نقلی — تو اسی طرح میں رَن کے جسم پر بھی ہاتھ پھیر کر جان جاتا ہوں کہ یہ رَن صح یا نقلی مال ہے" کالیا پھر ہنسنے لگا..

"تو اپنے سامنے نہیں دیکھ رہا کالیے —"

کالیے نے سامنے دیکھا اور چُپ ہو گیا-

یہ ایک عجیب سنگت تھی- عام بندے کی سمجھ میں نہ آنے والی — مشا اپنے آپ میں گم سم رہنے والے کی دوستی کالیے کے ساتھ کس جذباتی سطح پر ممکن شہر لاہور کی بوسیدہ ترین اور بھوکی گلیوں کا باسی، گندی نالیوں پر بیٹھ کر رفع حاجت والا اور گلی گلی برتن بیچنے والے کا پانچواں بیٹا جس کی رنگت بہت سفید تھی اور اُس صرف اس لیے کہ اُسے نظر نہ لگ جائے کالیا کہتی تھی، کیسے مشاہد کا دوست ہو چاہے وہ رنگ محل مشن ہائی سکول کے بنچوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوں اور ایک دو کہتے ہوں کہ ذرا اپنی پُھلو تو دکھاؤ- صرف اس لیے کہ کالیے میں ایک حس تھی خو اور شکل کی پہچان کی- وہ اکثر اوقات ایسی بات کہہ جاتا، کوئی کلمہ منہ سے نکالتا کہ سناٹا چھا جاتا- وہ نوادرات کا پرانی اشیا کا بین الاقوامی سمگلر تھا — پوری دنیا میں کالیے

روشن تھا- صرف اس لیے نہیں کہ وہ سیکرٹری سطح کے بیوروکریٹس کو خوش کر کے اور انہیں اپنی لیوش پارٹیز میں مدعو کر کے نوادرات اور خاص طور پر گندھارا کو ملک سے باہر منتقل کر دیتا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ایک کونیئر تھا — وہ کسی ہزاروں برس پرانے برتن یا مجسمے کو دیکھ کر کہیں اور چلا جاتا- اُس کی آواز بھرا جاتی اور اُنگلیاں لرزنے لگتیں اور وہ کہتا "جن بہن یا اُنگلیوں نے اِسے بنایا ہے میں صدقے اُن اُنگلیوں پر —"

کالیا بالکل چپ ہو گیا- چھوٹے قد کا، بے شمار بالوں کے جھمگھٹ کا، چٹا گورا، اپنی عمر سے بہت کم دِکھتا کالیا چپ ہو گیا-

"کالیے — چلیں؟"

"اب کیا چلیں؟ — اب میں نہیں جاتا- میں اِس بہن یا منظر کے اندر جا چکا ہوں واپس نہیں آ سکتا-"

پاپلر کے کالے سیاہ درختوں کے نیچے کالیے کی نسان پٹرول کھڑی تھی- اور اس رے اور سرد ہوا میں صرف نسان پٹرول کی شکل تھی جو قدرتی نہیں تھی- وہ ایک بدنما دھبہ لگ رہی تھی، سیاہ شاخوں کے جنگل، کھیتوں میں کہیں کہیں شکل دکھاتی سرد نرگس اور اس برفیلی کاٹ دار ہوا میں پارک کی گئی ایک بدنما دھبہ لگ رہی تھی-

اُنہیں چلنا تھا اس لیے تھوڑی دیر بعد چلے اور تھوڑی دیر بعد چک درہ پُل کے ادھر بائیں ہاتھ پر وے سائڈ ہوٹل سے پرے دریائے سوات کے بے دھوپ اور بے رنگ پانیوں کے کنارے اُنہوں نے پاپلر کے درختوں کی ٹہنیوں ایسے لچکتے پتلے دُبلے سے والے ڈاکٹر ارشد کو سپاٹ کیا جس کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے وہ آل دے وے بٹ خیلہ آئے تھے اور بٹ خیلہ کے سول ہسپتال میں پہنچ کر اُنہیں معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اگرچہ کل بیاہ ہے لیکن وہ عادت سے مجبور اُس وے سائڈ ہوٹل کو جا چکے ہیں جو چک درہ پُل کے ذرا ادھر بائیں ہاتھ پر واقع ہے-

ڈاکٹر ارشد نے انہیں دیکھ کر کوئی نمایاں مسرت کا اظہار نہ کیا- وہ اُس وقت پورے یقین میں تھا کہ دُکھتے ہوئے بازوؤں کے ساتھ یہ جو پانچ سو سترویں مرتبہ میں دریائے سوات کے گہرے پانیوں میں کاسٹ کر رہا ہوں تو بس ابھی اس بار میری ڈوری میں ریڈ کھچاؤ ہو گا اور ایک بھاری سِلور ٹراؤٹ اس بے رنگ اور بے دھوپ فضا کو چمکا دے گا.... وہ ڈوری لپیٹتا گیا جو بنا تناؤ کے آسانی سے چرخی پر لپٹتی گئی اور پھر خالی لٹکتی دھات

والا بیٹ پانی سے باہر آ گیا۔

"برگیتا نہیں آئی؟" ڈاکٹر ایک ہپنوٹائزڈ سٹانس میں پانی کے بہاؤ پر نظریں اُسے تکے جا رہا تھا۔

"نہیں —" مشاہد نے جواب دیا۔

"بہن یا —" کالیے نے ہپ فلاسک کو ایک پتھر کی طرح ہتھیلی میں تولا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو جمانے کی کوشش میں اُسے پوری قوت سے گھما کر سوات کے پانیوں پر پھینکا۔ فلاسک ایک ٹھیکری کی طرح بہاؤ کے ساتھ ساتھ اچھلتی پھر نیچے چلی گئی "بہن یا ہم مہمان آئے ہیں اسلام آباد سے — خیر سے شادی کے کھانے آئے ہیں اور ہمیں کوئی بہن یا پوچھتا ہی نہیں —"

"ہیلو زاہد —" ڈاکٹر پہلی بار مسکرایا اور اُس کے چہرے پر کھنچی عمر کی دلکش نظر آنے لگیں۔

"زاہد لیکن زاہدِ خشک نہیں —" کالیے نے شہادت کی اُنگلی لہراتے ہوئے مرے دل کہیں اور چل کے انداز میں لہکتے ہوئے کہا۔

وے سائڈ ہوٹل کا ایک لڑکا دو کرسیاں اُٹھائے آ رہا تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے کُتورا مکمل اطمینان سے شانت ہو کر اپنی ابتدائی دُم ہلاتا چلا آ رہا تھا۔

"اوئے —" کالیا چیخا "یہ وہی بہن یا کُتورا ہے جسے میں نے پچھلی مرتبہ پلیٹ میں سے گوشت کھلایا تھا۔ اپنی میز پر بٹھا کر۔ ایک طرف سے یہ کھاتا تھا اور دوسری طرف سے میں کھاتا تھا۔ ماشاء اللہ کیا قد نکالا ہے۔ اوئے برادرِ عزیز —" اُس نے کُتورے کے اوپر جھک کر اُسے خطاب کیا اور کُتورے نے فوراً پہچان کی چووں ہوئے دُم پوری ناتواں قوت سے ہلانی شروع کر دی۔ کالیے نے برادرِ عزیز کو اُٹھا کر اُس کی نم تھوتھنی کے متعدد بوسے لیے اور پھر احتیاط سے کسی مِنگ ڈائنسٹی کے قدیم گلدان کی احتیاط سے اُسے زمین پر رکھ دیا۔

وہ تینوں دریا کے کنارے رِکٹی، بہت مخدوش حال والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ قربت میں شور تھا اور ہوا زیادہ سرد تھی اور کانوں پر زیادہ اثر کرتی تھی۔

"وہ بدھا کے گریٹ ڈیپارچر والی فریز کہاں ہے ڈاکٹر؟" کالیے نے بیٹھتے ہی سوبر ہو کر کہا۔

بہت آسودگی سے اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر ارشد مسکرایا "تم سری بہلول گئے تھے —؟"

"ہاں —"

مردان تک زمین، درخت اور ہوا میں کچھ فرق نہ تھا۔ مردان سے نکلتے ہی جیسے زمین اور اس کے رنگ اور اس کی شکل بدلنے لگتی ہے۔ آلوچے کے درخت جن کی ٹہنیاں سیاہ اور گنجلک تھیں اور ان کے باغ دور دور تک، وہاں تک جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اُبھرتی تھیں۔ اور ایک عجیب ٹھہراؤ اور سکون جو ہزاروں برس پیشتر بدھ بھکشوؤں نے بھی اپنے دل کے اندر راہ بناتا ہوا محسوس کیا اور وہ یہاں سر جھکانے کے لیے ٹھہر گئے اور عبادت خانوں کی تعمیر کی — گندھارا کی لینڈ سکیپ میں چاہے وہ سوات میں تھی یا درہ خیبر کے آس پاس یا ٹیکسلا کے نواح میں، ہمیشہ ایک سرسبز میدان تھا جس میں کہیں کہیں پہاڑیاں سر اُٹھاتی تھیں اور یہاں ٹھہراؤ اور سکون کا احساس ذہن پر بیٹھتا چلا جاتا تھا۔

مردان سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تخت بائی سے پہلے بائیں ہاتھ پر گنے کے کھیتوں میں ایک راستہ نہر کے پار ہوتا تھا اور وہاں ایک بورڈ پر "سری بہلول" درج تھا۔ کالیے نے اپنی نسان پٹرول کے سٹیئرنگ کو یکدم ایسے گھمایا کہ دُھول کا ایک بادل اس کے بڑے ٹائروں میں سے اُٹھ کر ونڈ شیلڈ کے آگے آ گیا۔

مشاہد نے سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا۔

ذرا کھسیانا ہو کر کالیا مسکرایا اور عینک درست کر کے کہنے لگا "تھوڑا سا بزنس۔"

مشاہد نے سامنے دیکھا اور ذرا سنبھل گیا۔ گنّے کے کھیتوں اور پاپلر کے درختوں سے پرے ایک پتھریلے اور کچے گھروں والا قصبہ گنّے کی ہریالی اور پاپلر کے بنا پتوں کی شاخوں میں سے جیسے اُبھرتا جا رہا تھا۔ ایک بہت بڑے ٹیلے پر وہ گاؤں تقریباً دو ہزار برس سے آرام کر رہا تھا۔ گندھارا کے قدیم نقشوں میں سری بہلول ایک اہم پڑاؤ تھا۔

گاؤں کے باہر گنّے کو پیڑنے کے لیے بیلنے لگے ہوئے تھے اور صحت مند بیل سر جھکائے خشک پرالی پر چکر کاٹتے تھے اور اپنے گلے میں لٹکتی گھنٹیوں کی آواز سے مسحور ہوتے ہوئے بے تکان چلتے جاتے تھے۔

حجام کی دوکان کے باہر چند غلیظ تولیے لٹک رہے تھے اور دھوپ سینکتے ہوئے

کمبلوں کی بُکلوں میں لپٹے چند پٹھانوں نے اپنی جانب آتی نسان پٹرول کو دیکھ کر انداز
کہ بیوپاری آئے ہیں اور اُن میں سے جن کے پاس "گنّا" یا پتھر تھا وہ اپنے خیمے
ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے... ایک پتھریلی گلی کے کیچڑ میں سے زور لگاتی ہوئی پٹرول
ڈیرے کے قریب رُکی۔ اور پھر گیئر بدل کر ڈیرے کے اندر چلی گئی۔

ایک کچّا ڈیرہ جس کے صحن میں دو بڑی بڑی چارپائیاں تھیں اور دیوار پر تھو
پودے سجے تھے۔ دیوار سے پورا سری بہلول نظر آتا تھا اور تخت بائی کا علاقہ ایک
دُھند میں کچھ فاصلے پر تھا...

بُکل میں لپٹے لوگ آنے لگے۔ نوجوان بھی۔ عمر رسیدہ بھی اور چھوٹے چ
بچے بھی... وہ کالیے کے سامنے آتے اور بُکل کھول کر اپنے ہاتھ آگے کر دیتے... ان
میں سری بہلول اور اس کے آس پاس سے ملنے والے گندھارا عہد کے ٹکڑے
مہاتما بدھ کے ٹوٹے ہوئے سر... قدیم گندھارن برتن۔ بدھ کی زندگی کے مختلف اد
انگوٹھیاں... بیل بوٹوں والے پتھر...

سری بہلول گندھارا عہد کے مجسموں کی سپر مارکیٹ تھی۔

"بہن یا مجھے ٹوٹ پھوٹ نہیں چاہئے ——" کالیے نے اُن سب کو ڈانٹا "میر
کالیا ہوں کنگ آف گندھارا، مجھے سالم پیس چاہئے —— ہے یا نہیں؟"

ایک گدلے بھورے. بالوں والا شخص جس کا نام سُور تھا آگے آیا "یارا تھا
اب نہیں۔"

"کونسا پیس تھا؟" کالیے کا رنگ زرد ہو گیا۔

"گریٹ ڈیپارچر تھا ——" سُور کہنے لگا۔ اگرچہ وہ ان پڑھ تھا لیکن اس گاؤں
دیگر باسیوں کی طرح وہ جانتا تھا کہ گندھارا کے مجسمہ ساز مہاتما بدھ کی زندگی کے کون
سے ادوار پتھر میں سے تراشتے تھے اور اُن کو کس نام سے پکارا جاتا تھا۔

"ڈاکٹر تو نہیں آیا تھا؟" کالیے نے فوراً پوچھا۔

"آیا تھا ——" سُور نے کالیے کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا
لے گیا ——"

وہ تینوں دریا کے کنارے رِکٹی، بہت مخدوش حال والی کرسیوں پر اپنے آ

بمشکل بیلنس کر رہے تھے جب کالیے نے یکدم سوبر ہو کر پوچھا تھا کہ بدھا کے گریٹ
ڈیپارچر والی فریز کہاں ہے ڈاکٹر —— ؟

اور ڈاکٹر ارشد اس سوال کے جواب میں بہت آسودگی سے مسکراتا رہا۔

"بہن یا تمہارے کس کام کی ہے —— تم بس اپنے کمرے میں سجا لو گے... مجھے
بیچتے ہو... دوگنے پیسے دوں گا ——"

"تم یہاں کاروبار کرنے آئے ہو؟ ——" ڈاکٹر ارشد نے اُسے نہایت بے توقیر لہجے
میں کہا اور ذرا غصے میں آ گیا "تمہاری ذہنیت نہیں بدلی۔ تم اب بھی ایک پھیری والے ہو
برتن بیچنے والے۔ صرف نسان پٹرول پر بیٹھ کر پھیری لگاتے ہو۔ کبھی جاپان چلے جاتے ہو
اور کبھی امریکہ —— لیکن پھیری لگاتے ہو ڈیم اِٹ ——"

کالیے نے اپنے سر کو متعدد بار جھٹکا اور پھر ایک شرمندہ کُتورے کی طرح سر جھکا
کر کہنے لگا "بہن یا نشہ زیادہ ہو گیا تھا اس لیے —— سوری یار —— بہن یا ہو جو اب بزنس
کی بات کرے.. گندھارا.. فک گندھارا یار —— سوری یار۔"

"کوئی بات نہیں ——" ڈاکٹر سب کچھ بھول گیا اور اپنے ان دو دوستوں کے
چہروں کو اُلفت سے دیکھنے لگا جو اُس کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے اتنی دور سے آئے تھے۔

صرف پانچ برس پیشتر ڈاکٹر، مشاہد کو نہیں جانتا تھا۔

ایک شکار پر —— قادر آباد کی جھیلوں پر ایک بہت سرد اور مائنس زیرو والی تاریک
صبح کو اُن کی کشتی کے قریب سے ایک اور کشتی کہرے کی برف کو شیشے کی طرح توڑتی ہوئی
گذری تھی اور کالیے نے کہا تھا "اس میں میرا جماعتیا ہے مشاہد —— اس میں زور بہت تھا
نہیں تو میں نے اِسے وَرت دینا تھا ——"

پھر وہ اکٹھے شکار پر جانے لگے اور اب —— شائد وہ کالیے سے زیادہ اُس کے
نزدیک اُس کے گہرے بھید کے نزدیک آ چکا تھا۔ مشاہد بھی دریا کے بہاؤ کو ایک ہپناٹائزڈ
سٹانس میں تکے جا رہا تھا۔ اُس نے گردن پھیر کر ڈاکٹر کی جانب دیکھا اور ڈاکٹر نے فوراً سر
ہلایا۔ "شادی؟"

"ہاں" مشاہد نے بھی سر ہلایا۔

"کیا تم نے کبھی کسی مُردے کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا ہے؟"

"اوئے بہن یا مُردوں کی بات کرتے ہو دریائے سوات کے کنارے بیٹھ کر" کالیا

یکدم ہراساں ہو گیا "لو جی اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے مجھے ذرا طاقت چاہئے
طاقت میری پٹرول میں پڑی ہے اور بلیک لیبل ہے —" وہ اُٹھا اور اپنے آپ کو
بچاتا ہوا سڑک کی جانب چل دیا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے ایک سُریلی چاؤں چاؤں
کُتورا بھی سَرہلاتا ہوا چلا گیا۔

"میں ایک فاصلے پر رہتا تھا — ہمیشہ۔ کبھی قبر کے قریب نہیں جاتا تھا۔ جب
پڑ جاتی تھی تو ایک مٹھی میں بھی ڈالتا تھا اور قبرستان سے باہر آ کر دعا پڑھتا تھا اور چلا
لیکن... پچھلے دنوں میں نے... ایک مقامی دوست کو قبر میں رکھا۔ اُس کے سفید کفن
لپٹے ساکت اور بے بس جسم کو دیکھا۔ پھر میں نے اُس جسم کو بجری اور سیمنٹ سے بنی
سلوں کے پیچھے کٹ کٹ کر غائب ہوتے دیکھا۔ میں موت سے خائف تو نہیں ہوا
زندگی کے اکلاپے سے یکدم خوفزدہ ہو گیا... چنانچہ میں نے اس عمر میں بھی — شا
فیصلہ کر لیا۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی — تدفین کے اگلے روز میں نے ایک دمے کے مریض سے با
جو صرف ایک مرتبہ اپنی بیٹی کے ہمراہ آیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک مختصر سا خاکہ ایک
واضح سی شکل اُس کی بیٹی کی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا اُس کی بیٹی کی شادی
ہے تو اُس نے جواب میں اپنی غربت کے بارے میں کچھ کہا... بیٹی کی عمر زیادہ ہو جا
بارے میں کچھ کہا تو میں نے صرف اتنا کہا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور — وہ لڑکی کچھ پڑھی لکھی ہے؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ... اس علاقے میں لڑکی پڑھی لکھی ہو ہی
سکتی۔"

"ارشد — تم..."

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ بٹ خیلہ سول ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں جو گھر مجھے
ہوا ہے... اُس میں کوئی اور بھی ہو — کوئی بھی — میں اب اکیلا نہیں رہ سکتا۔"

اُس کے پیچھے چھوٹا کُتورا سَرہلاتا آ رہا تھا اور آگے آگے کالیا تھا اور اُس کے
میں جانی واکر کی ایک بلیک لیبل بوتل تھی۔ "لو جی ڈاکٹر صاحب — اب کرو مُردے
بات۔" اُس نے بوتل سے براہ راست ایک ڈیک لگائی اور سر جھٹک کر مسکرایا

کوشش کرنے لگا۔ اور اس کوشش میں اُس کی ناک کچھ زیادہ ہی سُرخ ہو گئی اور اُس کی
شکل انتہائی حماقت آمیز اور بیہودہ سی ہو گئی۔

"اب کرو مُردے کو قبر میں... اُتارنے والی بات۔ زاہد کالیا تیار ہے لبالب..."

مشاہد نے ہاتھ آگے کر کے کالیے کے ہاتھوں میں بھنچی ہوئی بوتل پر رکھا تو اُس
نے فوراً گرفت ڈھیلی کر دی "ابھی تم نہیں پیو گے —" آواز میں اتھارٹی تھی۔

"یس باس۔" کالیے نے کرسی سے اُٹھ کر مشاہد کو سلیوٹ کیا اور کرسی پر بیٹھنے کی
کوشش میں گرتے گرتے بچا۔

"اب یہ میرے پاس رہے گی —"

"یس باس۔" کالیے نے وقت ضائع کیے بغیر کھڑے ہو کر ایک اور زور دار سلیوٹ
را اور اُسی حالت میں کھڑا رہا۔

"بیٹھتے کیوں نہیں؟"

"باس یہ تمہارے پاس رہے گی لیکن پٹرول میں جو بہن یا تین بوتلیں اور ہیں وہ
س کے پاس رہیں گی؟"

دونوں نے اُسے دیکھا۔ کالیا دریا کی ٹھنڈک میں ہولے ہولے لرز رہا تھا اور ابھی
ل سلیوٹ کی حالت میں تھا اور دور کہیں افق پر نظریں جمائے بت بنا کھڑا تھا۔ وہ جانتے
ے کہ زاہد کالیا اب پہنچ چکا ہے اور جب وہ پہنچ چکا ہے تو پھر اسی حالت میں صبح تک کھڑا
ہے گا بیٹھے گا نہیں — جب تک کہ اُسے زبردستی نہ بٹھایا جائے چنانچہ ان دونوں نے
مُکراتے ہوئے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور زبردستی بٹھا دیا۔

"باس۔" وہ ابھی بٹھایا ہی گیا تھا کہ ایک سپرنگ کی طرح پھر اُٹھ کھڑا ہوا "بہن یا
چل —" اُس نے دریا کے پار چک درے کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں ابھی دھوپ تھی
پہاڑی کی چوٹی کے قریب ایک بیرک نما عمارت کے نیچے چونے سے "چر چل پوسٹ"
بڑے حرفوں میں لکھا گیا تھا کہ ورلڈ وار ٹو کی کسی فلم کا اشتہار لگتا تھا۔ وہ دونوں دوبارہ
ے اور اب قدرے ناگواری سے کالیے کو زبردستی اُس کی کرسی پر براجمان کیا "اب اگر
اری پشت نے اس کرسی کی پشت کو چھوڑا تو میں یہ بوتل توڑ دوں گا —"

"ویسے تو تین اور بھی ہیں باس —" کالیا جیسے پہلے اداکاری کر رہا تھا، صرف اپنے
پ کو خوش کرنے کے لیے، اب نارمل ہو گیا "لیکن اب نہیں اُٹھوں گا۔ پر ایک شرط

ہے۔ میرا ایک فلسفہ ہے —"

"سناؤ —" وہ جانتے تھے کہ کالیا جب کبھی، میرا ایک فلسفہ ہے کہتا تھا تو دے دیتا تھا لیکن اپنا "فلسفہ" ضرور بیان کرتا تھا۔

"فلسفہ یہ ہے کہ اگر کوئی یوسف زئی گولی اُدھر اُس پوسٹ پر چلی جاتی اور یا ونسٹن چرچل کو لگ جاتی تو آج دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی.. توپ فلسفہ ہے کہ نہیں

اُنھوں نے اپنے کالیے یار کو داد بھری نظروں سے دیکھا۔

کالیے نے ہتھیلی ناک پر جما کر شہادت کی اُنگلی چرچل پوسٹ کی طرف کی لو جی جرمنی دوسری جنگ عظیم جیت گیا ہے —"

اُس کے زوردار "ڈز" سے کُتورا جو مزے سے ڈھلتی دھوپ سینک رہا اور پھر ایک معمولی سی "وَف" کے بعد پھر لیٹ گیا۔

اُس وسیع اور شام کی چوکھٹ تک پہنچتی لینڈ سکیپ میں جو ہلکی دھوپ میں صرف وہ تینوں تھے جو دریائے سوات کے کنارے بیٹھے نظر آ رہے تھے...

"کچھ کھاؤ گے؟"

"لو ہم شادی کے مہمان ہیں —" کالیا پھر رواں ہو گیا "بہن یا اندر تک ہے اور ڈاکٹر کہتا ہے کچھ کھاؤ گے —"

ڈاکٹر اُٹھا اور سڑک کے کنارے تک ان کھوکھوں تک گیا جو وے سائڈ تھا... مشاہد نے بلیک لیبل کی بوتل کو اُٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیا؟ وہ میکنم تھی کافی تھی۔ اُس نے ڈھکن کھول کر ایک طویل گھونٹ حلق میں گرایا..

"اوئے صدقے —" کالیے نے خوش ہو کر نعرہ لگایا "ایک اور..."

"نہیں.. کافی ہے۔"

ہوٹل کا ملازم لڑکا سلور کی ایک غلیظ اور ٹیڑھی سی ٹرے اُٹھائے چلا آ رہا چینی کی ایک پلیٹ میں پڑے تکوں کے ڈھیر میں سے ایک تکہ اُٹھا کر اُس نے منہ اور پھر اپنے سفید اور ننگے بازو سے بہتی ہوئی ناک کو صاف کیا "اچھا ہے" اُس لوٹ گیا۔

"مشاہد —" کالیے نے ایک تکہ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

"پتہ نہیں کس قسم کا گوشت ہے — اور میرا معدہ..."

"زیادہ سے زیادہ کُتے کا ہو گا ناں — پھر بھی اس وقت اچھا ہے — کھاؤ۔"

ڈاکٹر ایک پیالی اُٹھائے اُسے چھلکنے سے بچاتا ہوا آہستہ آہستہ اُن کی طرف لپکتا آ رہا تھا.. اُنھوں نے دیکھا کہ ہوٹل کے پچھواڑے میں ایک تنہا درخت کی سوکھی ہوئی شاخوں پر کہیں کہیں سفید دھبے تھے — آلوچے کے شگوفوں کو کھلنے کے لیے ابھی تھوڑی سی حدت درکار تھی جو اگلے تین چار ہفتوں میں تو ممکن نہ تھی...

"میں صرف چائے پیوں گا —" ڈاکٹر نے بیٹھ کر ایک لمبی چسکی لی "زبردست.... اُس روز قادر آباد سے واپسی پر جیپ نے کوئی ٹربل تو نہیں دی؟"

"نہیں — لیکن لاہور پہنچنے پر برگیتا نے بہت ٹربل دی — اُس روز کرسمس تھی اور مجھے یاد ہی نہ رہا.."

کالیے نے فوراً کھڑے ہو کر مشاہد کو سیلوٹ مارتے ہوئے "میری کرسمس" کہنے کا ارادہ کیا اور پھر اُسکے متوقع ردعمل کے بارے میں سوچ کر یہ ارادہ فی الفور منسوخ کر دیا۔

"اُسے ساتھ کیوں نہیں لائے... میں نے خاص طور پر کہا تھا۔"

"وہ یہاں — اس مَردوں کی سختی والے علاقے میں بہت بے آرام ہوتی — تمہیں اُس کی عادتوں کا پتہ ہے ناں — پچھلی بار وہ بٹ خیلہ کے بازار میں نیکر پہن کر گھومتی رہی تھی اور مقامی معززین نے تمہاری جواب طلبی کر لی تھی۔ جہاں شریعت یا شہادت کے نعرے ہوں وہاں برگیتا سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہیں —"

"ہم میں سے بیشتر شرمندہ لوگ ہیں — ایک مسلسل شرمندگی ہمیں ایک خجالت آمیز مسکراہٹ کے قرب میں رکھتی ہے..."

کالیا ذرا اونگھ گیا تھا۔ اُس نے یکدم آنکھیں کھول کر پھر سر جھٹکا اور ایک نایاب قسم کی حماقت آمیز مسکراہٹ چہرے پر سجا لی جو شائد سردی کے باعث بہت دیر تک جمی ہوئی حالت میں رہی۔

"مشاہد —" ڈاکٹر نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا "کیا تم خوش ہو؟"

"ہاں —" اُس نے دیر تک سلیٹی راکھ ایسے ٹھنڈے آسمان، دریائے سوات کے پانیوں اور باغوں کی بے برگ سیاہ شاخوں کو دیکھا "صرف اس لیے کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

"اوئے" کالیا چونک گیا "بہن یا شکار شروع ہو گیا ہے —"

"چار مرغابیوں کا — ؟" ڈاکٹر یہ طے نہ کر سکا کہ وہ اپنے آپ کو سنجیدہ رکھے مسکرانے کی کوشش کرے "اور تم نے ان مرغابیوں کا کیا کیا؟"

"ان میں سے دو تو برگیتا نے رنجیت سنگھ کی پوتی کو بھیج دیں اور دو...."

"اوئے بہن یا —" کالیا ایک زلزلے کی طرح بیدار ہوا۔ آنکھیں ملتا ہوا ہوئی آواز میں سراسیمہ ہو کر مشاہد کو کہنے لگا اور اُس کی سرخ آنکھیں کول ڈوڈوں کی کھلی تھیں "رنجیت سنگھ کی پوتی"

"ہاں — رنجیت سنگھ کی پوتی —"

"یُو مین مہاراجہ رنجیت سنگھ؟" کالیا انگریزی پر اُتر آیا۔

"ہاں —"

"یُو ڈونٹ مین اِٹ مین —" کالیا براہ راست امریکی سلینگ میں آگیا۔ "دے لائن آف پنجاب دے وَن آئنڈ مہاراجہ —"

مشاہد خاموش رہا۔

"مشاہدی میرا دل رُک جائے گا۔ زاہد کالیے کا دِل رُک جائے گا اگر تم نہیں بتاؤ گے کہ یہ بہن یا رنجیت سنگھ کی بہن — میرا مطلب ہے پوتی کہاں ہے — اور اب تک زندہ ہے..."

"پتہ نہیں —"

"ہیں؟ تمہیں پتہ نہیں کہ رنجیت سنگھ کی پوتی زندہ ہے یا نہیں اور اس کے تم اُسے مرغابیاں بھیجتے ہو؟"

"میں نے نہیں برگیتا نے بھیجی تھیں —"

"ننھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ وَن اینڈ دی سیم تھنگ —" وہ جھنجلا سا گیا اور قطعی طور پر سوبر دکھائی دے رہا تھا "کیا واقعی وہاں لاہور میں — رنجیت سنگھ کی پو نہیں؟"

"نقوی کی کوٹھی سے پرے... جسے ریچھ والی کوٹھی بھی کہتے ہیں.. جہاں خوردہ سُنڈ ریچھ جانے کب سے پنجے اُٹھائے پورچ میں کھڑا ہے اور اُس کے سے بُرادہ گرتا رہتا ہے اور اشفاق نقوی نے کبھی اُس کا پنجہ پکڑ کر "ہاؤ ڈو یُو ڈو تو اُس کوٹھی سے پرے —" وہ رُکا اور اُس نے جھک کر بلیک لیبل کو اُٹھایا اور

ہلاتا ہوا گھونٹ بھرا اور اُس کے مسوڑھے بھی گرم ہونے لگے۔

"صدقے —" کالیے نے صرف اتنا کہا۔

"تو اُس کوٹھی سے پرے — ماڈل ٹاؤن کے اے بلاک میں کوٹھی نمبر ایک سو ایک ہے جو خان بہادر محمود شاہ کی ذاتی ملکیت تھی۔ 38-1937 کے لگ بھگ وہ خریدی گئی صرف تین یا چار ہزار روپے میں اور اسے پرنسس بمباں سدر لینڈ گرینڈ ڈاٹر آف پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خریدا جو اُن دنوں انگلستان میں رہتی تھی —"

"مشاہد —" ڈاکٹر نے اُسے روکا "کیا یہ ایک مِتھ ہے؟"

"نہیں — میں بھی تو اے بلاک میں رہتا ہوں۔ وہ کوٹھی A-101 شہزادی بمباں سدرلینڈ کی ہے —"

"اور وہ — رنجیت سنگھ کی پوتی قیام پاکستان کے بعد دیگر سکھ جنٹل مین اور لیڈیز کی طرح ہندوستان کیوں نہیں سدھاری؟"

"کہا جاتا ہے کہ اُس سے پوچھا گیا تھا۔ تو اُس نے کہا لاہور میرے دادا کی سلطنت کا صدر مقام ہے۔ میں یہاں کی، لاہور کی شہزادی ہوں میں اِسے چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتی ہوں —"

"صدقے —" کالیے نے پھر کہا "پر مشاہدی میں بار بار یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا وہ ابھی تک زندہ ہے؟"

"پتہ نہیں —"

"پھر پتہ نہیں — تو تم مرغابیاں کسے بھیجتے ہو؟"

"برگیتا بھیجتی ہے —"

"ننھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ —"

"کہتے ہیں جب وہ انگلستان سے لاہور، ماڈل ٹاؤن میں شفٹ ہوئی تو اپنا سامان بیل گاڑیوں میں لدوا کر لائی اور اُن میں پام کے وہ بوٹے تھے جو آج بھی A-101 میں جنگل بنے دکھائی دیتے ہیں۔"

"اُسے کبھی کسی نے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟"

"اشفاق نقوی نے اُسے بچپن میں دیکھا تھا اور وہ اُس پر عاشق ہو گیا تھا —"

"صدقے بھئی —" کالیا بہت متاثر ہو رہا تھا "لیکن مشاہدی تم نے آج تک اِس

رنجیت سنگھ کی پوتی کے بارے میں کبھی مجھ سے بات نہیں کی اور تم جانتے ہو کہ
بہن یا رنجیت سنگھ میں اور اُس کی پوتی میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہوں۔ تم جانتے
اچھا تو پھر یہ جو اشفاق احمد تھا تو یہ رنجیت سنگھ کی پوتی پر عاشق ہو گیا؟"
"اشفاق نقوی —— وہ کہتا تھا کہ ایک شام ہم دو لڑکے اپنی کوٹھی سے
سائیکلوں پر —— کیونکہ اُن دنوں سرِ شام سائیکلوں پر ماڈل ٹاؤن کی ویران سڑکوں
پہن کر گھومنا شرفا کا شیوہ تھا اور ہم نے A-101 کے پھاٹک کے باہر ایک شخص کو
پگڑی پہنے ہوئے تھا، ایک لمبا کوٹ اس کے گھٹنوں سے نیچے تک آ رہا تھا اور
لیڈی کے سامنے اتنا جھکا ہوا تھا کہ اُس کی ٹائی لمبے کوٹ کے کالروں کے حصار میں
کر ہوا میں معلق تھی۔ اور لیڈی نے گہرے سُرخ رنگ کا پیشواز پہنا ہوا تھا جو گھٹ
آتا تھا اور مائنڈ یُو لیڈی کی بیک اشفاق کی جانب تھی جو اُس لمحے پر اپر جنٹل مین
ایک سٹِف اَپر لِپ کے ساتھ پیڈل مارتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اور وہ اُس خوبصورت شبا
فوری طور پر فدا ہو گیا اگرچہ اُس کا قد چار فٹ سے زیادہ دکھائی نہ دیتا تھا لیکن
باوجود وہ درمیان میں ایک گرم اور مرطوب احساس دینے والی پشت تھی۔ لیڈی
ساٹن کا چُوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا ——"
"کیا یہ ایک مِتھ ہے؟"
"نہیں —— اور جب یہ دونوں نوجوان پسینے سے شرابور تیز تیز پیڈل مار
صرف اُس دوشیزہ کی زبردست بناوٹ والی پشت سے متاثر ہو کر اُسے سامنے سے
خواہش لیے اُس کے قریب پہنچے تو.. اُن کی سٹّی گم ہو گئی —— بے شک اُس کی با
بہت ہی پُرکشش دکھائی دی لیکن وہ ایک ٹھگنی سی انتہائی بوڑھی جھریوں سے
مخبوط الحواس عورت تھی جو دن کی سفید روشنی میں کسی بھی شخص کی حرکت قلب
بند کرنے کا باعث ہو سکتی تھی ——"
"کیا وہ اب بھی زندہ ہے؟" کالیا از حد پریشانی میں بولا۔
"پتہ نہیں ——"
"اور —— " کالیے نے دانت پیستے ہوئے اپنے ماتھے پر ایک زوردار تھپ
"اس کے باوجود تم اُسے مرغابیاں بھیجتے ہو؟"
"برگیتا بھیجتی ہے۔"

"میرا خیال ہے میں ٹُن ہو چکا ہوں اس لیے میں تم سے مزید سوالات نہیں
پُوچھوں گا۔"
کالیا تذبذب میں تھا۔ کیا میں اپنے حواس کھو چکا ہوں —— یا مشاہد مجھ سے مذاق
رہا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی ابھی تک لاہور میں ہو
۔ اور پھر ستم یہ کہ مرغابیاں... ہم بٹ خیلہ سے باہر منگورہ جانے والی سڑک کے ایک
ے سائڈ ہوٹل کے قریب دریائے سوات کے کنارے ایک راکھ رنگ کے منظر کی
دُک میں بیٹھے ہیں اور یہ شخص رنجیت سنگھ کی پوتی کے بارے میں بات کرتا ہے ——
نا یا بکواس کرتا ہے۔ بلیک لیبل کہاں ہے؟
"مردان آیا تھا —— " مشاہد بہت دیر بعد بولا اور ٹھٹھرنے لگا۔
"اچھا —— " ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ اُس نے پلیٹ میں منجمد زرد چربی میں سے ایک
، کو ٹٹولا۔ بالکل یخ تھا۔ کھانے کے قابل نہ تھا "وہ ہمیشہ دسمبر میں آتا ہے —— اُس کی
ـ کا کیا حال ہے اور اُس کا کیا حال ہے؟"
مشاہد کے اندر خوشی ایسے سرسرائی کہ کوئی بہت قریب آتا تو اُسے شک گذرتا۔
شک گذرتا کہ کھیتوں کے پار آلوچوں کے جنگل میں سے کسی تند جھونکے کا گذر ہوا
۔ صرف مردان کا ذکر اُسے ناآسودگی کی بوجھ سے نجات دلا دیتا تھا "زمین پر سوتا ہے۔
بھی —— اور ٹانگ گھسیٹ کر چلتا ہے لیکن.... بظاہر تو مطمئن ہے...."
"لیکن میں مطمئن نہیں ہوں —— " کالیے کا ضبط ختم ہوا اور وہ کھڑا ہو گیا "یار اللہ
ل کے واسطے بتا دو کہ یہ رنجیت سنگھ کی پوتی..."
"بتا دو مشاہد —— " ڈاکٹر پسیج گیا۔
"اُس کوٹھی کے بارے میں سبھی یہ کہتے ہیں کہ اس کے اندر ایک رانی رہتی
.. درخت اور جھاڑیاں اتنی گھنی ہیں کہ اُس کا پھاٹک اُن میں روپوش ہو چکا ہے۔ وہاں
ل کا ایک جوڑا ابھی مدت سے قیام پذیر ہے —— وہاں سے ایک خاتون کبھی کبھار برگیتا
لنے آ جاتی ہے ——"
"بہن یا رانی؟"
"اُس کا نام مس پیر ہے —— بقول انگریزوں کے وہ شیلف پر رہ گئی ہے اور ابھی
اُس کی شادی نہیں ہو سکی... بعض اوقات ہسٹریکل ہو کر برگیتا کو بتاتی ہے کہ اُس کے

بھائی رانی کی موت کا انتظار کر رہے ہیں یا کر رہے تھے... اور اُس نے بھی رانی کو کم دیکھا صرف اُس کا بڑا بھائی اُس کے کمرے میں جاتا ہے — اسی مس پیر کو برگیتا بھیجتی ہے — تسلی ہو گئی؟"

"ہاں — کسی حد تک — اس بہن یا کوٹھی پر ڈاکہ ڈالنا چاہیے۔ ان دنوں میں میرے پاس دو سکھ پارٹیاں ہیں جو سکھ نوادرات کے لیے جو مانگو دیتی ہیں... اگلے ماہ مجھے گرنتھ صاحب کا ایک نسخہ ملا تھا جس پر اُن کے کسی گرو کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی —"

"آیت نہیں، بانی"

"جو بھی — انہوں نے اتنے ڈالر دیئے کہ یہ نسان پٹرول خریدنے کے بعد رہے۔"

"اور ظاہر ہے تم نے یہ گرنتھ صاحب سمگل آؤٹ کی —"

"یہ بہن یا کیسا لفظ تم بولتے ہو — سمگل آؤٹ یا اِن کا کیا مطلب... تمہارا خیال" ہے کہ مولویوں کے اس ملک میں مجھے کسی نے اُس گرنتھ صاحب کا سو روپیہ دینا تھا؟... یہ زیادہ سے زیادہ اُسے جلا کر ثواب حاصل کر لیتے... اب اس پاکستان میں ایک پٹرول آئی ہے کچھ ڈالر آئے ہیں تو تمہیں کیا تکلیف ہے — یار تم تو سمجھ دار لوگ ہو تمہیں تو میری طرفداری کرنی چاہیے..."

"یعنی تمہاری سمگلنگ کو جائز قرار دینا چاہیے؟"

"نہ صرف جائز بلکہ... میں ایک قومی خدمت سر انجام دے رہا ہوں بہن... بھی لیڈر... دانش ور اور عالم فاضل سے زیادہ زاہد کالیا اس ملک کی خدمت کر رہا اُس کے لفظ اب روانی سے آ رہے تھے اور مشاہد اور ڈاکٹر انہیں غور سے سنتے ادھر گندھارا کے تمام علاقوں میں، ٹیکسلا میں تو اب کچھ باقی نہیں رہا صرف بابا زرد زبردست فیک بناتا ہے لیکن سوات میں، دیر اور باجوڑ میں اور ادھر تخت بائی پاس، تمہارے سری بہلول میں تم جتنے پکے مکان دیکھتے ہو وہ میری وجہ سے بنے کے گھروں میں جو بیٹیاں بال سفید کر رہی تھیں ان کی ڈولیاں میرے پیسے کے اُٹھیں.. کتنوں نے حج کیے... اللہ رسول کی قسم.... میں نے انہیں صرف محمود غزنوی کی اولاد یہ جو تمہارے کھیتوں میں سے ہل چلاتے ہوئے بُت نکلتے ہیں

کی بنیاد کھودتے ہو تو کسی سٹوپے کی دیوار برآمد ہو جاتی ہے.. بھیڑیں چراتے ہوئے کسی پہاڑی کی اوٹ میں کھنڈر مل جاتے ہیں تو ان کو مت توڑو یارا... ان کے سر توڑ کر تمہیں ثواب نہیں مل سکتا... میرے پاس لے آؤ تو پیسہ مل سکتا ہے... سکے ملیں پرانے زیور یا برتن ملیں تو میرے پاس لے آؤ —"

"اور تم ان نوادرات کو سمگل آؤٹ کر دیتے ہو —"

"ہاں — میں ان نوادرات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا ہوں۔ وہ دنیا کے کسی بھی میوزیم میں نمائش پر ہوں، کسی بھی کولیکشن میں ہوں وہ پاکستان کی ہزاروں برس پرانی کاریگری کی مثالیں ہوں گی۔ ہماری بہن یا ثقافت وہاں جا کر محفوظ ہو جاتی ہے مشاہدی.... یہاں یہ لوگ اس کی قدر کرنے کے قابل نہیں۔ اُسے دیکھ کر ان کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے.. کیا یہ بہتر نہیں جو میں کر رہا ہوں — ٹھیک ہے میں مال بنا رہا ہوں لیکن اس وقت کیوٹو میوزیم میں چونے کے جو بدھا ہیڈ ہیں جنہیں دنیا دیکھنے آتی ہے اگر میں سمگل آؤٹ نہ کرتا تو تم لوگ اُنہیں کُوٹ کر اُن کی قلعی بنا کر دیواروں پر سیاسی نعرے لکھتے...."

شام کی سیاہی دریا کے بہاؤ پر بھی اثرانداز ہو رہی تھی اور لگتا تھا کہ پانی تھم رہے ہیں... مشاہد اور ارشد کہیں ایک مقام پر پہنچ کر زاہد کالیے کے فلسفے سے اتفاق کرتے تھے اس لیے خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر مشاہد نے سر اٹھایا اور کالیے کو چھیڑنے کے انداز میں کہا "ایک بات میری فہم سے نہ صرف بالاتر ہے بلکہ بالا ہی بالا ہے اور وہ یہ کہ گندھارا کے نوادرات اور مجسمے جن علاقوں میں ملتے ہیں وہاں کے لوگ شدید طور پر مذہبی ہیں بلکہ ان نوں کی ڈکیبلری میں بنیاد پرست ہیں تو تم نے انہیں بت فروش بننے پر کس طرح قائل کر لیا —"

"سب سے نمبر ون تو پیسہ — بُت توڑنے سے تو جنت میں مکان ملے گا اور پتہ نہیں ملے کہ نہ ملے... لیکن بیچنے سے یہاں اُن کے کیچڑ بھرے کچے کوٹھوں کی جگہ فلش سسٹم اور چپس والا نیا مکان ملے گا... اور جو نظریاتی لوگ ہوتے ہیں انہیں میں تاریخ کی بت کے حوالے دے کر قائل کر لیتا ہوں —"

"تاریخ کی جبریت —؟"

"کیوں یہ ٹرم فٹ نہیں بیٹھتی — میں نے کسی سے سنا تھا کہ ایک چیز تاریخ کی جبریت ہوتی ہے اور میرا خیال تھا کہ یہ ہوتی ہے — بہرحال ان نظریاتی لوگوں کو میں کہتا

ہوں کہ بھئی میں یہ سب کچھ اسلام کی سربلندی کے لیے کر رہا ہوں — یعنی ہا
علاقوں میں سے جتنے بُت کدے اور بُت برآمد ہوں گے اور انہیں دنیا کے سامنے پ
جائے گا اتنی ہی یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اسلام کے آنے سے پیشتر یہ سارے کا
کفرستان تھا.... اور ہم نے اور ہمارے مذہب نے اتنے بڑے چیلنج کا سامنا کر کے اُ
ٹیکنے پر مجبور کر دیا — اگر ہم یہ بُت اور بُت کدے توڑ دیں گے تو ہمارے پاس کیا
ہے کہ یہاں پہلے کفُر ہی کفُر تھا... ہماری آمد سے پیشتر جتنا بڑا کفُر تھا اتنی ہی بڑی س
ہمارے حصے میں آتی ہے..."

"تم بعض اوقات بہت حیران کر دیتے ہو کالیے...." ارشد اس تھیسس س
متاثر نظر آ رہا تھا۔

"ہاں —" مشاہد نے گردن کھجا کر کہا "یہ عجیب و غریب بات کہہ جاتا ہے۔

"تجربہ اسے مِرے پُت پینڈو تجربہ... جو تم دونوں کے پاس نہیں ہے۔ ا
تینوں میں سے صرف میں ہوں جس کا جنازہ باقاعدہ جائز ہو گا —"

"کیا میں شادی شدہ نہیں ہوں؟" مشاہد مسکرایا۔

"نہ — میم سے شادی کرنا کوئی شادی نہیں ہے چاہے وہ کالے رنگ کی ہ
نہ ہو... اور کب شادی کی ہے تم نے؟ پانچ سال پہلے.. اور ابھی تک خالم خالی... اد
ڈاکٹر ہے پشوریا — جائداد کے جھگڑے پر اپنے بھائیوں سے الگ ہو کر جو ادھر ا
قصبے بٹ خیلے میں آیا ہے تو...." کالیا کھلکھلا کر ہنسنے لگا "اوئے ڈاکٹر تو کیا کرتا رہا
ہیں؟ ناں کوئی ہاتھ سے ہی ٹائپ کر لیتا تھا کہ اب ضرورت نہیں رہی — تیر
والے خلیفے نے حکم دیا تھا کہ شادی نہ کرنا ارشد احمد؟"

"بکواس نہ کر کالیے —" یہ پھر مشاہد تھا۔

"یار تیرے اِس قادیان والے مرزے کی انگریزی کی گرائمر ہی درست نہی
پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے۔ نہ نہ مائنڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے خود اُس کی
پڑھی ہیں..."

"کالیے —"

"دیکھ یار مشاہدی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اس کے عقیدے پ
بے شک سکھ ہوتا تب بھی میرا جگری یار ہوتا۔"

ڈاکٹر ارشد کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا "کالیے..." اور یہ رنگ دُکھ کا تھا
...نے کبھی تم سے عقیدے کے بارے میں بات کی ہے... تم بھی نہ کرو۔"

"نہ کرو زاہد —" مشاہد نے ارشد کی طرف دیکھا "ہر شخص اپنے عقیدے کی قید
...ہوتا ہے، نہ کرو۔"

"چلو نہیں کرتا... ویسے ڈاکٹر تم بدھ ہو جاتے تو زیادہ بہتر تھا.. کم از کم مُچل کام تو
...ا..."

"زاہد —" ڈاکٹر ہولے سے بولا "نہ کرو..."

خاموشی کا اجتناب ان تینوں کے درمیان حائل ہوا اور دریا کے بہاؤ کی آواز اتنی
...ہو گئی کہ اُس میں بات کرنا ممکن نہ تھا... پھر آہستگی سے یہ پانی کم ہو گئے اور کہیں سے
...وں کی آوازیں آنے لگیں۔

"ہاں تو تم تجربے کی بات کر رہے تھے زاہد —" ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر
...دوستانہ تھپکی دی...

"سوری یار... میں یونہی رواں ہو گیا تھا اس بھن یا عرق کے زور.." کالیے نے سر
...بایا "تو تجربہ صرف میرا ہے... ایک بار میں پھیری لگا رہا تھا ادھر راولپنڈی کینٹ کے
...قے میں تو ایک میم ناں بڑی بڑی چھاتیوں والی اُس نے دو پرانے کٹورے خریدے اور
...کمرے کے اندر لے جا کر سب کچھ اُتار دیا اور کہنے لگی "کچھ دیکھنا ہے؟" تو میں نے کہا
...صاحب باقی رہ کیا گیا ہے تم میری ماں کی عمر کی ہو کچھ شرم کرو... ان کاموں کے لیے
...والیاں تھوڑیاں ہیں — تو جناب عالی تجربہ صرف میرا ہے — باقاعدہ شادی شدہ
...ں پانچ بچے ہیں۔ اور بیوی کے علاوہ اوپر سے اللہ کا فضل بھی ہوتا رہتا ہے — اوئے
...لڑمیں نے تجھ سے ایک بات کرنی ہے — میں رہ نہیں سکتا میری مجبوری ہے — پر تو
...نے ناراض نہیں ہونا... وعدہ؟"

ڈاکٹر صرف سر جھٹک کر اُس کی جانب دیکھنے لگا۔

"بزنس کی بات نہیں کر رہا۔ میرے اندر کُھد بُد رہے گی بے چینی رہے گی صرف
...بتا دے کہ سری بہلول سے گریٹ ڈیپارچر والا کونسا ٹکڑا لے کر آیا ہے — وہ والا
...ں میں محل کے لوگ سو رہے ہیں اور شہزادہ سدھارتھ چپکے سے جا رہا ہے یا جس میں وہ
...گھوڑے کنتھکا پر سوار بہت خاموشی سے محل سے نکل رہا ہے یا پھر.... جب وہ اپنی پگڑی

اور شاہی چھتر حوالے کر رہا ہے.... کونسا یار... اتنا تو بتا دے... کونسا گریٹ ڈیپار
تیرے پاس۔"

"میں دکھا دیتا ہوں —" ڈاکٹر اٹھا اور سردی نے جوڑوں کو ٹھنڈا کر کے
دیا تھا اس لیے اٹھا تو قدرے مشکل سے اٹھا اور سڑک کی جانب جانے لگا جہاں و
ہوٹل کے ایک چھپر تلے اُس کی کار کھڑی تھی۔ کُتورے نے سمجھا کہ پارٹی ختم ہو
اس لیے وہ بھی دُم گیلی زمین پر پٹخ کر اُٹھا لیکن اُٹھتے ہی جان گیا کہ صرف ایک گیا
دونوں مزے سے دریا کنارے بیٹھے ہیں اس لیے پارٹی ختم نہیں ہوئی چنانچہ وہ دُم ہلا
سے استراحت کرنے لگا۔

وے سائڈ ہوٹل کی نیم تاریک کوٹھڑیوں میں کوئی بلب روشن ہوا تو اُن میں
ایک کوٹھڑی الگ ہو گئی اور اُس کی کھڑکی میں سے روشنی باہر آئی تو ٹھٹھرتی ہوئی ا
پہنچنے سے پیشتر دم توڑ گئی۔ چک درہ پُل پر بھی چند روشنیاں جلتی تھیں۔ سردی ایسی
کہ دریائے سوات کے پانیوں کے قریب کھلی فضا میں اطمینان سے بیٹھا جا سکے لیکن
پر جبر کیے بیٹھے رہے۔ ڈھیٹ بنے کچھ لاپرواہ ہو کر بیٹھے رہے۔

ڈاکٹر اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ گھسائے لٹکتا چلا آ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھ
نے ایک ہاتھ باہر نکالا اور کالیے کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے اخباری کاغذ میں لپٹے پتھ
جھکا کر عقیدت سے وصول کیا اور پھر بے حد احتیاط سے کاغذ کی تہیں الگ کیں۔
ایسی تھی کہ گرے پتھر کو سیاہ بناتی تھی۔ جب کچھ دکھائی دیا تو جو کچھ دکھائی دیا وہ کا
منہ سے "بہن یا" کہلوانے کے لیے کافی تھا۔

یہ چھوٹا سا ٹکڑا کسی سٹوپے کا حصہ تھا۔ مہاتما بدھ کی زندگی کی کہانی جہاں
دائرے میں چلتی ہے اور زائر اپنی آنکھیں اُن مجسموں پر رکھتے ہوئے طواف کرتے
یہ کہانی کوئین مایا کے اُس خواب سے شروع ہوتی ہے جس میں ایک سفید ہاتھی آسمان
اُتر کر اُس کی جانب آ رہا ہے اور اُن خاک دانوں پر اختتام کو پہنچتی ہے جن میں بد
خاک ہے اور انہیں مملکت کے تمام حصوں میں اونٹوں اور ہاتھیوں پر بھجوایا جا رہا ہے
اِسی کہانی میں گریٹ ڈیپارچر بھی آتا ہے... کالیا ایک عشق میں مبتلا اور فنا چہرہ
ٹکڑے کو جیسے آنکھوں سے لگانا چاہتا تھا۔ سدھارتھ کا گھوڑا کنتھکا اپنی تھوتھنی اُ
قدموں میں رکھے کھڑا ہے۔ شہزادہ سدھارتھ اپنا شاہی چھتر اور پگڑی اپنے ایک دو

حوالے کر رہا ہے...

"ہائے ہائے کیا بہن یا آرٹسٹ تھے اور کیا بہن یا اُنگلیاں تھیں جنہوں نے ایسے لاکھوں ماسٹر پیس بنائے —" اس نے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگایا اور چوم کر ڈاکٹر کو واپس کر دیا۔ "ڈاکٹر یہ بزنس کی بات نہیں۔ دل کی بات ہے — کیا بہن یا لوگ تھے جنہوں نے گندھارا کے پورے عہد میں صرف مجسمے بنائے... اور عبادت گاہیں کہاں بنائیں صرف وہاں جہاں سے منظر آسودگی اور سکون دیتا ہو... کیا بہن یا تہذیب تھی — اور اب پونے دو ہزار سال بعد بیسویں صدی کے آخری برسوں میں یہ پاکستان — کیا بہن یا تہذیب ہے۔"

"چلیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا...

"اس اندھیرے میں کوئی چلا بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے —" کالیا بڑبڑایا "لیکن میں نہیں جاؤں گا — کیونکہ مجھے دکھائی دیتا ہے۔ اللہ رسول کی قسمے مجھے دکھائی دیتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ مشاہدی — اندھیرا بہت ہو چکا ہے پر تمہیں پانیوں کے چلنے کی آواز تو آ رہی ہے ناں؟ لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ آواز مدھم ہو رہی ہے — بہت ساری چھوٹی چھوٹی ندیوں سے مل کر ایسے دریا بنتے ہیں... ایک ندی بندے کے دماغ میں سے نکلتی ہے، دل کے راستے باہر آتی ہے اور اس ندی میں... یہ گندھارا کے مجسمے ہوتے ہیں یارا... سندھی کڑھائی اور پنجابی کھیس ہوتے ہیں ہزاروں برسوں کی کمائی ہوتی ہے ہاتھوں آنکھوں اور دماغ کی.... تم لوگ دھیان ہی نہیں دے رہے۔ پرواہ ہی نہیں کر رہے... تم بناشک جو مرضی آئے کر لو پر ملک تبھی قائم رہتے ہیں جب وہ اپنی ہزاروں برس کی کمائی کو قلعی بنا کر دیواروں پر سیاسی نعرے نہیں لکھتے... اوئے مشاہدی سن رہا ہے؟"

"ہاں سن رہا ہوں —"

"تو پھر مجھے بلیک لیبل تلاش کر دے اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی... ایک گھونٹ لگوا دے رب تیرا بھلا کرے —"

"اب چلیں؟" ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

کالیے نے وہسکی کا گھونٹ لینے کی بجائے اُسے حلق میں اُنڈیلا اور "صدقے" کہنے کے بعد ڈاکٹر کے "اب چلیں؟" کی نقل اُتاری "آہو تیرے تو من کو ٹھنڈ ہے ناں تیرے پاس گریٹ ڈیپارچر جو ہے — اب چلیں۔ کیوں چلیں؟ ہمیں کہاں جانا ہے؟ اوئے

مشاہدی تو سب دیکھ رہا ہے کہ ہم نے اب کہیں نہیں جانا..... اور کم سے کم ڈاکٹر کے بنگلے میں تو نہیں جانا جس کے باتھ رُوموں کے کموڈ بہن یا اتنے ٹھنڈے ہیں کہ اُن پر سے بہن یا پچھی پر نیلے رنگ میں کموڈ کا نقشہ بن جاتا ہے —"

"میں نے باتھ رومز میں بھی ہیٹرز کا بندوبست کر دیا ہے —" ڈاکٹر شائد اندھیرے میں اب وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کی ہنسی کی آواز سُن کر کُتورے بھی اپنے ہونے کی خبر ایک "وَف" سے دی۔

"مشاہدی اوئے پُت پینڈو صرف ایک اور بات کر لینے دے... میں ذرا اُن اور میں ذرا لہر میں ہوں۔ اوئے تو نے اُستاد عشق لہر کا کلام سنا ہے نہیں سنا تو لکھ لعنت تم پر... وہ کہتا ہے — پر نئیں اس وقت میں ایک اور بات کرنا چاہتا ہوں... تو ہمیشہ پ تھا کہ گندھارا میں کیا چارم ہے — میں بتاؤں؟ بس آخری بات ہے۔"

"بتاؤ —" مشاہد نے کہا۔ وہ پتہ نہیں کالیے کی آواز سُن بھی رہا تھا یا نہیں۔ شائد مردان کے قرب میں تھا یا برگیتا کے ساتھ سویا ہوا تھا۔ وہ کہیں اور تھا۔ ڈاکٹر بھی سے الگ تھا لیکن کالیا بولے چلا جا رہا تھا.....

"ڈاکٹر کو اس چارم کا پتہ ہے — کیوں ڈاکٹر؟" ڈاکٹر بولا نہیں "مشاہدی، جب سری بہلول جاتے ہو نا... یا کہیں اور جہاں "پتھر" یا "گُتا" ملتا ہے تو ایک شخص آتا کمبل کی بُکل مارے اور وہ آپ کے سامنے آ کر ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہے کہ کوئی دیکھ تو رہا — اور پھر اپنی بُکل میں سے بُلھے شاہ کا چور نہیں نکالتا ایک پتھر نکالتا ہے... گندھا کوئی ٹکڑا نکالتا ہے — اور مشاہدی کیا یہ دل روکنے والا تجربہ نہیں کہ کسی بہن یا گا بندے نے ڈیڑھ پونے دو ہزار برس پہلے جو مجسمہ بنایا تھا اُسے تم پہلی بار دیکھ رہے ہو ہاں پونے دو ہزار برس میں اور کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ صرف تم دیکھ رہے ہو اور اور کائنات کے سارے نظریے تمہارے قدموں میں بچھ جاتے ہیں۔ اُسے، اُس ٹکڑ اُس شخص نے نہیں دیکھا جو اُسے بیچ رہا ہے جس نے اُسے کھیت میں سے یا کسی کھنڈر سے کھودا ہے کیونکہ اُس کے لیے وہ ایک قابل فروخت شے ہے، مرچن ڈائز ہے چنانچہ وہ اُسے نہیں دیکھتا تم اُسے پونے دو ہزار برس کے بعد پہلے بندے ہو جو دیکھ — اور... اگر تم اُسے نہیں خریدتے تو تم اُس ماسٹر پیس کو آخری مرتبہ دیکھ رہے ہو کیو وہ کہیں بھی جا سکتا ہے لیکن کسی میوزیم میں نہیں جائے گا اس لیے تم اُسے آخری

دیکھتے ہو — تو یہ چارم ہے گندھارا کی... کیوں ڈاکٹر؟"

"ہاں —"

"اور یہ ندی سُوکھ رہی ہے — ہماری ہزاروں برسوں کی کمائی سوکھ رہی ہے۔"

کُتورے نے دوبارہ "وَف وَف" کر کے کالیے کی تائید کی۔

درجہ حرارت صفر سے نیچے تھا اور اب برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ دریا کی آواز پہلے سے بلند تھی اور دور پہاڑیوں کے دامن میں آلوچے کے جو باغ تھے اُن کی جانب سے ایک برفیلی ہوا آتی تھی۔

اُنہوں نے دیکھا کہ ہوٹل کے پچھواڑے میں جو تنہا درخت تھا اور جس کی سُوکھی ہوئی سیاہ شاخوں پر کہیں کہیں سفید دھبے تھے اور آلوچے کے شگوفے کھلنے کے لیے ابھی تھوڑی سی حدّت درکار تھی جو اگلے تین چار ہفتوں میں تو ممکن نہ تھی — لیکن وہ تین چار ہفتے اُسی وقت گذر گئے۔ آلوچے کے درخت کے سفید دھبّے دیکھتے دیکھتے اُن کی نظروں کے سامنے اندھیرے میں کھلے اور اُن سے روشنی ہوئی — سُوکھی ہوئی شاخوں پر سفید روشنیاں تھیں جن سے دریائے سوات کے پانیوں پر رشک پیدا ہوتی تھی۔ سارے کا سارا سلیٹی منظر اُن کے سامنے آ گیا اور نرگس کی تیز بھید بھری مہک نے اُن چاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چار چیزیں جو ہر دسمبر میں اُسے بلاتی ہیں۔

اور اُن میں سے ایک وادیٔ سوات کا سلیٹی منظر ہے۔

آلوچے کے سفید شگوفوں کی روشنی نے کُتورے کی آنکھوں کو بھی چندھیا دیا اور اُس نے بیزار ہو کر ایک اور "وَف" کی۔

چار چیزیں ہیں۔

دور پہاڑیوں میں کہیں کہیں مائیکا کی دھات پتھروں میں تھی اور دھوپ کی ز[...]
آکر اس طرح لشکارے مارتی تھی جیسے کوئی آئینے کے ٹکڑے سے پیام بھیجتا ہو۔ مشا[...]
کے اس سردیلے منظر کو دیکھے چلا جا رہا تھا۔ پہاڑیاں ایک بہت ہلکی دھند میں تھیں اور
میں سے صرف وہ پتھر الگ ہو کر دکھتے تھے جن میں مائیکا دھوپ کو دھتکار کر واپس [...]
تھی...

ڈاکٹر نے واقعی باتھ رومز میں بھی ہیٹرز کا بندوبست کر رکھا تھا اور کالیے کی [...]
آج صبح کوئی شکایت نہ تھی۔

بٹ خیلہ کا بازار جسے سول ہسپتال میں مقید گھروں سے دور اُداس ہوتے اور [...]
کی عرضیاں مسلسل لکھتے نوجوان ڈاکٹر ایشیاء کا سب سے طویل بازار کہتے تھے آج [...]
وجہ سے بند پڑا تھا۔ بازار کے اختتام پر دائیں جانب وہ ریسٹ ہاؤس دکھائی دیا جس
برآمدے میں دریائے سوات کے ایک پھیلے ہوئے منظر کے سامنے بیٹھ کر تاریخ دان ٹائ[...]
نے "بٹوین آکسس اینڈ جمنا" کے چند باب تحریر کئے تھے۔ ذرا آگے بائیں طرف [...]
وسیع قبرستان تھا اور اس کی ننگی سلیٹی کتبوں پر وہی نقش اور بیلیں تھیں جو گندھارا [...]
میں بدھ کے گرد تراشی جاتی تھیں۔ ایک بڑی چٹان کو سامنے پا کر کار اس سے بچ کر [...]
تھی تو پاپلر کے درختوں والی سیدھی سڑک سامنے آجاتی تھی... کئی کلومیٹر تک بے [...]
شاخیں آسمان کی نیلاہٹ میں الگ الگ دکھائی دیتی تھیں اور وہ آپس میں ملتی دکھائی [...]
تھیں۔ دائیں طرف آلوچے کے سلیٹی جنگلوں کے ذخیرے تھے۔

کالیے نے ڈاکٹر کی شادی کی خوشی میں سردی میں ٹھٹھرتے سرخ ناکوں اور [...]
چہروں والے سب بچوں سے ان کے نرگس کے گچھے خرید کر پٹرول کی پچھلی نشست
پھینک دیئے تھے اور اب ہیٹر کی گرمی اُن کی مہک کو تیز کر رہی تھی۔
اُس نے دے سائڈ ہوٹل کے چھپروں تلے آکر اپنے برادرِ عزیز کو بھی کو[...]

کر لیا تھا اور اب برادرِ عزیز نرگس کے گچھوں میں استراحت فرما رہا تھا اور جب کبھی کوئی ہلکا سا دھچکا لگتا تو وہ ایک بلند "چاؤں" کر کے پھر آنکھیں موند لیتا۔

چک درّہ پُل کے چوک میں ہمیشہ رونق ہوتی تھی خاص طور پر متعدد اخبار بیچنے والے بٹ خیلہ سے آتی ہوئی کاروں کے آگے کھڑے ہو جاتے۔ مشاہد نے ایک اردو اور ایک انگریزی اخبار خریدا اور ہیڈلائنز پر نظر ڈالے بغیر انہیں پچھلی نشست پر پھینک دیا۔ اخبار کُتورے کے چھوٹے سے، سانس کے ساتھ اوپر نیچے ہوتے پیٹ پر قدرے زور سے لگے اور اُس نے ایک لمبی "چاؤں" کے بعد مشاہد کو ناراض نظروں سے دیکھا۔

اب اگلی نشست پر مشاہد اور کالیا تھے --- اور پچھلی نشست پر نرگس کے پھولوں کے گچھے دو اخبار اور ایک عدد کُتورا تھا۔

چک درّہ پُل سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر جہاں پاپلر ختم ہو رہے تھے وہاں سے دائیں جانب ایک راستہ تھانے کو جاتا تھا اور اگر آپ کی منزل منگورہ تھی تو پھر آپ مُڑتے نہیں تھے سیدھے چلے جاتے تھے۔ "تھانہ" ایک بارونق قصبے کا نام تھا اور اس کے مرکزی چوک میں جب یہ کاریں داخل ہوئیں تو متعدد خان صاحب اپنی پگڑیاں اور شلواریں سنبھالتے ہوئے اپنے آپ کو کیچڑ سے بچاتے ہوئے خشمگیں نظروں سے ان غیر ملکیوں کو دیکھنے لگے۔ تھانہ سے باہر آنے پر منظر میں ایک حیرت انگیز وسعت پیدا ہوئی۔ کھیت اور پہاڑیاں دور ہوتے گئے اور ان میں بے شمار دھوپ پھیلتی گئی۔ یہاں خنکی بہت تھی۔ پچھلی نشست سے آتی ہوئی نرگس کی مہک بھی تیز ہو گئی۔

اور پہاڑیوں میں کہیں کہیں مائیکا والا کوئی پتھر لشک کر الگ ہوتا تھا اور پھر گم ہو جاتا تھا۔

"مشاہدی --- " کالیے نے سڑک سے نظر ہٹا کر اسے غور سے دیکھا۔

"ہوں۔"

"رات دے سائڈ ہوٹل کے پچھواڑے میں آلوچے کا جو درخت تھا اور اس کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں میں جو سفید دھبے سے دکھائی دیتے تھے کیا وہ واقعی ہمارے دیکھتے دیکھتے کھِل گئے تھے اور اُن کی روشنی سے دریا کے پانی پر لشکتے سائے پڑے تھے... یا میرا وہم تھا۔"

"اگر یہ وہم تھا تو ہم سب کا تھا۔"

"لیکن یہ بہن یا ہو کیسے سکتا ہے — میں تو ڈر گیا تھا — وہ آلوچے کا ویسے کا ویسے ہی خالم خالی کھڑا ہے — بس سفید دھبے ہیں جو تین چار ہفتوں کے حدّت سے شگوفوں میں بدلیں گے — یہ کیا ہے مشاہدی؟"

"یہ ہم ہیں —"

"تو یہ بہن یا ہم ہیں..." کالیے نے نہ سمجھتے ہوئے بھی دانش مندی سے سر

"آج تم اتنی سویرے اٹھ کر کدھر چلے گئے تھے... میری نیند خراب کردی

"میں؟... تم نے آج صبح ڈاکٹر کو دیکھا ہے؟"

"ہاں —"

"کوئی فرق نظر آیا؟"

مشاہد نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"جناب عالی میں نے کل آتے ہی ڈاکٹر ارشد کے سفید بالوں کو ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ یارا جس مُنڈے کا بیاہ ہو وہ چٹا جھاٹا لے کر تو دولہن کو لینے نہیں چنانچہ میں آج صبح ڈاکٹر کے کمرے میں گیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ میں اس گریٹ ڈیپارچر چُرانے آیا ہوں لیکن میں گیا تھا اس کے بال ڈائی کرنے — کمال نے نوٹ ہی نہیں کیا۔ ڈاکٹر تو بال رنگ کے بالکل پوپٹ لگ رہا ہے —"

"کیا لگ رہا ہے؟"

"پوپٹ —" کالیا آج خاص طور پر ڈاکٹر کی خوشنودی حاصل کرنے کی کو رہا تھا تاکہ پچھلی شب اس نے اس کے عقیدے پر جو اعتراض کئے تھے اس کی کسر جائے۔

"ونگ کتنی دور ہے؟"

"بس پندرہ بیس منٹ —" کالیے نے سڑک کی سیدھ میں انگلی اٹھا پہاڑیوں کے دامن میں ہے — اوپر بلندی پر کافرکوٹ کے کھنڈر ہیں... اور اد طرف جو پہاڑ ہے اس کی دوسری جانب نوگرام کا ویران قلعہ اور بدھ عبادت گاہ سکندرِ اعظم نوگرام کے راستے دوسری جانب اُترا تھا۔ اور دوسری جانب نوگرام قصبہ دکھائی دیتا ہے جہاں سے سکندر نے دریائے سندھ عبور کیا تھا — کبھی چا ادھر..."

"عبور تم بھی رکھتے ہو تاریخ پر —" مشاہد متاثر ہو کر مسکرایا۔

"پِٹ پینڈو اینٹیک ڈیلر کو اگر تاریخ کا نہیں پتہ تو وہ تاریخی نوادرات کو کیسے پہچانے گا... مجھے ان علاقوں کی اصلی تاریخ کا پتہ ہے —"

"تاریخ نقلی بھی ہوتی ہے؟"

"ہاں — جو ہم نے اپنے خود ساختہ نظریئے یا مذہب کے حوالے سے بناتے ہیں۔ جو ہمارے نصاب میں ہوتی ہے۔ جس میں صرف ہم ہی ہم ہوتے ہیں اور ہر صفحے پر ہم زندہ باد لکھا ہوتا ہے — اور ہم اسی زندہ باد زعم میں مبتلا رہتے ہیں اور جب ایک دن اصلی تاریخ سامنے آتی ہے تو ہم چکرا جاتے ہیں — میرا خیال ہے اسی کو تاریخ کی جبریت کہتے ہیں —"

"پتہ نہیں —" مشاہد ایک مرتبہ پھر کالیے کے تجزیے سے متاثر ہوا اور مسکرایا۔

ان کی نسان سب سے آگے تھی۔ پچھلی کار میں ڈاکٹر ارشد اور اس کے تین کولیگ تھے... ان سے پچھلی دو کاروں میں چند دور پار کی رشتہ دار خواتین تھیں جنہیں صرف اس لئے بلایا گیا تھا کہ خواتین کی نمائندگی کے لئے ان کی موجودگی ضروری تھی ورنہ ڈاکٹر ان کو ٹھیک طرح سے پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اس نے کسی بھی قریبی عزیز کو اپنی شادی کا دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا۔

"ان پہاڑیوں میں سے ایک مرتبہ ایک چرواہے کو سونے کے پرندے ملے تھے — پتہ نہیں کس عہد کے تھے۔ اُس بہن یا نے تھانے کے ایک مُنیارے کو سونے کے داموں بیچ دیئے اور رقم سے پانچ گدھے خرید لیے... بہن یا سونے کے پرندے — میرے پاس لے آتا تو میں اسے اسلام آباد کے بلیو ایریئے میں پانچ پلازے خرید دیتا —"

"ادھر بھی گندھارا ہے؟"

"ادھر ہی تو ہے — تم دیکھنا تو سہی کیا ہوتا ہے — میں کتنی بار آ چکا ہوں اور بعض اوقات تو بڑا ریئر پیس مل جاتا ہے —"

پہاڑی کے دامن میں ایک پتھریلے اور سمٹے ہوئے قصبے کے آثار نظر آئے۔ جیسے وہ تھانہ سے لے کر یہاں تک لینڈ سکیپ سے خوفزدہ ہو کر پہاڑی کی گود میں جا چھپا ہو... تنگ سڑک کے گرد پتھریلی دیواریں بلند ہو گئیں۔ ایک دو مکان بھی نظر آئے جن کے

صحنوں میں خالی ہاتھ درخت تھے۔ پھر ایک قبرستان آیا اور سڑک کچے پکے مکانوں کر یکدم اوپر اٹھ گئی اور کالیے کو پھرتی سے گیئر نیچے لانا پڑا۔ چڑھائی کے بعد ایک جگہ آئی جس میں گُڈی کاغذ کی چند جھنڈیاں سرد ہوا سے پھڑپھڑا رہی تھیں۔ ایک شخص جس کی ایک آنکھ میں کوئی نقص تھا بار بار اپنی پگڑی سنبھالتا ایک بے مسکراہٹ کے ساتھ کاروں کے قریب آیا اور ہر کار میں جھانکتے ہوئے بالآخر جب ڈاکٹر ارشد کا چہرہ نظر آیا تو اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اسے پشتو کہا۔

ڈاکٹر ارشد کار سے اُترا اور کچھ لاتعلقی سے ادھیڑ عمر شخص سے گلے ملا۔ ا انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"نل" کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں نالیوں کو پھلانگتے وہ ایک کچے گھر کے داخل ہوئے... صحن میں ابھی تک پچھلی بارشوں کا کیچڑ موجود تھا۔ اس کے برابر ٹوٹے ہوئے چھپّر تلے ایک گائے ناکافی چارے پر جھکی ہوئی تھی۔ بالکل سامنے ایک تھا جس کے کچے اور گیلے فرش پر دریاں بچھا کر بارات کے بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا تھا

ادھیڑ عمر شخص کے چند رشتے داروں نے انہیں پہلے تو چھانوں کی خاص نگاہوں سے دیکھا اور پھر چائے اور مٹھائی کے ساتھ ان کی تواضع کی... پھر وہ بہت بیٹھے رہے... بہت سارے معاملات تھے جو طے ہو رہے تھے اور لڑکی کا باپ گل اب اتنا ادھیڑ عمر نہیں دکھائی دے رہا تھا پھرتی سے مختلف کوٹھڑیوں کے اندر جا رہا تھا باہر آ کر اپنے غصیلی نگاہوں والے رشتہ داروں سے مشورے کر رہا تھا۔

کالیا مشاہد کے کان کے قریب ہوا "آجا —" اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ گلی میں آ گیا۔

"آ تجھے سیر کراتے ہیں —" کالیے نے اپنے اکڑے ہوئے بدن کو انگڑا ہوئے نارمل کرنے کی "سعی کی" پہلے روزی کے پاس چلتے ہیں —"

"یہاں بھی کنیکشن ہے؟" مشاہد نے پوچھا۔ اسلام آباد میں کالیا ہر د منک کر چلنے والی خاتون سے آگاہ تھا اور وہ کہتا تھا کہ یہ بھی کنیکشن ہے۔

"ہاں — اور کیا کنیکشن ہے"

وہ ایک اور اسی طرح کے صحن میں داخل ہوئے جس طرح کے صحن میں

ل کر آئے تھے۔ اس صحن میں بھی پچھلی بارشوں کا کیچڑ تھا اور چھپّر تلے ایک گائے تھی لن ایک فرق تھا۔ صحن کی ایک کچی دیوار کے ساتھ نیچے اوپر انتہائی وزنی اور بڑے بڑے ر دیوار سے بھی بلند ہوتے تھے۔ ان پتھروں کی جسامت اور تراش سے یہ اندازہ لگانا کل نہ تھا کہ وہ کسی قدیم عبادت خانے کا حصہ رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر پر گل بوٹے ر بیلیں تراشی گئی تھیں۔ ایک بہت بڑا ستون شکستہ حالت میں صحن کے بیچ کیچڑ میں پڑا تھا ردو "باڈیاں" گائے کی کھُرلی سے ٹیک لگائے آرام کر رہی تھیں۔ بُدھ کے ایسے قد آدم ے جن کے سر غائب ہوں انہیں "باڈیاں" کہا جاتا تھا جیسے چھوٹے مجسموں کو ہمیشہ ڈی" کا نام دیا جاتا تھا...

"روزی خاناں —" کالیے نے ایک خاص سُر میں نعرہ لگایا... پھر متعدد بار پکارا... بالآخر اس نے روزی کے بچّے اور بہن یا روزی کے نعرے لگانے شروع کر دیئے... ک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور اس میں سے روزی کا چہرہ دکھائی دیا... مشاہد نے اپنی زندگی ں اتنا غلیظ اور کراہت آمیز چہرہ نہیں دیکھا تھا... وہ مسکرایا تو اس کی کراہت آمیزی میں بت اضافہ ہو گیا۔ اس نے پشتو میں کچھ کہا اور کھڑکی بند کر دی۔

"روزی خود کھدائی کرتا ہے اور بالکل جینئن مال رکھتا ہے —"

روزی کا میوزیم ایک اصطبل نما بڑے شہتیروں والی جس میں سے گندم کی پرالی ی تھی اور جس کا بھوسے اور گارے سے بنا ہوا فرش بھی ہموار نہ تھا ایک اصطبل نما ٹری میں تھا۔ فرش پر سینکڑوں ٹوٹے ہوئے اور نیم شکستہ گندھارا کے ٹکڑے سجے تھے روزی ہر ایک پر ہاتھ لگا لگا کر بتاتا تھا — یہ سٹوپا کا حصہ ہے۔ چھتری ہے۔ یہ بودھی ہے۔ ادھر یہ برتھ ہے اور یہ پجاری ہے اور ہاتھ باندھتا ہے۔ اس غلیظ روزی کی بُدھ بارے میں معلومات حیرت انگیز تھی... لیکن کالیا نے درست کہا تھا کہ انٹیک ڈیلر چاہے روزی ہی کیوں نہ ہو تاریخ سے مکمل واقفیت نہ رکھتا ہو تو پھر وہ انٹیکس کی پہچان کیسے ے۔

"نہیں روزی — یہ ٹوٹ پھوٹ ہے — کوئی خاص چیز ہے؟"

"ہے" روزی نے صرف اتنا کہا اور مسکرایا... اور مشاہد سے اس کی مسکراہٹ ت نہ ہو سکی اور اس نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"تو دکھاؤ ناں یارا —" کالیا بے چینی سے بولا اور اس کی آواز بیٹھ گئی۔

روزی اطمینان سے اٹھا اور اطمینان سے تادیر اپنے خصیئے کھجانے کے لیے
کوٹھڑی میں گیا۔ جب واپس آیا تو اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی گیند کے سائز کی کوئی شے اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے یہ شے کالیے کے آگے رکھ دی۔

"کیا ہے؟" کالیے کی آواز میں لرزش تھی اور جنسی طور پر بے اختیار ہو جانے والے ایک شخص کی طرح اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

"دیکھو ——" روزی نے صرف اتنا کہا۔

کالیے نے اخباری کاغذ کو ایسے احتیاط سے کھولا جیسے اس کے اندر کوئی ... ہو...

اس کے اندر ایک ٹوٹا ہوا ہیڈ تھا... ایک چھوٹا سا سر لیکن اس کی کوئی ... سلامت نہ تھی۔ مشاہد کو وہ ایک عام سا پتھر لگا۔

"یہ تو سب ٹوٹا ہوا ہے ——" کالیے نے اس پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"ہاں ——" روزی نے پھر صرف یہی ایک لفظ کہا۔

"تو یہ... بالکل ٹوٹا ہوا ہے بیکار ہے ——"

"ہاں ——"

"کتنے کا؟"

"پانچ ہزار ——"

کالیا ہنسنے لگا لیکن مشاہد کو ان کی ہنسی تھیٹر کے کسی اداکار کی لگی... کہیں وہ قدرے بلند تھی اور قدرے بے وجہ" پانچ ہزار —— اس ٹوٹے ہوئے ہیڈ

"زیادہ سے زیادہ سو روپے کا ہے ——"

"ٹھیک ہے ——" روزی نے کہا۔ پہلے تو کالیا یہ سمجھا کہ سودا ہو گیا ہے
روزی نے ہیڈ کو کاغذ میں لپیٹا اور اٹھ کر اندر جانے لگا۔

"روزی —— بات تو کرو ——" کالیا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا بات کرو ——"

"تم اپنی قیمت بتاؤ یارا۔ غصہ مت کرو ——"

"پانچ ہزار ——"

"یہ تو انصاف نہیں ہے ——"

"تم انصاف کرو —— اسے دیکھو کیا ہے؟"

"بس بدھا کا ٹوٹا ہوا ہیڈ ہے —— اور کیا ہے؟"

"نہیں سیٹھ کالیا —— یہ صرف ہیڈ نہیں۔ سُوکھے کا ہیڈ ہے —— اس کا گال پھو... اس کا آنکھ دیکھو اندر گیا ہے۔ سُوکھے کا ہیڈ ہے... بے شک ٹوٹا ہوا ہے —— پانچ ... نہیں تو میں لے جاتا ہوں:"

"اچھا بن یا پانچ ہزار ہی سہی ——" کالیا جھنجھلا گیا اور پھر پٹھانوں کے بارے میں نازیبا کلمات کہے۔

"ابھی لے جاؤ گے یا اندر رکھ دوں" روزی یقیناً لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"ابھی ——" کالیے نے رقم گن کر اس کے کھردرے اور ٹوٹے ہوئے ناخنوں لے ہاتھوں میں دی اور اخباری کاغذ میں لپٹے گیند کو اٹھا کر وہ دونوں باہر گلی میں آ گئے۔

"پانچ ہزار ——" مشاہد تقریباً چیخ اُٹھا "اِس پتھر کے... تم ہوش میں تو ہو ——"

"میں نے صبح سے ایک گھونٹ نہیں پیا ——" کالیے نے شہادت کی اُنگلی بلند کی پھر اخباری کاغذ کو ذرا سا کھول کر اُس میں جھانکتے ہوئے وہ مستی میں بولا "مشاہد یہ یُونیک چیز ہے —— تم نے لاہور میوزیم میں فاسٹنگ بدھا تو دیکھا ہے ناں.... پوری دنیا اس سے یُونیک پیس اور کوئی نہیں۔ اس کی کوئی قیمت نہیں —— جب لارڈ بدھ نے طویل تپسیا کی گیان حاصل کرنے کے لئے تو وہ —— بالکل سُوکھ گیا —— اسی لئے ں نے اسے سوکھا کہا تھا... یہ نمونے بالکل نایاب ہیں... یہ دیکھو روزی درست کہتا تھا کچھ ٹوٹا ہوا ہے لیکن —— اس کی دونوں آنکھیں ایک فاقہ زدہ شخص کی طرح دھنسی اور مُردہ ہیں اور اس کے گال اور ماتھا پچکا ہوا ہے —— میں اسے پانچ ہزار تو کیا پچاس میں بھی خرید لیتا ——"

"اِسے بھی جاپان سمگل کرو گے"

"نہیں —— اِسے میں اپنے پاس رکھوں گا۔ اپنے پرائیویٹ میوزیم میں ——"

اس دوران روزی اپنی بہتی ہوئی ناک کُرتے کی آستین سے صاف کرتا ہوا باہر آ
ادھر اسلام خان کے پاس ایک چیز ہے —— دیکھو گے؟"

"میں جانتا ہوں" کالیے نے سر ہلایا" پوری مارکیٹ جانتی ہے لیکن وہ پیسے بہت رہا ہے ——"

"نہیں دیکھو گے؟"

"دیکھ لیتے ہیں — کیوں مشاہدی؟"

مشاہد بھی ایک نامعلوم کشش کے تحت گندھارا کے ان ہزاروں برس
نقوش کے قریب آ رہا تھا۔ یہ ایک عجیب کھیل تھا — کیا دنیا کے کسی حصے میں اپنی
کے ساتھ اس قسم کا کھیل کھیلا جاتا ہے؟

اسلام خان بہترین چترالی چرس کے تین سگرٹ پی کر اپنے کمبل میں آنکھ
کیے پتہ نہیں کن جہانوں میں تھا جب اُسے روزی کی آواز دور سے... کہیں ایک گ
گہرائی سے آتی سنائی دی اور وہ فوراً ہوشیار ہو گیا۔ کالیے کو دیکھ کر اُس کی باچھ
گئیں اور وہ مزید ہوشیار ہو گیا" آ.. آ کالیا سیٹھ —" وہ آگے بڑھ کر اُس سے بغل
اور چرس کے نشے کی وجہ سے خاصی دیر بغل گیر رہا۔ پھر کالیے نے اُسے باقاعدہ د
پرے کیا اور کہنے لگا" اسلام..."

فوری طور پر خان نے "زندہ باد" کا نعرہ لگایا اور پھر فوری طور پر شرمندہ ہو
سر کھجا کر کہنے لگا "ہاں کالیا سیٹھ —"

"ہم وہ دیکھنے آئے ہیں —"

"آؤ —" اُس نے کہا۔

اُن تینوں کو دیکھ کر چتکبری گائے نے ایک خوش آمدیدی "باآں" کی
جواب میں اسلام خان نے اُسے پشتو میں کس مناسب گالی سے نوازا۔ گائے نے نا
کر تھوتھنی دوسری جانب کر لی۔ کوٹھڑی میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد انہیں کچ
دیا۔ گوبر کے ڈھیر کے برابر پرالی کے گٹھے تھے اور ان کے برابر میں فرش پر کچھ
پرالی میں سے ایک سفید پاؤں نظر آ رہا تھا۔

"بھن یا جینوئن ہے۔" کالیے نے ایکسائیٹ ہو کر مشاہد کا بازو جھنجھوڑا "یہ
پاؤں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ باقی بھی اصلی ہے اور کیا پاؤں ہے مشاہدی" وہ سلو مو
نیچے بیٹھتا گیا اور پھر اپنی آنکھوں کو پاؤں کے قریب لاتا گیا "صدقے —"

اسلام خان ایک کونے میں کھڑا اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لئے
دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رہا تھا۔

"اوئے باقی بھی دکھا دے ظالما — پرالی ہٹا دے"

اسلام سنبھلا اور آگے بڑھ کر پرالی کے گچھے اُٹھانے شروع کر دیئے اور وہ انہیں
س کے نشے کی وجہ سے بے حد آہستگی سے اُٹھا رہا تھا اور کالیا کہتا تھا "اوئے جلدی کر
۔جلدی..."

آہستہ آہستہ وہ ظاہر ہوتا گیا۔

نفیس ترین کاریگری۔ Stucco سے بنا ہوا ایک لائف سائز بدھ کا مجسمہ۔ ایسی
نائی کہ صرف ایک سانس کی کسر تھی ورنہ وہ بولتا۔ کیا اُس کے گھٹنے پر بھی کسی مائیکل
نجلو نے ہتھوڑی مار کر کہا ہو گا کہ بول — تو ہی تو پرفیکٹ بدھ ہے — اگر مُوسے
ں بولا تھا تو یہ بُدھ کہاں بولا ہو گا جو یُوں بھی کم گو تھا — یہ ایسے مائیکل اینجلوز تھے جو
انام نہیں اپنی عقیدت چھوڑ جاتے تھے — ویسے جس نے فاسٹنگ بُدھ تراشا تھا اس نے
اسے شاید بولنے کے لئے ضرب نہیں لگائی ہو گی کیونکہ وہ لوگ اپنے بڑوں کا ادب
تے تھے۔

کالیا ابھی تک اس کے پاؤں پکڑے بیٹھا تھا اور انگلیوں پر غور کر رہا تھا — "بولو
ں — کتنا رقم؟"

وہ نہیں بولا۔ دیوار سے ٹیک لگائے کالیے کے زرد پڑتے چہرے کی ایکسائٹ منٹ
لطف اندوز ہوتا رہا...

"بولو —" کالیے نے ایک بار پھر کہا اور چونے کی سفیدی جس میں شائد جان بھی
ا پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا" کیا بھن یا کاریگر تھے — بولو"

"پانچ —" خان نے مسلسل مسکراتے ہوئے کہا۔

"پانچ؟" کالیے نے اُس کی جانب دیکھے بغیر کہا" پانچ میں تو بھن یا اُدھر لندن میں
ٹی کے نیلام گھر میں ایسا پیس مل جاتا ہے یارا —"

"تو اُدھر جاؤ اِدھر کیا کرتا ہے —" اُسکی مسکراہٹ چلتی جا رہی تھی۔

ہر دو چار ہفتوں میں وہ لندن کا پھیرا لگاتا تھا۔ اکثر اوقات کرسٹی سے کوئی گندھارا
خرید کر اسے پاکستان لاتا اور یہاں سے جاپان سمگل کر دیتا... کیونکہ جو کچھ Source
آتا ہے اُس کے جینوین ہونے میں شک نہیں ہوتا۔

"چار — منظور ہے —"

"نہیں —" اسلام نے گوبر پر تھوکا "نہیں —"

"آؤ مشاہدی" کالیا مجسمے سے نظریں چُراتا ہوا اُٹھا صرف اِس ڈر سے کہ کہیں اُس کی صناعی سے متاثر ہو کر "پانچ" نہ کہہ دے...

"سنو —" خان بولا۔

"ہاں —" کالیا بیتابی سے اُس کی جانب پلٹ پڑا۔

"یارا اِدھر تم دونوں اِس کو ہاتھ تو لگاؤ۔ برکت کے لئے —"

کالیا مسکرایا اور اُس نے بدھ کے سر پر پیار دیا "آؤ مشاہدی"

"میں کیا کروں؟"

"صرف اِس ورک آف آرٹ پر اپنا ہاتھ پھیر دو۔ اِدھر گندھارا میں ڈیل والوں میں رواج ہے کہ جب کوئی ریئر پیس ملے تو اپنے مہمانوں کی عزت افزائی ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اس پر ہاتھ پھیرو... جب وہ پیس اُن کی خواہش کے فروخت ہو جاتا ہے تو ہر ہاتھ پھیرنے والے کو نذرانے کے طور کچھ رقم روانہ کی جا — تمہیں بھی چار پانچ ہزار مل جائیں گے ہاتھ پھیرو —"

مشاہد نے کندھے سکیڑے اور مجسمے کے پاس بیٹھ کر اس کے سینے پر ا رکھا... اور اُسے آئندہ زندگی میں — زندگی کے آخر تک شبہ رہا کہ اس لیے جب نے وادیٔ سوات کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک اصطبل میں بُدھا کے سینے پر ہا تھا تو اس کی ہتھیلی کے نیچے کچھ دھڑکا تھا۔ جیسے دل کی ایک دَھک ہو۔

"اصطبل میں ایک اور عیسیٰ پیدا ہوا ہے —" کالیا باہر نکلتے ہوئے بڑبڑ مشاہدی۔"

گلی میں ان کے آنکھیں یکدم چندھیا گئیں۔ وہ ایک اور زمانے میں چلے اور اب واپس آئے تھے۔

ڈاکٹر ارشد اور اُس کا سُسر اُن کے انتظار میں تھے اور شدید ناگواری اُن پر تھی کیونکہ وہ دونوں گواہ تھے — نکاح نامے میں صرف اُن کے دستخطوں کا پڑتی تھی۔

چار کاروں کا قافلہ جب نل سے نکلا تو شام ہو رہی تھی اور اب آس پہاڑیوں میں مائیکا کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ ایک سفید شٹل کاک برقعے

ٹھوکریں کھاتی ہوئی اُس صحن میں سے نکلی تھی اور ڈاکٹر کی کار میں ایک نابینا کی طرح، راستہ دکھاتے سہارا دیتے بٹھا دی گئی تھی۔

برادرِ عزیز نے پیٹرول کی پچھلی نشست پر خوب گند مچایا ہوا تھا۔ اور اب وہاں صرف نرگس کی مہک نہ تھی۔

تھانے کے ویران ہوتے بازاروں میں سے گزر کر جب وہ بٹ خیلہ جانے والی سڑک پر آئے تو شام بہت گہری ہو چکی تھی۔ چک درہ پُل پر چند روشنیاں تھیں جن کا عکس نیچے برفیلے پانیوں پر پڑتا تھا۔

"کل صبح ذرا سویرے سویرے نکلیں گے — میں شام سے پہلے لاہور پہنچنا چاہتا ہوں۔ برگیتا فکرمند ہو گی"

"کل صبح؟ — آج رات بٹ خیلہ میں بسر کرو گے؟"

"ہاں —"

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟"

"بھئی رات کے وقت جو کرنا ہے شیر نے کرنا ہے۔ اب پتہ نہیں اس بوڑھے شیر سے کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں — ہم سیدھے چلتے ہیں۔"

"اسلام آباد؟"

"ہاں —"

مشاہد نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ چھ بج رہے تھے۔ باہر سلیٹی منظر گھنی تاریکی میں گم تھا

"ٹھیک ہے — چلو"

"لیکن مجھے برادرِ عزیز کو وے سائڈ ہوٹل میں اُتارنا ہے —"

ان کی پیٹرول کی بریک لائٹیں جلیں تو بقیہ تینوں کاریں ہارن دیتی ہوئی آگے چلی گئیں۔

"چلو برادرِ عزیز" کالیے نے کتورے کو گردن سے دبوچ کر اُٹھایا اور وے سائڈ ہوٹل کے چھپر کی طرف پھینک دیا۔ اُس کی دردناک "چاؤں" دریائے سوات کے شور کے باوجود اُن تک پہنچی۔

دریا کے کنارے اُن کی کرسیاں اُسی ترتیب سے اب بھی پڑی تھیں۔

"تھوڑی دیر بیٹھ جائیں؟"

"کیا کریں گے؟"

"یہ —" کالیے نے جس طرح کُتورے کو دبوچا تھا اُسی طرح پچھلی نشست
فرش پر پڑی بلیک لیبل کی ایک بوتل کو پکڑا اور مشاہد کی آنکھوں کے سامنے لہ
"یہ..."

کُتورا پھر اُن کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

دریا کا شور قریب ہونے لگا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں نے تیرگی کو دیکھا اور ایک گہرا سانس بھرا۔

"صدقے —" کالیے نے پہلی گھونٹ کے بعد بہت دھیمے ہو کر اپنے آپ مطمئن ہو کر سرگوشی میں کہا "چل بھئی مشاہدی —"

"نو تھینک یو —"

"کیوں؟"

"بس —"

"اِدھر آؤ برادر عزیز —" کالیے کی چٹکی پر کُتورے نے بے حساب دم ہلائی۔ قریب آیا تو کالیے نے ہتھیلی پر تھوڑی سی وہسکی انڈیل کر اُس کے سامنے کی۔ اُس تھوتھنی آگے کر کے سونگھا اور اتنے زور سے چھینکا کہ دوہرا ہو کر گر گیا اور پھر مشکل اُٹھا۔

"برادر عزیز آفٹر آل کُتا ہی نکلا —" کالیے نے مایوسی میں سرہلایا اور ہتھیلی منہ کے قریب لا کر وہسکی کو سوپ کی طرح خود ہی سڑپ گیا۔

"مشاہدی — اسلام آباد پہنچتے ہی تمہیں پتہ ہے کہ سب سے پہلے میں نے کیا کرنا ہے؟"

مشاہد چپ رہا تو کالیا ناراض ہو کر کہنے لگا "پوچھو تو سہی کہ کیا کرنا ہے؟"

"کیا کام کرنا ہے؟"

"گشتیوں کا بندوبست کرنا ہے —"

"کیا؟"

"زبردست مُجرا کرانا ہے ڈاکٹر بڈھے شیر کی شادی کی خوشی میں — باشرابیں

گشتیاں —"

"فار ہیونز سیک —" مشاہد نے شدید ناگواری سے سرہلایا "یہ... یہ لفظ استعمال کیا کرو"

"کونسا لفظ؟ —"

"یہی — گشتی وغیرہ"

"اوئے —" کالیا اندھیرے میں اُس کے چہرے کے قریب اپنی آنکھیں لا کر بولا
شتی کو گشتی نہ کہوں — لیڈی کہوں؟ نیک پروین کہوں؟ تم ابھی تک وہی پُت پینڈو ہو
ے محل مشن ہائی سکول والے..."

سیاہی ہر شے میں سرائت کر چکی تھی۔

درجہ حرارت آج بھی صفر سے کہیں نیچے تھا اور برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔
ڑیوں کے دامن میں آلوچے کے جو باغ تھے اُن کی جانب سے ایک برفیلی ہوا آتی تھی۔

"نہیں —" یکدم کالیے نے اُسی سرگوشی میں کہا جیسے اُس نے "صدقے" کہا تھا
منہ کھول کر اُس میں وہسکی اُنڈیلتے ہوئے ایک ڈر کے ساتھ بولا "نہیں —" اُس نے
کھا کہ ہوٹل کے پچھواڑے میں آلوچے کا جو تنہا درخت تھا اور جس کی سُوکھی ہوئی
خوں پر ابھی ابھی جب اس نے برادرِ عزیز کو دبوچ کر وہاں پھینکا تھا کہیں کہیں سفید دھبے
، اور آلوچے کے شگوفے کھلنے کے لئے ابھی تھوڑی سی حدت درکار تھی جو اگلے تین
ہفتوں میں تو ممکن نہ تھی —

لیکن — وہ تین چار ہفتے اُسی وقت گذر گئے۔

آلوچے کی شاخوں پر پھُوٹتے ہوئے سفید دھبے دیکھتے دیکھتے اُس کی نظروں کے
نے اندھیرے میں کھلنے لگے۔ ساری شاخیں سفید روشن شگوفوں سے بھر گئیں۔

"نہیں —" تب کالیے نے اُسی سرگوشی میں کہا تھا — وہ بے یقین ہو رہا تھا۔
ا دیکھ رہے ہو مشاہدی؟"

مشاہد خاموش رہا۔ آلوچے کے سفید شگوفوں کی روشنی نے کُتورے کی آنکھوں کو
چندھیا دیا اور اُس نے بیزار ہو کر ایک ہلکی سی "وَف" کی۔

"میں — میں بُرے کے گھر تک پہنچوں گا۔ میں دیکھوں گا —" کالیا اُٹھا ہاتھ
تا ہوا اور لرزش میں اٹھا اور اسی انداز میں کُتورا بھی سرد زمین پر پڑی دُم پیچ کر اُٹھا اور

اُس کے پیچھے ہو لیا۔

وہ دونوں تاریکی میں چلے گئے۔ کالیا اور کُتورا۔

کچھ مدت — ایک سرد اور صفر سے نیچے کے درجہ حرارت میں بیٹھنے سے، آلوچے کے جنگلوں سے برفیلی اور سلیٹی ہوائیں آتی تھیں اور جہاں بہاؤ کا شور تھا ابھی تک تھما نہیں تھا وہاں کچھ مدت بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا — مشاہد بھی

وہ دونوں تاریکی میں سے نکل کر اُس کی جانب واپس آ رہے تھے۔ کالیا اور کالیے کے چہرے پر بے یقینی کی عبارت تھی جو اُس تاریکی میں بھی صاف سکتی تھی... اُس نے ہاتھ آگے کیا۔ اُس میں ایک سفید شگوفہ تھا — ایک سفید — کِھلا ہوا —

"یہ کیا ہے مشاہدی؟"

"یہ — ہم ہیں"

چار چیزیں ہیں...

صاحب کمال کا گال بلیڈر رُک رُک کر دھچکوں سے خالی ہونے لگا اور اُسی رفتار کی کاوٹ سے قرار کا ایک گہرا سانس اس کے ہانپتے کھلے منہ سے باہر آنے لگا... آئی ہوپ آئی ایم ناٹ ویٹنگ مائی سیلف... لائٹ سوئچ پتہ نہیں کہاں تھا۔

باتھ رُوم میں مکمل تاریکی تھی۔

صاحب کمال نے اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنے کے لئے دیوار کا سہارا لیا اور وہ کوئی دوسرا تھا باتھ رُوم کے آئینے کے اندر، جس کے خدوخال اس سے مماثلت رکھتے تھے اُسے دیکھنے لگا کہ یہ وہ خود تھا... لیکن اُس کا چہرہ سیاہی میں تھا اور سفید بال بھی سیاہ نظر آتے تھے... یُوتھ او یُوتھ وہیر ہیو آئی مس پلیسڈ یُو... کم از کم ادھر ویسٹ میں غسل خانوں کی دیواریں سالڈ ہیں اور ہولڈ کرتی ہیں اُدھر ایسٹ میں تو غسل خانے بھی بیمبوز کے ہوتے تھے ڈیم اِٹ... سہارا لو تو پورا سیٹ اَپ تمہارے سمیت کریش کر جاتا تھا... بیمبو ہٹ میں وہ کتنی تھیں؟ وہ جتنی بھی تھیں اُن پر گوشت بہت کم تھا... اینڈ اِٹ واز نو فن — بٹ ڈیوٹی از ڈیوٹی — آفٹر آل تب کا کرنل صاحب کمال "ٹائیگر" کا شاگرد تھا... ویرائل باسٹرڈ۔

کیا یہ عمر ہے جو مجھ پر صاحب کمال پر رینگتی ہوئی چلی آ رہی ہے اور اُس کے پنجے میرے بدن میں چُبھتے چلے جاتے ہیں ڈیم اِٹ یا یہ کچھ اور ہے... یہ عجیب قصہ ہے کہ وہ سارے چہرے مجھے یاد ہیں اُن بنگالی بلیکیز کے... منٹو کا ٹھنڈا گوشت لیکن آنکھوں میں... اُس لمحے بھی... نفرت کے زندہ جرثومے کروٹیں لیتے ہوئے... یہ پنجے میرے بدن کے اندر سُولوں کی طرح جاتے ہیں... ان میں کوئی ایک سُول پچھتاوے کی تو نہیں... ہے؟ — ہولٹ نان سنس... اِٹ واز مائی ڈیوٹی... نسل کو بدل دینا... ذرا رنگت اور قد کو بہتر کر دینے میں کیا قباحت ہے... مائی ڈیوٹی۔

صاحب کمال یکدم بُری طرح لڑکھڑایا... اُس کا مثانہ کب کا خالی ہو چکا تھا اور جس دیوار کو اُس نے تھام رکھا تھا اس میں سے ایک یخ بستگی اُس کی ہتھیلی کے راستے اُس کے

مثانے کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔

ڈیوٹی اپنی جگہ لیکن —— وہ سب کہاں ہوں گے؟

میرے آف سپرنگز ——

یہ ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا —— شائد یہ ہو سکتا ہے کہ میں کبھی اُن میں سے ایک کو دیکھ سکوں... اِس آئینے میں جو شکل اب دِکھنے لگی ہے اور اس کے بال بکھر چکے ہیں اور آنکھوں کے گرد کروز فیٹ ہیں اور ہڈیوں پر کھنچی ہوئی جلد ڈھیلی پڑ چکی کیا کسی کی شکل ایسی ہو گی؟

"کس کی شکل ایسی ہو گی؟" اُس نے یکدم ایک بلند اور بھدی سی آواز پکارا... ایک ملٹری کمانڈ کی طرح۔

مجھے اُن میں سے صرف ایک درکار ہے تاکہ میں اُسے اپنی ملکائی کی گود میں سکوں... لیکن وہ تو اب تک بہت بڑے ہو چکے ہوں گے... ماشاء اللہ... صرف ایک ہے ملکائی کی تسلی کے لئے... صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ فال سے پہلے میں مرد ڈیم اِٹ آئی ایم ناٹ امپوٹنٹ...

"آئی ایم ناٹ؟ ——" اس نے پھر بلند اور بھدی سی آواز میں جیسے سوال کیا

"وَف..." ایک غیر انسانی ساجواب کہیں سے آیا۔

صاحب کمال نے اپنے آپ کو خاصے تردد کے بعد ڈولنے اور گرنے سے بچایا اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی... ایک اور "وَف" سے اس نے سمت کا تعین کیا شائد ٹب میں کوئی چیز تھی جس کے جسم کا کوئی حصہ مسلسل حرکت میں تھا اور یہ "وَ وہیں سے آئی تھی... آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں اور بجلی کا سوئچ دکھائی د لگا تھا۔ اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی روشنی آن کر دی جس کی پہلی چبھن اس کی آنکھ میں گئی اور اُس نے ناک چڑھا کر اُدھر دیکھا جدھر نیلے ٹب میں ایک مخدوش نسل کا نہائت اہتمام سے دُم ہلا رہا تھا اور تیز روشنی نے اس کی مہین آنکھوں کو بھی لمحہ بھر لئے چندھیا دیا تھا۔

"اے ڈیم پپّی ——" صاحب کمال زیرِ لب بڑبڑایا —— یہ زاہد کالیا ان دنوں پارٹیاں تھرو کر رہا ہے۔

کُتورے نے جو بہت دیر سے کموڈ پر جھومتے جنٹل مین کو دیکھ رہا تھا اور کوئی

گرتی بوندوں کی ٹپ ٹپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا ایک اور "وَف ——" کر کے اپنی مکمل طمانیت کا اظہار کیا۔

اُسی لمحے باہر سے زاہد کالیے کی آواز اندر آئی —— "آر یو آل رائٹ سر؟"

صاحب کمال نے جواب میں غسل خانے کا دروازہ کھول دیا" آف کورس آئی ایم آل رائٹ..."

"بٹن اپ سر ——" کالیے نے نظریں جھکا کر درخواست کی۔

"اوہ ——" صاحب کمال نے قدرے خجالت سے اپنے آپ کو بٹن اپ کیا اور پھر ذرا سیدھا ہو کر غصے سے کہا "اِز ہی انوائٹیڈ؟"

"کون سر؟" زاہد کالیا رسلک کے سنہری ڈلکیں مارتے سُوٹ اور میچنگ ٹائی کے ساتھ صاحب کمال کے سامنے تقریباً جھک گیا۔

"ہی ——" اس نے صرف اپنی گھنی ابرو چڑھا کر ادھر اشارہ کیا۔

کالیے نے غسل خانے کے اندر جھانکا اور اس کے چہرے پر ماؤں ایسی شفقت کی رنگت گہری ہونے لگی" سر —— یہ بہن یا برادرِ عزیز ہے —— میرا بھائی ہے"

"انڈیڈ ——" صاحب کمال نے اپنے آپ کو مزید کمپوز کیا اور مسکرانے لگا" زاہد —یو آر دے لمٹس —— پارٹی شروع ہوئی ہے یا نہیں؟"

"سَر کشتیاں ابھی نِکل رہی ہیں اور ذرا بن یا سُر میں آ رہی ہیں —— اور سَر آپ غسل خانے میں ڈرائی تو نہیں رہے —— ادھر کھڑکی کی چوکھٹ پر بھی میں نے بلیک لیبل کی ایک بوتل اور گلاس رکھوا دیئے تھے..."

"Really?"

"سر ——" کالیا فوراً باتھ روم میں گیا اور باہر آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں وہسکی کی ناک تک بھری بوتل تھی اور دوسرے میں ایک گلاس "سنگل یا ڈبل سر؟"

"یُو آر دے لمٹس کالیا ——" وہ بے حد محظوظ ہو رہا تھا "سنگل پلیز ——"

صاحب کمال کے رخصت ہونے پر کالیا جو ابھی تک جان بُوجھ کر ڈرائی تھا کہ یہ پارٹی اُس کے گھر میں تھی اور اسے انتظام کرنے تھے اور یہ پارٹی ڈاکٹر ارشد کی تاخیر شدہ شادی کی خوشی میں تھی، غسل خانے کے اندر گیا اور اُس نے برادرِ عزیز کی ایک فوری "وُف ——" کے جواب میں اُسے اُٹھایا اور اس کے گیلے کُتا ہونٹوں پر ایک زبردست پیار

بھرا بوسہ دیا اور نہائت الفت سے کہنے لگا "یُو آر دے چیف گیسٹ برادر عزیز ـــ"

مہمان مختلف کمروں میں تھے۔

اپنی عادتوں۔ خصلتوں اور رُتبوں کے مطابق ـــ

"لونگ ٹائم نو سی ـــ" صاحب کمال کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ا گروپ نے جو آہستہ آہستہ صوفوں سے اُٹھ کر اب چینی سلک کے پُھول دار قال براجمان تھا ایک مؤدب ریگولیشن کے مطابق نعرہ لگایا۔ قالین کے ابھرے ہوئے پُھو مختلف زاویوں سے الگ الگ رنگ کے دکھائی دیتے تھے۔

صرف ریٹائرڈ جنرل بشیر کے گلاس میں ایکوا پیورا تھا... اس پر کچھ شکوک ابھی تک بات اوپر تک نہیں گئی تھی... کچھ لین دین کا معاملہ تھا۔ اور بات اوپر تک گ تو کہاں تک جائے گی... البتہ نسبتاً کم عمر جنرل سلامت ایک پڑھاکو طالب علم کی طرح دیکھ رہا تھا اور تمام باتیں کان لگا کر غور سے سُن رہا تھا۔

اس گروپ میں بیشتر ریٹائرڈ آرمی تھے، چند سیاست دان تھے اور کچھ بیوروکریٹس اور ـــ ایک کُتورا تھا جو کالیے کے ساتھ ہی غسل خانے سے باہر آگیا تھ قدرے پریشان حالت میں اس کمرے میں آگیا تھا جہاں کچھ لوگ ایک چینی قالی براجمان بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہے تھے۔ یہاں اُس نے اپنا آپ ظاہر کرنا مناس جانا اور ایک اطالوی میز کے سنہری گُل بُوٹوں تلے روپوش ہو کر حسبِ توفیق دُم ہلانے

"نہیں ـــ یہ نہیں ہو گا" ریٹائرڈ جنرل بشیر ایک ایماندار تیقن کے ساتھ گ "کیونکہ جو ملک خوابوں کی بنیاد پر حاصل کئے جاتے ہیں اُن میں اللہ کی جانب سے خاص لچک ایک کُشن سا ہوتا ہے جو تاریخ کے ناروا گھونسے برداشت کئے جاتا ہے۔ سرکنڈوں پر سے ابتلا کے پانی گذر جاتے ہیں اور وہ پھر سے بلند ہو جاتے ہیں اور صحیح رہتے ہیں۔ پاکستان کا دوسرے ملکوں کے ساتھ موازنہ مت کریں۔ یہ خوابوں کی بن حاصل کی گئی سلطنت ہے سر۔"

"سر ـــ" سلامت نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے انتہائی عاجزی سے ایک چندہ مانگنے والے کی عاجزی سے بولا "انسانی تاریخ کا ایک بہت بڑا خواب سوویت تھا اُس کا کیا ہوا؟"

"وہ لامذہب تھے۔ اُن میں یقین کی روشنی نہیں تھی۔ ایک پیغمبر اور

رسٹ کے پیغام میں فرق ہوتا ہے"

"لیکن سر ـــ" سلامت نے صرف ایک کلاس رُوم میں بیٹھے طالب علم کی طرح ٹھ کھڑا نہیں کیا لیکن اُسی انکساری سے پھر بولا" میں سینڈ ہرسٹ میں رہا ہوں سَر... اور یسٹ پوائنٹ میں بھی کورسز اٹینڈ کئے ہیں اور سَر ـــ وہ لوگ ـــ ویسٹ اور امریکہ کے ـ اُن میں زیادہ تر لامذہب ہیں اور بہت زیادہ بنیاد پرست ہوں تو صرف سنڈے کے نڈے چرچ اٹینڈ کرتے ہیں سر ـــ"

"لیکن وہ گاڈ فیئرنگ تو ہیں ـــ" بشیر نے خشمگیں نگاہوں سے اس نوجوان کو یکھا جو تمامتر روایات کی خلاف ورزی کر رہا تھا یعنی سوال پوچھ رہا تھا اور سینئرز پر اعتراض کر رہا تھا۔ سلامت چُپ کی عافیت میں چلا گیا کیونکہ بشیر جی۔ ایچ۔ کیو میں اب بھی ایک Say رکھتا تھا۔

"میری بات سُنو ینگ مین ـــ" بشیر چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر سلامت کی طرف متوجہ ہوا۔

"سر ـــ"

"ہم نے جنگیں لڑی ہیں ینگ مین۔ 65ء اور 71ء اور سیاچن۔ تمہیں کیا پتہ ہو کہ جنگ کیا چیز ہوتی ہے۔ جنگ کے بغیر تمہارے عہدے تک پہنچ جانا ـــ میں تمہاری صلاحیتوں پر شک نہیں کر رہا لیکن جنگ ـــ جنگ ہوتی ہے ینگ مین ـــ"

"اِن ڈیڈ سر ـــ" سلامت نے سر جھکا لیا۔

"وُف ـــ" ایک آواز آئی اور سب کے کان اُدھر گئے جس طرف سے یہ آواز آئی تھی اور یہ "وُف ـــ" اُسی ردھم میں تھی جس ردھم میں "جنگ" کہا گیا تھا۔

"یہ تو برادر عزیز ہے ـــ" صاحب کمال نے ایک زور دار قہقہہ لگایا "کالیے کا عاشق ہے... اور جنٹل مین یہ اس پارٹی میں باقاعدہ مدعو ہے بغیر دعوت کے نہیں آیا" وہ اُٹھا اور اطالوی میز کے نیچے جھک کر اسے دیکھا ـــ "وُف ـــ" کُتورے نے اپنی خلوت میں دخل انداز ہونے والی اُس کی شکل کو ناپسند کیا اور وہ ایک چڑھی تیوڑی اور بھینچے ہونٹوں کے ساتھ واپس چینی قالین پر آ بیٹھا "پتہ نہیں گشتیاں کب آئیں گی ـــ"

"جی سر ـــ" سلامت چونک گیا کہ شائد کوئی لیٹسٹ ملٹری ٹرم استعمال ہوئی ہے۔

"دیکھ نہیں ——"

یہ ناکام جنرل مجھ سے جنگوں کی بات کر رہا ہے۔ جرم کی کیفیت اور اُر
ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ نعروں کے شور میں بھی ایک شے ہوتی ہے ضمیر... یا نہیں
وہ مسلسل سرگوشیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ آئی بیٹ کہ ان کے کان پک چکے
سرگوشیاں سُن سُن کر... یہ اُن پر دھیان دیں تو کیونکر دیں... ان کی آب و
روائیت زنگ آلود ہوتی ہے۔ اور اس کے باوجود یہ مختار ہیں... یہ سب تو ا
65ء کی جنگ جیسی بھی تھی ایک مورال بُوسٹر تھی... ہم نے باسٹرڈز کو مزہ چکھ
پیگ اِن لاہور جم خانہ مائی فٹ... لالہ لوگ ایک چھوٹی سی نہر... بی آر بی کرا
سکتے تھے سترہ دنوں میں... اُن میں سے ایک پیچھے ہٹنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ٹروپس
کر دیا تھا... اَن وِلنگ ہیرو... اور یہ جو صاحب کمال ہیں کمال کے آدمی ہیں...
مردانگی پر بڑا زعم ہے —— آل دے ٹائم... بی اے مین —— فک دے ہیل آ
دیم... کیا یہ بھی بیچرز میں شامل تھا... اور اب یہ بھی مختار تھا۔

"ینگ مین یُو آر کوائٹ ——" صاحب کمال نے اُنگلی اُٹھا کر اس کی ج
کیا۔

نو سر ——" سلامت قالین پر بیٹھا بیٹھا شَن ہو گیا

اور اِنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہاں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اُگتا...

ہیرو آف سیاچن اِنڈیڈ۔

آخری دن وہ ہیلی کاپٹر کیسے اُڑا تھا جس میں مریض اور نرسیں تھیں۔ اُ
ہونا تھا اور آل دے جنرلز... ہی واز وَن آف دیم... فوج میں کہانیاں سفر کرتی ہیں
ایک تسلسل میں جاری رہتا ہے... وہاں جیسور یا سلہٹ میں ایک میجر تھا جس
نہیں ڈالے تھے... ہی واز اے مَین —— لیکن اُس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اُس نے
احکام کی خلاف ورزی کی تھی... اُس کا کوئی ذکر نہیں اور ٹائیگر کی بیلٹ ابھی تک
نمائش پر رکھی ہے... بیلٹ بیجز... ریوالور... ہر شے... سوائے عزت نفس کے...
ٹائیگر ہمیشہ کے لئے لافانی ہو گیا ہے... یہ سب کچھ ہوا تو ہم دیکھ رہے تھے... نگ
رہے تھے لیکن اُن کے بس میں کچھ نہ تھا... ایک اور جنگ آنے دو پھر ہم انہیں
کہ جنگ کیا ہوتی ہے... وقت اب ہمارا ہے۔

"میں نے تمہیں ریکمنڈ کیا تھا جنرل ——"

سلامت پھر شن ہو گیا "تھینک یُو سَر ——"

اسی نے تو مخالفت کی تھی —— ان کی نسل ایک عینک والا انٹلیکچوئل جنرل افورڈ
ہیں کر سکتی تھی... لیکن وقت بدل چکے ہیں۔

بشیر نے اپنا اکوا پیورا سِپ کیا اور کہنے لگا "سی ڈی حسین صاحب آپ بہت
وش ہیں... کیپٹیل کی کیا خبریں ہیں ——"

سی ڈی حسین اس یک لخت التفات پر بوکھلا گیا۔ وہ بہت دیر سے اپنا منہ بھینچے
ردن گھما گھما کر گفتگو کرنے والوں کے چہروں کا پیچھا کر رہا تھا "بس جی پارٹی ٹھیک جا رہی
ہ ——" اُس نے بالآخر ایک ایم این اے کی متانت چہرے پر طاری کی جو کہ وہ تھا
ہا ایم کو کوئی خطرہ نہیں ——"

"اِن ڈیڈ ——" صاحب کمال نے صرف سر ہلایا۔ اُسے ان سیاست دانوں سے
ت وحشت ہوتی تھی اور وہ کچھ بھی کومٹ نہیں کرنا چاہتا تھا —— پالیسی بھی یہی تھی ——
الحال ——

سی ڈی حسین آج اپنے آپ سے بہت خوش تھا۔ وہ بقول کسے نوبل کمپنی میں
.. آل دے جنرلز —— بلکہ نائٹ آف دی جنرلز۔

"وَف ——" بٹ خیلوی کُتورے سے رہا نہ گیا اور اُس نے اپنے ہونے کا اعلان
ے کر دیا۔

"سَن آف اے بیچ ——" صاحب کمال نے حاضرین کی جانب داد طلب نظروں
دیکھا اور ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا۔

"بالکل سر ——" سلامت نے اس کی گُڈ بکس میں واپس آنے کے لئے یہ موقع
ت جانا اور سب سے پہلے داد دی۔

"کیا بات کی ہے جنرل صاحب ——" سی ڈی حسین بھی ذرا جھوم کر بولا "بالکل
کُتیا کا بچہ ہے سر —— اور سر آپ جانتے ہیں کہ میں کامونکی سے الیکٹ ہوا ہوں
ب... آپ کی مہربانی سر... اور جناب قریب ہی ایمن آباد میں میرا ایک یار ہے حفیظ ہنجرا
ے کُتوں کا بڑا شوق ہے —— تو اس کے پاس ایک بڑی شاندار کُتی تھی جناب عالی...
شام میں نے ہنجرا سے کہا اور آپ خود سیانے بیانے ہیں کہ میں نے کس حالت میں کہا

ہو گا تو میں نے اُسے کہا، ہنجرا کو — کہ یار تمہارے پاس کیا زبردست کُتی ہے —
کمینہ کہنے لگا، سی ڈے حسین — یہ کیا کتی ہے، کتی تو اس کی ماں تھی — ہاہا —
ڈی پہلی بار ذرا کُھل کر ہنسا اور قدرے لاپرواہ ہو گیا۔

قومی ایئرلائن کا ایک مخمور پائلٹ جو بہت دیر سے گفتگو میں شامل ہونے کے پَر تول رہا تھا اور کوئی مقام تلاش کر رہا تھا یکدم بول اٹھا "واہ — حسین صاحب — — جناب آپ ہمارے محترم نمائندے ہیں لیکن — ہمیں یہ معلوم نہیں کہ آپ نام کا جو سی ڈی ہے — یہ کس کا مخفف ہے؟"

"چراغ دین —" سی ڈی حسین نے ایک عوامی نمائندے کی درشتگی سے دیا اور "اس کا سی ڈی کیسٹ سے کوئی تعلق نہیں"

"اِن ڈیڈ —" صاحب کمال نے سر ہلایا۔

"وَف —" کُتورا پھر بولا۔

"ڈیم اِٹ —" صاحب کمال نے غصّے سے قالین پر تھوک دیا" کالیے براور عزیز قطعی طور پر ادب و آداب سے بہرہ ور نہیں، نہیں جانتا کہ ایک جنٹل کب وَف... میرا مطلب ہے کب بولنا چاہئے — ہی اِز ناٹ اے جنٹل مین —"

"اس لئے کہ یہ — سَن آف اے بِچ ہے سر —" سلامت نے فوراً لقمہ

صاحب کمال اُسی غصے میں اٹھا اور گرنے کو تھا کہ سی ڈی حسین نے اُسے لیا "جناب ہمیشہ آپ ہمیں سہارا دیتے ہیں آج تو ہمیں بھی موقع دیں —"

"تھینک یُو سی ڈی —"

صاحب کمال آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا نپے تُلے قدم اٹھا کوشش میں اُس اطالوی میز کے قریب گیا جس کے نیچے براور عزیز براجمان تھا۔ وہ اسے گردن سے دبوچ کر فضا میں بلند کر دیا۔ کُتورا بالکل نہیں بولا شائد فوج کی میں تھا بس اطمینان سے لٹکتا رہا۔ صاحب کمال نے دروازہ کھولا اور اُسے برآمدے پھینک دیا۔ دروازہ کھولنے سے آوازوں کی بھنبھناہٹ کے ساتھ طبلے کی تھاپ اُوپر منزل تک آئی۔ صاحب کمال نے تھاپ کو کان لگا کر سُنا اور اس پر تا تھئی تا تھئی جھٹکا پھر واپس آ گیا۔

کُتورے نے جہاں بھی لینڈ کیا تھا وہیں بیٹھا رہا اور نہایت متانت اور

ی احساس کے بغیر ایک ہلکی سی وَف کی اور یہ وَف طبلے کی تھاپ سے ہم آہنگ وَف ں اور دُم ہلانے لگا۔ دے ڈیم میوزیکل بِچ۔

فیصل مسجد سے ادھر نیوی کالونی کے نواح میں یہ اسلام آباد کا ایک پاش، بے حد ز اور مہنگا ترین سیکٹر تھا۔

جیسے بھری دوپہر میں گاؤں کے کچے گھر روشن ہوتے ہیں ایسے رات کے گیارہ بجے ی سیکٹر میں یہ گھر سراسر روشن اور بے حد آباد تھا۔ گیٹ کے قریب دو جیپیں کھڑی تھیں ں میں پولیس کے اہلکار ڈیوٹی پر تھے۔ علاقے کا ایس ایچ او ذاتی طور پر نگرانی کر رہا تھا تاکہ ل نہ پڑے۔

کالیے نے اس کے سامنے مدعوئین کی فہرست رکھ دی تھی کہ — یہ آ رہے ہیں خلل نہیں پڑنا چاہئے اور وہ جیپیں لے کر آ گئے تھے۔

برگیتا اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئی — "مشیل — یہ تو سٹیگ پارٹی ہے۔ ے علاوہ کوئی عورت نہیں —"

ایک پرفیکٹ ہوسٹ کی طرح کالیا ہر لمحے ہر جگہ موجود تھا چنانچہ جس وقت برگیتا ر مشاہد اندر آئے تو وہ ایک بغلی برآمدے سے فوراً برآمد ہو گیا" ویلکم بھرجائی — بالکل رست فرمایا آپ جناب نے کہ ادھر صرف ایک عورت ہے — باقی تو — کیئر فار اے رنک؟" اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر برگیتا کے ہاتھ میں ایک گلاس تھما دیا اور پھر اپنا اس بلند کر کے سرخوشی سے نعرہ لگایا "سکول —"

"سکول —" برگیتا یکدم بھول گئی کہ وہ اس سٹیگ پارٹی میں اکلوتی خاتون ہے ر اُس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ یہ جاننے کے لئے بھرا کہ گلاس میں ہے کیا —

"ارشد کہاں ہے؟" مشاہد نے کالیے کے کندھے کو تھپکا۔

"اُوپر — تیسری منزل پر جو سَن روم ہے اُس میں —"

"وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"ستارے گن رہا ہے رات کے سوا گیارہ بجے اکیلا —"

اُوپر سَن روم میں جب برگیتا اور مشاہد داخل ہوئے تو ارشد انہیں دیکھ کر یُوں لگت ہوا جیسے وہ کسی ویران جزیرے پر عرصہ دراز سے پھنسا ہوا تھا اور اب اُس نے کسی

سمندری جہاز کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔

"میں نے زاہد کو منع بھی کیا تھا کہ وہ یہ... یہ سب کچھ نہ کرے۔ اور اب تم رہے ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے"

"وہ یہ سب کچھ تمہارے لئے نہیں کر رہا —" مشاہد نے اس سے ہاتھ ملا ایک آرام کرسی میں دھنس گیا" تم بیٹھو برگیتا — اسے تو بہانہ چاہئے — یہ اُس کی ریلیشننگ ایکسرسائز ہے... ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو اس کے کاروبار میں ثابت ہوتے ہیں یا جن کی رفاقت سے وہ اپنے آپ کو معزز ثابت کرتا ہے — یہ کچھ تمہارے لئے نہیں ہے"

"اور ارشد —" برگیتا نے جُھک کر ایک بیزار اور سُوجے ہوئے منہ والے کے گالوں پر ایک بہت ہی گیلا بوسہ دیا اور اپنی مخصوص ہچکی بھری "تمہیں بہت مبارک ہو۔ لیکن تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"وہ یہاں کیسے آ سکتی تھی — بٹ خیلہ کے شٹل کاک برقعے میں سے نکل یکدم آناً فاناً یہاں اس پارٹی میں کیسے آ سکتی تھی۔ یوں بھی یہ کوئی شریف زادیوا آنے کی جگہ ہے؟"

"بالکل نہیں —" برگیتا نے اِک ادا سے کہا۔

ارشد کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ یہ اُس نے کیا کہہ دیا تھا۔ اس نے اٹھ کر ہاتھ تھام لیا" آئی ایم سوری بھابھی... میرا یہ مطلب نہیں تھا"

"میں یُوں بھی شریف زادی نہیں ہوں —" برگیتا بُرا ماننے کی بجائے شرا ان دھجیّوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری —" وہ بہت ہی پشیمان ہو رہا تھا۔

"تم یہاں آنے سے پیشتر وے سائڈ ہوٹل کی طرف گئے تھے؟" مشاہد ار سے لاتعلق صرف یہی سوال پوچھنے کے انتظار میں تھا۔

"ہاں —"

"تو پھر؟"

"ہوٹل والے شکایت کر رہے تھے کہ کالیا اُن کا کُتورا اٹھا لایا ہے —"

"میں اس کی بات نہیں کر رہا — آلوچے کا وہ درخت، پچھواڑے میں

شگوفے کِھل چکے تھے؟"

"تم بھی بے یقینی میں ہو، مخمصے میں ہو — مشاہد وہ شٹل کاک میرے کمرے میں برقعے میں لپٹی لپٹائی بیٹھی تھی... شادی کی رات تھی اور میں نے اسے کہا میں ابھی آتا — اور میں کہاں گیا؟ اپنی کار سٹارٹ کی رات کے پچھلے پہر اور وے سائڈ ہوٹل چلا... وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ صرف وہ ٹوٹنے کے نزدیک تین کرسیاں پڑی تھیں دریا کے جن پر ہم بیٹھے تھے... اور میں وہاں دیر تک اندھیرے میں گم یخ بستگی میں بیٹھا ٹھٹھرتا —"

"دریا کے بہاؤ کی آواز تھی؟"

"ہاں — شائد —"

"اور شگوفے کھل چکے تھے؟"

"ہاں۔ شائد۔"

"یہ ہم ہیں ارشد —"

"اور یہ جو ہم ہیں، ہمارے بارے میں کیا خیال ہے —" برگیتا نے بمشکل اپنی ناروکی "یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو — اور ہم یہاں تمہاری شادی کی خوشی میں دیکھنے آئے ہیں... وہ... کیا دیکھنے آئے ہیں مشیل؟"

"تم نے ضد کی تھی کہ تم بھی میرے ساتھ چلو گی — تمہارا خیال تھا کہ میں پتہ نا کس میڈی ایول اَورجی میں شرکت کرنے جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہم دیکھنے کیا آئے ہیں؟"

"مُجرا —"

"ہاں آں — رِیک" برگیتا نے ہچکی لی تو اُس کا سیاہ بدن اس کے سلیٹی لباس میں پل بھر کے لیے ظاہر ہوا "دی ڈانسنگ گرلز... مردان کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ اُس نے سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں مجھے ہیرامنڈی لے کر جائے گا۔"

"یار تم اتنی بے دھڑک ہو کر ہیرا منڈی کا نام نہ لیا کرو —" مشیل نے اسے سمجھایا جیسے وہ جانتا ہو کہ اس بار بھی سمجھانے سے کوئی خاص فائدہ نہ ہو گا "ارشد تم ب آئے؟"

"تم خوش کیوں نہیں ہو؟"

"اس لیے کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

مشاہد نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا جو ٹی روم میں پچھلے دو گھنٹے سے نیچے سے آنے والی آوازوں کی جھنجھناہٹ اور طبلے کی ایک آدھ تھاپ سنتا تھا اور کے لب مسکراہٹ میں پھیل گئے۔

برگیتا بھی منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی "ارشد — پلیز مجھے یہ کوئیکشن — میں بالکل لاچار ہو چکی ہوں اور میرے ذہن میں بالکل نہیں آ رہا کہ... آخر یہ کا خوشی سے کیا تعلق ہے کیونکہ مشیل نے بھی یہی کہا تھا... جب تم لوگ شکار پر یاد ہے؟"

"برگیتا بھابھی — میں زندگی بونس پر گذار رہا ہوں۔ وہ جو گذرنی تھی وہ گذر چکی۔ ٹرین جا چکی ہے اب صرف اس کے پہیوں کی گونج پلیٹ فارم پر باقی تھوڑی دیر کے لیے باقی ہے اور میں اس گونج میں ہوں۔ جو شخص یہ جانتا ہو کہ گونج کے اختتام پر ختم ہو جائے گا... وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ چار مرغابیوں کا خوشی تعلق نہیں۔"

"بالکل —" برگیتا نے لاچارگی سے سر جھٹکا اور ناک میں اس کی محسوس کرتے ہوئے سارا مشروب حلق میں اُنڈیل لیا "میری سمجھ میں ساری با ہے۔"

"تم نہیں سمجھ سکو گی برگیتا — یہ کانٹینٹ آف سرے ہے... انسانوں اپنے پاس بلاتا ہے اور پھر انہیں جانوروں میں بدل دیتا ہے... اس کی کشش ہے... یہاں ہر شے اور ہر عمل پر لاجک اپلائی نہیں کی جا سکتی —"

"اور اِسی لیے اس کی بھی کوئی لاجک نہیں کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے —" ارشد قہقہہ مار کر ہنسا۔

برگیتا نے بناوٹی غصے میں اپنا گلاس اُٹھا کر ارشد کو نشانہ بنایا "خدا کے مرغابیوں کی بات اب نہ کرنا نہیں تو میں تمہیں قتل کر دوں گی — تم دونوں میں ایک کو تو ہر صورت میں —"

"ہیلو۔ ہیلو" زاہد کالیا ہانپتا ہوا اوپر آ چکا تھا اور اُس کے تعاقب میں وہی تھا۔ نیچے سی ڈی حسین فل سونگ میں تھا۔

سی ڈی حسین کے بارے میں مصدقہ افواہ تھی کہ پارٹیشن کے دنوں میں کامونکی ریلوے سٹیشن پر ہندوؤں کی جو ٹرین روک کر ملیامیٹ کی گئی تھی تو کئی روز تک کوئی جانور بھی لاشوں کی بُو برداشت کرنے کا اہل ہو کر اِدھر جانے کے قابل نہ ہوتا تھا تو تب سی ڈی حسین ایسا دلیر تھا جو اُدھر جاتا تھا... کئی کہتے تھے کہ روزانہ جاتا تھا اور لاشوں کی جامہ تلاشی لیتا تھا۔ کچھ کہتے تھے کہ نہیں صرف سرخ گھگھرے والی کوئی بڑھیا تھی جس کی کمر کے ساتھ کرنسی نوٹوں کی ایک پیٹی بندھی ہوئی تھی... یہیں سے سی ڈی حسین کی عظمت کا آغاز ہوا تھا۔ صرف ان دنوں وہ چراغ دین تھا۔

تو سی ڈی حسین فُل سونگ میں تھا۔

"اصل میں مسئلہ صرف یہ ہے کہ کیا اس ملک میں قانون کی حکمرانی کی حفاظت کرنے والے لوگ ہیں؟... ہم جو قانون کے پاسبان ہیں.. ابھی پچھلے دنوں پی۔ ایم نے ایک کیس کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تھا... تو ہم جو قانون کے پاسبان ہیں ہم کہاں تک جا سکتے ہیں؟... ساری ذمہ داری ہمارے کندھوں پر تو نہیں ہونی چاہیے... کچھ بوجھ تو عوام کو بھی اُٹھانا چاہیے۔"

"کوئی شخص بھی قانون سے بالاتر نہیں —" صاحب کمال نے اُنگلی اُٹھا کر تائید کی۔

"جنرل صاحب..."

"ریٹائرڈ جنرل —" صاحب کمال نے پھر اُنگلی اُٹھائی۔

"جی سر — تو ابھی پچھلے دنوں کامونکی کے نزدیک جو کیس ہوا ہے۔ اُس کے بارے میں کیا بکواس لکھی ہے انٹرنیشنل پریس نے اور یہاں کے جو مغرب زدہ لوگ ہیں انہوں نے کتنا واویلا مچایا ہے —"

"معاف کیجئے گا واویلا شائد کیا جاتا ہے —" ایک سینئر بیوروکریٹ زبان کی اتنی فاش غلطی برداشت نہ کر سکا۔

"جی ہاں —" سی ڈی حسین نے شرمندہ ہو کر فوراً معذرت کی "تو یہ... واویلا کیا گیا — اور — اب پتہ نہیں کس بات پر واویلا کیا گیا —" وہ قدرے بھٹک گیا اور بھٹک اس لیے گیا کہ اس سے پیشتر وہ بہک چکا تھا۔

"یہ کوئی کیس جو ہوا تھا آپ کے ہاں — اُس کے بارے میں" سلامت مدد کے

لیے سامنے آ گیا۔

"جی ہاں — تو کیس کیا تھا؟ — وہی —" سی ڈی حسین نے "وہی" پیشتر اپنی پوروں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا اور آنکھوں سے آنسو جیسے چھلک جا

"میں قربان... لیکن میں کیسے اپنی کتی زبان سے کہوں کہ کیس کیا تھا —"

"کہیں کہیں" — سلامت نے اس کے تقدس کی ہمت بڑھائی۔

"ہمارے ہاں ایک چوڑے نے جسارت کی تھی.. مقدمہ چلا ہے تو واو ہے... بلکہ کیا جا رہا ہے کہ حقوق پامال ہو رہے ہیں.. حالانکہ سب کچھ آئین کے م رہا ہے۔"

"ہینگ دے باسٹرڈ —" صاحب کمال جہاں کہیں بھی جا چکا تھا وہاں سے وا اور پھر اُنگلی اُٹھا کر جیسے آرڈر آف دے ڈے دے دیا...

"لیکن سی ڈی صاحب — ایک بات ہے" یہ سلامت کی آواز تھی اور اس کی جانب انتہائی غصے کے عالم میں دیکھا کہ وہ جانتا تھا کہ بس یہی اعتراض کرتا اب کیا پوچھنا چاہتا ہے یہ ینگ پپ —"سنا ہے کہ چھوٹا سا بچہ ہے اور اَن پڑھ

"سلامت —" صاحب کمال کی آنکھیں مزید سرخ ہو گئیں "تم کس کی ہو.. میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کس کی سائڈ پر ہو؟"

"ہینگ دے باسٹرڈ سر —" سلامت نے فوراً کہا اور پھر کچھ نہیں بولا۔

سی ڈی حسین کو ذرا شہہ ملی تو وہ پر اعتماد ہو گیا "میں ان چوڑوں کے خاندان کو جانتا ہوں۔ اُس خبیث کا باپ انتہائی غلیظ اور ناپاک جسم والا شخص ہے۔ کی گندگی اور کیچڑ میں اُتر کر گمشدہ چیزیں تلاش کرتا ہے... اُس کا سانس بڑا طویل او تھا اس لیے اُسے بگو ساہ پکا بھی کہتے تھے.. میں ان بدبختوں کو شروع سے جانتا ہوں"

"آپ شروع سے اُن کو کیسے جانتے تھے —" ظاہر ہے یہ سوال بھی سلا طرف سے آیا تھا...

"ہم لوگ تو معززین میں شمار ہوتے تھے جنابِ عالی — ہم تو جی اِن برتنوں یا کپڑوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے.. اب بھی نہیں لگانے دیتے منگتے قسم کے لوگ ہیں، ہمارے ٹکڑوں پر پلتے ہیں — اور اَن پڑھ اور جاہل ہیں کے پورے —"

"اس کے باوجود دیواروں پر لکھ لیتے ہیں —"

سی ڈی حسین رُک گیا اور سلامت کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں کہ وہ ے دیر تک نہ دیکھ سکتا تھا۔

سی ڈی حسین کی فُل سونگ ذرا ڈھیلی ہو کر نیچے آ گئی اور وہ کھسیانا ہو کر اب حب کمال اور بشیر کی جانب دیکھنے لگا جو اس وقت روسٹ چاپیں کھانے میں مشغول ہو ے تھے۔

زاہد کالیا "ہیلو، ہیلو" کہتا ہوا ہانپتا ہوا اوپر آ چکا تھا اور اُس کے تعاقب میں وہی ازلی نورا تھا "بہن یا سارے کمینے نیچے عیش کر رہے ہیں اور میرے یار یہاں اوپر سَن روم میں ے مرغابیوں کی باتیں کر رہے ہیں — اوئے ڈاکٹر —" وہ ارشد کے قریب آنکھیں ل جا کر اس کی کنپٹیوں کو غور سے دیکھنے لگا "تیرے بال تو پھر سفید ہو رہے ہیں — ئے بڈھے شیر کوئی شیروں والا کام بھی دکھایا ہے کہ ابھی نہیں — نہیں دکھایا تو ایک نسخہ ہے میرے پاس —"

مشاہد زور سے کھانسا۔

کالیے نے اُدھر دیکھا اور پھر سنبھل گیا "آئی ایم سوری —"

"میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو" برگیتا کی ہنسی میں خمار کی مناسب آلودگی ا "تم بے شک مجھے بھی مردوں کی طرح ہی ٹریٹ کرو — لیکن زاہد تم نے صرف ردوں کو ہی کیوں مدعو کیا ہے... عورتیں کیوں نہیں؟"

"عورتوں کی موجودگی میں — اپنی عورتوں کی موجودگی میں ہم گلٹی فیل کرتے ہیں" زاہد ٹیرس پر چلتا ہوا ریلنگ تک گیا اور نیچے دیکھ کر کہنے لگا "لان میں بہن یا افغانی لگ رہے ہیں، بکرے سالم کے سالم روسٹ ہو رہے ہیں اور تم لوگ یہاں بیٹھے خوشی ا مرغابیوں کا شکار کر رہے ہو... ہوائی مرغابیاں بہن یا — یارا نیچے جا کر ذرا بندوبست تو کرو —"

"زاہد —" برگیتا اُٹھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "عورتیں کیوں ں؟"

"بھرجائی میں بتاتا ہوں کہ عورتیں کیوں نہیں —" وہ اُس کی جانب مڑا — اور بے دھیانی میں پاؤں کتورے کی دُم پر رکھ دیا جو مسلسل اُس کے آگے پیچھے ہو رہا تھا۔

کتورے نے ایک طویل اور شکایت آمیز دردمندی سے چاؤں کی اور چپ ہو گیا۔" یہاں اس لیے نہیں کہ — ہمارا ملک.. ہمارے عقائد — اور ہم سب سٹیک ہا — مین اَونلی —"

نیچے فیصل مسجد سے آنے والی شاہراہ پر جیپیں بہت دیر سے کھڑی تھیں۔ بنگلے کے اندر سے چند ویٹر نفیس وردیوں میں ملبوس برآمد ہوئے اور جن کے ہاتھ تھامی ہوئی طشتریوں میں وہسکی اور پرندوں کا گوشت تھا اور پرندے ایسے تھے جنہیں برڈ کہا جاتا ہے اور جیپوں میں بیزار ہوتے پولیس کے اہلکاروں میں زندگی کی ایک نئ گئی۔

پورے ساڑھے گیارہ بجے وہ نیچے آئیں...

اور جو اُن کے منتظر تھے — لاؤنج اور ڈرائنگ رُوم میں — یا لان میں کے کنارے... یا کمروں کے اندر جو Elite تھے اور جو غسل خانوں میں مسلسل آ تھے تو اُن سب کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔

مشاہد، برگیتا اور ارشد بھی نیچے آ چکے تھے اور سیڑھیوں کے قریب کھڑے۔

وہ تینوں اگر کچھ بھی نہ تھیں تو کم از کم پریاں تھیں جو کہیں سے اُتری ایسے زرق برق چمچماتے شوخ پیراہنوں میں جو نظر کو جچتے تھے اور نظر میں کُھبتے تھے از کم پریاں ضرور تھیں۔ اور زاہد کالیا — اَن کُوتھ اَن گھڑ زاہد کالیا ان آسمانی چ گشتیاں کہتا تھا۔ آفٹر آل نسبت روڈ کے پھیری لگانے والے کا بیٹا تھا... آ بھانڈے تام چینی، پتل دے بھانڈے لا —

وہ تینوں پہلے تو سیاسی راہنماؤں کی طرح عوام میں گھُل مل گئیں... نہایت تیکھے نین نقش، گفتگو صرف بزبانِ انگریزی جس پر کانونٹ کا رنگ گُوڑھا تھا اور گمان تھا کہ یہ معزز نہیں ہیں اور ابھی تھوڑی دیر بعد "نچدیاں تینوں سوہنیاں" اور "ہا ہے بدن" کی دُھنوں پر بے باک اور بے حیا ہو جائیں گی۔

اس دوران سازندے اپنے اپنے سازوں پر جھکے اُنہیں سُر میں لا رہے تھے خاص لمحے تک اُن تینوں خواتین نے حاضرین کی بے تابی کو بڑھایا اور پھر زاہد کالیے کی دیکھا جس کی تین پجاروز انہیں لاہور سے وصول کر کے ابھی پچھلے پہر اسلام آباد تھیں اور وہ اس دوران اُن میں سے بظاہر نازک ترین پر ہاتھ اور تولیہ صاف کر چکا

"صدقے..." کالیے نے اپنے گلاس کو اوپر کیا یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں نے اُس کے پیندے کو دیکھا اور پھر اُس نے کوٹ کی جیب میں سے پانچ پانچ سو روپے کے نئے نکور نوٹوں کا ایک پلندہ نکال کر اُس کا نصف حصہ اُن تینوں پر نچھاور کرتے ہوئے نعرہ لگایا — "بسم اللہ بھئی —"

وہ تینوں بقول وارث شاہ پیکنگ کی پُتلیوں کی طرح تھرکتی ہوئی سب کے سامنے آ گئیں۔

وڈیو کی تیز روشنی صاحب کمال کے گلاس پر چمکی تو اس نے آنکھوں کے آگے ہتھیلی کا چھجا بنا کر بے حد ناگواری سے کیمرے کے پیچھے پوشیدہ شخص کو ڈانٹا — "سٹاپ اِٹ یو..."

"کیمرہ ادھر نہیں لے جاؤ طارق..." کالیا فوراً جھپٹ پڑا "صاحب کی طرف نہیں۔ صرف ادھر رکھو کشتیوں کے اوپر.... اور خاص طور پر اُس نازک سی سوہنی پر...." اور کالیا اس دوپہر کی حلاوت اور گرمی میں چلا گیا جو اس سوہنی کے اندر تہہ در تہہ تھی اور وہاں جانا اُسے بہت مہنگا پڑا تھا۔

جو عدیم الفرصت تھے اور گریڈ بیس سے بالا ہو چکے تھے انہوں نے فون پر مسلسل رابطہ قائم کر رکھا تھا کہ اصل کام شروع ہوا ہے یا نہیں — اور یہ سب لوگ اب کاروں سے اُتر رہے تھے۔ وہ اندر آتے تو پہلے گویا کسی سرکاری میٹنگ میں داخل ہونے والے بیوروکریٹ کی طرح ہونٹ بھینچ کر اور گردن اکڑا کر اِک نظرِ حقارت کے ساتھ آتے۔ کچھ دیر اسی حالت میں ساکت رہتے اور پھر موسیقی اور اُن تینوں کے بدنوں کے تحرک اور — کالیے کے استقبالی کلمات سے اُن میں جان پڑنے لگتی اور وہ انسانوں کی کیٹگری میں داخل ہونے لگتے۔

سی ڈی حسین قالین پر آلتی پالتی مارے اپنے سامنے نوٹوں کی گڈیاں سجائے ایک منجھے ہوئے تماشبین کی طرح براجمان تھا اور کبھی کبھار ایک آدھ نوٹ ہوا میں اچھال دیتا تھا... یہ وہ لمحہ تھا جب وہ صاحب کمال سے سرپرائز محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ صاحب تقریباً خالی جیب آتے ہیں اور ناچنے والیوں کی نگاہیں کندھے پر لگے رینک کی بجائے نوٹوں کی طرف زیادہ ملتفت ہوتی ہیں۔

"جناب عالی —" سی ڈی حسین نے ڈرائنگ رُوم کی بلند چھت پر ایک نظر ڈال

کر نہایت دانش مند شکل بناتے ہوئے کہا "اِن فلٹی ایئر کنڈیشنڈ گھروں میں مجرا دیکھنے لطف نہیں آتا — میں تجربے کی بات کر رہا ہوں۔"

صاحب کمال بھی اب سی ڈی سے پہلے کی نسبت زیادہ فرینڈلی ہو رہا تھا کہ جانتا تھا کہ ایک عالم ایسا بھی ہو گا جب یہ بیوقوف اپنے نوٹوں کی گڈیاں اس کے آگے کر دے گا اور ہاتھ جوڑ کر اصرار کرے گا کہ سرجی پلیز اپنے ہاتھ لگا دیں — لٹادیں کتی دولت کو اِن گشتیوں پر — اور وہ اُسے مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھے گا۔

"تجربہ تو آپ کا ہے سی ڈی حسین — لیکن کیوں لطف نہیں آتا مجرے کا ایئر کنڈیشنڈ گھروں میں؟"

سی ڈی نے ایک فاتحانہ انداز میں ہاتھ فضا میں لہرایا "جنابِ عالی پہلے زمانے ایئر کنڈیشننگ سسٹم تو ہوتا نہیں تھا بس اوپر پنکھے فل سپیڈ پر چل رہے ہوتے تھے۔ تو جو اصل تماشبین ہوتے تھے وہ نوٹوں کی گڈّی کھول کر پنکھے کی طرف اُچھال دیتے تھے او جناب عالی جس طرح نوٹ پنکھے کے پروں سے لگ لگ کر لہراتے ہوئے چھم چھم گشتیو گرتے تھے... سبحان اللہ جناب... اب تو ہائے ہائے وہ زمانے ہی نہیں رہے —"

سلامت نہایت سنجیدگی سے ایک کُہنہ مشق رپورٹر کی سنجیدگی سے حالات کا لے رہا تھا... اُس نے ہمیشہ زندگی کو ایک فاصلے سے جانچا تھا اور اپنے فیصلے خود کئے تھے ذہنی طور پر قرار میں تھا اور یہاں اُس کی حیثیت ایک غیر جانبدار مبصر کی تھی۔

ہاں بشیر رخصت ہو چکا تھا کیونکہ وہ ان لغویات سے الرجک تھا۔

ابھی وہ کچھ گا نہیں رہی تھیں صرف تال پر تھرک رہی تھیں جیسے کھلاڑی آغاز کرنے سے پیشتر ذرا پریکٹس کرتے ہیں، یہ دیکھنے کے لیے کہ گراؤنڈ کنڈیشن ہے... پچ فاسٹ باؤلرز کے لیے مددگار ثابت ہو گی یا سپنرز کے لیے... وہ وارم اَپ کر تھیں.... اپنے آپ کو بھی اور دیکھنے والوں کو بھی...

اس ڈرائنگ روم میں، ملحقہ لِونگ روم میں... برآمدوں اور راہداریوں میں میز، تپائی یا کارنس ایسی نہ تھی جو "ڈرائی" ہو۔ کالیے کے گھر میں بقول اس کے آج اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ اُس نے وہ جہاں بھی تھا، بیٹھا تھا یا کھڑا تھا، ہاتھ ہے اور اُس کی گرفت میں بلیک لیبل وہسکی کی بوتل نہیں آئی تو بے شک اس کی ہر کے قانونی ہونے کے بارے میں کھلے عام شک کیا جائے۔ اس بندوبست کے علاوہ

بڑِ آدم تانبے کی بنی ہوئی قدیم صراحیوں کو بھی ایمرجنسی کے طور پر لبریز کر لیا گیا تھا لیکن اُن میں سے وہسکی انڈیلنے کے لیے خاصا تردّد کرنا پڑتا تھا۔

یکدم خاموشی ہو گئی۔

صرف ایئر کنڈیشننگ پلانٹ کی بھنبھناہٹ تھی جو کانوں میں اُتر رہی تھی۔

اُن تینوں نے اپنے آپ کو ساکت کیا، نرت کی چند ادائیں دکھائیں اور پھر طبلے کی پہلی تھاپ پر حرکت میں آ گئیں۔

"صدقے..." کالیے نے ایک اور نعرہ لگایا اور پھر منظر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا... اس نے شو شروع کروا دیا تھا — اس کے لیے ان شوز میں زیادہ کشش نہیں تھی... وہ اب تک مہمانوں کی خوشنودی کے لیے ایکٹ کر رہا تھا۔ کالیا اپنے بیشتروی آئی پی مہمانوں کی نسبت زیادہ باشعور اور چیزوں کے بارے میں سوچنے کا ایک سراسر انفرادی رویہ رکھتا تھا۔ وہ اس وقت بھی تمام لوگوں کا تفصیلی تجزیہ کرنے پر قادر تھا۔ اُس کے بارے میں اس کے ساتھی "کاروباری" کہتے تھے کہ کالیا ہمیشہ اپنی کھیر ٹھنڈی کر کے کھاتا ہے۔

اُس کے دونوں "جگر" اور بھرجائی برگیتا سیڑھیوں کے قریب کھڑے تھے۔

"اوئے ٹھہرو —" یکدم کالیے نے ہاتھ اُٹھا کر بلند آواز میں کہا اور ناچنے والیاں گویا اُسی کی آواز کی منتظر تھیں، وہ جہاں جس انداز میں تھیں، رُک گئیں... لوگ ہنسنے لگے... صرف اس لیے کہ اُن میں سے بیشتر مخمور ہو کر اپنی اوقات بھول چکے تھے اور اب ہنسنے کا یا شور مچانے کا کوئی بہانہ تلاش کر رہے تھے "خواتین و حضرات۔ میں نے زاہد کالیے نے جو آج یہ محفل سجائی ہے تو کس کے لیے سجائی ہے؟ اس کے لیے..." اس نے انتہائی فلمی انداز میں ڈاکٹر ارشد کا ہاتھ پکڑ کر ہوا میں بلند کر دیا "یہ میرا جگر ہے۔ یہ میرا بڈھا شیر ہے۔"

"تھری چیئرز فار بڈھا شیر —" سیڑھیوں کے نیچے نیم دراز ایک نوجوان افسر نے اپنا گلاس اٹھا کر حلق میں خالی کر دیا اور پھر اُس کے شدید اثر سے مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

ارشد اپنے ہونٹ چبانے لگا اور نظریں جھکا لیں... یہ کم بخت کالیا کیا کر رہا ہے... تمام لوگ منہ کھولے متوقع نظروں سے صرف اسے دیکھ رہے تھے کہ وہ کچھ نہ کچھ تو کہے گا اور انہیں شور مچانے کا ایک اور موقع نصیب ہو گا لیکن وہ ہونٹ چباتا نظریں جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اور اس خاموشی میں وہ یہ نہ جان سکا کہ کب کالیے نے اس کے گال کے

ساتھ ہزار روپے کا ایک نوٹ پریس کیا ہے اور کب اُس کی آنکھوں کے اشار بندھی ایک سوہنی آئی ہے اور نوٹ نوچ کر لے جانے سے پیشتر اس پر اپنے ہونٹ گئی ہے۔ موسیقی یکدم بلند ہوئی اور شور میں بدل گئی اور اس شور میں لوگوں بھی تھے ناچنے والیوں کے پاؤں میں بندھے گھنگھروؤں کی ایک گونج والی مترنم آواز تھیں..

"تمہیں رومال چاہئے —" برگیتا نے ارشد سے دریافت کیا جو اب بھی جھکائے کھڑا تھا "تمہارے رُخسار پر جامنی رنگ کی لپ سٹک ہے۔"

اگرچہ برگیتا کی جانب کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن وہ سب کے پپوٹوں کے اُن کے اندر اپنی مکمل ساخت اور بے چین بھرے ہوئے آبنوسی جسم کے ساتھ تھی۔ وہ اُس کی جانب دیکھتے نہیں تھے لیکن آگاہ تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ کالیے نزدیکی دوست کی سویڈش بیوی تھی — لیکن ایک سویڈ اتنی کالی سیاہ کیسے ہو سکتی ہے

اُس لمحے صرف سی ڈی حسین نے ناچتی ہوئی سوہنی پُتلیوں سے پرے دیکھا تو پہچان کی ایک پرچھائیں آئی اور گذر گئی۔

اس نے نوٹوں کی ایک اور گڈی کھول کر اُن پر نچھاور کی اور پھر غور سے جانب دیکھا.... پہچان کی وہ پرچھائیں گم ہو چکی تھی۔

"جنابِ عالی پلیز —" اُس نے ہاتھ جوڑ کر صاحب کمال کو متوجہ کیا" نوٹوں کو ہاتھ لگا دیں... لٹا دیں اس کُتّی دولت کو گشتیوں پر...."

اور صاحب کمال نے اسے مایوس کرنا مناسب نہ جانا۔

"مشاہدی —" کالیے نے اس کے کان میں سرگوشی کی "ان تینوں میں ایک پر دل راضی ہوتا ہے تو بندوبست کر دوں؟"

"یہ تم میرے خاوند کو کچھ کہہ رہے ہو؟" برگیتا نے جو ہچکی لی وہ سویڈش تھی "سرگوشیاں کرنا اخلاقی طور پر مناسب حرکت نہیں —"

"وَف۔" قریب سے ہی آواز آئی۔ موسیقی اور آوازوں کے شور کی وجہ وَف صرف مشاہد ارشد اور کالیے کو ہی سنائی دی یا صرف وہی تھے جو اسے سننا تھے۔

"ہائے ہائے برادر عزیز تم کہاں تھے —" کالیے نے بہت گہری مسرت کا اظ

اور کتورے کو گود میں اُٹھا لیا۔

"اوہ ہاؤ کیوٹ —" برگیتا چلائی "یہ کہاں سے آ گیا —"

"یہ میرا بھائی ہے — اور یہ معزز مہمانوں میں سے ایک ہے — بلکہ" کالیا اپنی ہنسی سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا اپنا منہ برگیتا کے قریب لے گیا "بلکہ یہ چیف گیسٹ ہے —"

برگیتا بے اختیار ہنسنے لگی اور اتنی بے باکی سے ہنسی کہ تینوں ناچنے والیوں نے اسے ناپسند کیا اور تیوڑھی چڑھا کر اُس چوڑی سی عورت کو دیکھا جس کی جانب ہر کوئی نظر بچا کے دیکھتا تھا۔ اور جو اپنے نشے کا اظہار کرتی ہوئی ذرہ بھر جھجکتی نہ تھی۔

صاحب کمال نے سی ڈی حسین کے نوٹوں کا ایک پلندہ ہوا میں اُچھالا تو ایک ایک نوٹ.... الگ الگ بلندی سے نیچے آنے لگا.. ایک ایک نوٹ ایک ایک ہیلی کاپٹر تھا — جو نیچے آ رہا تھا۔

میڈیکل سٹاف ہے سَر....

چند نرسیں اور زخمی اور قریب المرگ جوان سَر — انہیں ایوکیوٹ کیا جا رہا ہے... بائی جانب.. دشمن ان بانسوں کے جنگل میں آ چکا ہے — اور ووئی مسٹ ایوکیوٹ..

انہیں ہیلی کاپٹر سے اُتار دو —

ہیلی کے بلیڈز حرکت میں ہیں سَر... یہ زمین سے اُٹھنے والا ہے سَر... نرسیں اور مرتے ہوئے جوان سَر...

اُتار دو —

سَر!

ہیلی کاپٹر بلند ہوا تو اُس نے دیکھا کہ بانس کے جنگل کے برابر میں جو چھوٹا سا ہیلی پیڈ تھا وہاں مرتے ہوئے جوان اور نرسیں اس آس میں اوپر دیکھ رہے تھے کہ ہیلی واپس آئے گا...

ہیلی واپس کیسے جاتا — وہاں دشمن آ چکا تھا۔

ایک ایک نوٹ ناچنے والیوں کے تھرکیلے بدنوں پر لینڈ کر رہا تھا... اُن کے زرق برق لبادے اُن کے جسموں کے گرد اتنی تیزی سے گھومتے تھے جیسے وہ ابھی ابھی فضا میں بلند ہو جائیں گی۔ صاحب کمال نے نوٹوں کا ایک اور پلندہ اُن کی جانب اس امید میں پھینکا

کہ اُس کا بوجھ اُنہیں پرواز کر جانے سے روک دے گا ۔۔۔

سی ڈی حسین نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ سرٗ صاحب کمال کچھ زیادہ ہی بہک گئے ہیں اور اس کی کُتی دولت کو کچھ زیادہ ہی بیدردی سے لٹا رہے ہیں لیکن وہ روک نہیں سکتا تھا۔ کل کلاں اُن کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

یہ کُتی بُو کہاں سے آ رہی ہے سی ڈی حسین؟

خون تو کب کا خشک ہو چکا تھا...

بکو ۔۔۔ وہاں ایک موٹی ہندنی مائی کی لاش ہے... اس نے ایک بڑے گھیر کا گھگرا پہنا ہوا ہے... تیرا سانس پکا ہے... جا شاباش تجھے سو روپیہ دوں گا۔

باہر، گذرتی ٹرین میں سے مشاہد نے دیکھا کہ ایک سیاہ ننگ دھڑنگ بچہ کسی سارے سرخ رنگ کے بھاری کپڑے کو پلیٹ فارم پر گھسیٹتا چلا جا رہا ہے۔

چار چیزیں ہیں...

شائد اُس محفل میں مشاہد سب سے زیادہ خوش شکل تھا اس لیے... یا وہ کا قریب بیٹھا تھا اس لئے، ناچنے والیاں اس پر اپنی توجہ نچھاور کرنے میں بخل سے کام لے رہی تھیں اور وہ خالی ہاتھ اُن کی جانب دیکھتا چلا جا رہا تھا اور اُن کی نظروں میں کے جو پیام تھے وہ نہیں سمجھ رہا تھا۔

مشاہد نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اپنی ہتھیلی کو غور سے دیکھا... راکھ ہوتی تو آ جاتی... شاہ عالمی میں بھڑبھڑ کرتی آگ جو سیاہ پَر کٹے پرندے فضا میں اُڑاتی تھی اور کے روم کی آگ... اور اس کی راکھ فیصل مسجد کے قریب اس سیکٹر کے اِس عالی شان کے اندر کہاں سے آ سکتی تھی... جیسے سرد راتوں میں اوس کی جو شائبہ شائبہ نمی چہرے محسوس ہوتی ہے ۔۔۔ ویسے راکھ اُترتی محسوس ہوتی تھی لیکن تھی نہیں... اگر ہوتی تو آ جاتی... کنسپریسی آف انیشرز ۔۔۔

طبلے پر ایک زور دار تھاپ پڑی تو کُتورے نے بھی آنکھیں پوری کھولیں "وَف" کہا۔ وہ بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

باہر جیپوں میں پولیس کے اہلکار اونگھ رہے تھے اور اندر بدنوں کی گرمی تھی موسیقی کا شور تھا اور نوٹ فضا میں سے ہیلی کاپٹروں کی طرح مسلسل اُترتے تھے۔

کُتورا آرام کرنا چاہتا تھا، ذرا اونگھنا چاہتا تھا لیکن طبلے پر اکثر اس

پڑتی تھی کہ وہ چونک جاتا تھا اور جب وہ چونکتا تھا تو دیکھتا تھا کہ کوئی کمر میں ہاتھ ڈالے رقص کرتا ہے، کوئی اپنے آپ میں مگن اور مخمور ناچتا ہے اور کوئی وھسکی کی بوتل اپنے سر پر اُنڈیلتا ہوا بھیگتا ہے اور کشتیاں اس کے گرد ناچتی ہیں اور اُسے چھیڑتی ہیں... اور اُس کی جیب میں ٹھنسے ہوئے نوٹ نکال کر موسیقاروں کی طرف اُچھالتی ہیں..

وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اگرچہ وہ ایک معمولی وے سائڈ کُتورا تھا۔

اُن تینوں کے گھیرے دار لباس موسیقی اور مردوں کے شور میں اُن کے جسم کے گرد لپٹتے تھے اور پھر اُٹھتے تھے... وہ ناچ تو قالین پر رہی تھیں لیکن ان کے پاؤں سے دُھول اُٹھتی تھی جو اُن کے گھومتے ہوئے لبادوں میں جا کر چکراتی اور چہروں کی جانب سفر کرنے لگتی... دُھول کا رنگ راکھ ایسا تھا، کُتورے نے نوٹ کیا۔

اور پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ وہ تینوں ساکت ہو گئیں اور اُن کی اُٹھی ہوئی باہیں جیسے سوکھی ہوئی شاخیں ہیں اور وہ ایک سلیٹی رنگ کی لینڈ سکیپ میں ہیں جہاں دُور آلوچے کے جنگلوں میں سے ایک یخ ہوا آتی ہے اور ابھی کہیں کہیں دھبّے تھے اور شگوفوں کے کھلنے کے لیے ابھی تھوڑی سی حدّت درکار تھی جو اگلے تین چار ہفتوں میں تو ممکن نہ تھی۔

لیکن آلوچے کی شاخوں پر پھوٹتے ہوئے سفید دھبّے دیکھتے دیکھتے اُس کی نظروں کے سامنے اندھیرے میں کِھلنے لگے۔

"وَف ۔۔۔" کُتورے نے خوش ہو کر اُنہیں کِھلتے ہوئے دیکھا ۔۔۔ اور صرف وہ تھا جو اُنہیں کِھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا... اور باقی جو تھے وہ ناچنے والیوں میں مگن تھے۔ اس کے باوجود کہ وہ ساکت ہو چکی تھیں اور اُن کی باہیں سوکھی ہوئی شاخوں کی طرح تھیں جن پر سفید دھبّے تھے جو کِھلنے والے تھے یا کِھل چکے تھے۔

پھر ساری شاخیں سفید شگوفوں سے بھر گئیں...

ایک سفید اور کِھلا ہوا اور مہک والا شگوفہ کُتورے کے عین سامنے آ گرا۔

"وَف ۔۔۔" اس نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

چار چیزیں ہیں...

اور یہ ہم ہیں ۔۔۔

وَف ۔۔۔

وہ پتہ نہیں کس جانور کی کھال تھی جس کی ملائمت میں اس کی ستواں ناک
اور اُس میں ایک حیوانی وحشت سے بھری مہک آتی تھی جو اُس کے تقریباً اٹھارہ سالہ
میں یوں سرائت کرتی تھی جیسے اُسے ابھی زیر کر لے گی اور اُس کے نیچے نہ صرف
جانور کی کھال ہو گی بلکہ وہ سب کچھ بھی ہو گا جس میں اُس کا چہرہ بمشکل سانس لیتا تھا
اس کی ملائمت ایسی تھی کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کہاں وہ نرم ملائمت ختم ہوتی ہے اور
ایک وحشت سے بھری گرم مہک شروع ہوتی ہے... اور کہاں اُس کے ہونٹ ایک
راستہ بناتے ہوئے اوپر آتے ہیں اور اوپر جو ہونٹ کھلے ہیں جن میں گہرے سانسوں
ہے اور ایک دلدل میں بدل جاتے ہیں.. اور دلدل کو الگ الگ کرنا بہت دشوار ہوتا
اور ایک گہرا سنسناتا ہوا سناٹا تھا جو اس کے لُوں لُوں کو ایک رطوبت بھری بے چینی
بھرتا تھا۔

دُھند اس پتھریلی میڈی ایول گلی میں ٹھہری ہوئی تھی۔

اور اُس نے اپنے سمور کی کوٹ کی جیب میں سے گھر کی چابی نکالتے ہوئے
تم مجھے شب بخیر کہنے سے جھجک رہے ہو مجھے اب بھی شک ہے کہ تم اکیس برس کے
ہو۔

رات بہت گذر چکی تھی اور کوبلڈ سٹریٹ کے پتھروں کے اوپر دُھند کی
ٹھہری ہوئی تھی اور اُن پر جو آواز تھی صرف ان کے چلنے کی تھی۔ اُس کی ہائی
کبھار کسی ناہموار پتھر سے لڑکھڑا جاتی اور وہ اپنے سمور کے کوٹ سمیت اُس کا سہارا
وہ ہراساں ہو کر سوچتا، کوئی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس لڑکی کو اگر گھر تک چھوڑ
ہے تو اس کے آداب کیا ہیں اور جب وہ لاعلم اور ہونق سا کھڑا رہا تب اُرسلا نے
کوٹ میں سے چابی نکالتے ہوئے کہا تھا کہ... مجھے اب بھی شک ہے کہ تم اکیس بر
نہیں ہو اور اتنی نزدیک آ گئی تھی کہ وہ "ٹُو کلوز فار کمفرٹ" ہو گئی تھی...

"میں ہوں —" وہ بڑبڑایا تھا۔

"کیا؟"

"اکیس برس کا..."

"تم اس کا کوئی ثبوت نہیں دیتے —" وہ ہنس دی۔

تو ستمبر کی اس رات میں — نوٹنگھم کے رابن ہُڈ کاسل کے قریب ایک ڈھلوان
لی گلی میں دیوار سے ٹیک لگائے، سرد اور دُھند آلود رات میں وہ عورت کی اُس مہک
آشنا ہوا... سینے پر پھوٹتے گرم پسینے کی مہک سے آشنا ہوا جو نسل انسانی کی بقا بھی ہے
اس کی بربادی بھی... اس میں اُرسلا کی پسندیدہ خوشبو بھی شامل تھی اور سمور کے کوٹ
جانور مہک بھی اور پسینے کی نمی کا رچاؤ بھی اور سب سے وحشی اور قابو میں نہ آنے والا
یعنی اُس کا بدن بھی — اس مہک کو صرف اولین تجربے میں ہی جانا جاتا ہے، دوسری
اس کا موازنہ کیا جاتا ہے، تیسری مرتبہ آپ کے پاس چناؤ کا موقع ہوتا ہے اور پھر یہ
روٹین میں بدل جاتی ہے، اور کسی بھی روٹین کی کوئی مہک نہیں ہوتی صرف میکنزم
تا ہے۔

ہونٹوں کا سفر گرم اوس والے ٹراپیکل جنگل میں تھا جہاں اندھیرے میں گرم
ئیں اور سرگوشیاں تھیں۔

یہ تجربے کی پہلی سیڑھی تھی۔

یہ اُرسلا تھی۔

اور جو سمیعہ تھی وہ آج سے ٹھیک پندرہ روز پیشتر لکشمی مینشن میں اپنے صحن میں
بانس کی سیڑھی پر چڑھ کر کوٹھے پر آئی تھی اور بہت نڈر ہو کر اس کے صحن پر سے
نکتے ہوئے اسے اوپر آنے کا اشارہ کیا تھا... وہ ایک ڈراکل بچے کی طرح جو کہ وہ تھا
سے چھپ کر اوپر گیا تھا تو سمیعہ ایک لو کٹ گلے والی ململ کی شرٹ میں فلمی
ئنوں کی طرح ایک گھائل ہرنی کی تصویر بنی آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھی تھی "میں
ہاری جدائی میں مر جاؤں گی مشاہدی، میری دنیا برباد ہو جائے گی مجھے چھوڑ کر جانے
لے..." اور مشاہد ایک ہپنوٹائزڈ کبوتر کی طرح صرف اس کے پندرہ سالہ ابھی نیم ترقی
فتہ سینے کو دیکھے چلا جا رہا تھا جس پر ایک سستا، داتا دربار کے عرس کے موقع پر خریدا ہوا
ادھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔

"پیاری میں وعدہ کرتا ہوں کہ پردیس سے جلد واپس آ جاؤں گا ـــ"
اسے کہنا تھا اس لیے اُس نے کہا ورنہ وہ قطعی طور پر جلد واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا۔

"تم مجھ سے مُحبت کرتے ہو ناں؟"

"ہاں ـــ"

اس "ہاں" کے جواب میں سمیعہ نے ایک شرابور آنسو نچوڑتی آہ بھری اور آگے ہو کر اپنے ہونٹ نیم وا کر دیئے بالکل اُسی انداز میں جس میں اُس نے مدھوبالا کے دیکھے تھے.... مشاہد نے منٹو صاحب کے افسانوں میں اکثر اس قسم کی صورتِ حال کے بارے میں تفصیلی تذکرے پڑھے تھے لیکن اگر سچ مچ اس قسم کی صورتِ حال بالکل کے سامنے بیٹھی آنکھوں میں آنسو لیے ہونٹ کھولے منتظر ہو تو کیا کرنا چاہیے... اس بارے میں تو منٹو صاحب نے کچھ نہیں لکھا تھا۔

اس نے جھجکتے ہوئے اور اُس لمحے لکشمی مینشن کی چھت پر ستمبر کے اوائل اس کا پورا وجود سرگوشیاں کرتا ہوا دھکنے لگا تھا تو اس نے پہلے تو اُس لڑھکتے ہوئے ہاتھ رکھ کر اسے تھاما اور جو کچھ اس کے نیچے آیا اسے بھی تھاما اور وہاں تھامنے کے بہت کچھ نہ تھا اور پھر اس کے نیم وا ہونٹوں کو سیل بند کر دیا یہاں تک کہ کافی دیر تک سمیعہ نے اسے دھکیل کر پرے کیا اور شرمند ہو کر کہنے لگی "ہائے اس طرح تو سانس نہیں لیا جاتا ـــ"

یہ صرف پندرہ دن پہلے کی بات تھی۔

اور اس نے ابھی ابھی یہ سیکھ لیا تھا کہ اس دوران سانس کس طرح لیا جاتا اور یہاں تھامنے کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔

وہ ابھی گورنمنٹ کالج کے گوتھک برآمدوں، بے آرام کرنے والے ڈیپ کلاک ٹاور، اوول اور اوپن ایئر تھیٹر میں قیوم نظر کی پاٹ دار آواز اور اونچی چھتوں کلاس رومز میں صفدر میر زینو کی جان گلگو شیکسپیرئن انگریزی اور عطا الرحمٰن کی اکنامکس کے لیکچرز کی ایک نئی اور بدن کو ایک پُر امید امنگ دینے والی دنیا میں چوہدری اللہ داد نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مزید تعلیم انگلستان میں حاصل کرے گا۔ پہلے کے حق میں فیصلہ ہوا اور اس فیصلے میں مشاہد سے مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا

برسوں اس سے نہ قائداعظم جو اُس نسل کے تقریباً پیغمبر تھے بیرسٹر تھے.. پھر مشاہد نے دل کڑا کر کے ہلکا سا احتجاج کیا کہ وہ قائداعظم کی ہمسری کرنے کے قابل نہیں ہے اور اُسے پلیز کسی تخلیقی شعبے میں تعلیم کے لیے اگر انگلستان بھیجنا ہی ہے تو بھیجا جائے۔

چنانچہ اس کے لیے ٹیکسٹائل انجینئرنگ کا چناؤ کیا گیا جو اُن کے نزدیک ایک تخلیقی شعبہ تھا۔ اِس چناؤ کا سبب چوہدری صاحب کے ایک عزیز دوست کا برخوردار تھا جو یہ کورس پاس کر کے وطن پہنچتے ہی بوریوالہ میں ساڑھے تین سو روپے ماہانہ پر ملازم ہو گیا تھا اور اُسے فیکٹری کے کمپاؤنڈ میں ایک ایسا گھر بھی الاٹ ہو گیا تھا جس کے دونوں غسل خانوں میں فلش سسٹم کی ماڈرن سہولت تھی۔

نوٹنگھم پہنچتے ہی خالد کوکی اس کے تمام تر معاملات کا نگہبان ہو گیا۔

خالد کوکی پچھلے کئی برس سے نوٹنگھم میں مقیم تھا، خالص لاہوریا اور انتہائی ذہین اور چارمنگ ہونے کی وجہ سے ابھی تک جیل نہیں گیا تھا... کالج کبھی اٹینڈ کرتا تھا اور اکثر نہیں کرتا تھا اور جب نہیں کرتا تھا تو رود بار انگلستان کے پار کسی جرمن چرچ یا اطالوی کلیسا میں کسی جرمن یا اطالوی لڑکی کے ساتھ کھڑا اُسے شادی کی انگوٹھی پہنا کر "ڈش لینڈ اُوبر آلس ـــ" یا "آوے ماریا" وغیرہ گا رہا ہوتا تھا۔ ہر ماہ جب اس کے مڈل کلاس والدین خرچے کا چیک بہ سلسلہ ہائر سٹڈیز روانہ کرتے تو وہ سب سے پہلے اسے کیش کروا کے دو "چیزوں" کا بندوبست کرتا۔ ایک وہ جس سے نسل انسانی کی بقا میں رکاوٹ پڑتی ہے اور دوسری کم از کم چھ عدد ذرا سستی قسم کی لیکن دیدہ زیب انگوٹھیاں.... یہ انگوٹھیاں ہر اُس بے وقوف یا شاطر دوشیزہ کے لیے تھیں جسے وہ پہلی ملاقات کے بعد رات بارہ بجے فون کر کے مسلسل آہیں بھرتا... اگلے روز ہر تین گھنٹوں کے وقفے سے پھولوں کے تحفے بھیجتا اور اُس سے اگلے روز بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لا کر اعلان کرتا کہ وہ پچھلے تین روز سے سو نہیں سکا کیونکہ اُسے شدید عشق ہو چکا ہے اور اب یہ جو ایک انگوٹھی میرے پاس ہے یہ میری والدہ مرحومہ نے آخری ہچکی لیتے ہوئے وصیت کی تھی کہ صرف اس لڑکی کو پہنانا اور یہ انگوٹھی ہمارے خاندان میں مغلوں کے عہد سے چلی آ رہی ہے تو صرف اس لڑکی کو پہنانا جس کے ساتھ تم پہلی بار مُحبت میں مبتلا ہو کر شادی کرو گے ـــ اور تم وہ لڑکی ہو... تمہاری انگلی کہاں ہے؟

خالد کوکی نے صرف لاہوریئے ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اُس کا آفیشل

شپران مقرر کر لیا تھا۔

اگرچہ وہ اس سے کئی برس سینئر تھا لیکن مشاہد کو اس نے "یار" کے رُتبے کر دیا تھا۔

"یار پاکستان سے جو لڑکے آتے ہیں اُن میں سے بیشتر گھگھو ہوتے ہیں۔ قطعی طور پر علم نہیں ہوتا کہ یہاں انگلینڈ میں کس طرح پراپر لی بی ہیو کیا جاتا ہے... بتاؤ کہ تمہاری وارڈ روب میں کیا کیا ہے... میرا مطلب ہے کپڑے کونسے ساتھ لے آ ہو... نہیں نہیں یار یہاں دھاری دار پاجاموں اور کُتے کے کانوں ایسے کالروں والی سے کام نہیں چلے گا... ذرا نوٹ کرو... تمہیں ایک بلیک سوٹ اور گرے سلک ضرورت ہے سیٹر ڈے نائٹس کے لیے... اور سنڈیز کے لیے صرف اور صرف فلینل ٹراؤزرز، نیلا بلیزر اور سرخ ٹائی — سرخ جرابوں اور کالے شوز کے ساتھ۔ کے دِنوں کے لیے نیلا سویٹر اور ہلکے کریم کلر کی پتلون... کالج جانے کے لیے سکاٹش ٹویڈی کوٹ، کہنیوں پر چمڑا، چیک شرٹ، اونی براؤن ٹائی اور براؤن سویڈ شوز — برساتی اور ایک بڑے کالروں والا اوور کوٹ..."

مشاہد نے پورے ایک ماہ کا خرچہ کوکی کی ہدایات کے مطابق "آسٹن ریڈ" روم میں خرچ کر دیا... انگلینڈ میں بی ہیو کرنے کے لیے... پراپرلی۔

اب ذرا پرائیویٹ اور خفیہ سیشن شروع ہوا۔

"کیا کبھی کسی لڑکی کے ساتھ...."

مشاہد کے نہ صرف کان سُرخ ہو گئے بلکہ جو کچھ دکھائی نہ دیتا تھا وہ بھی سُر گیا۔ کیونکہ یہ بے شرمی کی بات پوچھی گئی تھی۔

کوکی نے ازحد مایوسی سے سر ہلایا "یار تم ابھی تک... نہیں یار... بالکل کو

مشاہد نے لجا کر ذرا سا سر ہلایا۔

"یار یہ تو معاملہ گڑبڑ ہے... تمہیں تو ٹرین کرنا پڑے گا... اچھا تو کبھی کسی کی چُ بھی نہیں لی؟"

مشاہد نے سمیعہ کا آخری راز افشا کرنا مناسب نہ سمجھا اور پھر انکار میں سر ہلا

"اوئے —" کوکی نے اسے ایک زوردار دھپ لگا کر اپنی چوڑی اونچی والی مسکراہٹ سے نوازا "تم تو بالکل ہی کچے ہو — کتنے سال کے ہو؟"

"میں — اٹھارہ برس کا ہو جاؤں گا —"

"اوئے ہوئے — یہ تو بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔ اتنے چھوٹے... تم تو ابھی بچے ہو تم کو بڑا کرنا پڑے گا —"

اور کوکی نے مشاہد کو بڑا اس طرح کیا کہ ایک شام اپنی سپرویژن میں اُسے ڈریس کروایا... مناسب کولون اس کے لباس پر چھڑکے، ٹائی کی گرہ درست کی، اپنے ہاتھوں اُس کی کنگھی کی اور پھر کہنے لگا "یہاں مشاہد ٹائپ نام لڑکیوں کو آسانی سے یاد نہیں تے اس لیے آج سے تم مثیل ہو..."

"نہیں کوکی ابا جی ناراض ہوں گے... کہیں گے انگریز ہو گیا ہے۔"

"تم اب آزاد ہو جانی... اباجی کی پہنچ سے بہت دور... اور یہ انگریز نہیں فرانسیسی ہے سخت رومینٹک قسم کا... مثیل آج تم بڑے ہو جاؤ گے انشاء اللہ —"

باہر، نوٹنگھم کے ماہ ستمبر میں 1958ء میں ہر سو دُھند تھی جس میں اُن کی برساتیاں ں دُھند سے نم ہو کر مزید یخ ہوتی تھیں۔ کوکی نے سب سے پہلے تو ایک پرانی پب میں لر بیئر کے دو مگ پیے اور مشاہد اُسے حیرانی اور قدرے خوف سے دیکھتا رہا کہ یہ شخص اب پیتا ہے اور ابھی جھومنے لگے گا اور اے مرے دل کہیں اور چل گانے لگے گا کہ ں کے ذہن میں شراب کا یہی تصور تھا لیکن کوکی کو کچھ بھی نہ ہوا اور وہ ڈرافٹ کی ایک ا کھیلنے کے بعد باچھوں سے جھاگ پونچھتا ہوا مسکرا کر کہنے لگا "یہ ذرا وارم اپ ہو رہا ہے—"

کافی ہاؤس جس کا نام "ال گریکو" تھا کوکی کا پسندیدہ ہانٹ تھا اور وہاں، مشاہد نے عرصے کے بعد جانا کہ جو تصویریں دیواروں پر چسپاں تھیں وہ کسی مشہور ہسپانوی مصور گریکو کے پرنٹ تھے۔ یہاں مشاہد نے اپنی زندگی کی پہلی سفید جھاگ والی ایسپریسو کافی ائقہ اپنے حلق میں اُتارا... وہ دونوں اپنی نئی برساتیوں میں اور نئے سوٹوں میں اور نئی ٹی جوانیوں میں اپنے سامنے آویزاں آئینوں میں واقعی دلکش لگ رہے تھے... اور رے کونے میں سنہری بالوں والی دو جرمن لڑکیاں سر جوڑے ہنستی تھیں اور اُن کی ا رُکتی نہ تھی کیونکہ وہ اپنے سامنے بیٹھے ڈارک اور مشرقی نوجوانوں کی سیاہ آنکھوں کے م سے کیسے نکلتیں کہ وہ اُن کے پہلے مشرقی طلسم تھے اور اُن کی ایک ایک چیز اُن کے ں میں اور اُن کے سینے کے اُبھاروں میں کھبتی تھیں اور اُن کے اندر تک اثر کرتی

تھی... اور کوکی ایک شاطر کھلاڑی کی طرح یہ جانتا تھا...

اس نے ایک خفیہ اشارے سے اُس ویٹرس کو بلایا جو اس سے پیشتر بھی ثابت ہو چکی تھی اور جسے وہ اوبلائج کر چکا تھا اور اُن گنگلی خواتین کے بل کی ادائیگی — اور جونہی اُن خواتین نے یہ جانا کہ سامنے بیٹھے جادو بھرے ڈارک مشرقیوں نے کافی اور فرنچ فرائز کی پے منٹ کر دی ہے تو انہوں نے بظاہر ازحد شرمندگی سے اپنے تشکر کا اظہار کیا اور یہی وہ سنہری لمحہ تھا جب کوکی اپنی نشست سے اُٹھا اور ان کے سامنے جھک کر اپنے بڑے دانتوں والی باچھوں تک آنے والی مسکراہٹ کے اُنہیں اپنی ٹیبل پر مدعو کیا... اور اُنہیں بندھے آنے کے لیے کچے دھاگے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

"لمبی والی تمہاری ہے اور چھوٹی اور قدرے پلی ہوئی میری ہے۔" اُن کے بیٹھتے کوکی نے اسے وارن کر دیا۔

کوکی ایک چارمر تھا... وہ ٹرکس آف دی ٹریڈ جانتا تھا — ایک جرمن لڑکی کو کس طرح لبھایا جاتا ہے، اُسے کون کونسے لطیفے سنائے جاتے ہیں اور کس لمحے اُسے کس اُداس کیا جاتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے بھی جانتا تھا کہ اس کی ایک بیوی جرمن بھی اُس کی منتظر تھی۔ اور وہ اتنی جرمن ضرور جانتا تھا جتنی آخری آہ تک لے جانے کے لیے ضروری ہوتی ہے..

جرمن لڑکیاں جو انگلستان میں گھریلو ملازمت کے دوران انگریزی سیکھنے کے لیے آتی تھیں اور اُن کی انگریزی ابھی جرمن سے الگ نہیں ہو رہی تھی ایک مشرقی کو اپنی زبان بولتے ہوئے سن کر مکمل طور پر غافل ہو گئیں اور کوکی اسی غفلت کا انتظار کر رہا تھا۔

"خبردار ان کو یہ نہ بتانا کہ تم صرف سترہ برس کے ہو —" اُس نے اُن کی باچھیں کھلی مسکراہٹ کو منقطع کیے بغیر مشاہد سے کہا "ورنہ یہ مائنڈ کر جائیں گی — فراؤ لائن —" وہ اُن میں سے چھوٹے قد کی اور مناسب حد تک پلی ہوئی جرمن کی طرف راغب ہوا "کیا حسین اتفاق ہے کہ میں... میں کوکی ہوں.. اور میرا دوست ... ہے... ہم دونوں ابھی ابھی ایک فلم دیکھنے جا رہے ہیں... کیا آپ ہمیں اپنی رفاقت کا... بخشیں گی... بِٹے..."

اُن دونوں نے شوقین نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا... غیر ملکی گھریلو ملازمہ کی تنخواہ اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اپنی پینیز گنتی رہتی ہے... کندھے سکیڑ کر ہنسیں اور پھر کہنے لگیں — "وُنڈے بار۔"

اُن میں سے ایک اُرسلا تھی... اُرسلا ہبٹس... اور دوسری رانگے تھی..رانگے شیل۔

فلم کا نام "دو بیگھہ زمین" تھا... انگریزی کے سب ٹائٹلز کے ساتھ۔

بلراج ساہنی کلکتہ کے بازاروں اور گلیوں میں.. بے پناہ آبادی کے اژدہام میں ایک قرض اُتارنے کے لیے، اپنی دو بیگھ زمین کو رہن سے چھڑانے کے لیے دن رات رکشا کھینچتا ہے — ایک انسان حیوانوں کی طرح انسانوں کا بوجھ کھینچتا ہے اور اس کی پنڈلیوں کی رگیں پھٹنے کو آتی ہیں اور وہ ہانپتا ہوا اپنی زمین کی خاطر دوڑتا چلا جاتا ہے — یہ سب کچھ سکرین پر حرکت میں تھا اور مشاہد نہایت دل جمعی سے تیزی سے سرکنے والے انگریزی سب ٹائٹل پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جب کوکی کی آواز آئی — "مشیل......"

اور جو کچھ اُس نے کہا وہ سن کر مشاہد سناٹے میں آ گیا۔

یقیناً اُس بھید بھری انگلستانی تاریکی میں ایک خُوشبو اُس کے برابر میں جانور کی کھال اور نسوانی سینٹ اور بدن کی تھی اور اُرسلا نے ذرا مہربان ہو کر اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا لیکن یہ کس طرح ہو سکتا تھا وہ — وہ کرے جس کا مشورہ کوکی دے رہا تھا.. اگرچہ ایک اُسے بھی تنگ کرتا تھا... سکرین پر بلراج ساہنی کلکتہ کے بازاروں میں بھاگ رہا تھا، پسینہ پونچھ رہا تھا، ہانپ رہا تھا، ہر دن کے اختتام پر رقم گن رہا تھا — ہم کب گاؤں واپس جائیں گے؟ اُس کا بیٹا پوچھ رہا تھا — اور اُرسلا کا چہرہ اُس کے رُخسار کو حدت دے رہا تھا۔

"یہ تمہارا ملک ہے فلم میں؟"

"نہیں —" اس نے فوراً کہا "یہ انڈیا ہے — میں پاکستانی ہوں... تم پاکستان کو جانتی؟"

"نہیں — لیکن میں پاکستانی کو جانتی ہوں..." وہ یقیناً جغرافیے سے آگاہ ہونا چاہتی

"نہیں —" اس نے احتجاج کیا..

"تمہاری عمر کیا ہے —" ایک شک بھری آواز میں ارسلا نے دریافت کیا۔

"— اکیس برس"

"پھر تم بہت شائی ہو — میں بھی اکیس برس کی ہوں... تم اگر کم عمر ہوتے تو میں
بے حد گلٹی محسوس کرتی — " اس نے لاپروائی سے اُس کی ران پر ہاتھ رکھ کر کہا اور
ذرا چوکنا ہو گیا۔ لیکن سینما ہال میں اندھیرا بہت تھا اور ساہنی کلکتہ کے بازاروں میں
کھولے مشقت کے پسینے میں انسانی بوجھ کھینچ رہا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اس حیوانی
مشقت کے باوجود وہ اپنی دو بیگھہ زمین رہن سے نہیں چھڑا سکے گا۔

وہ پتہ نہیں کس جانور کی کھال تھی جس کی ملائمت میں اُس کی ستوان ناک تھی
اور کھال پر پسینہ کیسے آ سکتا ہے اور اُس میں ایک وحشت بھری مہک آتی تھی جو اس
سترہ سالہ بدن میں یوں سرائت کرتی تھی... جیسے... جیسے...

کوکی اُس پستہ قد اور نہ انکار کرنے والی لڑکی کے ساتھ پتہ نہیں کہاں چلا گیا تھا
وہ اُسے — اُرسلا کو گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ کوبلڈ سٹریٹ — ویران اور دُھند میں ملفوف
جہاں اُس کی ہائی ہیل کہیں کہیں اٹکتی تھی اور وہ اُس کا سہارا لیتی تھی... اور کب جانور کی
کھال ختم ہوتی تھی اور کب اُس ستمبر کی سرد رات میں.. نوٹنگھم کے رابن ہڈ کاسل کے
قریب.. ایک ڈھلوان پتھریلی گلی کی دیوار سے ٹیک لگائے.. اور وہ دیوار سے لگتی نہ تھی اور
مشاہد شرمندگی سے پیچھے ہٹتا تھا...

سمور کے کوٹ کو اگر پسینہ آتا ہے تو اس میں گرم مہک تو نہیں ہوتی۔

"مجھے شک تھا کہ تم اکیس برس کے نہیں ہو — اور تم نہیں ہو"

"میں ہوں —"

"نہیں.. اگر تم ہوتے تو فائدہ اُٹھاتے۔؟"

کوکی نے ہولے سے دستک دی، پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا — کچھ دیر انتظار کیا
آگے ہو کر ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر پیچھے ہوا، آواز کے لیے کان لگائے" کوئی
بولا۔ پھر اس نے مشاہد کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر دھیرے سے ہینڈل کو گھمایا
کمرے کے اندر جھانکا۔

"وہ تو نماز پڑھ رہا ہے —" اس نے آہستگی سے دروازہ پھر بند کر دیا۔

"کونسی نماز —" مشاہد نے گھڑی پر نگاہ ڈال کر جلدی سے حساب لگایا

وقت — کونسی نماز پڑھ رہا ہے؟"

"مجھے کیا پتہ کونسی نماز.... میں تو عید کے عید پڑھتا ہوں" کوکی نے گردن کھجاتے
ہوئے بے آرام شرمندگی سے کہا "گراف پیپر کسی اور سے مانگ لیتے ہیں — آؤ۔"

وہ ابھی لینڈنگ تک پہنچے تھے کہ انہیں اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی..

"مسٹر کوکی، مسٹر مشاہد آپ لوگ میرا دروازہ کو بجایا؟" چوڑے منہ ماتھے والا
گندمی رنگ اور گھنگھریالے بالوں والا محمد مقدّس علی عام مشرقی پاکستانیوں کی نسبت مضبوط
قد کاٹھ کا تھا، اُن کا کلاس فیلو تھا اور اسی لیے وہ دونوں اس کے پاس آئے تھے۔

"بنگالی بابا —" کوکی نے حسب عادت سگرٹ کو اُنگلیوں میں پھنسا کر مٹھی کو منہ
پر جما کر ایک زور دار سُوٹا لگایا اور دھویں کی دو تیز آبشاریں نتھنوں میں سے خارج کرتے
ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی چوڑی مسکراہٹ سے اُسے نوازتا ہوا بولا
"گراف پیپر چاہیئے۔"

"کیا کرے گا؟"

"یہ مشاہدی جو ہے یہ نٹنگ مشین کی ڈرائنگ نہیں بنا سکتا۔ خاص طور پر نیڈلز
کے ٹیڑھے بنا دیتا ہے... اسے سکھاؤں گا — اور میرے پاس گراف پیپر نہیں ہے۔"

"بہت ہے —" مقدس کمرے میں گیا اور فوراً واپس آ گیا "یہ بہت ہے؟"

"بہت ہے —" کوکی نے گراف پیپر گنے اور فائل میں رکھ لیے "سوری تمہارا
پریئر ٹائم تھا تمہیں ڈسٹرب کیا۔"

"نیور مائنڈ —"

مقدس کمرے میں واپس جانے لگا تو کوکی نے پھر گردن کھجائی "یار بنگالی بابا... یہ تم
کونسی نماز پڑھ رہے تھے؟"

"نمازِ دُعا —"

"یہ کونسی نماز ہوتی ہے مقدس؟" مشاہد نے پوچھا۔

"یہ کسی کے لیے اگر دل بہت دُکھتا ہے تو اُس کی کامیابی اور سلامتی کے لیے نماز
پڑھتا ہے۔ اسے صلوۃ حاجت یا صلوۃ دُعا بولتے ہیں — آپ نہیں جانتے؟"

"اچھا...." کوکی نے ایسے سر ہلایا جیسے صلوۃ دعا پڑھنا اس کی زندگی کا معمول رہا ہو،
ایک اور سُوٹا لگا کر اس نے مقدس کے گال کو چھوتے ہوئے اپنی مسکراہٹ مزید چوڑی کر

دی "تو کوئی گوری پھنساؤ گے... اپنی کامیابی کے لیے دعائیں مانگ رہے ہو — یار مجھے یہ ٹوٹکا بتا دو میں بھی نمازیں پڑھنے لگوں گا —" کوکی ہنسا اور پھر اس نے مقدس چہرے کو دیکھا جس پر ایک سیاہی تھی جو یہ کہتی تھی کہ جو تم کہتے ہو وہ مجھے پسند نہیں اور کوکی فوراً سنجیدہ ہو گیا کہ وہ چہرے پڑھنا جانتا تھا "کس کے لیے دعا کر رہے ہو مقدس

مقدّس نے اوپر چھت کی طرف دیکھا اور مشاہد نے اُس کی آنکھوں کو بھرا دیکھا "بہت مصیبت ہے مسلمانوں پر مسٹر کوکی — یہ جو بدماس ہے آنتھونی ایڈن اس اور اس کے بدماس ساتھیوں نے، فرانس والا اور بدبخت اسرائیل والا نے مل کر ہمارے پر حملہ کر دیا ہے —"

"اچھا؟" کوکی نے مشاہد کی طرف دیکھا "کب؟"

"ٹیلی ویژن پر آیا ہے سب بدماسی — پورا ہوسٹل کا سٹوڈنٹ ادھر کامن رُوم بیٹھا تھا جب نیوز میں اُنہوں نے دکھایا کہ یہ بدماس لوگ نہر سوئز کو نیشنلائز کرنے کا فیصلہ برداشت نہیں کیا اور حملہ کر دیا سب شیطان لوگ نے — اور پیراشوٹ والا فوج اُتار پورٹ سعید میں اور اسے بالکل برباد کر دیا — تو میں کامن رُوم سے اُٹھ آیا کوکی بھائی — ہم رونے لگا پر اُن کافروں کے سامنے ہم نے اپنے کو روک دیا کہ وہ سب بہت خوش تھا انگریز لوگ تو اُن کے سامنے ہم نے سوچا کہ محمد مقدس علی مسلمان کا عزت ہے اُن سامنے نہیں روئے گا، اللہ سے مدد مانگے گا — اس لیے صلوٰۃ دُعا پڑھ رہا تھا مصری بھائی کے لیے —"

کوکی کے ہونٹ جو ہمیشہ تھوڑے سے ڈھیلے رہتے تھے مزید لٹک گئے اور اس اونچے دانت نظر آنے لگے۔ اس نے جلدی سے سگرٹ بجھا دیا جیسے وہ کسی چرچ کے اندر داخل ہونے کو تھا... مشاہد نے متعدد بار اپنی گال کو ناخنوں سے کھرچا اور سر جھکا لیا۔

بہت دنوں سے جمال عبدالناصر نیوز میں تھا...

بہت دنوں سے نہر سوئز نیوز میں تھی —

اگرچہ ناصر بار بار کہتا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے گھمنڈ میں مغرب یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا کر دکھائے گا۔ سوئز فرانس کی ملکیت ہے... جیسے انڈونیشیا ڈچ جائداد ہے، کانگو، بیلجیم کے شاہ کی ذاتی ملکیت ہے... فلاں معاہدے کے تحت فلاں سال تک بین الاقوامی قانون کے مطابق — سوئز فرانس کی ہے۔

اور جس روز جمال ناصر نے سوئز کو قومیانے کا اعلان کیا تو اس روز کوئی بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا — بے یقینی کے بعد اُبلتا ہوا نفرت انگیز غصہ آیا اور ایک مچھر کو کچلنے کے لیے ہاتھی حرکت میں آ گئے۔

نیچے ہوسٹل کے کامن رُوم میں طالب علموں کا ایک بین الاقوامی اجتماع تھا... ہانگ کانگ کے چینی — انگریز، فرانسیسی، ہندوستانی، پاکستانی، اطالوی... ویسٹ انڈینز... اور یہ سب تازہ ترین نیوز بلیٹن کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ برطانوی لڑکے، ٹوئیڈ جیکٹس اور سوئڈ شوز اور شائد پائپ بھی، کرسیوں سے ٹیک لگائے اطمینان سے بیٹھے ٹیلی ویژن کی سکرین کو مسکراتے ہوئے دیکھتے جاتے تھے۔ جب کبھی اتحادی فوجوں کی شاندار کامیابی کی کوئی رپورٹ فلیش ہوتی تو وہ صرف ایک نظر سب کی طرف دیکھتے کہ یہ تو ہونا تھا... ایک قدرتی عمل جاری ہے.. اور یہ ناصر — وہ تینوں بھی نیچے اُترے اور کامن رُوم کے ہجوم میں جگہ بنا کر ادھر اُدھر جہاں نشست ملی، بیٹھ گئے۔ نیوز بلیٹن ختم ہوا تو ٹیلی ویژن آف کر دیا گیا۔

ایک بڑی — خصوصی یہودی ناک والا لڑکا امبرتو — اتھلیٹک بدن، پستہ قد اور بلا کا ذہین کم از کم آٹھ زبانوں پر عبور رکھنے والا یہودی امبرتو... میرا باپ اطالوی ہے اور ماں فرانسیسی... جرمنی میں بھی رشتے داری ہے، کچھ پولش بھی ہیں جو یدش بولتے ہیں... عبرانی ہم سب سیکھتے ہیں زبور پڑھنے کے لیے۔ اسرائیل میں دو برس سکول میں گیا تو مقامی عربوں سے عربی سیکھ لی۔ ایک خالہ رُوس میں ہیں — اور انگریزی تو میں بول ہی رہا ہوں — اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اپنے مطالعے کے زور پر لامذہب ہو چکا تھا اور اس کے باوجود وہ اول تا آخر یہودی تھا۔ کالج کے لڑکے اس کے ساتھ بحث میں اُلجھنا مناسب خیال نہ کرتے تھے صرف اس لیے کہ اُسے بے شمار علوم پر عبور حاصل تھا اور وہ لمحے میں منطقی نتیجے پر پہنچ جاتا تھا.... "دی اَیربز — دے آر کاورڈز —" اُس نے میز پر مکّہ مار کر اعلان کیا اور پھر ہتھیلی پھیلا کر سب کی جانب دیکھا "وہ اتنی تیزی سے ہتھیار ڈال رہے ہیں کہ اسرائیلی فوجی اُن کے ہتھیار اُٹھا نہیں سکتے... ہم صحرائے سینا میں پیدل چلتے ہوئے سیر کرتے گئے ہیں... وہ بھیڑوں کی طرح بھاگ گئے... میرے لفظ یاد رکھنا اگلی صدی — اسرائیل کی ہے۔"

"جب اسرائیل کسی کی پشت پناہی کے بغیر تن تنہا کسی عرب ملک سے لڑے گا تب

ہم مان جائیں گے ــــ"

امبرتو نے جو ایک عظیم تر اسرائیل کے خواب کو اپنے سامنے ٹیلی ویژن بنتے دیکھ چکا تھا ایک زخمی جانور کی وحشت سے پلٹ کر دیکھا کہ کون بولا ہے...ا تھا... نوجوان پاکستانی جو اس کی آنکھوں میں ایک سپاٹ احساس کے ساتھ بے خوا رہا تھا "ایک غریب اور پسماندہ ملک پر تین سپرپاورز کا حملہ...اِٹس اِن بیڈ ٹیسٹ

"اِن بید تیست؟ ــــ" رولینڈ بہت حیران ہوا کیونکہ پورے کامن رُوم مخمور مسرت اور ناقابل تسخیر فتح کی کیفیت تھی اور یہ مشرقی لڑکا کچھ اور کہہ رہا تھ ایک فرانسیسی لبرل تھا لیکن سویز کی نیشنلائزیشن نے اس کی لبرل ازم کا گلا گھونٹ وہ اپنی اس آبائی جائداد کی واپسی کے لیے مصر کی مکمل تباہی اور بیشتر عربوں کو مار حق میں اب قانونی اور اخلاقی جواز پیش کرنے میں سب سے آگے تھا اور مشاہد نہ صرف متعجب ہوا تھا بلکہ اسے شدید دُکھ پہنچا تھا "دی سویز ــــ اِز فرنچ" اس سکیڑ کر کہا "ناصر ایک لٹیرا ہے۔ ہم اسے قانون توڑنے کی سزا دے رہے ہیں۔ رہے ہیں۔ ویٹس آل..."

"اولڈ مین اِیڈن نے بالآخر درست سمت میں قدم اُٹھایا ہے ــــ" بل نہایت بردبار اور غیر جذباتی تھا "ناصر نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی ہمارا مہذب اقوام کا فرض ہے کہ قانون کی سربلندی کے لیے مناسب اقدام کر صرف اور صرف قانونی حیثیت کا مسئلہ ہے... ناصر کو کیا حق تھا کہ وہ سکندریہ کھلے عام سویز کو اپنی جاگیر بنا لینے کا اعلان کرتا..."

جیک میکڈوگل جو اگرچہ ایک تعصّب زدہ سکاٹ تھا اور ہمیشہ ساتھی انگر دکھانے کی فکر میں رہتا تھا آج اس کی بھی فریکوئنسی بدلی ہوئی تھی "مین تم نے کہ کتنی آسانی سے پورٹ سعید کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ہے... اور جب لیڈ... مائنڈ یو سکاٹش لیڈز پیراشوٹوں سے وہاں اُترے ہیں تو میں تمہیں سچ بتاتا ہوا مصری اپنے مورچے چھوڑ کر فرار ہو گئے ــــ ہاں ــــ اپنی لاشوں کی بجائے اپنے بوٹ پیچھے چھوڑنا زیادہ بہتر جانا ــــ"

اس پر ایک ہلکا سا مہذّب قہقہہ بلند ہوا۔

"آئی ایم ٹیلنگ یو ــــ" جیک جیسے خود محاذ جنگ سے واپس آیا

مصری فوجی تھے وہ ڈگ اِن تھے اور پیراشوٹ رجمنٹ کو نیچے سے مرغابیوں کی طرح شوٹ کر سکتے تھے لیکن... وہ یااللہ یااللہ کہتے بھاگ گئے... یہ جو موزلم ہیں، محمڈن... یہ سب ایسے ہوتے ہیں۔"

"ڈونٹ سپیک۔ ڈونٹ سپیک ــــ" مقدس یکدم کھڑا ہو گیا اور اُس کا چہرہ سرخ انار ہو رہا تھا "دِس میٹر مائی ریلیجن... اینڈ یُو... یُو..." وہ انگریزی میں زیادہ رواں نہ تھا بلکہ بالکل رواں نہ تھا اور اُس نے بے چارگی سے مشاہد کی طرف دیکھا "اِن کو بولو کہ ہم موزلم ہیں... الحمدللہ... ہمارے خلاف بات کرے گا تو ہم جان دے دے گا ــــ بولو..."

"مسلمانوں کے حوالے سے بات مت کرو جیک..."

"لیکن مشیل ــــ وہ بھاگ گئے مورچے چھوڑ کر ــــ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ سچ ہے ــــ"

"ہو گا ــــ لیکن ڈونٹ ٹاک اباؤٹ مُسلمز ــــ"

"یاہ ــــ" نائیجیرین مہدی محمد بالآخر ایک درشت لہجے میں بولا "مسلمانوں کی بات مت کرو... کیونکہ میں ہوں... اور ڈونٹ ٹاک اباؤٹ محمد ــــ"

"ٹھیک ہے ــــ" جیک نے ان کے تیور دیکھے تو جان گیا کہ اسے اب کچھ نہیں کہنا چاہئے "میں کچھ نہیں کہوں گا ــــ"

"لیکن میں کہوں گا ــــ" امبرتو کھڑا ہو گیا اور اس کے گٹھے ہوئے بدن کے سامنے مہدی محمد بہت ناتواں لگتا تھا "تاریخ کا ذکر کرنا کوئی جرم نہیں... ان عربوں نے اپنی زمینیں خود یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کیں ــــ وے آر گڈ فار نتھنگ.... یہودیوں نے صحرا آباد کیے، بستیاں تعمیر کیں اور... اگر تم بلندی سے نیچے دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اسرائیل اور عربوں کی سرحد کونسی ہے... ایک جانب لش گرین فیلڈز ہیں اور دوسری طرف صحرا اور ریت... اور یہ ایربز... بلڈی بدّو..."

"ڈونٹ سپیک ــــ" مقدس پھر کھڑا ہو گیا "بدّوؤں کو بلڈی مت کہو... مائی ریلیجن..."

کامن رُوم کا دروازہ کھُلا اور ہوسٹل کا وارڈن جیسے خطرے کی بُو سونگھتا اندر آ گیا۔ اُس نے اپنی براؤن مونچھوں کو تاؤ دیا۔ سکاچ زدہ زرد دانتوں کی فخریہ نمائش کی اور اُنگلی اُٹھا کر کہنے لگا "لیڈز ــــ انگلینڈ اِز اے فری کنٹری ــــ لیکن تمہیں سیاسی اختلافات پر لڑنے

کی فریڈم نہیں ہے... بیک ٹُو یور رُومز... پلیز۔"

بادلِ نخواستہ سب اُٹھنے لگے۔

آج بھی ایک گیلی دُھند کارواں فریب اُن پتھریلی گلیوں میں تھا جو ویران رابن ہڈ کاسل کی جانب بلند ہو رہی تھیں.....

سٹریٹ لائٹس بھی قدیم وضع کے لیمپوں کی شکل میں تھیں اور جہاں سے صدر دروازے کو راستہ جاتا تھا وہاں ایک لیمپ کے نیچے حفاظتی دیوار سے ٹیک لگا جوڑا دلدل کی صورت میں تھا اگرچہ دُھند کی وجہ سے کم دکھائی دیتا تھا... یہاں گیلری نما راستہ جو قلعے کی فصیل کے گرد بل کھاتا ہوا جا رہا تھا اس پر چلتے ہوئے مُش لگا اور دُھند میں اس کا سانس بھی سفید بھاپ کی طرح الگ نظر آنے لگا۔

وہ اس اصطبل نما سیاہ دُھویں سے کالے سیاہ ہونے والے شہتیروں ک والے قدیم شراب خانے میں داخل ہوئے تو لکڑی کی بے آرام لیکن تاریخ زدہ کر بہت دیر سے منتظر اُرسلا اور اِنگے نے اپنے تھکتے ہوئے بدنوں کو ذرا پہلو بدل کرتا اور اُنہیں متوجہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے — کاؤنٹر پر رکھے ٹیلی ویژن کرائسس کے بارے میں ایک نیوز بلیٹن چل رہا تھا لیکن آواز بہت مدھم تھی۔

"ہا — " کوکی دونوں بازو ایک شِکرے کی طرح پھیلائے اپنی بلند مسکراہٹ سجائے ایک بہت عمدہ گرے سوٹ اور اوورکوٹ میں اور مفلر کو لاپروا گردن میں ڈالے اُن کی طرف بڑھا اور پہلے اِنگے کو گلے لگا کر اُس کے رخسار پُرشور بوسہ دیا اور پھر اُرسلا کا ہاتھ تھام کر اس کی ہتھیلی کی پشت پر اپنے باعزت چھوئے "کیا ہم تاخیر سے آئے ہیں؟" اِنگے کی آنکھوں میں بہت کچھ چمک رہا تھا لاچار محبت میں مبتلا لڑکی کی طرح کچھ بے وقوف سی ہو رہی تھی اور اُس کے بدن شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اُرسلا، مشاہد کی جانب دیکھ رہی تھی اور اِس یقین کے دیکھ رہی تھی کہ یہ لڑکا اکیس برس کا ہرگز نہیں ہے ورنہ یہ بھی اپنے دوست کی آتے ہی کم از کم میرے رخسار پر ایک ہلکا سا بوسہ تو ضرور دیتا۔

"آپ کیا پئیں گی؟" کوکی نے پوچھا اور وہ اب تک ضبط کیے بیٹھی رہتی کیونکہ انگلستان میں انگریزی سیکھنے کے لیے آنے والی غیر ملکی لڑکیاں بجٹ کے معاملے

ہت ٹائٹ ہوتی ہیں اور اُن کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی مناسب ڈیٹ انہیں ایک شام کے لیے باہر لے جائے اور اُن کی ڈل روٹین میں دراڑ ڈال دے۔ پاکستانی عام طور پر اس خوشگوار فریضے کے لیے ازحد پُرجوش ہوتے ہیں۔

"بیئر پلیز — " اِنگے نے کوکی کی جانب ایک بھیڑ کی معصومیت سے دیکھا، ایک ایسی بھیڑ جو جلد از جلد ذبح ہو جانا چاہتی ہو۔

"میرے لیے سکاچ — پلیز — آن راکس" اُرسلا بولی۔

"اوہو — " کوکی نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا "یو آر اے بِگ گرل — اور تم بل؟"

"آ — اورنج جوس.... پلیز"

دونوں لڑکیاں یکدم چپ ہوئیں اور پھر اپنے بلانڈ بال جھٹک کر ہنسنے لگیں کوکی نے بھی دانت نکال دیئے "یو آر اے بِگ بوائے مشیل — بی اے بِگ بوائے.... بیئر؟"

"نہیں۔" مشاہد نے فوراً کہا اور اس "نہیں" میں اُس کی ساری پرورش تھی۔ اُس کا گھر اور اس کے ماں باپ تھے۔ وہ رحل تھی جس پر رکھے سیپارے کو وہ آگے پیچھے ہلتا اور جھومتا پڑھتا تھا اور سارے خوف تھے گناہ اور ثواب کے اور — روزہ کھولنے کے لیے شکر دوپہر میں ہی بادام کوٹ کر اُن میں دودھ ملانے کا عمل تھا اور — ایک کشش بھی تھی۔

"کچھ بھی — " بِگ بوائے یا کسی اور نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

اور وہ لیموں کے نچوڑ کے ساتھ سفید رنگت کا "کچھ" تھا۔

"انگلستان کے قدیم ترین شراب خانے میں.... ہاں سب گائڈ بکس میں درج ہے کہ رابن ہڈ کاسل کی یہ پب سینکڑوں برس سے چلی آ رہی ہے اور انگلستان کی سب سے قدیم پب ہے... تو یہاں شراب نوشی کا آغاز کرنا ایک بہت ہی مقدس عمل ہے — " کوکی نے خصوصی طور پر اپنی بھیڑ پر نظر رکھتے ہوئے اپنا مگ اٹھا کر ایک پُرجوش انداز میں نعرہ لگایا "چیئرز — "

تین چار مگز کے بعد — تین چار لیموں کے نچوڑ کے ساتھ "کچھ" کے بعد — بھرے پب میں... سیاہ شہتیروں کے نیچے۔ ایک گرم اصطبل نما شراب خانے میں کوکی گلوگیر ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "مجھے... یوں تو یہ درخواست مکمل

تنہائی میں کرنی چاہیے..." اس نے اِنگے کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی نیلی خمار آلود آ
دیکھتے ہوئے کہا "لیکن — مجھ میں مزید انتظار کی سکت نہیں ہے — اور یوں ہم
— اور مشیل تم — گواہ رہنا — کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ — لیکن اس سے
جانب سے ایک ایک اور ڈرنک — " وہ ڈولتا ہوا اٹھا اور کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

بلیک اینڈ وہائٹ ٹیلی ویژن پر پورٹ سعید کے ملبے اور بربادی کی تصویریں
رہی تھیں.... نہر سوئز کے پانیوں میں اُن جہازوں کے ڈھانچے ساکت تھے جنہیں
اتحادیوں کا راستہ بلاک کرنے کے لیے ڈبو دیا تھا۔

کوکی ایک ڈیشنگ نائٹ کی طرح چلتا ہوا واپس آیا اور اس کی انگلیوں
ڈرنکس پروئی ہوئی تھیں "چیئرز — مڈاِن یر آئیز — اور باٹمز اَپ..."

سب لوگ ایک ہی سانس میں سب کچھ پی گئے۔

"تو میں کہہ رہا تھا — " کوکی کہہ رہا تھا "آپ گواہ رہیے گا — " اُس
میں سے ایک — انگوٹھی برآمد کی "مشیل جانتا ہے کہ یہ انگوٹھی — " اُس
آنسو پونچھا "یہ انگوٹھی میری ماں نے — اور میں اپنی ماں سے کتنی مُحبت کرتا
ایک اور آنسو پونچھا "تو یہ انگوٹھی میری ماں نے مرتے وقت مجھے دی تھی اور کہا
کئی سو برس سے یہ انگوٹھی ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے۔ اِسے اُس لڑکی کا
ہماری بہو بننے کے قابل ہو گی۔ جس کے ساتھ تم زندگی میں پہلی بار مُحبت میں
— اور اِنگے — " وہ بہت ہی گلوگیر ہو گیا "اور اِنگے.. وہ لڑکی تم ہو۔"

اِنگے ایک مسحور کبوتر کی طرح بیٹھی آنکھیں جھپکے بغیر سن رہی تھی۔ اُس
مسحوریت کے سکتے میں اپنا ہاتھ آگے کر کے ایک اُنگلی الگ کر دی۔ کوکی نے اپنے
جذبات کو بمشکل قابو میں لاتے ہوئے اسے انگوٹھی پہنا دی اور پھر اُرسلا اور مشاہد
میں ایک ضرورت سے زیادہ طویل بوسہ اس کے لبوں پر ثبت کیا اور اس بوسے
کی بے چینی شامل تھی کہ وہ اب یہاں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی، لیٹنا چاہتی تھی اور
چاہتا تھا۔

ٹیلی ویژن پر "پاکستان" کا لفظ سنائی دیا۔

پاکستان — ہُو کیئرز اباؤٹ پاکستان — دُھواں زدہ شہتیر اور اُن میں
سگاروں، سگرٹوں اور پائپس کا دھواں — موٹی بدرنگ بھورے بالوں والی

اُن کی تھل تھل چھاتیوں کو چھوتی تھیں — اور کون گا رہا ہے، برنگ بیک مائی
ٹو می — یہ بوُنی کون ہے... اور اِسے کیوں واپس بلایا جا رہا ہے... ہو کیئرز اباؤٹ
...ان

اِنگے کی سلگتی آنکھیں صرف کوکی کو دیکھتی تھیں۔ وہ بیئر کا ایک گھونٹ بھرتی تھی
پھر کوکی کو دیکھتی تھی اور اگر اِدھر اُدھر دیکھتی تھی تو صرف اپنی انگلی میں جگمگاتی منگنی کی
ٹھی کو دیکھتی تھی۔

شراب خانے کا دروازہ جب بھی کھلتا تو باہر کی یخ ہوا چہروں کو اتنی دیر چھوتی جتنی
دہ کھلا رہتا۔ دُھند کا ایک غبار بھی بے آواز ساتھ چلا آتا جو شراب خانے کے اندرون
حدت سے اپنی سفیدی فوراً کھو بیٹھتا — اُرسلا میں عام جرمن لڑکیوں والی بے تابی
تھی، اُس کے چہرے اور بدن میں ایک ٹھہراؤ تھا جو انتظار کر سکتا تھا اور وہ انتظار کر
ی تھی۔

مشاہد بار بار اپنی آنکھوں کو مسلتا کیونکہ اُن میں دھواں اثر کرتا تھا اور اُرسلا دیکھتی
کیا ایک اکیس برس کا نوجوان اپنی آنکھوں کو اس طرح بچوں کی مانند مسلتا ہے — اُس
پولکا ڈاٹ فراک کا گلا بہت نیچے تھا اتنا نیچے تھا کہ اُس سے نیچے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور
ب بھی مشاہد اُس سے کچھ کہتا تو وہ آگے ہو کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہتی "ہاں مشیل
—" اور جب وہ آگے ہوتی تو فراک سے الگ ہو جاتی اور سفیدی اور روئیں دائروں میں
لگتے...

اور وہ انتظار کر رہی تھی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے — " اس نے مشاہد کا بازو چھُوا "کیوں
شیل؟"

سب کچھ دُھویں اور دُھند میں تھا۔ یہ دُھند اُس کی رگوں میں اُتر کر ایک مخمور
رش کر رہی تھی اور وہ اس کے لطف میں بھی تھا اور اس کے خوف میں بھی تھا۔ اُس کی
آنکھیں پہلی بار یہ دیکھنے کے قابل ہوئیں کہ اُرسلا کی آنکھیں بہت نیلی اور خاموش ہیں
ور اُس کے ہونٹ بہت بھیگے ہوئے ہیں جیسے سٹرابریز بارش کے بعد ہوتی ہیں۔

وہاں جتنے بھی لوگ تھے وہ سب ایک خاص مستی میں تھے جو حدود سے باہر نہیں
جاتی تھی، اُن کی آوازیں بھی ایک خاص سطح سے بلند نہیں ہوتی تھیں اور جب وہ گاتے

تھے اور وہ یہی گا رہے تھے کہ برنگ بیک مائی بونی ٹو می — تو ایسے، جیسے ایک دور
سنا رہے ہوں.... اِس مدھم اور دھویں بھرے شور میں ایک مرتبہ پھر ٹیلی ویژن پر
"پاکستان" کا نام لیا —"

ہوکیئرز —

سامنے صرف اُرسلا تھی — اور بارش میں بھیگی ہوئی دو سٹرابریز تھیں۔

"کوکی اور رانگے کہاں ہیں؟"

"انہیں گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے مشیل —" اُرسلا کا ہاتھ تسلی د
تھا۔

"کہاں؟ — کہاں گئے ہیں؟"

اُرسلا نے پھر اس کا ہاتھ تھپکا۔

"میں ہوسٹل کیسے واپس جاؤں گا؟"

"یو آر اے بگ بوائے۔ تم اکیلے ہوسٹل واپس جا سکتے ہو — کیا ہم بھی چلیں"

اُس نے مشاہد کے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ اٹھی اور کرسی کی پشت پر رکھے ہو
کوٹ کو اُٹھایا اور پہننے لگی۔

مشاہد بھی کرسی سے اُٹھا اور اُس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اُرسلا اُس کے قریب
اُس کا بازو تھاما اور کہنے لگی "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میری برساتی —"

"وہ تم نے پہن رکھی ہے ڈارلنگ بوائے —"

سامنے کاؤنٹر کے ایک کونے میں ٹیلی ویژن پر متحرک تصویریں تھیں... اس نے
جھٹک کر انہیں پہچاننے کی کوشش کی.... مشرق وسطیٰ کے علاقے کے ایک ایکسپرٹ
رائے دے رہے تھے۔ انٹرویوز — پیراشوٹ — عمارتوں کا ملبہ — نہر سویز میں
ہوئے جہاز اور پورٹ سعید میں مسکراتے ہوئے اتحادی فوجی اور انتھونی ایڈن... سنجیدہ
سنجیدہ... اور ایک مرتبہ پھر "پاکستان —" نیوز کاسٹر کی آواز اس کے کانوں میں ٹھہر
جیسے سرگوشیاں کرتی چلی جا رہی تھی.... پاکستانی وزیر اعظم... حسین شہید سہروردی
اتحادیوں کے حملے کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے.... اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ
سویز... دے پاکستانی پریمیئر سیڈ... اینڈ زیرو پلس زیرو از ایکل ٹو زیرو....

"یہ ہمارے وزیر اعظم کو کیا ہوا ہے؟" اس نے اُرسلا کا بازو پرے کرتے ہوئے کہا
کون زیرو ہے؟... سب عرب... ہم؟... کون زیرو ہے؟"

"یہ سیاست دانوں کی باتیں ہیں مشیل، ہمارا ان سے کیا تعلق — تمہیں پتہ ہے
ں میں تم سے محبت کرتی ہوں اگرچہ تم اکیس برس کے نہیں ہو — آؤ اب چلتے ہیں۔"

باہر دُھند بہت گہری ہو چکی تھی، اتنی گھنی کہ انہیں اُس گیلری کا ایک پتھر بھی
ئی نہیں دیتا تھا جس پر انہیں چلنا تھا۔ کھردرے پتھروں پر کہیں کہیں وہ ٹھوکر کھاتا تھا اور
اُرسلا اسے سنبھالتی تھی۔ قلعے کے پھاٹک کے ساتھ جو حفاظتی دیوار تھی اور جہاں ایک
یم لیمپ کی ناکافی روشنی دُھند کے سفید جال سے باہر نہیں جا پا رہی تھی وہاں اب وہ جوڑا
جود نہ تھا۔ اُرسلا نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی — اور اس کی رگوں میں جو دُھند اتر
ی تھی اس کی مستی میں راستے بہت تھے اور وہ مہک اتنی شدت رکھتی تھی کہ اسے بار بار
نہ کے راستے سانس لینا پڑتا جو اس کے گرم پسینے پر پھیلتا اور وہ بیچ میں سے سمٹ جاتی..

"بی جنٹل —"

"ہوکیئرز — زیرو پلس زیرو — از — برابر ہے زیرو.... یہ کیسا بیان ہے.. میں
برتو نہیں کرتا لیکن...

"تم نے ایک مدت سے ناخن نہیں کاٹے —"

ہُوکیئرز —

اندھیرے کونوں کھدروں میں ٹارچ کی روشنی ڈالتا، چیک کرتا ایک بابی چلا گیا...
نکھیں چندھیا گئیں اور پھر تاریکی ہو گئی جس میں لیمپ کی روشنی دُھند میں دفن ہو رہی
تا۔

"مشیل —" اس کے کانوں کی قربت میں اس نے سرگوشی کی "آؤ گھر چلتے
ہیں۔"

انہیں بہت آہستگی سے۔ چوروں کی طرح، کارٹون کرداروں کی طرح پنجوں پر چلتے
ئے سانس روکے ہوئے، ہر سیڑھی پر قدم رکھتے اپنے آپ کو ساکت رکھتے ہوئے اوپر
پڑا تاکہ تخت گیر لینڈ لیڈی بیدار نہ ہو جائے...

اُسے قطعی طور پر علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے کیونکہ اُرسلا نے ازراہ احتیاط روشنی
ں جلائی تھی۔

"میں ہوسٹل واپس کیسے جاؤں گا —"

"صبح سویرے جب روشنی ہو گی تب —"

ٹراپیکل جنگلوں میں ایسی گیلی حدت ہے کہ اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے ا
کے اندر دُھند میں سیڑھیاں اترتی ہیں جو ایک دلدل میں بدل جاتی ہیں... بلند درختو
سے بارش کے قطرے نیچے آتے ہیں اور راستہ دکھائی نہیں دیتا... جنگل گرین ہیں او
بھی گرین ہوں... میں سبز کیسے ہو سکتا ہوں... ان میں جانے کے لیے گائڈ کی خدمات
ہیں صرف اپنے آپ کو سنبھالنا ہے —"

"تم کبھی کسی کی مُحبت میں مبتلا ہوئے ہو؟"

"ہاں.... میں... سمیعہ... نہیں نہیں، صرف ایک لاکٹ تھا اور اس کے نیچے
میں مُحبت میں مبتلا ہوا ہوں —"

"وہ کون تھی؟"

"ایوا گارڈنر — تم اسے جانتی ہو؟"

اُرسلا چپ رہی پھر اس کی دبی دبی ہنسی سنائی دی "اسے کون نہیں جانتا... ت
بہک گئے ہو۔"

"نہیں میں سچ کہتا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں ابھی تک اس کے باڈی پرف
مہک ہے... ہاں واقعی —"

"ڈونٹ بی سِلّی —"

"نہیں اُرسلا —" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا "تم بے شک سونگھ لو —" اس
انگلیاں اندھیرے میں اُدھر گئیں جدھر اُرسلا کا چہرہ ہو سکتا تھا۔

"اِن میں جو مہک ہے وہ یقیناً ایوا گارڈنر کی نہیں —"

"تم نے اس کی فلم بھوانی جنکشن دیکھی ہے؟"

"نہیں —"

"میں نے انگلینڈ پہنچتے ہی جو پہلی فلم دیکھی تھی وہ "بھوانی جنکشن" تھی۔ اس
ایک منظر ہے جس میں مکان کو آگ لگ چکی ہے اور ایک سِکھ کردار ایوا کو گود میں اُ
باہر لاتا ہے اور اُس کی جان بچالیتا ہے — کیا تم یقین کر سکتی ہو کہ یہ منظر ہمارے
مینشن میں شوٹ ہوا تھا... ہمارے فلیٹ کی باون سیڑھیاں ہیں... میرا خیال ہے تم

ادب کو نہیں جانتیں، وہ ہمارے ہمسائے تھے... ہاں واقعی وہ منظر میرے سامنے شوٹ ہوا
ا۔"

"اچھا —"

"میں واقعی سچ کہہ رہا ہوں —"

اُرسلا کا ردعمل بہت سرد اور بیزار ہو گیا "کیا ہم بھوانی جنکشن کے بارے میں کسی
وقت گفتگو نہیں کر سکتے —"

"بالکل —"

گرم ٹراپیکل جنگلوں میں دستک... جہاں زینہ زینہ اتر رہی ہے رات — رات
کے زینے دھواں آلود بارشوں میں اپنے منہ کھولتے ہیں اور ایک کائنات حرکت میں ہے
ن یہ زمین ابھی سرد نہیں ہوئی اور ابھی جگہ جگہ لاوا اُبل رہا ہے اور اُس پر دھواں معلق
ہے اور زبان دُکھتی اور کٹتی چلی جاتی ہے... تہہ در تہہ زینے تاریکی کے اندر اُترتے ہیں...
جنگل... ایک سرگوشی ہے اور اس کے برابر میں ایک اور سرگوشی ہے... زیرو پلس زیرو...
بننے لگتا ہے۔

"شیل —"

"زیرو پلس زیرو اِز ایکول ٹو زیرو —"

"بِلّی بوائے کیا کہہ رہے ہو؟"

"زیرو پلس زیرو —" اُس کی آواز یکدم اپنا حصار توڑ کر بہت بلند ہو گئی۔

"شیل —" اُرسلا کی آواز میں ہراس تھا۔

"مِس اُرسلا —" یہ دستک تھی اور لینڈ لیڈی کی آواز تھی "اندر کون ہے۔"
بلی اور ناآسودہ آواز۔

ایک جانوروں والی حِس تھی راستہ تلاش کرنے کی کہ میرا غار کدھر ہے — گھر
ں ہے — اِسی حِس کے تابع وہ رات کے پچھلے پہر بے آباد اور ابھی تک دُھند کے
ب میں مبتلا کوبلڈ سٹریٹس میں ٹھوکریں کھاتا چلتا رہا...

دُھند مزید گہری ہو چکی تھی اور شیروڈ فارسٹ کے نزدیک اس میں وہ بھید اور گہرا
جس میں سے عجیب غیر قدرتی شکلیں ظاہر ہوتی ہیں... درختوں کی شاخیں سانس لیتی
لگتی ہیں اور وہ زندہ ہونے لگتے ہیں۔ دُھند کے حصار میں سے نکل کر وہ قریب آنے

لگتے ہیں — اس خاموشی میں وہ اپنے قدموں کی چاپ سنتا جا رہا تھا اور اس چاپ میں کا ہندسہ سب سے بلند سنائی دیتا تھا۔

اس کے بدن میں تھکاوٹ تھی، کسی کُند بلیڈ سے شیو کرنے کے بعد جیسے چھِلی جِلد ہوتی ہے... شیروڈ جنگل کے ایک حصے میں ہوا چلنے سے ایک سرسراہٹ ہوئی اور اُسی لمحے خاموشی پھر اُتر آئی۔

"تم ایک کچے اور بیوقوف لڑکے ہو اور واقعی زیرو ہو اور میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔" یہ آواز اس کی پُشت پر تھی جب وہ اپنی برساتی پہن کر کمرے سے باہر آ رہا تھا۔

کیا مُحبت اور زینہ زینہ اُترنے والی رات کا رشتہ اتنا کچا اور عارضی ہوتا ہے —

اُس کے قدموں کی چاپ بلند ہو گئی...

شیروڈ جنگل میں ہوا نے پھر ایک راستہ بنا کر سرسراہٹ کو جنم دیا۔

اور قدموں کی چاپ جسے صرف دُھند سن سکتی تھی۔

اور زیرو —

پلس زیرو —

اِز ایکوَل ٹُو زیرو —

بہت لمبے اور لٹکتے اور سیاہ رنگ کے مفلر ان دونوں کے قدموں میں آ آ کر اُلجھتے تھے اور وہ لاپرواہ مسرت اور جوانی کے بخار میں تپتے ہوئے چلتے تھے۔

نیلے سفید دھاریوں والے تھری پیس سوٹوں سے میچ کرتی ہوئی رسلک کی نیوی بلو ٹائیاں اور بائیں ہاتھ میں ناک سے ذرا بلندی پر ترچھے تھامے ہوئے پائپ جن میں سے دھواں اُٹھے مدت ہو چکی تھی — اس لیے بھی کہ انہیں بہت دیر سے ہنسنے سے ہی فُرصت نہیں ملی تھی یہاں تک کہ اُن کے سنڈے بیسٹ پر جو ستائش بھری نظریں اُٹھتی تھیں وہ اُن کو بھی وصول نہیں کر رہے تھے۔

"نہیں یار —" مشاہد ہنستا جا رہا تھا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ بائیں ہاتھ میں تھاما پائپ مناسب اور متعینہ بلندی پر ہی فضا میں معلق رہے کہ یہی اِن ڈوگ تھا...

"ہاں ہاں —" بابو نے دو بار سر ہلایا "رُستم کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

اور رُستم ایک ایرانی گدھ تھا جو "ال گریکو" کے ایک مخصوص کونے میں سرِشام آ بیٹھتا تھا اور چہرے پر ایک بھید بھری دانائی طاری کر لیتا تھا، لاتعلق سا ہو کر، سیاہ چشمے کے نقب میں اگرچہ اُس کی گدھ آنکھیں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن ہر سو تاکتی تھیں۔ سفید رہاتی میں اور نفاست سے ترشی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی میں وہ خاصا مدبر اور گہری سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا اور اُنہیں تب خبر ہوتی جب اس کا کونہ خالی ہوتا اور وہ کسی لڑکی کے ہمراہ دبے پاؤں بلکہ دبے پنجوں کافی بار سے نکل جاتا اور پھر اُسے دبے پنجوں اپنے کمرے میں منتقل کر لیتا کہ 1960ء میں ابھی تک وِکٹورین اخلاقیات اور قیود کی گرہیں مضبوط تھیں۔

"اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا اور جب وہ سب سے آخر میں اپنی دبیز عینک اُتارتا ہے اور لڑکی کی جانب اندازے سے دیکھتا ہے اور ایک گریگوری پیک والی مسکراہٹ چہرے پر سجا لیتا ہے تو اس سے زیادہ احمق شکل کا کوئی جانور روئے زمین پر نہیں پایا جاتا —"

"تمہیں کیسے پتہ ہے یار —"

"مجھے جوائے نے بتایا ہے —"

"ہوں —" مشاہد ایک لمحے کے لیے رُکا اور "اوہ جوائے —" کہہ اور پھر چلنے لگا "اور جوائے بی بی نے تمہیں اور کیا کیا بتایا ہے؟"

اے تھنگ آف جوائے اِز جوائے فار ایور...

جوائے اگرچہ اریکا ژونگ سے بہت پہلے پیدا ہو چکی تھی اور ظاہر ہے "فیئر آف فلائنگ" بھی نہیں پڑھ رکھی تھی لیکن وہ معاملاتِ من و تو میں اریکا کی تھی۔ ابھی وومن لب کا زمانہ دور تھا لیکن وہ ایک بااختیار اور انتہائی فراخ دل لڑ مشاہد اور بابو کے اور شائد ایک دو اور غیر ملکی لڑکوں کے سوا وہ سب پر ہاتھ صاف تھی۔ اریکا کی طرح وہ اپنے گیلے انڈر گارمنٹس سے وی آنا تو نہیں البتہ نوٹنگھم گلیاں بآسانی صاف کر سکتی تھی اور پھر بھی گنجائش رہ سکتی تھی — ایک دو مزید گلی لیے — ایک سیٹرڈے نائٹ پارٹی میں وہ بہت دیر تک مشاہد کو ایکسائٹ کرنے کی کرتی رہی اور جب ناکام ہو گئی تو مشاہد نے اس سے بلاجھجک پوچھ لیا کہ جوائے آسان کیوں ہو؟ — میں آسان نہیں تم مرد حضرات آسان ہو۔ میں بہت کم ایسے سے ملی ہوں جنہوں نے میری پیشکش کو ٹھکرایا ہو۔ دیکھو مشیل میں پی ایچ ڈی کر رہی اور اس کے لیے جان لیوا اور شدید پڑھائی کرنی پڑتی ہے اور میں یہ ہرگز افورڈ نہیں کہ کسی ایک لڑکے کے ساتھ پہلے ڈیٹنگ کروں، بچگانہ محبت کا اظہار کروں، سینما کی نشستوں پر سموچنگ کروں اور ویلنٹائن ڈے کارڈز وغیرہ بھیجوں اور — وقت ضائع — اور چونکہ میرے بدن کی کچھ بیالوجیکل نیڈز ہیں چنانچہ میں کوئی ایک لڑکا پسند کرتی اور اُسے جا کر براہ راست آفر دے دیتی ہوں کہ اگلے دس منٹ میں ہم دونوں بستر سکتے ہیں... بیس منٹ میں، اگر تمہارا گھر زیادہ دور ہے — دراصل میں تم لوگوں ایکسپلائٹ کرتی ہوں اپنے فائدے کے لیے اور چونکہ تم اس وقت موڈ میں نہیں ہو گرل فرینڈ کا انتظار کر رہے ہو جس کا بدن شائد مجھ سے بہتر ہے اس لیے میں گھنگھریالے بالوں والے ہونق پاکستانی لڑکے کے پاس جا رہی ہوں — لیکن وہ تو فیکٹری مزدور ہے اور ان پڑھ ہے.. اور... جوائے نے اسے شرارت سے چھوا اور کہنے میں نے اس سے کوئی لیٹر ٹائپ نہیں کروانا... جوائے یقیناً اریکا سے کئی قدم آگے تھی اس کی مشہور فلاسفی "زِپ لیس..." کو اس سے بہت پہلے اختیار کر چکی تھی۔

"اور جوائے بی بی نے تمہیں اور کیا کیا بتایا ہے؟"

بابو یہ قصہ بیان کرتے ہوئے مسلسل ہنس رہا تھا "رُستم عینک اُتار چکا تھا... اور وہ عینک ظاہر ہے سب سے آخر میں اُتارتا ہے اور جوائے باتھ رُوم میں سے باہر آ رہی تھی اور رُستم ہاتھ پھیلائے ایک ایبسٹرکٹ مسکراہٹ کے ساتھ چُندھی آنکھوں سے اُدھر دیکھ رہا تھا جدھر اس کے خیال میں اس کی آرزو کھڑی تھی اور وہ پتہ ہے کیا کہہ رہا تھا اور ذرا گا کر کہہ رہا تھا — کم ٹُومی... کم ٹُومی او مائی ڈارلنگ کم ٹُومی — مائی ڈارلنگ جوائے نے کیا کیا — کپڑے پہنے اور چپکے سے اُس کے کمرے سے باہر آ گئی اور وہ خالی ہاتھ پھیلائے کہ وہ ابھی اِن میں آئے گی مسکرا رہا تھا اور بے حد گرم جذبے کے ساتھ گائے چلا جا رہا تھا، کم ٹُومی... او مائی ڈارلنگ کم ٹُومی —"

"واقعی اے تھنگ آف جوائے اِز جوائے فار ایور —" مشاہد نے ایک مرتبہ پھر اپنے طویل مفلر کو اُٹھا کر گردن کے گرد لپیٹا اور ناک کے اوپر معلّق پائپ کو نیچے کر کے ایک کش لیا۔ اس نے ہونٹوں کو سکیڑ کر اُن میں سے برآمد ہونے والے متوقع دھوئیں کو دیکھنے کی کوشش کی "بُجھ گیا ہے — بابو پٹیل یہ جو تمہاری ضد ہے ناں کہ ہر سنڈے ہم دونوں ایک جیسا لباس زیب تن کر کے رابن ہڈ کاسل کے راستے دریائے ٹرینٹ تک پیدل مارچ کریں.. میری سمجھ میں نہیں آتی... آخر ہم سگار کیوں نہیں پی سکتے — پائپ ہمیشہ بجھ جاتا ہے۔"

"پائپ بہت ضروری ہے چوہدری... اس لیے کہ پی۔ جی۔ وُڈہاؤس...."

"نو مور وُڈ ہاؤس —" مشاہد نے فوراً اپنے قدم روکے اور دھمکی دینے کے انداز میں اُس کے سینے پر اُنگلی رکھ دی "اِس کم بخت وُڈ ہاؤس نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔"

وُڈ ہاؤس اس ہندو بچے کی فکسیشن تھا۔ وہ اُس کے کرداروں کے لباس، خوراک، بول چال اور I say Jeeves کا مرید تھا... اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ چاہے صرف ایک دن کے لیے لیکن اُسے جیوز جیسا بٹلر مل جائے.. پائپ ناک سے کتنی بلندی پر معلّق رکھنا چاہیے شائد یہ بھی وُڈ ہاؤس کی ہدایات کے مطابق تھا۔

"بابا تم چلو تو سہی... گولڈی انتظار کر رہی ہو گی —"

گولڈی کے نام پر مشاہد کا موڈ بھی قدرے بحال ہو گیا "وہ ہمیں اکاموڈیٹ کرے

گی ناں؟"

"بالکل — بچھ جائے گی ہمارے سامنے — تم چلو تو سہی۔"

شیرووڈ فارسٹ کے قریب گولڈی کا کھوکھا تھا...

گولڈی — ستّر برس سے زائد سُرخ تھل تھل چہرے اور بھورے
گولڈی جس کی آنکھیں کبھی نیلی جھیلیں ضرور ہوتی ہوں گی لیکن اب گدلے ج
تھیں بابو کو دیکھ کر کِھل اُٹھی — چونکہ اس کا کھوکھا بہت چھوٹا سا تھا اس لیے
طرح باہر آ کر کِھلی اور بابو کو شکنجے میں لے کر "مائی سویٹ بے بی" کہہ کر خوب خو
بابو ذرا بدحواس ہو گیا کیونکہ وہ اس قسم کے والہانہ استقبال کے لیے ہرگز تیار نہیں
مشاہد کی ناک نے البتہ اُسے خبر کر دی کہ گولڈی گرمیوں کی اس صاف اور
آسمان والی سنڈے مارننگ میں گیارہ بجے بھی "ٹُن" ہے اور اسی لیے یہ تفصیلی ا
کے حصے میں آ رہا تھا۔

"یہ مشیل ہے میرا پاکستانی دوست — " بابو نے سنبھلنے کی کوشش کر
کہا۔

"اچھا تو یہ مشیل ہے — " کہہ کر گولڈی مشاہد کی طرف بھی آئی لیکن مش
دفاع کے لئے چوکس ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے چنانچہ گولا
اس کے ہاتھ پکڑ کر صرف ایک دو سرد آہیں بھرنے پر ہی اکتفا کیا "آہ مشیل مائی سوی

گولڈی کے کھوکھے میں وہ سب کچھ تھا جو شیرووڈ فارسٹ میں سیر کرنے
آنے والوں کو درکار ہو سکتا تھا۔ پکچر پوسٹ کارڈ۔ سگرٹ، سگار، سوئیٹس، سوونیئر
فلمز اور اس قسم کی الابلا —

"ٹھیک ہے تم دونوں آج شام ہی شفٹ کر جاؤ۔ میں پچھلے پہر تمہارے کم
ڈسٹنگ کر دوں گی اور گل دانوں میں تازہ پھول بھی سجا دوں گی — یُو آر لکی بوا
اتنا زبردست روشن اور بلند فرنچ ونڈوز اور لکڑی کے فرش والا کمرہ، ایک ایرانی
بھی... اور شہر کے عین مرکز میں اور پھر میں تمہیں ایسے ایسے ناشتے بنا کر کھلاؤں گی
آر لکی — "یہ آخری یُو آر لکی کو بہانہ بنا کر گولڈی نے مشاہد کی بے خبری سے فائد
اور اس کے گال پر زبردست بوسہ دیا اور پھر اپنے آپ میں خوش ہنستی ہوئی اپنے کھ
میں گئی اور اس میں بھر گئی" سوئیٹس فار مائی سویٹ ڈارلنگز..." اس نے سوس چا

دو بارز انہیں تھما دیں۔

"یار یہ تو بڑی خوفناک مائی ہے — " مشاہد نے رومال سے اپنے گال پونچھا "یہ اس چوما چاٹی سے آگے تو نہیں جائے گی — "

"نہیں یار..."

"اور تمہیں یقین ہے کہ ہم شوکت ہینڈسم کے گھر کی نسبت گولڈی کے کمرے میں زیادہ سُکھی رہیں گے؟"

"یقیناً — بابا میں نے کمرہ دیکھا ہے۔ کمرہ کیا ہے ایک رائل ہال ہے۔ جس میں صرف میں اور تم ہوں گے اور گولڈی ہمیں ناشتہ سرو کر کے اپنے کاروبار پر چلی جایا کرے گی اور پھر وہ پورا گھر ہمارا ہو گا بابا — اور صرف چار پاؤنڈ ہفتے کے یار — ہم واقعی خوش قسمت لڑکے ہیں۔"

شوکت ہینڈسم یا عام لفظوں میں شوکت گنجے کو وہ ٹیل بریز بھی کہتے تھے۔

وہ انگلستان میں سمگل ہونے سے پیشتر لاہور لوکو ورکشاپ میں ریل گاڑیوں کے ڈبے پینٹ کرتا تھا اور یہاں اپنا تعارف لوکو انجینئر کے طور پر کرواتا تھا۔ نوٹنگھم کی کسی فیکٹری میں وہ جو کچھ بھی کرتا تھا اُس کے اوور ٹائم اور اپنی کمینی کنجوسی کے زور پر اس نے دو برس کے اندر اندر قسطوں پر ایک پُرانا وکٹورین گھر خرید لیا تھا اور اب باقاعدہ لینڈ لارڈ کہلاتا تھا۔ مشاہد اور بابو اُن دنوں ہوسٹل کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ لگے بندھے شیڈیول کی پابندی میں زیادہ سے زیادہ ایک برس بندھا جا سکتا ہے لیکن اُس کے بعد آزادی کی طلب ہوتی ہے۔ چنانچہ شوکت گنجے کی چرب زبانی کرائے دار کے طور پر اُنہیں اس کے گھر لے گئی۔ انہیں پہلے روز ہی احساس ہو گیا کہ غلطی ہو گئی ہے۔

شوکت گنجا ایک کامن تھیف تھا۔ اُس کے پاس ایک ماسٹر کی تھی اور جونہی وہ دونوں کمرے سے باہر نکلتے وہ اُن کا تالہ کھول کر اُن کی ایک ایک شے سونگھتا، پرکھتا اور کوئی ایسی چیز غائب کر دیتا جسے فوری طور پر مس نہیں کیا جاتا۔ ایک شام وہ دونوں باہر نکلے۔ گلی کے کونے پر مشاہد کو یاد آیا کہ وہ اپنی ٹیلی فون ڈائری میز پر بھول آیا ہے۔ وہ واپس گیا تو کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور شوکت گنجا اس کے سوٹ کیس میں ہاتھ چلا رہا تھا — "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ — ہی ہی — میں نے کیا کرنا ہے — شوکت گنجا کمال کا بے غیرت شخص تھا اور مجال ہے کہ شرمندگی کا کوئی شائبہ اس کے پستہ قد بدن پر رکھے

کدو چہرے پر آیا ہو ـــ ہی ہی ـــ آفٹر آل میں لینڈ لارڈ ہوں ـــ اپنی پراپرٹی
رہا تھا۔ پھر کرلوں گا ہی ہی ـــ آپ آجاؤ آفٹر آل آپ کرایہ دیتے ہو ـــ میں
کرلوں گا ـــ یوں بھی میں مغرب کی نماز پڑھنے جا رہا تھا۔

اگر اُنہیں شوکت گنجے سے نجات مل جائے اور اتنے مناسب کرائے پر اور
میں تو انہیں اور کیا چاہیے تھا سویٹ ڈارلنگز کو۔

ویسے شوکت گنجا اپنے آپ کو شوکت ہینڈسم کہتا تھا۔

اکثر پارٹیوں پر وہ لوگوں کے مناسب حد تک مخمور ہونے کا انتظار کرتا اور
چپکے سکاچ اور برانڈی وغیرہ کی بوتلیں کوٹ میں چھپا کر باہر جاتا۔ شراب ایک ایسے
کین میں انڈیل لیتا جو اِسی مقصد کے لئے ہمہ وقت اس کی کار میں موجود رہتا اور
بوتلیں واپس لا کر ڈرنکس کی میز پر سجا دیتا اور بعد میں ـــ ہی ہی... آپ لوگ
ڈرنک کرتے ہو، ساری بوتلیں خالی کر گئے ہی ہی ـــ اور جب وہ خود ترنگ میں
نزدیک ترین لڑکی کے بازوؤں میں سے اپنا گنجا سر نکال کر کہتا ـــ ہی ہی شوکت ہینڈسم
لڑکی اکثر اوقات بے حد شاکڈ ہوتی اور کبھی کبھار اس کی بیوقوفی پر محظوظ ہو کر اس
ساتھ باتیں کرنے لگتی ـــ اور اُسے ہینڈسم کا خطاب کس نے دیا تھا؟ ـــ جوائے نے
اس کا خیال تھا کہ ہینڈسم لوگوں میں بھی ورائٹی ہونی چاہئے اور شوکت گنجا ورائٹی کے
پر ہینڈسم تھا۔

"نیوز آف دے ورلڈ ـــ فار یُو لیڈز ـــ" ایک کاکنی اخبار فروش نے اُن
رنگ کی وجہ سے انہیں متوقع گاہک سمجھ کر نعرہ لگایا۔ ہیڈ لائن ان دنوں کی گرما گرم
کے بارے میں تھی... "پبیوبک ہیئر آر ـــ نو پبیوبک ہیئر" ـــ کیا برہنہ تصاویر میں پوشیدہ
بال بھی دکھائے جاسکتے ہیں یا نہیں۔

گھر سے کل ایک تشویش ناک خط آیا تھا ـــ مردان نے تمہارے جانے کے
گھر میں کبوتر پال لئے ہیں اور سارا سارا دن کوٹھے پر شکر دوپہروں میں آسمان کو تکتا
ہے۔ اس کی آنکھیں خراب ہو جائیں گی ـــ اُسے خط کے ذریعے سمجھاؤ ـــ چنانچہ اس
نے مردان کو خط کے ذریعے سمجھا دیا تھا۔

پچھلے اتوار وہ دونوں پوائنٹ ٹو پوائنٹ گھڑ دوڑوں پر گئے تھے۔

نوٹنگھم سے کچھ فاصلے پر کنٹری سائڈ میں ایک دیہاتی سا میلہ تھا... مشاہد کی

لچسپیوں میں گھڑ دوڑ یا کسی قسم کے جوئے کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی لیکن اس کا ایک
انگریز کلاس فیلو کلارک گھڑ دوڑ کا بے حد رسیا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ پوائنٹ ٹو پوائنٹ ریسز
میں اگر کوئی شخص حصہ نہیں لیتا تو وہ مکمل طور پر تہذیب یافتہ کہلانے کے لائق نہیں ہے
مشاہد نے بابو سے پوچھا تو وہ کہنے لگا چلیں گے یار۔ تم ریس کھیلنا میں کسی کھیت میں بیٹھ
کر اطمینان سے بینجو بجاؤں گا... کھلی فضا میں اور ایک بارش کے بعد کی سردی میں جسے
تی طور پر انگلش سمر کہا جاتا تھا ان دونوں کو فوری طور پر چھینکیں آنی شروع ہو گئیں۔
میں اتنی گیلی تھی کہ اُن کے بوٹ اس میں دھنستے تھے اور زور لگانے پر پاؤں پہلے باہر
نے لگتا تھا۔ البتہ جو ہجوم تھا وہ اپنے سنڈے بیسٹ میں تھا۔ کلارک اُن دونوں کو دھڑا
دھڑ مشورے دے رہا تھا۔ میں اُن تمام کسانوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کے گھوڑے
ں میں حصہ لے رہے ہیں اور ان کے جوکیز کے ساتھ تو میں روزانہ جارج پنجم شراب
نے میں بیئر پیتا ہوں... گھوڑے کو جاننے کے لئے گھوڑے کے مالک اور جوکی کو جانو ـــ
کہ میں جانتا ہوں اس لئے صرف میرے مشورے پر عمل کرو اور سفید ٹانگوں والے
وڑے پر ـــ یا شاید وہ تو گھوڑی ہے تو گھوڑی پر دل کھول کر رقم لگا دو ـــ جیتے گی۔

پچھلے پہر جب وہ نوٹنگھم واپس آئے تو بابو اُن تینوں میں متمول ترین شخص تھا۔

کلارک کو یہ شائبہ سا تھا کہ وہ کچھ رقم جیتا ہے اور مشاہد اگرچہ کلارک کے
یئے کے مطابق اپنے آپ کو ایک مکمل تہذیب یافتہ شخص ثابت کرنے میں کامیاب تو
بکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی پورے مہینے کا خرچہ جو ابھی کل ہی ڈرافٹ کی صورت میں
ا نے روانہ کیا تھا سفید ٹانگوں والے گھوڑے یا گھوڑی پر ہار چکا تھا۔ بابو اِن تینوں میں
ا ترین شخص اس لئے تھا کہ اُس کی جیب میں وہی پندرہ پاؤنڈ محفوظ پڑے تھے جن
ساتھ وہ اِن دوڑوں میں داخل ہوا تھا۔ اُس نے کلارک کی گارنٹی کے باوجود ایک پینی
ان دہقانی گھوڑوں پر لگانے سے انکار کر دیا تھا جو شکل سے ریس کے گھوڑوں کی بجائے
ا خچر لگتے تھے... وہ تمام وقت ریس کے میدان سے پرے ایک کھیت کے کنارے
تنہائی میں اپنے بینجو سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا...

رابن ہڈ کاسل کی قربت میں پہنچ کر انہوں نے اپنے پائپ صاف کئے اور انہیں
کی تھیلیوں میں سنبھال لیا کیونکہ ان کی کافی نمائش ہو چکی تھی اور ان کے ہاتھ اتنی

دیر فضا میں معلق رہنے کی وجہ سے دُکھنے کو آ رہے تھے۔ بابو نے جو ایک اصل لئے بہت دیر سے بے چین تھا سگرٹ سلگایا اور ایک گہرا سانس لے کر دھواں چہرے پر چھوڑ دیا...

"افریقی بچے یہ مت کرو —" اس نے ناک چڑھا کر چہرے کے آ چلائی۔

"سوری بابا —"

وہ پھر چلنے لگے۔

کیا شاندار دن تھا۔

اگرچہ ہوا میں ایک بے آرام خنکی تھی اور دھوپ چینی لڑکیوں کے سلائ کی طرح مشکل سے کھلتی تھی اور بے شکل بادل بے رنگ آسمان پر کہیں کہیں ت لیکن اس کے باوجود — کیا شاندار دن تھا — یہ انگلش سمر تھی اس لئے — ٹوبی — اور فش اینڈ چپس میں تلی ہوئی سمر تھی اس لئے — ٹوبی۔

تب محمد مقدس علی بے حد ناراض ہوا تھا۔

مائی فرینڈ آپ نے ہمارا بے عزتی کر دیا۔ کوکی کے سامنے بولا کہ مقدس بیوی بچہ کا فوٹو دکھاؤ۔

تو اس میں حرج ہی کیا ہے مقدس؟

بہت سخت حرج ہے ناں مائی فرینڈ — ہمارا بی بی پردہ کرتا ہے تو ان کا فو محرم کو نہیں دکھا سکتا۔ آپ تو بھائی ہے ہر کسی کو نہیں دکھا سکتا۔

جب بھی اُسے وقت ملتا۔ کلاس میں، بس شاپ پر، کھانا کھاتے ہوئے، ایک آدھ لمحہ بھی میسر ہوتا تو وہ فوراً جیب میں سے بٹوہ نکالتا اور اپنی بیوی اور بچے نکال کر آنکھوں کے سامنے کر لیتا اور اس تصویر میں کوئی ایسی روشنی تھی کہ اس دینے لگتا جیسے اندھیری شب میں وہ دیوار پر رکھے جلتے چراغوں پر جھک گیا ہو —

ہم نے بوہوت گلتی کیا جو ادھر ایڈمشن لیا اور اپنا بیوی بچہ اور بابا کو چھوڑ کر ادھ مشاہد علی یہ بہت ٹھنڈا اور کھراب ملک ہے مائی فرینڈ... اِدھر تو آئی ایم پھر دجن ود ادھر ہم چھوٹا مینجر تھا ٹی اسٹیٹ پر —

"نہیں —" مشاہد حیرت سے کہتا —

بس مائی فرینڈ۔ ہم نے لالچ کیا کہ ادھر ٹیکسٹائل کرے گا اور پھر کھُلنا میں بڑا افسر لگ جائے گا۔ بوہت گلتی کیا — تم واپس جائے گا ناں ویسٹ میں تو پھر ہمارا ایسٹ میں آنا لہٹ میں —

تم بھی ہمارے ویسٹ میں آنا مقدس — مشاہد کی یہ دعوت دل کی گہرائی سے برآمد نہ ہوتی کیونکہ کوکی کے مقابلے میں مقدس بہت ڈل کمپنی تھا اور اس کی گفتگو ہر دو چار منٹ کے بعد ہمارا بیوی بچہ اور بابا کی کہانیوں کی طرف چلی جاتی...

آئے گا مشاہد علی — اپنے بابا کو بھی لائے گا۔ وہ بہت خوش ہو گا اور بادشاہ مسجد میں نماز کے لئے جائے گا... لیکن مائی فرینڈ ہم نے بوہوت گلتی کیا اپنا بیوی بچہ چھوڑا اور ادھر آگیا — ہم واپس جائے گا۔

کورس مکمل نہیں کرو گے؟

وہ بھی کرے گا۔ بابا نے پراپرٹی بیچا اور میرے لئے ادھر کا ٹکٹ خریدا... لیکن ہم نے گلتی کیا... ہم واپس جائے گا...

محمد مقدس علی نے رو پیٹ کر بمشکل ایک برس نکالا اور پھر کورس ادھورا چھوڑ کر پنے بیوی بچہ اور بابا کو سدھار گیا۔

اور کوکی۔

انہیں دنوں ایک رات بارہ بجے کے آس پاس کوکی نے اسے سوتے میں اُٹھا دیا تھا... اُس کے ہونٹ لٹکے ہوئے تھے اور وہ سخت پریشانی میں مبتلا دکھائی دیتا تھا — یار ایمرجنسی ہو گئی ہے مجھے چالیس پاؤنڈ کی ضرورت پڑ گئی ہے... اگلے ہفتے لوٹا دوں گا... چلو ٹھیک ہے پرسوں ہی بندوبست کردوں گا — میرے تین سو پاؤنڈ مڈلینڈ بنک میں پڑے ہیں لیکن چیک بک گم ہو گئی ہے — مشاہد کو بہت بعد میں خیال آیا کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اُس کے نام چالیس پاؤنڈ کا ڈرافٹ آتا ہے — اور اس روز پہلی ستمبر تھی۔

اور اس رات بارہ بجے کے آس پاس کے بعد — اس کی ملاقات کوکی سے ہوئی کئی برسوں کے بعد — اتفاقاً — میکلوڈ روڈ کراچی پر — جب کہ اس کا جرمن فوج کی زرق برق وردی اور گولڈن پی کیپ میں ملبوس پاکستانی ڈرائیور اس کے لئے جھک کر سیڈز 1100 کا دروازہ کھول رہا تھا اور مشاہد کسی رکشے کے انتظار میں کھڑا تھا اور پہلی ...کی نے اسے جپھا مارتے ہوئے کہی تھی وہ یہ تھی کہ سوری مشیل پانچ سات برس

دیر ہو گئی ہے لیکن تمہارے چالیس پاؤنڈ میری طرف ڈیو ہیں — یار بڑی خوشی
سے مل کر — اور اُس کے چہرے پر تلاش کرنے سے بھی کہیں ذرہ برابر شرمندگی
ملتی تھی... تم میرے ساتھ میرے بنگلے پر چلو گے، وہیں ٹھہرو گے اور بھابھی سے ملو گے
اور یہ ایک اور بھابھی ہے اور یہ بھی جرمن ہے... اور ذرا اپنی زبان قابو میں رکھنا
یار — لیکن یہ تو بہت دنوں بعد کا قصہ ہے — البتہ غائب ہونے سے پیشتر وہ
"ٹریننگ" مکمل کر گیا تھا۔

اگر تمہیں بال روم ڈانسنگ پر عبور حاصل نہیں ہے تو انگلینڈ میں تمہارا م
تاریک ہے —

"ڈانسنگ؟ کوکی میں ہر شے کر لوں گا لیکن ناچا نہیں بنوں گا — ہم کسان
ہیں اور ہمارے ہاں رقص و سرود کو بے حد معیوب گردانا جاتا ہے اور اسے میراثی پنا
جاتا ہے —

"مائی ڈیر مشیل یہ رقص و سرود نہیں ہے — والز ہے۔ کوئک سٹیپ اور ر
این رول ہے... اور ٹینگو ہے — اگر تم ٹینگو نہیں کر سکتے تو تم ایک مکمل طور پر تہذ
یافتہ انسان نہیں کہلا سکتے۔"

انسان کو مکمل تہذیب یافتہ کہلانے کے لئے کیا کیا بکھیڑے کرنے پڑتے ہیں۔

اور اب ہم ٹینگو کر سکتے ہیں اور پیلس سنیما کے بالائی ہال میں واقع وکٹر سل
سکول آف ڈانسنگ کے عین نیچے سے گذر رہے ہیں — میں اور ہندو بچہ — چھال
برس پیشتر کرک براؤن نامی دبلا اور گیلے ہونٹوں والا انسٹرکٹر اور ایک موٹی سکاٹ خا
اینجی — اور ہال میں نصب سپیکروں پر وی آنا والز کے گھسے ہوئے ریکارڈ کی زکام
ناک میں سے نکلتی موسیقی — اور ون ٹو تھری اینڈ ون ٹو — ونس اگین — والز کے
سٹیپ اور چاچا... چا... نسبتاً آسان تھے۔ ٹینگو ایک فوجی مشق کی طرح ناپا تلا اور انتہائی
قسم کا رقص تھا بلکہ مشقت تھی... قدم اس طرح رکھنا پڑتا تھا جیسے آپ کسی بارو
سرنگوں کے علاقے میں چل رہے ہوں... ٹینگو سکھاتے ہوئے کرک اسے جب
تو ضرورت سے زیادہ قریب آ جاتا اور اسے مسلسل بھینچتا رہتا... وہ یقیناً گے تھا۔

ڈو یو لائک ٹو ٹینگو؟

آئی لو ٹو —

یاد کرو گے یاد کرو گے اک دن ہم کو یاد کرو گے — ٹینگو کی اس دھن پر تم کس
کو یاد کرو گے مشاہد علی —
کس کس کو یاد کرو گے —
دو بیگھہ زمین اور سمور کا کوٹ —
محبت اور دلدل کے کچے اور عارضی رشتے —
زیرو پلس زیرو — از ایکل ٹو زیرو —
ہو کیئرز اباؤٹ — پاکستان
آئی مشاہد علی — کیئر اباؤٹ پاکستان —
انگلستان میں اتنے برسوں سے کس کس کو یاد کرو گے؟

جان آزبورن کا "لُک بیک ان اینگر" — "ہاؤس بوٹ" میں کیری گرانٹ —
رنس ہاردے کے لئے "روم ایٹ دے ٹاپ" — "ورلڈ آف سوزی وانگ" —
انڈو کی "سٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر" یا الزبتھ ٹیلر "کیٹ آن اے ہاٹ ٹن رُوف" یا پھر جیمز
ین کا "ریبل وداؤٹ اے کاز —"

ہاں کس کس کو یاد کرو گے مشاہد علی — ایلوس پریسلے اور کلف رچرڈز اور
ائز جیرلڈ...

اور نوجوان نسل کے کمروں کی دیواروں پر چسپاں پوسٹر — ایسے چہروں کے جو اُس
بے سمت معاشرے میں ایک سمت رکھتے تھے — ہو چی منہ۔ ماؤزے تنگ۔ اور
چے... چے گویرا — وہ اُس بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ کس افق پر نظریں جمائے
ئے ہے — اُسے کیا دکھائی دے رہا ہے یا وہ دیکھنا چاہتا ہے اور دکھائی نہیں دیتا —
لیڈ میں اُن لاکھوں اتحادی سپاہیوں میں سے ایک تھا جو ڈنکرک میں شکست کھا کر
منوں کی اندھا دھند گولہ باری میں کشتیوں اور سٹیمرز کی مدد سے بھاگ کر واپس اپنے
یسے میں آئے تھے۔ میرے بوٹ کاٹ کر الگ کئے گئے تھے اور جرابوں کے ساتھ میرا
شت بھی اُتر گیا تھا — تم نے لنڈن بلز نہیں دیکھی — وار از اے ڈرٹی گیم مائی ڈیئر۔
نکیتا خروشچوف — اپنی تصویروں کی نسبت زیادہ سوبر لگتا تھا۔
کوسیان — ہمہ وقت خروشچوف کی جانب دیکھتا تھا اور اس کی سیاہ مونچھیں اُس
لبوں کی لرزش سے لرزتی تھیں۔

بلگانن — بہت بھاری اور وسیع تن و توش کا مالک، غصے پر قابو پاتا ہوا۔
اور یہ تینوں کریملن کے وسیع جگ مگ کرتے بینکوٹ ہال میں مشاہد
بیٹھے جیسے صرف اسے نگاہ میں رکھتے تھے — یو ٹُو بروٹس — نہیں نہیں
جاسوس جہاز — بڈابیر پشاور سے اور ایک سرخ دائرہ ایٹمی حملے کے لئے —
خروشچوف نے یُوتھ فیسٹول کے لئے آئے ہوئے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے
گلاس اُٹھایا تو جیسے اس نے صرف مشاہد کو ٹوسٹ کیا" یو ٹُو مشاہد —"

ہُو کیئرز اباؤٹ پاکستان —

آئی — مشاہد علی —

برلن ۵۹ء — کرفرسٹن ڈام کے آخر میں قیصر ولیم میموریل چرچ کا ڈھانچہ۔

لاہور ۴۷ء — شاہ عالمی چوک میں آگ سے بچا ہوا ایک مندر — ٹوٹا ہوا جو کبھی سنہری ہوا کرتا تھا۔

برلن ۵۹ء — ابھی دیوار نہیں اُٹھائی گئی تھی — مشرقی برلن کا بیشتر حصہ کھنڈر تھا۔ مارشل ژوخوف کی بھاری توپوں کی دھمک ابھی ملبے میں تھی اور کیا سننے کے لئے بوڑھے جرمن ایک ایک اینٹ اُٹھا کر اسے کانوں سے لگاتے تھے یا مسمار شدہ مدفون گھروں کو تلاش کرتے تھے۔ وہ مسلسل ان کھنڈروں کو کریدتے تھے۔ یہ کھنڈر اپنے قرابت دار شاہ عالمی کے کھنڈروں کی طرح صرف خاک اور تھے، اس راکھ میں بارود کی چنگاریاں ابھی موجود تھیں۔ اتحادیوں کے گرائے ہوئے بموں میں سے کوئی ایک جس کی نیند پوری ہو جاتی اُٹھتا اور کھنڈر کے ملبے کو سر بلندی پر لے جاتا اور اُس کے دھماکے سے کھنڈر کریدنے والے ذرا دہلتے اور ذرا کرتے کہ دُھول بیٹھ جائے اور پھر کھودنے کریدنے میں مصروف ہو جاتے۔

مشاہد اُرسلا کے لئے برلن گیا تھا۔

ہاں، اس نے زیرو پلس زیرو والی رات کو اگرچہ یہی کہا تھا کہ تم ایک بیوقوف اور زیرو لڑکے ہو اور میں تمہیں پسند نہیں کرتی لیکن اُرسلا کو یہ گہری سیاہ آ والا مشرقی طلسم ڈس چکا تھا... انگریزی زبان کا کورس مکمل کرنے پر وہ واپس برلن اور وہاں پہنچ کر اسے پھر شدت سے احساس ہوا کہ مشرقی مثیل کے کاٹے کا کوئی علاج

اور اس نے اُسے کہاں کہاں نہیں کاٹا تھا — وہ اپنی بیشتر شامیں اسے طویل درخواست گزار تم کے خط لکھنے میں گزارتی اور اپنی قلیل تنخواہ میں سے مہینے کے پہلے دس دن روزانہ پھولوں کا ایک گُل دستہ روانہ کرتی اور گیارہویں دن اس کی پُونجی تمام ہو جاتی۔

چنانچہ سمر ۵۹ء — مشاہد برلن میں تھا۔

اُرسلا ایک تعمیراتی ادارے میں سٹینو ٹائپسٹ کے طور پر کام کرتی تھی۔ وہ اپنے وقت پر بیدار ہو کر، سوئے ہوئے مشاہد کو افیدا ذین کا ایک طویل اور غیر جذباتی بوسہ دے کر دفتر چلی جاتی۔ مشاہد جب بھی بیدار ہوتا ڈبل روٹی اور دودھ کی ایک بوتل اُٹھا کر فلیٹ کے سامنے کھنڈروں میں چلا جاتا — دنیا میں جتنے بھی کھنڈر انسان کے ہاتھوں سے وجود میں آتے ہیں اُن کی شکل اور بلندی اور ویرانی ایک جیسی ہوتی ہے... اُن کی راکھ چہرے کو تلاش کرتی ہے — برلن ہو یا لاہور — پتہ نہیں وہ کہاں تھا۔ کئی روز تک لاہور کے آسمان کو جس آگ نے سرخ کئے رکھا تھا اس کے کھنڈر بھی یہی تھے — تمام کھنڈر ایک دوسرے کی فوٹو سٹیٹ ہوتے ہیں۔ جلے ہوئے بہی کھاتے۔ کتابوں اور کپڑوں کے پَر کٹے سیاہ پرندے جب اڑتے ہیں تو لاہور اور برلن کا آسمان ایک ہوتا ہے —

قدیم رہائش گاہیں، حویلیاں، عبادت گاہوں اور دوکانیں کہیں بھی ہو سکتی ہیں۔

برلن میں بھی ایسے دروازے اور کھڑکیاں تھیں جن میں صرف آسمان تھا... اُن کے عقب میں کچھ نہ تھا — ایک فلمی سیٹ کی طرح — تم ہندو ہو بُندو رام تو ہندوستان کیوں نہیں جاتے — آر یُو آل رائٹ مثیل؟

ہاں — بالکل

تم بار بار اپنے چہرے کو پونچھ رہے ہو —

شائد مجھے پسینہ آ رہا ہے — دیٹس آل۔

اس نے رومال کو غور سے دیکھا... اس پر کوئی ذرہ یا سیاہ نشان نہ تھا

اور اُسے محسوس ہوا تھا کہ ذرہ ذرہ — جیسے اوس شائبہ شائبہ چہرے پر اُترتی ہے جیسے راکھ تھی... لیکن رومال پر کوئی ذرہ یا سیاہ نشان نہ تھا۔

"اوہ کرائسٹ —" بابو اتنا پُرمسرت ہوا کہ بلبلا اُٹھا اور وہ مشاہد کا بازو اتنی قوت سے جھنجھوڑ رہا تھا کہ وہ برلن سے فوراً واپس آ گیا اور اس نے صرف گھور کر دیکھا۔ بابو

نے شرمندہ ہو کر بازو چھوڑ دیا" بابا ادھر دیکھو ——— ایلوس پریسلے"

ایلوس دے پیلوس پہلے سے کمزور نظر آتا تھا اور ذرا سالم ڈھینگ ہو چکا تھا کریم سے اپنی جگہ پر جمے ہوئے چمکیلے لمبے بالوں اور کانوں سے نیچے اُترتی لٹکتی ہوئی ایسی سائیڈ برنز کی بجائے وہاں اس کے سر پر ایک امریکی طرز کا کروکٹ تھا۔ جنگل کی اور اب وہاں صرف چھدری گھاس تھی۔ ایلوس اُن سے نظریں بظاہر چرائے ہوا شوکیس میں جھانک رہا تھا۔

"ہائے ایلوس ———" بابو نے اس کی پشت پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا اور وہ یکدم مڑا۔

"ہیلو ایلوس ———" مشاہد نے بھی مسکرا کر کہا۔

"ہائے بابو ——— ہائے مشیل" وہ بہت دھیما اور مدھم تھا۔

"لونگ ٹائم نو سی ——— کہاں تھے؟"

"آئی واز اِن دے آرمی یُو نو ——— نیشنل سروس"

وِکی ہر پیمانے سے ایک خوش شکل نوجوان تھا اور اُن کا کالج میٹ تھا۔ لڑکیاں پر بیوقوف مکھیوں کی طرح مرتی تھیں بلکہ پھر زندہ ہوتی تھیں اور بار بار مرتی تھیں اس لئے نہیں کہ وہ ہینڈسم تھا بلکہ اس لئے کہ اس کی شکل ایلوس پریسلے سے حیرت طور پر مشابہہ تھی۔ وِکی صرف وہی کپڑے پہنتا جو ایلوس اپنے تازہ ترین شو میں ز کرتا اور اس کے بال اور قلمیں ہو بہو ایلوس کی کاپی تھیں۔ اُن دنوں ہر دوسرا ایلوس تھا لیکن وِکی اُن سے مختلف تھا... پہلی نظر میں واقعی دھوکا ہوتا تھا اور یوں لڑکیوں کی نوجوانی سے نچڑتی اور خواہشوں سے بھری ہنسی کے ساتھ جب فرمائش شیک اِٹ ایلوس ——— تو وِکی ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر ——— ذرا جنسی انداز میں منہ اپنے نچلے دھڑ کو جو چُست سنہری پتلون میں ہوتا، ذرا شیک کرتا ——— ایک ایلوس ٹھمکا لگاتا تو لڑکیوں کی چیخیں نکل جاتیں۔

"شیک اِٹ ایلوس ———" مشاہد نے پرانی فرمائش دوہرائی۔

وِکی نے اپنے بالوں پر ایسے ہاتھ پھیرا جیسے وہ اب بھی پچھلے دنوں کی طرح گھنے ہوں، پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا" نہیں مشیل۔ اب

"کیوں؟" بابو کی حیرت بجا تھی، پہلے تو وہ اس فرمائش کا منتظر رہتا تھا۔

"وقت بدل چکے ہیں" وِکی پھر مدھم آواز میں بولا "میں نے دو برس فوج میں ارے ہیں ——— اب نہیں ———" اور وہ جلدی سے اُن سے ہاتھ ملا کر بالوں پر ہاتھ پھیرتا لیا۔

وہ دونوں بھی چلنے لگے... کچھ دیر سر جھکائے اپنے آپ میں سوال جواب کرتے ئے۔ انہیں دریائے ٹرینٹ کا پہلا پُل نظر آیا جس کے نیچے رواں پانی اس روشن دن میں گدلے اور مٹیالے تھے۔ "کیا وقت سے ہم اتنے بدل جاتے ہیں مشیل ———" بابو وِکی ردِ عمل پر بہت اپ سیٹ تھا" یہ منتظر رہتا تھا کہ کوئی اسے شیک اِٹ ایلوس کہے اور... یا وقت ہمیں بدل دیتا ہے یا ہم خود ——— وقت کو بدل دیتے ہیں"

"پتہ نہیں ———"

"نہیں بابا تم جانتے ہو... کئی بار تم بہت اونچی بات کرتے ہو جہاں تک میں نہیں پہنچ سکتا... اور میں چُپ رہتا ہوں... کیا ہم بھی بدل جائیں گے مشیل ———"

اُس روشن اور چمکیلے دن میں یہ بہتر تھا کہ بابو وقت کی کُترن پر لکھا ہوا نہیں پڑھ سکتا تھا...

"ہاں... ہم بھی یوں نہ ہوں گے جیسے آج ہیں ———"

"لیکن کیوں بابا ———"

"یہ ہم ہیں بابو ———"

"ہم ہیں؟" بابو کے چہرے پر حیرت اور بے یقینی شکنیں کاڑھتی گئی۔

"ہاں ——— یہ صرف ہم اور ہم ہیں... لمحۂ موجود میں ——— اب ——— نوٹنگھم کے رابن ہُڈ کاسل کے سائے میں، لمبے سیاہ اونی سکارف اس گیلی سرد سمر میں ہمارے قدموں میں اُلجھتے ہوئے... اپنے نیلے سوٹوں میں، یہ صرف ہم ہیں۔ ابھی گرمیوں کا آغاز ہے اور دریا کے کنارے جو چیری کے درخت ہیں اُن کی سیاہ شاخوں کو اگر تم بہت غور سے دیکھو اور بہت دھیان سے مسلسل تکتے رہو تو تم دیکھو گے کہ ان پر جو سفید دھبے ہیں جیسے شیشے پر پارے کے قطرے ٹھہرتے ہیں، ابھی کچھ دنوں میں... ذرا ٹھہر کے... حدت ہو گی اور پھر یہ پھوٹیں گے اور کھلیں گے ——— لیکن یہ اب لمحۂ موجود میں بھی کھل سکتے ہیں اگر تم چاہو... اور ان میں سے ایک شگوفہ تمہارے قدموں میں گر سکتا ہے ———"

اور ایک شگوفہ بابو کے قدموں میں جہاں لمبا سیاہ سکارف اُلجھتا تھا گرا۔

"اس لئے کہ یہ ہم ہیں بابو — ٹرنیٹ کی مٹیالی اور گدلی سطح پر کیا تیر رہا ہے
کچھ بھی نہیں... سوائے اس کے کنارے بیٹھے لوگوں کی متلاشی نظروں کے...
مسلسل دیکھتے ہیں تو اُن کی نظریں اس پر تیرتی ہوئی دور تک جاتی ہیں اور وہ نہیں
جانتے ہیں کہ ہماری نظریں کہاں جا رہی ہیں۔ ہم وہاں تک نہیں جانا چاہتے جہاں تک یہ
نظریں ہمیں لے جا رہی ہیں... وقت کی کترن پر آنکھ جھپکنے سے منظر بدلتے ہیں...
اگر تم پورے یقین سے چاہو تو ٹرنیٹ کی اس روانی پر... اس کی سطح پر چھوٹی چھوٹی کھلونا
بادبانی کشتیاں بھی تو تیر سکتی ہیں... سیل بوٹس بابو... لمحۂ موجود میں ظاہر ہو سکتی ہیں
تمہارے سامنے — اگر تم چاہو... کیونکہ یہ ہم ہیں"

چھوٹی چھوٹی کھلونا نما بادبانی کشتیاں ٹرنیٹ کے گدلے پانیوں پر، کچھ یہاں، کچھ وہاں
— تیرنے لگیں۔ اور اگر کوئی دیکھ سکتا تو چیری کا ایک شگوفہ جو سائز میں ان بادبانی کشتیوں
سے کئی گنا بڑا تھا اور وہ ایک سفید مہک والے بادبان کی طرح تھا اُن کے پہلو میں تیرتا
جاتا تھا۔

"بابا ایسا مت کرو کہ میری نظر کو دھوکہ ہوتا ہے — ایسا مت کرو"

"میں کچھ نہیں کر رہا بابو — یہ تو تم خود ہو"

جیسے پانی پر بلبلے خاموشی سے اپنے وجود کا کوئی نشان چھوڑے بغیر بجھ کر عدم میں
چلے جاتے ہیں ایسے وہ بادبانی کشتیاں تھیں... ایک ایک کر کے وہ ابھی تھیں... ابھی نہ
تھیں۔

وہ گئے اور موجود میں واپس آ گئے۔

"آج تمہارے واسطے ایک سرپرائز ہے۔ ایسا سرپرائز ہے کہ تمہارا ہوش گم ہو
جائے۔ لیکن اس سے پہلے ابھی تم نے ہوش گم کر دیا ہے رِشی بابا۔ میری نظر کو
دھوکہ ہوا تھا کہ... چیری بلاسمز کھل چکے ہیں۔ میں آنکھ جھپکتا ہوں تو کچھ دکھائی دیتا ہے
اور پھر جھپکتا ہوں تو کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ مجھے اپنی آئی سائٹ ٹیسٹ کروانی چاہیے
ٹرنیٹ کے واٹرز پر سیلز بوٹس... اتنی چھوٹی کہ ہاتھ میں آ جائیں — ہیری بیلا فونٹے کا "
سیلز اِن دے سَن سیٹ" سامنے آ گیا بابا — یہ کیا تھا؟"

"ہم —"

"یہ ہم تو ہیں —" بابو نے دانائی سے سر ہلایا "اپنے سنڈے بیسٹ میں، دریا

ٹرنیٹ کے کنارے اور یہ لمبے سکارف۔ یہ تمہارا آئیڈیا تھا، ہم چلتے ہیں تو ہمارے پاؤں میں
آتے ہیں... یہ ہم تو ہیں..."

دریائے ٹرنیٹ کے جتنے پُل تھے اُن کے نیچے سے — واقعی بہت سا پانی بہہ چکا تھا
اور اس پانی کے ساتھ مشاہد کی زندگی کے بہت سارے اولین لمحے، معصومیت اور نہ جاننے
کے لمحے بہہ چکے تھے اور اب وہ بہت کچھ جانتا تھا اور نہ جاننے میں جو گرم کشش ہے اسے
کھو چکا تھا۔ اَن دیکھے کو دیکھ لینے کے بعد — تھکاوٹ اور پژمردگی کے سوا اور کیا تھا... ان
پانیوں میں اس کے چار برس بہہ چکے تھے...

"سرپرائز کیا ہے بابو؟"

"پہلے یہ سینڈوچ کھاؤ:" اس نے جیب میں سے ایلومینیم فائل میں پیک کیا ہوا
ایک سینڈوچ نکالا اور اس کا نصف پورشن مشاہد کی طرف بڑھا دیا" نہیں، اس میں ہیم
وغیرہ نہیں، کھالو"

دریا کنارے — دھوپ کو ترسے ہوئے بدرنگ بدن جن کی نیم برہنگی میں کوئی
جاذبیت نہ تھی جو خون میں کوئی گرم سندیسہ بھیجتی۔

سینڈوچ ختم کرنے کے بعد بابو نے اطمینان سے منہ پونچھا اور سگرٹ سلگا کر
مسکرانے لگا" بابا... آج دیوالی ہے"

"اچھا —"

مشاہد یہ کیسے فیصلہ کر لیتا کہ اس کا ردعمل کیا ہو گا... وہ ایک الگ تہذیبی خطے سے
تعلق رکھتا تھا جہاں دوسرے عقیدوں میں مسرت اور شادمانی کے جو دن ہوتے ہیں اُن کا
اُسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے صرف "اچھا" کہا اور بابو کے چہرے پر اپنا ردِعمل
تلاش کیا...

"بابا دیوالی —" بابو نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس طرح پھڑپھڑائے جیسے اُڑنے کو
ہو" ہیپی دیوالی بولو —"

"ہیپی دیوالی ٹو یو سر —" مشاہد بالآخر واضح ہو کر مسکرانے لگا "سو اِٹس دیوالی
— تو اسے کیسے منایا جائے۔ میں نے تو یہی سنا یا پڑھا ہے کہ بنیا لوگ دیوالی کے موقع پر
چراغاں کرتے ہیں — اور کیا کرتے ہیں؟"

"تم نے ٹھیک سنا ہے بابا... اور ہم پٹیل ہیں اور ہم کو بنیا لوگ مت بولو — ہم

دیئے جلاتے ہیں اور آج بھی جلائیں گے۔ جوا کھیلتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور کھاتے ہیں... لیکن آج ایک اور سرپرائز ہے بابا" بابو اِس سرپرائز کا اعلان کرنے سے پہلے اسے دیکھ چکا تھا — اور ادھر ہی دیکھ رہا تھا...

ٹرنیٹ کے بالکل کنارے پر جو سفید آہنی بنچ تھا اُس پر... آف وہائٹ بلاؤز اور کارڈیگن اور پلیٹ والے سیاہ سکرٹ اور ہائی ہیل شوز میں... نیم گھنگھریالے بالوں اور سیاہ آنکھوں والی — سرپرائز۔

"میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں مشیل —"

"اچھا —" اس نے ایک مرتبہ پھر کہا اور صرف اس لئے کہا کہ اب وہ ردعمل بخوبی جانتا تھا لیکن ظاہر نہیں کر سکتا۔

کیونکہ — وہاں ٹرنیٹ کے کنارے سفید آہنی بنچ پر — کوئلہ سیاہ آنکھوں والی کویتی لڑکی فاطمہ اپنے ہاتھوں کو بے چینی سے ملتی تھی... اور ادھر دیکھتی تھی۔

"تم فاطمہ کو جانتے ہو ناں؟"

فاطمہ کو اس شہر میں کون نہیں جانتا تھا — اور کیا کیا کچھ نہیں جانتا تھا۔

اوہ وہ — مشاہد — بابو کو جانتا تھا۔

بابو — یعنی بابو راؤ پٹیل چھوٹے قد کا اور غلافی آنکھوں والا ایک ہندو بچہ تھا جو اپنے آپ کو ہندوستانی کہنے پر خفا ہو جاتا تھا۔ وہ یوگنڈا کی پیداوار تھا اور ایسٹ افریقن کہلانا پسند کرتا تھا۔ اور اُسے افریقی لینڈ سکیپ آب و ہوا اور تہذیب سے پیدائشی کہ وہ وہیں پیدا ہوا تھا ایک فنا کر دینے والا عشق تھا... وہ یوگنڈا کے فضائل بیان کرتا نہ تھکتا تھا۔ اگرچہ نوٹنگھم کالج میں ہی اکاؤنٹینسی کا طالب علم تھا لیکن ان دونوں کی باقاعدہ ملاقات اگر ہوئی تو جوائے کی ایک سیٹرڈے نائٹ پارٹی میں ہوئی — وہ پارٹی ایک مکمل ڈیزاسٹر تھی... بہت سے لڑکے آئے اور اُن میں ایک شوکت ہینڈسم بھی تھا... اور جوائے کے علاوہ وہاں مختلف وجوہات کی بنا پر ایک بھی لڑکی موجود نہ تھی.. اور یہ گے زمانے نہیں تھے کہ لڑکوں کے ساتھ ہی شغل میلہ کر لیا جائے اس لیے تمام لوگ پہلے تو اپنے آپ کو مشروبات سے گرماتے رہے اور پھر کلف رچرڈز کے تازہ ترین "ڈیانا" پر جھومتے رہے کہ "آئی ایم ینگ اینڈ یُو آر سو اولڈ" — اور پھر ذرا قنوطیت طاری ہوئی تو "ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈُولی — ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ اینڈ کرائی —" صرف اس لیے کہ اگلی صبح ٹام ڈُولی کو پھانسی

کا سامنا تھا — لیکن پھر ہر سُو یاسیت چھا گئی۔ جوائے نے ہر مہمان کو ذاتی توجہ کے پھندے سے نوازا لیکن ایک لڑکی چاہے وہ کتنی ہی لبرل کیوں نہ ہو صرف ایک ہوتی ہے اور سات لڑکوں کو بیک وقت خوش رکھنا جسمانی طور پر اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے اس لیے — ہر سُو یاسیت چھا گئی... مشاہد جمائیوں میں خود کفیل ہونے کے بعد گھر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک سحرانگیز دُھن سنی جو کمرے سے باہر بالکونی کی طرف سے سرد ہوا کی رفاقت میں اندر آ رہی تھی۔ وہ اپنا گلاس اُٹھا کر باہر چلا گیا — بابو راؤ پٹیل ٹھنڈے یخ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اس کی گود میں ایک پرانا بینجو تھا جس کے تاروں کو وہ مضراب سے چھیڑتا چلا جاتا تھا اور اُن میں سے مشاہد کے بچپن کی یادیں دل کو مٹھی میں لے لینے والے سریلے پن سے نکلتی تھیں... ون ٹو — ون ٹو تھری... گھر آیا میرا پردیسی یاد ہے میرے بچپن کی — اور بینجو کی تاروں پر جھکا ہوا لاپرواہ بابو راؤ پٹیل نہیں جانتا تھا کہ مشاہد کتنی دیر سے مبہوت کھڑا سردی سے کپکپاتا اُسے سن رہا ہے... ایک مقام پر وہ بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں خاموشی سے راکھ گراتے سگرٹ کا ایک کش لینے کے لیے رُکا تو مشاہد نے اس کے کندھے کو چھُوا — "واہ —"

بابو نے اپنی غلافی آنکھیں اُٹھائیں، اسے دیکھا اور پھر بینجو کے تاروں پر جھُک گیا...

آوارہ ہوں.. ٹوں رٹیں... رئیں — یا گردش میں ہوں — اِس گانے نے مارکوپولو سے زیادہ سفر کیا تھا۔ ماسکو کے ریڈ سکوئر میں جشن کی راتوں میں اکارڈین پر یہی گیت پسندیدہ تھا اور استنبول کے تقسیم میں بھی تُرک لبوں سے اور شیریں لبوں سے بھی اسی نغمے کے بول نکلتے تھے... نصیب اِسی کو کہتے ہیں کہ ایک درمیانے درجے کے گلوکار کا گیت گلوب کے کس کس کارنر میں پہنچتا ہے اور گلوب کے کارنر کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ عظیم گلوکاروں کو اُن کے ملک سے باہر کوئی بھی نہیں جانتا... اور اس نوٹنگھم 60ء میں جوائے کی بالکونی پر غلافی آنکھوں والا ہندو بچہ اپنے بینجو پر اِسی نغمے کو الاپ رہا تھا.. گھر بار نہیں سنسار نہیں... مجھ کو کسی سے پیار نہیں...

"کیا تم.... یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی — بجا سکتے ہو؟"

بابو نے سر اُٹھا کر اسے ایک نظر دیکھا اور پھر بینجو کی چند تاریں چھیڑنے کے بعد بولا "نہیں —"

"یا پھر... یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں...."

رات تو تھی- اور بابو کے بینجو میں سے اداس سُروں کی چاندنی بھی نکلنے لگی
اُسی لمحے جوائے باہر آ گئی — "بوائز تم اس سٹنگ پارٹی میں بور تو نہیں ہو رہے ہو رہے ہو تو — میرے پاس اور صرف میں ہی ہوں، ایک نسخہ ہے۔"

"نو تھینکس —" مشاہد جانتا تھا کہ اس کے پاس ہر درد کی دوا کیا ہے۔

"جیسے تمہاری مرضی — شائد تم ایک دوسرے کو نہیں جانتے — مشاہد اِسے مشیل بھی کہتے ہیں پاکستان سے — اور بابو — فرام انڈیا"

"نہیں" بابو نے اِس حسین آگ میں تو بھی جل کے دیکھ لے — کمل کیا سرہلایا "فرام ایسٹ افریقہ —"

"اوکے — فرام افریقہ —"

"ایسٹ افریقہ — یوگنڈا"

"رائٹ —" جوائے ہنس کر چلی گئی۔

یہ غلافی آنکھوں والا ہندو بچہ مشاہد کو پسند آ گیا —

آپا جی جب بھی اس کے لیے خالص دیسی گھی میں گندھی ہوئی پنجیری بنا کر بھیجتیں اور اُن کا خیال تھا کہ ولایت میں لوگ صرف اُبلی ہوئی سبزیاں کھاتے ہیں اس لیے بدرنگ اور پھٹکارے جاتے ہیں... اور پنجیری کھانے سے جس میں کہ بادام، پستہ اور کو گوند وافر مقدار میں ہوتے ہیں، بندے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ تو یہ رنگ نکھار پنجیری دو ڈبوں میں آتی — ایک مشاہد کے لیے اور دوسرا اس کے دوست بابو صاحب لیے۔

اُدھر ایسٹ افریقہ سے جب کبھی مصالحے والی دالیں اور لڈو آتے تو بابو والدین خط میں یہ وضاحت ضروری سمجھتے کہ یہ والی پوٹلی مشاہد بیٹے کے لیے ہے اور ا ہم نے خاص طور پر ایک مسلمان عورت سے بنوا کر بھیجا ہے، اپنے ہاتھ نہیں لگائے بڑے پٹیل صاحب اور مشاہد کے درمیان ایک خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا بیٹے تم تو ہمارے دھرم کو جانتے ہو، بابو کو گوشت نہ کھانے دینا، خاص طور پر بڑا گوشت اس کا خیال رکھنا — اور مشاہد اُس کا کیا خیال رکھتا وہ ہمیشہ مٹن کی بجائے بیف سٹیک آرڈر دیتا اور ہفتے کی شب خود بڑے اہتمام سے ایسٹ افریقن مصالحے ڈال کر بڑا گوشت بھونتا اور بھونتے ہوئے اسے سونگھتا اور "جے رام جی" کہتے ہوئے گھر میں

پکا کر کھاتا جاتا — بڑے پٹیل صاحب اس کی شادی کے بارے میں بھی فکر مند تھے... مشاہد کو اس کا بھی خیال رکھنے کا کہا گیا تھا۔

اور فاطمہ — وہ ایک بالکل مختلف چیز تھی۔

مشاہد اس کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ جان بوجھ کر اُس کے قریب نہیں آتی تھی، لیکن وہ ہر کسی کے قریب آ جاتی تھی۔ اس کے قریب اس لیے نہیں آتی تھی کہ وہ پاکستان سے تھا — اور مسلمان تھا۔

وہ اسے مختلف پارٹیوں پر دیکھتا اور — اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اُس کی رشتے دار ہو... وہ اس پر نظر رکھتا۔ فاطمہ کس کے ساتھ رقص کر رہی ہے — اور وہ اگر کس لڑکے کے ہمراہ کمرے سے باہر گئی ہے تو اسے باہر گئے کتنی دیر ہو چکی ہے اور وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئی... اس کے ہاتھ میں جو اورنج جوس کا گلاس ہے کیا اس میں صرف اورنج جوس ہے — اگر وہ ہنس رہی ہے تو کیا زیادہ تو نہیں ہنس رہی — اس کی ہنسی کی زیادتی میں کیا راز ہے — وہ اپنے آپ کو بے طرح ملامت کرتا کہ اس کی نظریں کیوں اُس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں... جب کہ وہ اس میں دلچسپی بھی نہیں رکھتا تھا... وہ کیوں خواہ مخواہ خدائی فوجدار بن رہا تھا... شائد فاطمہ بھی اس کی اس فوجداری سے آگاہ تھی... وہ ہمیشہ اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی۔

اس نے ایک کویتی لڑکے سے — راضی احمد سے سرسری طور پر ایک لاپرواہ انداز سے پوچھا "تمہیں بُرا نہیں لگتا جب فاطمہ غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ رقص کرتی ہے یا باہر جاتی ہے۔"

"وہائی —" حیرت سے اس کا منہ کھل گیا "شی از ناٹ مائی سسٹر —"

اینڈ شی از ناٹ مائی سسٹر ایدر — مشاہد نے اپنے آپ کو سمجھایا — لیکن اِس کے باوجود۔

"میں فاطمہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں مشیل —" بابو نے ایک مرتبہ پھر کہا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

نیم گھنگھریالے سیاہ بال اور کوئلہ سیاہ آنکھیں اُنہیں اپنی جانب آتے دیکھ رہی تھیں۔ اور جو مسکراہٹ فاطمہ کے چہرے پر بابو کو دیکھ کر پھیلی تھی وہ اس کے ساتھی پر نظر پڑتے ہی سمٹنے لگی... کہیں اس کے اندر ایک پیمانہ تھا جو بتاتا تھا کہ مشاہد — یہ پاکستانی

تمہاری خوشی کے راستے میں دیوار بنے گا اور نامعلوم وجوہات کی بنا پر دیوار بنے گا نہیں یہ وجوہات بہت زیادہ نامعلوم بھی نہیں تھیں۔ اسے پارٹیوں میں دیکھ کر اُس کے گلاس پر نظر رکھتے مشاہد کی آنکھوں میں جو ناراضگی اور سُرخی آتی تھی وہ اس نے اپنے دادا کے خیمے میں ایک مرتبہ دیکھی تھی... جب اُن کی ہمشیرہ نے قبیلے سے باہر ایک لڑکے سے شادی کی خواہش کی تھی — لیکن میرے دادا کا — اور اِس کمبخت پاکستانی کا کیا ہے —

آنکھ جھپکتا ہوں تو کچھ دکھائی دیتا ہے اور پھر جھپکتا ہوں تو کچھ اور دکھائی دیتا ہے

شفق کی سُرخی میں رنگی ہوئی سُرخ بادبانوں والی کشتیاں —

اور یہ ہم ہیں بابو —

لیکن اس کے باوجود بابو ایک غلافی آنکھوں والا — ہندو تھا۔

ہیپی دیوالی —

"حرام کھاؤ گے۔ تمہیں گوروں کا حرام کھانا منظور ہے... اوئے تمہاری بھرجائی نے تمہاری کیا کیا خدمتیں نہیں کیں... مسور چاول اس نے کھلائے، بینگن گوشت بھون بھون کر اس نے کھلائے... اور کوفتے، کرکٹ کی گیند جتنے بڑے بڑے کوفتے اس نے تمہارے لیے پکائے اور اب ہماری خدمتیں بھول کر مجھے جواب دے کر گوروں کا حرام کھانے رہے ہو —"

شوکت ہینڈسم کے نتھنوں میں سے بھاپ نکل رہی تھی اور وہ بار بار اپنے گنج کر مایہ کو رومال سے پونچھتا تھا۔ وہ مسور چاول، بینگن گوشت اور کرکٹ کی گیند جتنے کوفتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑی آسانی سے فراموش کر گیا تھا کہ وہ اِن حلال خوراکوں کی باقاعدہ قیمت وصول کرتا تھا اور کچھ زیادہ ہی وصول کرتا تھا۔

"اور جب تمہارے اس بابو نے... ہندو نے... ہمارے کچن میں سُور کا گوشت اور ہمارے سارے بھانڈے پلیت کر دیئے تو میں نے کچھ کہا —"

کچھ ایسا ہوا تھا کہ بابو ایک روز کچن میں اپنا ناشتہ تیار کر رہا تھا اور جب وہ سیٹی بجا رہا تھا کہ بھرجائی صاحبہ نے اندر جھانکا "ہائے یہ کیسی بو آ رہی ہے — ہائے کس چیز کا گوشت ہمارے فرائنگ پین میں فرائی کر رہے ہو —"

بابو نے سیٹی صرف ایک سیکنڈ کے لیے ملتوی کر کے "سور کا گوشت" کہا اور پھر "شام ڈھلے کھڑکی تلے تم سیٹی بجانا چھوڑ دو" کی دُھن پر سیٹی بجانے لگا۔ بھرجائی نے ایک لمبی اُبکائی لی اور مُنہ کو دبائے غسل خانے کی طرف بھاگی اور ساتھ ہی شوکت ہینڈسم وارد ہو گیا "یہ... یہ..."

"یہ بیکن ہے۔ میں ہمیشہ انڈوں کے ساتھ فرائی کر کے کھاتا ہوں.. سُور کا گوشت"

"اچھا؟" شوکت ہینڈسم نے اپنے گنج پر ہاتھ پھیرا اور ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا "کیسا ہوتا ہے؟"

"چکھ لو —"

"نہیں یار — حرام ہوتا ہے۔"

"شراب بھی تو حرام ہوتی ہے —"

"اُس کی اور بات ہوتی ہے —"

اس دوران بھرجائی غسل خانے میں قے کرنے کے بعد پھر وارد ہو گئی "تواڈھا بیڑہ غرق... میرے سارے بھانڈے پلیت کر دیئے —"

شوکت ہینڈسم نے صرف اپنی بیگم کی اخلاقی مدد کے لیے تھوڑا سا واویلا کیا اور پھر کہنے لگا "کچھ نہیں ہوتا بانو۔ کلمہ پڑھ کر پھُونک دو تو سارے برتن پاک ہو جائیں گے۔ ایک ایک برتن دھو کر پھر کلمہ پڑھنے کی ضرورت نہیں — یہ بھی مسئلہ ہے —"

ویسے فرائنگ پین میں بیف کے قتلے تھے...

مشاہد کو امید نہ تھی کہ اُن کے شفٹ کر جانے کے فیصلے پر شوکت ہینڈسم اتنا رنجیدہ ہو گا...

"ہم آتے جاتے رہیں گے شوکت بھائی — وہ کمرہ ذرا وسیع بھی ہے.. صاف بھی بہت ہے اور مرکز میں بھی ہے اور... سستا بھی ہے۔"

"دو چار پاؤنڈ بچانے کے لیے گوروں کا حرام کھاؤ گے۔ اُسی فرائنگ پین میں سُور تلے گی، حرام گوشت پکائے گی اور اُسی میں تمہارے لیے انڈے فرائی کرے گی تمہاری لیڈی لیڈی۔"

"لیڈی لیڈی نہیں — لینڈ لیڈی"

"وہی — دو چار پاؤنڈ کے لیے مسلمانی کو داؤ پر لگا رہے ہو —"

بحث اور غصے کے درمیان کہیں بھی شوکت ہینڈسم نے اپنے کمرے کے کرائے

میں تخفیف کرنے کی پیشکش کر کے اس کی مسلمانی کو داؤ سے اُٹھانے کی کوشش نہ کی

اور اب وہ گولڈی کے پاس تھے۔

یہ اُن کی پہلی شب تھی...

گولڈی نے انہیں خوش آمدیدی ڈنر کے طور پر پوم فرے یعنی بہترین کی مچھلی سفید ساس اور آرٹی چوکس کے ساتھ سرو کی تھی اور مچھلی کے ہمراہ صرف وائن سِپ کی جا سکتی ہے اس لیے ایک بوتل وِینو بلانکا —

اور اب بابو فرنچ ونڈوز کے بھاری پردوں کے قریب دبیز ایرانی قالین پر آلتی مارے بیٹھا تھا اور گود میں رکھے بینجو پر "نیور آن اے سنڈے" کی دُھن بجا رہا تھا اور اس کے لبوں میں اٹکا سگرٹ وقفوں کے ساتھ قالین پر راکھ گراتا چلا جا رہا تھا۔ چونکہ مرکزی طور پر گرم تھا اس لیے مشاہد مچھلی اور وینو بلانکا کی اندرونی آسائش میں بستر پر "نیور آن اے سنڈے" کی ہیروئن مالینا مرکیوری کے خدوخال اور اُس کی ہسکی آواز زبردست جنسیت پر غور کر رہا تھا... گولڈی ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد ہولے سے تہذیب یافتہ دستک دیتی پھر چھت تک جاتے ہوئے سنہری ہینڈل والے دروازے کو لاڈ سے کھولتی اور ایک سنہری مسکراہٹ فلیش کرتے ہوئے پوچھتی "آر یُو انجائنگ یورسیلف ڈارلنگز —" اور ہر مرتبہ اس کی مسکراہٹ میں فلیش کی روشنی کچھ زیادہ اور "ڈارلنگز —" کہتے ہوئے وہ دونوں کے قریب آ کر پیار سے اُن کے گال چھوتی۔

"بابا — دِس اِز لائف —" بابو نے ایک اور سگرٹ سلگا کر بینجو گود میں سے کر قالین پر رکھ دیا "ہم خواہ مخواہ دوستی یاری میں شوکت گنجے کے ہاں سڑتے رہے —"

"ہوں —"

"ہوں کیا یار —" بابو اُٹھ کر اس کے قریب چلا آیا "کیا رائل رُوم ہے!! چھت کے ساتھ ساتھ گولڈن پھول بُوٹا بھی بنا ہوا ہے... وِنڈسر پیلس کی طرح"

"باقی سب کچھ تو بہت اعلیٰ درجے کا ہے بابو بوائے — لیکن یہ جو گولڈی ہے یہ جس طرح ہمارے گالوں کو ہاتھ لگاتی ہے تو مجھے خدشہ ہے کہ یہ — صرف گالوں کو ہی ہاتھ نہیں لگائے گی — بس یہی گڑبڑ ہے — باقی تو ہر شے پُر ہے"

"نہیں بابا —" بابو نے خوش مزاجی سے اپنے خدشوں کی سرکوبی کی "وہ بس تھوڑی سی گے ہو جاتی ہے — لیکن ایسی نہیں ہے۔"

"تمہاری سہیلی ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے — لیکن مجھے بوڑھی عورتوں سے کوئی رغبت نہیں —"

"سنو یار —" بابو نے شاپنگ بیگ میں سے پینتالیس آر۔ پی۔ ایم کا ایک ریکارڈ نکالا اور اُسے دونوں ہتھیلیوں کے درمیان ایک آئینے کی طرح احتیاط سے تھاما "ایورلی برورز کا تازہ ترین..." کمرے کی بلند وسعت میں بابو کے ریکارڈ پلیئر کی تقریباً فل والیوم میں ایورلی برورز کی گٹاریں ہر شے پر ایک گہری دھمک سے دستک دینے لگیں — کیپ آن ناکنگ بٹ یُو کینٹ کم اِن... اور... کم بیک ٹومارو نائٹ اینڈ ٹرائی اگین — مشاہد اُٹھا اور وکٹر سلوسٹر سکول سے سیکھے ہوئے راک اینڈ رول کے سٹیپس پریکٹس کرنے لگا...

"یاہ یاہ —" اس نے ملنگ بابوں کی طرح جھومتے ہوئے نعرہ بلند کیا۔

"شیک اِٹ بے بی —" بابو بھی سر ہلاتا داد دینے لگا اور پھر لہراتا ہوا اُٹھا اور بینجو گود میں رکھ کر کیپ آن ناکنگ کے ساتھ ٹیون ملانے لگا۔

مشاہد اپنے سامنے کسی خالی پارٹنر کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا تھا اور چٹکیاں بجاتا اس کے ساتھ قدم ملاتا تھا۔

"یاہ یاہ —" بابو نے بھی زور سے نعرہ لگایا اور بینجو بجانے لگا۔

گٹاریں فل والیوم پر.. اور یاہ یاہ کے نعرے اور بینجو میوزک... کیا سماں تھا.. اِسی لمحے دروازے پر جو دستک ہوئی وہ خاصی بلند تھی لیکن شور میں گم ہو گئی... جب دروازہ باقاعدہ پیٹا جانے لگا تو ان تک ایک شائبہ سا آیا کہ شاید کوئی دستک دے رہا ہے۔ اس پر ان دونوں نے بیک آواز ہو کر گانے کے بول دوہرائے... کیپ آن ناکنگ بٹ یُو کینٹ کم اِن... دستک دیتے جاؤ لیکن تم اندر نہیں آ سکتے۔ لیکن دستک دینے والا اندر آ گیا... ان کا خیال تھا کہ گولڈی ہو گی لیکن یہ کچھ اور تھا... اک پستہ قد قدرے جھکا ہوا شخص جس کے کندھوں سے ایک کچومری برساتی لٹکتی تھی اور سر پر کم از کم دو سائز بڑا ہیٹ جو اس کے بھنوؤں تک آتا تھا۔ اُس کی عینک کا فریم سنہری تھا اور جب اس نے منہ کھولا تو ایک دانت بھی سنہری تھا... پرانی کچومر برساتی، فیلٹ ہیٹ اور عینک میں سے اُس کا چہرہ تلاش کرنا دشوار ہو رہا تھا — پھر اس کی انتہائی مہین سی آواز آئی جیسے ایک شیرخوار بچے کی ہوتی ہے لیکن آواز میں جو شدید غصہ تھا وہ ایک بڑے کا تھا — "وہاٹ دے ہیل اِز گوئنگ

آن"

وہ دونوں جہاں تھے وہیں رُک گئے۔

"اور تم لوگ میری دستک کے جواب میں کہتے تھے کہ دستک دیتے جاؤ اندر نہیں آ سکتے... میں اندر نہیں آ سکتا —"

مشاہد نے مڑ کر ریکارڈ پلیئر کی طرف دیکھا۔ بابو نے آگے بڑھ کر اُسے دیا۔ "جی آپ کون ہیں؟"

"میں... میں اس فلیٹ کا مالک ہوں جسے تم کہہ رہے ہو کہ دستک د اور....." وہ آگے آیا اور مزید جھک کر ایک ایک شے کو غور سے دیکھنے لگا — "آ وہ قالین پر جھک گیا "سگرٹ کی راکھ میرے کاشان قالین پر..." وارڈ روب کی نے عینک اُتار کر تقریباً اپنی موٹی ناک سے چھوتے ہوئے دیکھا "آہ — اس پر خراشیں ہیں —" پھر وہ بستر کی جانب آیا اُسے کچھ دیر کے لیے غور سے دیکھا " ہاتھی لوٹتے رہے ہیں —"

اِس انسپکشن کے دوران بابو اور مشاہد مجرموں کی طرح ایک کونے میں اسے دیکھتے رہے۔

"میری خواہش نہیں تھی کہ میں یہ کمرہ... بلیکیز... آ... غیر ملکیوں کو کرائے کیونکہ تم لوگ... بس لاپرواہ ہوتے ہو۔ لیکن گولڈی جب نشے میں ہوتی ہے تو احمقانہ حرکتیں کر گذرتی ہے.. اور یہ اُن میں سے ایک ہے.. اگر تم یہاں رہنا چاہتے ہو آئندہ تم نے میری دستک پر یہ نہیں کہنا کہ، کیپ آن ناکنگ بٹ یُو کینٹ کم اِن... بھی گا گا کر... اور اگر تم واقعی یہاں رہنا چاہتے ہو تو — نو میوزک — کوئی شور گا۔ فرش لکڑی کا ہے اس لیے صرف جرابوں کے ساتھ اس پر چلو گے شوز کے نہیں۔ میرا تمام فرنیچر، میزیں، بیڈ، کھڑکیاں، وارڈ روب وغیرہ تازہ پالش شدہ ہیں اِن بھی سکریچ نظر آیا تو — آؤٹ یُو گو — اپنے ناخن ابھی سے کاٹ لو... سویٹ ڈریم وہ جانے لگا اور اطمینان کے دو سانس ابھی حلق سے ذرا اوپر آئے تھے کہ وہ پھر اور بابو کے سینے پر اُنگلی رکھ کر کہنے لگا "اینڈ — نو گرلز۔"

وہ چلا گیا تو اس کی دہشت نے اُنہیں کچھ دیر خاموش رکھا پھر بابو نے کچکچاتے ہوئے غصے سے اپنا سگرٹ قالین پر پھینکا اور اُسے بوٹ سے مسل دیا "

ہن کو..."

"ایزی بابو بوائے —" مشاہد نے اس کے کندھے کو تھپکا "مجھے معلوم تھا کہ یہ اچھا ہے کہ سچ نہیں ہو سکتا —" اُس نے اِٹس ٹُو گڈ ٹُو بی ٹرُو... کا ترجمہ کیا تھا۔

ابھی جہاں زندگی کی حرکت تھی وہاں موت کی مردنی چھا گئی اور کمرے کی چھت پر کسی مقبرے کے تاریک گنبد کا گمان ہونے لگا۔

فرائیڈ مچھلی۔ سفید ساس، آرٹی چوکس، ونیو بلانکا اور نیور آن سنڈے کا مزہ کرکرا ہو گیا۔

وہ دونوں شکست خوردہ سپاہیوں کی طرح بالکل ہی بجھ گئے تھے۔

"مشیل —"

بہت دیر کے بعد بابو کی آواز اندھیرے میں سفر کرتی مشاہد کے پاس آئی۔ اتنی دیر کے بعد کہ وہ اب اس خیال میں تھا کہ بیڈ لیمپ آف کرنے کے بعد اسے گہری نیند میں لیے ہوئے ایک مدت بیت گئی ہو گی۔ اگرچہ وہ خود نیند کی تاریک فراموشی کی دہلیز پر تھا لن وہاں سے پلٹتے ہوئے وہ خبر رکھتا تھا کہ بابو جو بہت دیر سے کروٹ بھی نہیں لیتا تھا، سویا ہں تھا بلکہ اِس "مشیل" کے بعد جو اس نے کہنا تھا وہ ذہن میں دوہرا رہا تھا۔

"تم نے بالکل کچھ نہیں کہا —"

"کس کے بارے میں؟" اگرچہ وہ جانتا تھا کہ کس کے بارے میں۔

"فاطمہ —" بابو نے جیسے ایک نام نہ لیا سسکی بھری اور مشاہد کو اس سسکی سے ازہ ہوا کہ وہ بہت دور جا چکا ہے اور اُسے — مشاہد علی کو اُسے واپس لانا ہے۔

"تم کیا چاہتے ہو بابو —" اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ کا بٹن دبا دیا — اتنے ے کمرے میں صرف ایک بلب کی روشنی نے چیزوں کو پہچان دی اُنہیں واضح نہیں کیا... آلتی پالتی مارے بستر پر بیٹھا تھا جیسے بینجو بجانے لگا ہو اور اس کی جانب آنکھیں جھپکے بغیر جا رہا تھا۔

"بابا مجھے کچھ تو بتاؤ — ادھر مجھے بتانے والا کوئی نہیں — میں اس کے ساتھ ی کرنا چاہتا ہوں —"

"اور وہ —"

"اُسے تو میں نے ابھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن وِوئی آر اِن لَو مشیل —"

"فاطمہ سے پیشتر تم کتنی لڑکیوں کی مُحبت میں مبتلا ہو چکے ہو بابو بوائے؟"

"نہیں یار —" وہ اُٹھ کر اس کے پلنگ کی پائنتی پر آ بیٹھا "یہ بہت بُرا بابا.... ہلا گلا نہیں ہے۔ ادھر صرف تم ہو جس کے ساتھ میں پرائیویٹ معاملہ پر بات کر رہا ہوں —"

"لیکن وہ تو مسلمان ہے —"

"ہاں ہے —"

"تو؟"

"تو کیا؟ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے.. مجھے یقین ہے وہ میرے لیے ہندو ہو گی۔"

"نہیں ہو گی —" اِس، نہیں ہو گی، میں ایک خاص درشتگی تھی جو بابو تک پہنچی۔

"تو بابا میں مسلم ہو جاؤں گا کیا فرق پڑتا ہے —"

"تمہارے ماں باپ اُسے پسند نہیں کریں گے — اور تمہارے باپو جب بھی خط لکھتے ہیں تو یہی لکھتے ہیں کہ... ماس نہ کھانے کے علاوہ — بابو ادھر میم کے ساتھ نہ بنا لے —"

"فاطمہ میم تو نہیں ہے بابا —"

مشاہد نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ خود کبھی بھی فاطمہ کی شکل سے یا بدن سے نہیں ہوا تھا... اور اندر اس کے اندر جو کیڑے اس کے ماس میں کرابل کرابل رینگتے اُسے کھاتے تھے وہ حسد کے تھے۔ جیسے وہ بخار کی تپش میں ہو، اُس سے ٹھیک طرح سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ وہ بابو سے یا بابو اُس سے کبھی کوئی رومانس، کوئی حادثہ — یا دوسرا چھپاتا نہیں تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے تمام رابطوں، بینک اکاؤنٹس اور... کا علم تھا — تو پھر آناً فاناً — ایک میجک ٹرک کی طرح یہ فاطمہ ایک سمرسنڈے ملا دریائے ٹرینٹ کے کنارے سفید بنچ پر کہاں سے آ کر بیٹھ گئی....

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا —"

"فاطمہ نہیں چاہتی تھی —"

تو اسے بھی علم تھا کہ یہ شخص... اس ارینج منٹ سے ناخوش ہو سکتا ہے؟

"وہ تو تم سے ملنا بھی نہیں چاہتی تھی —"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے وہ شائی ہے —" بابو کے لہجے میں اتنا پیار تھا کہ ایک لمحے کے لیے مشاہد بھی پگھل گیا "وہ ایک مشرقی لڑکی ہے بابا"

"یہ تمہارا فیصلہ ہے — میں کیا کہہ سکتا ہوں" اس نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کے لیے ایک اور گہرا سانس لیا "اگر تم اس سے مُحبت کرتے ہو تو بس کرتے ہو، اس میں میرا مشورہ کس کام کا —"

بابو کے چہرے پر جیسے کسی نے بلیڈ سے ایک زخم لگایا ہو — اس کی جِلد سُکڑی اور آنکھیں اذیت برداشت کرنے کی کوشش میں بھنچ گئیں "مجھے تمہارا مشورہ چاہئے مشیل — میں ابھی تم سے دو سال چھوٹا ہوں اور میرا دماغ بہت زیادہ کام نہیں کر رہا... تم بتاؤ... پلیز میری ہیلپ کرو... تم دوست ہو، تم بتاؤ —"

"وہ اتنی شائی نہیں جتنا تمہارا خیال ہے —"

بابو نے پپوٹے اُٹھا کر اسے یکدم گھورا۔ ایک نفرت کے قریب کی پرچھائیں اس کے چہرے پر آئی اور گذر گئی... اس کی غلافی آنکھوں میں کبوتر ذبح ہو رہے تھے، ان سے خون ٹپکنے کو تھا۔ اس نے اپنے سر کو متعدد بار جھٹکا اور پھر اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ایک سگرٹ سلگایا اور چھت کو گھورنے لگا "وہاٹ ڈُو یُو مین؟"

مشاہد سر جھکائے چپ بیٹھا رہا...

بلند چھتوں والے کمروں میں شائد خاموشی زیادہ دیر ٹھہرتی ہے۔

بابو نے ایک طویل کش لیا، سگرٹ کو قالین پر پھینک کر اسے بہت دیر تک مسلتا رہا اور پھر ایک اور سگرٹ سلگا لیا "تم کہنا کیا چاہتے ہو مشیل؟"

"میں اُسے ایک عرصے سے واچ کر رہا ہوں۔ اُس کا تجربہ جوائے سے کم نہیں"

بابو کی اُنگلیاں اتنی بے اختیاری سے لرزیں کہ اُسے کوشش کر کے سگرٹ سنبھالنا پڑا "آر یُو شیور؟"

"ہاں —" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا "آئی ایم شیور — میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن... شائد یہ... میرا ذاتی تجربہ بھی ہو" — اور جونہی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے اُسی لمحے مشاہد اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ اسے اپنا آپ بے حد ننگا اور ذلیل

لگا۔ اس میں حقیقت نہ تھی اور اور وہ اپنی حماقت میں بہت آگے نکل گیا تھا۔ اگر فقرہ نہ بھی کہتا تو شائد بابو وہی فیصلہ کرتا۔

ٹیبل لیمپ آف ہو گیا۔

کمرے کی بلند چھت کسی مقبرے کے گنبد کی طرح تاریک اور اتھاہ نظر لگی۔

کاغذ کا پرندہ تہہ خانے کے روشن دان کے سامنے جھول رہا ہے۔

وہ جھولتا اس لیے ہے کہ ہیٹر کی حدت اس رہائشی تہہ خانے کی ہوا کو گرم کرتی ہے تو وہ اوپر اٹھتی ہے اور وہاں جہاں روشن دان ہے وہاں تک اُٹھتی ہے اور وہاں کترن بے ساختہ سفید چونچ دار پرندے کے سکوت کو ہلکورے دیتی ہے...

یہ کاغذی پرندہ ایک عرصے سے مشاہد کے ذہن میں جھول رہا ہے۔

ہوزری کی مشینیں چلتی ہیں تو اُن کی سوئیوں میں سے ایک خاص مشینی غنائیت سنائی دیتی ہے۔ اُن کا شور ذہن پر بوجھ نہیں بنتا بلکہ کہیں ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں وہ دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے... اور بدن کے اندر اداسی اور بے مقصدیت کے تانے بانے سے نٹنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس کا End Result ہمیشہ نامعلوم رہتا ہے...

نٹنگ ہال میں کبھی کسی طالب علم کی کھانسی اس غنائیت کو بے سُرا کر دیتی۔

اُون کے ریشے اور ذرّے فضا کو بھر دیتے ہیں اور جہاں جہاں سے دھوپ کی کوئی لکیر بلند کھڑکیوں کے شیشوں میں سے یا کوئی روشن غیر مرئی شہتیر اندر آتا تھا وہاں اُس ہوا کا ایک ایک ریشہ الگ الگ زندہ ہوتا تھا اور ایک ایک ذرّہ اپنی پہچان کرواتا غیر محسوس آہستگی سے اوپر اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ ہوزری کی مشینیں جرابوں، بنیانوں، سویٹروں اور زیر جامہ ملبوسات کو جنم دے رہی تھیں اور اُن پر وہ ڈیزائن اُبھر رہے تھے جو مشاہد نے ایک ماہ کی عرق ریزی سے تخلیق کیے تھے، گراف پیپر پر ڈیزائن بنا کر پھر مشینوں کی سوئیوں کو نقشے کے مطابق ترتیب دیا تھا... نتائج خاصے اطمینان بخش تھے۔ اس کے رنگوں کا چناؤ بھی تخلیقی تناسب میں تھا... اکثر اوقات ڈیزائن کی میز پر جو ڈیزائن پُرکشش لگتے ہیں اور بہار دیتے ہیں وہ فنشڈ پروڈکٹ میں ڈل ہو جاتے ہیں اور خزاں کا تاثر دینے لگتے ہیں...

یہ پروجیکٹ اس کے فائنل رزلٹ پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

اُون کے ذرّوں کی وجہ سے اس کا گلا بھی خشک ہونے لگا۔ وہ کھانستا ہوا امبرتو کے پاس آ گیا۔ اُس کے گھنگھریالے بالوں پر بھی اُون کے ذرّوں کی ایک باریک تہ...

"پیپر منٹ؟"

"تھینکس —" اس نے شکر گزار ہو کر پیپر منٹ کی گولی منہ میں رکھ لی۔

"ہا — مشیل تم نے میرے ڈیزائن کردہ انڈرویئر دیکھے ہیں — لَولی —" اطالوی یہودی کی ناک پر بھی کیونکہ وہ ایک بڑی یہودی ناک تھی اُون کے ریشے اٹکے تھے۔

"ہاں — نہایت پُر فریب قسم کے ڈیزائن ہیں — لَولی —"

"شکریہ... یہ ایک کامپلیمنٹ ہے — انڈرویئر خاص طور پر خواتین کے پُر فریب ہونے چاہئیں —"

اور وہاں ایک پُر فریب خرگوش بنا ہوا تھا جس کے لمبے کانوں کے درمیان مم... درمیان تھا۔

کرسٹین بھی اُس کاغذی پرندے کو تکتی رہتی تھی۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد میں تل ابیب میں ایک ہوزری یونٹ لگاؤں گا... صرف لیڈیز انڈرویئر — سپیشلی فار ایرب وومن... بگ بگ انڈرویئر —"

"یہودی عورتوں کے لیے کیوں نہیں۔ وہ بھی تو بگ بگ انڈرویئر"

"یاہ —" امبرتو نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اُون کے ریشوں کو جھٹکا "میں جب بھی تم سے بات کرتا ہوں تو بھول جاتا ہوں کہ تم آدھے عرب ہو، پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ عرب تم پاکستانیوں کو شٹ سمجھتے ہیں۔ یُو نو ڈرٹی شٹ —"

"آئی ڈونٹ مائنڈ —" مشاہد نے مسکرا کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا "لیکن آج سے تین سال پہلے جس طرح فرانس، برطانیہ اور اسرائیل نے اپنی سو کالڈ فتح کے باوجود مصر کے ہاتھوں جو رسوائی سہی تھی وہ بہت شرمناک تھی — اب سویز کنال کس کے پاس ہے؟ امبرتو؟"

"اگلی صدی اسرائیل کی ہے مشیل — اور ایک دن آئے گا کہ عرب اور تمہارا پاکستان بھی اسرائیل کے پاس آئیں گے... جھکے ہوئے... مارک مائی ورڈ —"

"تیور —" مشیل نے کہا اور اُسی لمحے اس کی توجہ تیسری مشین کی جانب گئی جہاں تمام سوئیاں بند ہو چکی تھیں اور سویٹر کے درمیان میں ایک خالی دھاری سی چل رہی تھی اور ڈیزائن کا ستیاناس کر رہی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر مشین بند کی اور تینوں سوئیوں کے منہ کھول کر انہیں سیٹ کیا اور اُسے پھر سے آن کر دیا۔ اُس کی کھٹ کھٹ آواز ایک ہموار تال پر سنائی دینے لگی۔

اُون کے ریشے، ذرّے، جیسے سردیوں کی صبح میں لاہور کی سرکلر روڈ پر خاکروب جھاڑو دیتے ہوئے صرف یہ اہتمام کرتے ہیں کہ گندگی، مٹی اور گھوڑوں کی خشک لید کو جھاڑو سے ٹھیک کر کے فضا میں اُڑا دیا جائے اور پہلی زرد دھوپ میں مٹی اور خشک لید کے ذرّے الگ الگ معلق نظر آنے لگتے ہیں اور آپ اگر اس غبار میں سے گذرتے ہیں تو سانس روک کر تیزی سے گذر جاتے ہیں — یہاں نوٹنگھم ٹیکنیکل کالج کے ہوزری سیکشن میں بھی یہی گمان ہوتا تھا کہ لاہوری خاکروبوں کا گذر ہو چکا ہے۔ روزانہ پینتالیس منٹ کا ایک پیریڈ اِس غبار میں... پچھلے تین برس سے... اگر روزانہ دس گھنٹے کا ایک ایسا پیریڈ ہو جو آئندہ ملازمت کے دوران کسی بھی ہوزری فیکٹری میں ہو گا اور یہ پیریڈ تین برس نہیں زندگی کے اختتام تک چلے — تو وہ زندگی کیسی ہو گی — روزانہ دس گھنٹے کے غبار میں... کاغذ کے پرندے کا بھی دم گُھٹ جائے...

اور کاغذ کا پرندہ تہ خانے کے روشندان کے سامنے جھول رہا ہے۔

گولڈی کے ہاں اُس رات کے بعد بابو نے فاطمہ کا کبھی کوئی تذکرہ نہ کیا...

وہ پہلے کی مانند بے فکرا اور لاپرواہ دکھائی دیتا اور بینجو بجاتے ہوئے اس کے منہ میں اٹکے ہوئے سگرٹ سے اب بھی راکھ کاشان قالین پر گرتی چلی جاتی... لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اجتناب آ گیا تھا... بے ساختگی میں کہیں کہیں ساخت کا پہلو آ جاتا اور وہ یکدم ایک دوسرے کی جانب چور نظروں سے دیکھنے لگتے اور پھر بے وجہ ہنسنے لگتے...

گولڈی کے ہاں اُن کا متوقع خوشگوار قیام ایک عذاب ثابت ہوا۔ اس کا جھکا ہوا یہودی خاوند کسی وقت بھی دستک دیئے بغیر کمرے میں داخل ہو سکتا تھا اور اندر آنے پر وہ اُن کی جانب دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا، صرف ناک اُونچی کر کے کچھ سونگھتا، اپنے بڑے اور کھلے ہیٹ کو تھامے وہ کسی میز، کسی الماری کی جانب دوڑتا جاتا جھک کر اس کا معائنہ کرتا

اور اُسی میز یا الماری سے مخاطب ہو کر کہتا "سکریچز — پالش شدہ سطح پر سکریچ
تمہارے ناخنوں کے — اپنے ناخن دکھاؤ — " اور وہ دونوں قیدیوں کی طرح
اطاعت سے اپنے ہاتھ آگے کر دیتے — گولڈی نے اس اولین ڈنر کے بعد اگلے
پانچ روز میں صرف ایک ٹیونا سینڈوچ سَرو کیا تھا ورنہ وہ ہمیشہ سر درد کا بہانہ کرتی یا
وقت دستک دینے کے باوجود اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتی... انہیں اکثر بھوکا سونا پڑتا
شائد یہ سب کچھ بھی وہ سہ جاتے لیکن وہ نصف شب کے بعد اُٹھ کر روتی بھی بہت تھی
اس کا خاوند قابل فہم طور پر سخت گیر تھا اور وہ اسے ایک حد سے زیادہ پینے نہیں دیتا
چنانچہ وہ جِن کی بوتل گلے سے لگائے کمرے سے نکل کر راہداری میں آ بیٹھتی اور
مکمل طور پر حواس باختہ اور مخمور ہو جاتی تو غرارے کرتی غُراتی ہوئی سرگوشیوں میں اپنے
آپ سے باتیں کرنے لگتی... ایک بھدی اور بیٹھی ہوئی آواز اُن کے کمبلوں کے اندر
مسلسل آتی رہتی اور وہ بے آرام کروٹیں بدلتے رات گذارتے.... نیند میں اُترتے ہو
اس کی سرگوشیاں کسی بلی کے رونے کی آواز میں بدل جاتیں اور پھر وہ میاؤں میاؤں
اُن کے خوابوں میں سنائی دینے لگتے... یہ مسلسل اذیت اور مصیبت کے دن تھے۔ اگر
وہ گولڈی کو وسیع القلبی کا بیوقوفانہ مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ماہ کا کرایہ ایڈوانس کے طو
ادا کر چکے تھے لیکن اُن کی برداشت ایک ہفتے میں ہی جواب دے گئی — انہوں نے
سے شفٹ کر جانے کا ارادہ کر لیا۔

"کالج کی سٹوڈنٹ ویل فیئر آفیسر مسز کالنز سے رابطہ کرتے ہیں۔ اُن کے پا
مناسب اور آزمودہ لینڈ لیڈیز کی ایک فہرست ہمہ وقت موجود رہتی ہے — کیا
ہے؟"

بابو لب بھینچے کچھ دیر چھت کو تکتا رہا پھر اُس نے سگرٹ سلگایا اور خصوصی
کے طور کاشان قالین پر راکھ جھاڑ کر کہنے لگا "جب میں بینجو بجاتا ہوں تو تمہاری پڑھائی
بہت حرج ہوتا ہے — " اُس نے اس کے سوا کچھ اور کہنا مناسب خیال نہ کیا اور وا
روب میں سے اپنے کپڑے نکال کر اُنہیں تہہ کرنے لگا۔

وہ اپنا سامان اُٹھا کر کمرے سے باہر آنے لگے تو بابو رُکا۔ اس نے جلتا ہوا
قالین پر پھینکا اور اُسے تب تک نہ مسلا جب تک کہ اُون کے جلنے کی بُو اُن کے نتھنوں
نہ آئی۔ پھر اُس نے ایک جیبی چاقو نکال کر اُس کا پھل سیدھا کیا اور وارڈ روب کے

گہرا گھاؤ لگایا "سوری مسٹر گولڈی میں نے آج صبح اپنے ناخن نہیں کاٹے تھے۔"
اس کے بعد تین ماہ تک وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل رہے... یہ اتفاق
ہو سکتا تھا... اور اگر یہ احتیاط تھی تو مشاہد کی طرف سے نہ تھی۔

وہ کبھی ایک جانب کسی ایک کنارے پر ٹھہرنے کا فیصلہ کرنے کا اہل نہ ہو سکا جھجک اس کی خصلت میں شامل تھی۔ اس کی شخصیت میں چودھری اللہ داد کا رنگ گوڑھا تھا۔ وہ بھی اپنی زندگی کسی واضح اور سوچی سمجھی متعین منصوبہ بندی کے تحت گزارتے تھے۔ وہ لاپرواہ تو نہیں تھے لیکن زندگی کا رجسٹر ایک اکاؤنٹنٹ کی طرح جمع تفریق کی غلطیوں سے مبّرا برقرار رکھنے پر بھی قادر نہیں تھے۔ چنانچہ بہار کی چھٹیوں میں اس پر کھلا کہ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے اور وہ اس موڑ پر ہے جہاں اسے بہرصورت آئندہ زندگی کے راستے کا تعین کرنا ہے.... انہی دنوں بیشتر دوسرے لڑکوں کی طرح اس نے بھی اپنے قیام کو بنیاد بنا کر بڑی آسانی سے برطانوی پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ ایک خط میں اس نے سرسری طور پر تذکرہ کر دیا کہ آج کی ڈاک میں آپ کے خط کے علاوہ برٹش ہوم آفس سے.... اور اُدھر سے فوری طور پر چودھری اللہ داد کی خصلت میں جتنا غصہ تھا اور بہت زیادہ نہ تھا بروئے کار لا کر ایک سرزنش کی تحریر اس کے نام آئی۔ برخوردار من — مجھے بے حد قلق ہوا ہے کہ تم نے برطانیہ کی شہریت اختیار کر لی ہے — پاکستان ہمارا پاکستان — تحریک پاکستان۔ تم اپنے آپ کو بھول رہے ہو — کیا تم چودھری اللہ داد کے بڑے بیٹے نہیں ہو... اگر ہو تو صرف پاکستانی ہو۔

اس نے ایک معذرت بھری چٹھی کے ساتھ — چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر برطانوی شہریت... اس لئے... برٹش ہوم آفس کو اپنا برطانوی پاسپورٹ لوٹا دیا... ان دنوں ابھی دوہری شہریت کا قانون لاگو نہیں ہوا تھا۔

تو پھر اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے؟ برطانیہ میں کسی حد تک ایک واضح متمول روشن مستقبل تھا۔ اس کا طرز زندگی انگلستان میں طویل قیام کی وجہ سے مغربی اقدار کے قریب ہو چکا تھا اور وہ اپنے آپ کو یہاں آرامدہ محسوس کرتا تھا... لیکن پاکستان میں چودھری اللہ داد تھے۔ اور وہاں کہیں بوریوالہ۔ فیصل آباد یا گوجرانوالہ میں کوئی

ہوزری فیکٹری اپنے اُون اور سُوت کے غبار سمیت دس گھنٹے کے روزانہ پیریڈ کے ساتھ اس کی منتظر تھی... اگر اسے ملازمت مل جائے تو... کیونکہ ٹیکسٹائل کے شعبے میں ان دنوں ہوزری کی نسبت ویونگ اور پینٹنگ زیادہ اہمیت اختیار کر چکی تھی اور غیر ملکی سند رکھنے والے باآسانی ویونگ یا پینٹنگ ماسٹرز کی ملازمت حاصل کر لیتے تھے اور تنخواہ خاصی معقول ہوتی تھی جب کہ ہوزری میں ملازمت کی نسبت ذاتی کاروبار کے مواقع بہتر تھے۔

سپرنگ ویکیشنز میں ہی وہ اس کاغذی پرندے سے آشنا ہوا جو تہہ خانے کے روشن دان کے آگے ہلکورے لیتا رہتا تھا۔

"کیا تمہیں میرا پیپر برڈ پسند ہے —" — کرسٹین کی اُنگلیاں کسی جھیل پر اترتے سارس کی ٹانگوں کی طرح پیانو کیز کو کبھی یہاں کبھی وہاں چھوتی اختتام تک پہنچ گئیں اور آخری کیز پر تھوڑی دیر دباؤ ڈالنے کے بعد جیسے پھر پرواز کرنے کو اٹھیں اور ہوا میں معلق ہو گئیں۔ اس کی اُنگلیوں کی طرح اس کی ٹانگیں بھی خاصی لامبی تھیں کیونکہ وہ ایک لمبی لڑکی تھی۔

اور جب اس کی انگلیاں ہوا میں اٹھ کر عین اس کی ناک کی سیدھ میں ٹھہر گئیں تو انہیں وہیں ساکت کئے ہوئے اس نے پلٹ کر فوم کے دبیز گدّے پر سر کے نیچے بازو کا تکیہ رکھے اپنی آخری جمائی روکتے مشاہد سے پوچھا — کیا تمہیں میرا پیپر برڈ پسند ہے؟

مشاہد مسلسل اُسی پیپر برڈ کو ہی دیکھے جا رہا تھا جو بند روشن دان کے چار اندھے شیشوں کے آگے نہ دکھائی دینے والے سفید دھاگے سے بندھا ایک بے ربط پینڈولم کی طرح جُھول رہا تھا — پیانو کے کچھ نوٹس ایسے بھی آئے جب وہ پرندہ انہیں اپنی پوری توجہ دینے کی خاطر بالکل ساکت ہو جاتا۔ ایسے ہی دکھائی دیا تھا۔

تہہ خانے کی چوتھی آرائش گرینڈ پیانو، فوم کے گدّے اور پیپر برڈ کے علاوہ ایک ویسٹ پیپر باسکٹ تھی جو نیلے کاغذ سے ہی بنائی گئی تھی۔ اور اس میں متعدد تڑے مڑے اب بھی کسی حد تک گیلے کاغذ کے پرندے پڑے تھے۔ یہ کرسٹین کا خبط تھے، سودا تھے۔

اور یہی نہیں اس کے اور بھی خبط تھے۔

جب وہ پیانو کے سامنے ایک عبادت گزار کی طرح سر جُھکا کر اور بہت دیر تک آنکھیں بند کئے کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد کسی ایک کِی پر انگلی رکھتی تو اس لمحے کے بعد

جب تک اس کی لامبی انگلیاں پیانو کیز پر سے ٹھہر ٹھہرا کر پرواز نہ کر جاتیں وہ کسی قسم کی کوئی آواز کوئی مداخلت برداشت نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ منہ باندھے چپ بیٹھا رہتا تو سگریٹ پینے سے بھی اجتناب کرتا کیونکہ ماچس جلاتے ہوئے رگڑ کی آواز آتی تھی۔

بہار کی چھٹیوں میں وہ دو ہفتے کے ایک کورس پر کوپن ہیگن کی ایک بہترین ڈیزائننگ فرم کی دعوت پر ڈنمارک آیا تھا۔ یہیں پر اس کی ملاقات کرسٹین سے ہوئی وہ اس سے بھی قد میں سے نکلتی ہوئی لم ڈھینگ قسم کی لڑکی تھی اور اس پر گوشت قدرے کم تناسب میں تھا اور جب انسان اسے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں تک پہنچتا تھا تو ان کی نیلاہٹ اور پھر بالوں کے سنہری پن کو پسند کرتا تھا لیکن وہ وہاں ذرا دیر سے پہنچتا تھا۔

اس کا گھرانہ مذہبی حوالے سے بہت پابند اور بنیاد پرست تھا۔

میرے ماں باپ کی موجودگی میں تم نے میرے کندھے پر بھی ہاتھ نہیں رکھنا۔ ہاتھ بالکل نہیں تھامنا — اور میری جانب بہت کم دیکھنا ہے اور دیکھنا ہے تو ذُو معنی انداز میں پیار کی کسی رمق کے ساتھ ہرگز نہیں دیکھنا... میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم میری ایک سہیلی کے منگیتر ہو اور اسے ملنے کے لئے لندن سے ڈنمارک آئے ہو لیکن غیر متوقع طور پر اس سہیلی کی ایک آنٹی فن لینڈ میں سکی انگ کرتے ہوئے فوت ہو گئی ہے اور اسے وہاں جانا پڑ گیا ہے اور فن لینڈ کے لئے فیری سروس پر بہت رش ہے اس لئے تم...."

"میں اتنا کچھ کیسے یاد رکھوں گا —"

"میں خیال رکھوں گی — اور سہیلی کا نام... اس کا نام.. اس کا نام کیا ہے"

"مجھے کیا پتہ —" اس نے بیزاری سے کہا۔

"وہ انگرڈ ہے".. ہاں وہ انگرڈ ہے — میں خیال رکھوں گی —" وہ نروس ہو رہی تھی اور اس کی انگلیاں لامبی تھیں اسی لئے لرزش بھی زیادہ تھی۔

کرسٹین کی ماں صرف اپنے مذہبی عقیدے پر جامد رہنے کے تکبر اور تقدس میں جیسے سکڑ چکی تھی.... اس کے چہرے پر ایسا ملال تھا کہ اس پر ترس آتا تھا۔ شاید یہ رنج تھا زندگی کے آخری کنارے پر پہنچ کر ان لوگوں کی طرف دیکھنے کا جو زندگی سے الفت کرتے ہوئے اس کی گہما گہمی اور مسرت سے لطف اندوز ہوتے تھے.... اور باپ صرف بولی کا اگلے جہان کی بشارتوں کی نگاہ اور حکم کا منتظر رہتا — اس نے مشاہد کی جانب صرف دو بار دیکھا — ایک مرتبہ جب وہ جھجکتا ہوا ان کے بے آرام حد تک ستھرے اور بے تکلف

بار جب اسے خدا حافظ کہا گیا — کرسٹین کا پردادا جس کا نام کچھ ... ہوا اور دوسری بار ... اپنے زمانے میں ایک مانا ہوا کلاسیکل موسیقار تھا... اور ڈنمارک میں جن لوگوں کی ... تھوڑا بہت لگاؤ تھا وہ اس اوہلسن سے متعارف تھے.... شام کا بیشتر حصہ اوہلسن ... کے لکھے ہوئے اور جنل میوزک سکور اور ڈائریاں دیکھنے میں صرف ہوا.... پھر ... پیانو پر بیٹھ گئی اور اپنے پردادا کی تمام کمپوزیشنز بجائیں اس معزز مہمان کے لئے جو ... آپ پر جبر کر کے ایک نیم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی لامبی انگلیوں کو پیانو پر چلتے ... دیکھے جا رہا تھا — مغربی موسیقی کی کلاسیکی روایت سے وہ مکمل طور پر آگاہ تو نہیں تھا لیکن ... بھی فل ہار مونیک آرکسٹرا کی درجنوں وائیلنز میں سے اگر ایک بھی قدرے بے سُری ... تو اسے الجھن ضرور ہوتی۔ وہ کن رس رکھتا تھا اور واگنر کا بلند آہنگ کانوں میں ... تے ہی اس کا جرمنک گرینجر پہچان جاتا تھا۔ چائے کوسکی کی سمفونیز میں وائیلنز کی کسک ... روس کی ٹریجک ٹریڈیشن سے آشنا کرتی تھی اور بیتھوون کی بہتی ہوئی چاندنی کے ... اس پر ہمیشہ اثر کرتے — سٹراس کے تقریباً تمام والز اور خاص طور پر بدنام زمانہ "بلیو ڈینیوب" وکٹر سلوسٹر سکول آف ڈانسنگ کے بھدی آواز والے سپیکروں پر اس نے اتنی بار سنے تھے اور اتنی بار اُن پر دَن ٹُو تھری — سٹپس ان پر لئے تھے کہ وہ اس کی بدنی تحریک کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بہت دیر تک پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ کان لگائے کھانسے بغیر بُت بنے اور سگریٹ سلگائے بغیر یورپی کلاسیکل موسیقی تادیر سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا — کیونکہ یہ اس کی بدنی روایت میں گردش نہیں کرتی تھی صرف باہر کا علم تھا — کرسٹین ایک باکمال پیانو پلیئر لگتی تھی لیکن ایک مناسب شام میں پیانو کی موسیقی جتنی دیر تک سنی جا سکتی ہے وہ اس سے کچھ زیادہ دیر سناتی تھی...

اس انگمار برگمین کی فلموں والی ٹھہری ہوئی سفید ویرانی والے مختصر ڈینش قصبے کا نام راس کلے تھا اور اس کے ساحلوں تک جو پانی آتے تھے ان کے مخالف کناروں پر جرمنی کی بجھی بجھی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں اور یہاں ساحل کے قریب اگر کوئی راہ گیر بہت نوزی پارکر ہوتا اور جھک کر اپنے قدموں کی سطح تک جھک کر جھانکتا تو اسے فٹ پاتھ کی سطح پر کسی تہہ خانے کا روشندان دکھائی دیتا اور سفید کاغذی پرندہ اسی روشندان سے پرے جھونکتا تھا اور اس کے عین نیچے ایک گرینڈ پیانو تھا جس پر کرسٹین کے بلانڈ ہیئر اور نیلی آنکھیں ایک عبادت گزار کی طرح جھکی اپنی لامبی انگلیوں کی پینٹنگ کے لئے مناسب کیز کا

انتخاب کر رہی تھیں...

یہ راس کلے میں ان کی پہلی شام تھی۔

تہہ خانے میں جو سیڑھیاں اترتی تھیں ان پر ایک قدرے پلی ہوئی لڑکی عمر میں لئے گردن ٹیڑھی کر کے بیزاری کا تاثر دے رہی تھی کیونکہ اسے وہیں ان سیڑ پر، جس زاویے پر سیڑھیاں نیچے آتی تھیں اسی زاویے پر سونا تھا — یہی ارینج منٹ جب کبھی اُس کا بوائے فرینڈ ٹاؤن میں ہوتا تو کرسٹین بھی اسی پچھتر کے زاویے پر اسی میں سیڑھیوں پر اپنی نیند پوری کرتی۔ چنانچہ یہ میوچل ارینج منٹ تھا۔

مشاہد نے جب پہلی صبح بیدار ہو کر اس فربہ لڑکی کو سیڑھیوں پر ایک عجیب زا میں محو خواب دیکھا تو اسے بہرطور مسکرانا تھا... یوں لگتا تھا جیسے وہ فربہ لڑکی جس کا نام کسی ہارر مُووی کی ہیروئن کی مانند اپنی تاریک اور دھند آلود قبر میں سے مردہ اور ا حالت میں سیدھی ہو رہی تھی کہ رک گئی۔ یا اسے مصلوب کر دیا گیا تھا اور صلیب اتارنے کے لئے صلیب کو ذرا نیچے کر کے اسے وہیں چھوڑ دیا گیا۔ بہرحال یہی ارینج تھا —

لیکن اس لمحے کوئی بھی راہ گیر اگرچہ نوزی پارکر ہو یہ نہیں جانتا تھا کہ فٹ پاتھ سطح پر جو روشندان اس کے قدموں میں ہے اس کے عقب میں ایک کاغذی پرندہ ہے نیچے ایک گرینڈ پیانو ہے — پیانو پر یہاں وہاں چھوتی لامبی انگلیاں بھی ہیں اور نرم موٹے گدے پر ایک ایشیائی لڑکا اپنی جمائیاں روکتا ہے اور اس کے قریب سیڑھیوں پر فربہ لڑکی جو کہ اُلا ہے تکیہ گود میں بھینچے سونے کی منتظر ہے —

"تم بے شک سو جاؤ اُلا —" کرسٹین کے لبوں سے — اور وہ اس کے لب نامعلوم وجہ سے ہمہ وقت گیلے رہتے تھے اور اکثر منہ میں جمع شدہ لعاب نگلتی رہتی ایک حکم سا جاری ہوا.. گو نو ہیل قسم کا.. اور اُلا گویا اس حکم کی منتظر تھی اس نے سیڑھی پر جمایا اور ایک سونے جاگنے والی میکانکی گڑیا کی مانند ایک پل میں سو گئی دوسرے پل میں اس کا منہ کھل گیا اور وہ ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی۔

"اُلا کو موسیقی کا کوئی شعور نہیں —" کرسٹین نے مسکرا کر اور لبوں سے گیلا پونچھ کر آخری کیز کو ہلکے سے چھوا اور ان میں سے تہہ خانے کی خاموشی میں گونجنے روانی سے مطمئن ہو کر خوشی سے سر ہلایا اور پھر ایک نظر کاغذی پرندے پر ڈال کر

ا کی کمپوز کی ہوئی کوئی دھن بجانے لگی۔ مشاہد یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ صرف اس کی اسے یہاں لے آئی تھی۔

وہ اس کے ماں باپ کے ساتھ اس دہشت ناک یادگار شام کے بعد اگلی صبح لندن لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن کرسٹین گیلے لبوں کے ساتھ اپنی لامبی انگلیوں میں اس کا چہرہ ے بولتی چلی گئی.... دیکھو ہم یہاں بہت پابند رہے ہیں... راس کلے میں میرا اپنا کمرہ ہم وہاں نہانے کے لئے بھی جا سکتے ہیں کیونکہ میرا کمرہ ساحل کے برابر میں ہے اور اپنے ٹیچرز ٹریننگ کالج سے بیماری کی رخصت لے لوں گی۔ میں اپنے والدین کو یہی دوں گی کہ میری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں اور میں واپس راس کلے میں اپنے کالج کو جا رہی — اور کسی کو بتانا نہیں.... ہم کوپن ہیگن تک الگ الگ سفر کریں گے اور پھر وہاں اکٹھے ٹرین لے لیں گے — اور پلیز ایک دو دن کے لئے۔

اور مشاہد اپنی جھجک اور جس ذرا کل پنے کا وہ سمیعہ کے ساتھ مظاہرہ کرتا رہا تھا کی وجہ سے سب کچھ قبول کرتا رہا... ورنہ کرسٹین بقول کوکی کے وَن نائٹ سٹینڈ کے تو بہت مناسب تھی لیکن ایک طویل رفاقت کے لئے وہ اس میں بہت زیادہ کشش پاتا تھا... اور وہ خاص طور پر اس میں یہ کشش اس لئے بھی نہیں پاتا تھا کہ اس کے رنگ میں ایک نہایت کریہہ النظر اور بدشکل بلکہ بن مانس کی شکل کے کسی افریقی شخص تصویر تھی جو اس کی اولین محبت تھا اور جسے وہ "ڈیشنگ" کہتی تھی اور جو بقول اس بستر میں بہت گرم، جذباتی اور ڈیلی کیٹ ہوتا تھا — مشاہد کی لبرل ازم اپنے جینز اور وغیرہ سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ کالا رنگ اور آبنوسی کالا شاہ رنگ بہرطور کالا تھا اور چاہے گورے اور کالے کی تمیز چودہ سو برس پیشتر ختم کر دی گئی تھی لیکن — رنگ ناں کسے نوں رب دیوے تے سارا پنڈ ویری پے گیا... اپارٹ ہیڈ اس کے اندر تی تھی۔ ذات پات کی جڑیں بے حد گہری اور مضبوط تھیں... وہ ہزاروں برس کے ہندو بنیاد پرست ہو کر بھی چپ نہیں کرا سکتا تھا — وہ بولتا تھا.. وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ اس کا گلا گھونٹتا تھا تب بھی وہ بولتا تھا اور یہی کہتا تھا کہ یہ لڑکی ایک حبشی اور وہ بھی بد حبشی کے ساتھ مبتلا رہی ہے اور تم ایک آریائی ہو کر ایک کالے کے چھوڑے ہوئے طرف مائل ہو....

پیانو کے گہرے بلند اور گُم ہوتے سُروں کے ساتھ سمندر کی چھپاک چھپاک کی

آواز مسلسل سنائی دیتی جو بند روشن دان میں سے بھی سرائت کرتی اندر آتی تھی۔
کرسٹین کو اوری گیمی کے پرندے بنانے کا جنون تھا۔

ان میں سے ایک وہ تھا جو دھاگے سے لٹکا سمندر کی آواز سنتا تھا اور روشن دا
کے آگے جھولتا تھا۔ سیڑھیوں پر اُلا صلیب سے اتاری جا رہی تھی یا قبر سے بلند ہو
ہوئے رک گئی تھی۔ مشاہد کو نیند آ رہی تھی۔

اس نے بستر کی بجائے فرش پر فوم کا گدا اس لیے بچھا رکھا تھا کہ اس کی ٹا
بہت لامبی تھیں... وہ مکمل تاریکی پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک موم بتی ہمیشہ روشن رہتی
سفید پرندے کا سیاہ سایہ تہہ خانے کی چھت پر جھولتا رہتا۔

وہ بہت سرد اور شائد فرجڈ بھی تھی — اس پرندے تلے جو پہلی شب تھی
میں وہ ایک مشقت کرتے۔ پسینے سے نچڑتے اور ہانپتے ہوئے دیہاڑی دار مزدور کی ط
محسوس کر رہا تھا جو مسلسل رزقِ حلال کی جستجو میں اپنے آپ کو ہلکان کر رہا ہے اور
کے باوجود ایک برف کی سل ہے جو اتنی کم پگھلتی ہے کہ ایک مدت کے بعد ایک ٹپ
آواز آتی ہے — ایک قطرہ گرا... اور پھر... پسینے کے قطرے زیادہ تھے اور برف کی
کے قطرے کم — لمبی ٹانگوں کے ساتھ وہ ایک کیکڑے کی طرح گرفت رکھتی تھی۔

اور جب سل پگھلنے لگی اور بہت دیر کے بعد پگھلنے لگی تو اس نے کہا ٹھہرو —
ہانپتا ہوا، پسینے سے بھیگتا ہوا ٹھہر گیا — مجھے ایک پرندہ چاہیے۔

"میرے پاس تو کوئی — پرندہ نہیں ہے —" وہ بمشکل بولا۔

"میرے پاس ہے —" اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹیں اور بازو پھیلائے اور ان
ہاتھ بھی لامبے تھے اور اس کے ہاتھوں میں ایک پرندہ تھا — روشندان کے سامنے جھو
والے پرندے کا ہم شکل ایک اور پرندہ.... یہ منطق الطائر کی منطق یہاں کہاں سے
— کیا لونگ سٹون سی گل کا دوبارہ جنم ہو گیا ہے.... وہاں تو پرندوں کی مجلس حکیم عطار
ہاں تھی اور یہاں ڈنمارک کے آخری سرے پر، سمندر کنارے ایک اندھے روشندان
آگے ایک سفید کاغذی پرندہ۔

اور اس کے ہاتھوں میں ایک پرندہ تھا — ہم شکل....

اور اس نے اسے اپنے سینے کے درمیان رکھا.... جیسے وہاں اس کا گھونسلہ ہو
وہ پرندہ اگرچہ نرم کاغذ کی کترن سے تخلیق ہوا تھا اس کے باوجود وہ اسے

لیکن یہ کرسٹین کا سودا تھا — اسے اپنی چھاتیوں کے درمیان ایک کاغذی
ت تھا —
ندے کا بسیرا چاہیے تھا..
وہ پہلے بہت چبھتا تھا....
پھر پسینے سے دباؤ سے وہ نرم اور گیلا ہونے لگتا تھا...
اور جو پرندہ ایک بار دب جاتا تھا اور گیلا ہو کر اپنی شکل کھو دیتا تھا اس کی جگہ اور
پرندہ آ جاتا تھا اور اسی لئے وہاں — ردّی کی ٹوکری میں — جو نیلے کاغذ سے بنی تھی۔
ت سارے پرندے تھے — جو تڑے مڑے اور گیلے تھے۔
دن کے وقت وہ بے سدھ سویا رہتا.... کرسٹین کو بہت کوشش اور بہت بہانے
کرنے پر بھی چھٹی نہیں مل سکی تھی اس لئے وہ کالج چلی جاتی اور وہاں بچوں کی نفسیات
کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی سعی کرتی۔
اور رات کے وقت ... پیانو اور گیلے پرندے۔
پتہ نہیں وہ سوتی کب تھی —
ایک بار کرسٹین نے ایسا بھی کیا کہ اس کے ہاتھوں میں ایک پرندہ تھا اور اس کی
آنکھیں روشندان کے سامنے ہلارے لیتے پکھیرو پر تھیں اور جب مشاہد کی مشقت رنگ
لائی اور لطف کی سیڑھیاں رک رک کر چڑھتی کرسٹین کے گلے میں سے حیوانی آوازیں
نکلنے لگیں تو اس نے اس پرندے کی کاغذی پرندے کی گردن مروڑ دی۔
آنے والے دنوں میں کئی دن ایسے تھے جب مشاہد نے اپنے سینے پر کسی پرندے
کی چونچ کی نوک چبھتی محسوس کی.. وہ اس احساس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا.. اور برگیتا
نے بہت مرتبہ پوچھا... یہاں میرے بدن پر تو ایسا کچھ نہیں جو تمہیں تکلیف دے سکے تو تم
کراہ کر اپنے سینے پر ہاتھ کیوں پھیرتے ہو — لیکن اگلی سویر شیو کرتے ہوئے آئینے میں
اس کی چھاتی پر متعدد نیلے نشان ہوتے... کاغذی چونچوں کے —
تو رات کے وقت — پیانو اور گیلے پرندے۔
وہ اس پرندے اور پیانو کا قیدی تھا کیونکہ اس تہہ خانے سے باہر جانا اس کے لئے
ممنوع قرار دے دیا گیا تھا — تمہاری شکل مختلف ہے — تم جانے جاؤ گے — کہ تم
آخر میرے پاس ٹھہرے ہوئے ہو.... یہاں ڈنمارک میں چھوٹے قصبوں کا ماحول ابھی تک
میڈیوایول اور کنزرویٹو ہے اور باہر جانے کی ضرورت بھی کیا ہے.... چنانچہ وہ یا تو سویا رہتا

اور یا پھر روشندان کے پرندے کے ساتھ باتیں کرتا رہتا —

پرندہ جواب دیتا تھا —

تم وہی ہو جو سچ کی تلاش میں نکلے تھے...

ہاں — میں اُن میں سے ایک ہوں جو سی مرغ کی تلاش میں دربدر ہوئے اور ہم یقین، تلاش، پیار، آزادی، وصال، حیرانی و غربت اور موت اور عدم وجود کی وادیوں میں سے گزرے اور اس سفر کے دوران کئی پرندے (اور ہم سب کاغذ کے) سمندروں میں ڈوب گئے (اور روشندان میں سے سمندر کی آواز آتی تھی جس میں کا کشتیاں ڈوب جاتی تھیں)۔ کچھ ایسے تھے جن کی زبانیں سوکھ گئیں اور وہ برف کی وا میں پیاسے مر گئے... کئیوں کے جگر سورج کی تپش سے راکھ ہوئے اور ان کے پَر گئے۔ کچھ جنگلوں اور صحراؤں میں گم ہوئے۔ کئی اپنے حواس کھو بیٹھے اور پاگل پن ایک دوسرے کو کھا گئے اور کچھ نے ایسی انہونی شکلیں دیکھ لیں کہ وہ حیرت سے گئے....

نہیں... مجھے یقین نہیں آتا۔

اس لئے کہ تم یقین کی وادی میں سے نہیں گزرے... اور پھر "قاف" کی پہا — ہم صرف تیس بچے تھے... اور ہمارے سامنے ایک پردہ تھا — پردہ اٹھا تو وہاں ہم تھے — ہماری شکل کے... ہم جیسے.. ہم... تیس پرندے... ہم خود ہی سچ تھے...

اور ردی کی ٹوکری میں کتنے پرندے ہیں؟

کیا یہ بھی اُن تیس میں سے ہیں جو قاف کی پہاڑیوں تک پہنچ گئے تھے۔ یہ وادیوں میں گیلے ہوئے بے شکل ہوئے..

نوٹنگھم ٹیکنیکل کالج کے ہوزری روم میں اُون کے جو ذرّے فضا میں بلند کھڑکیوں میں سے آنے والی دھوپ کی زد میں آ رہے تھے وہ قاف سے واپس آنے وا پرندوں کی طرح بے یقین اور بے سمت تھے اور آہستہ آہستہ روشنی میں حرکت کر تھے۔

وہ رات بھر کی مشقت کے بعد گہری نیند میں جا چکا تھا جب اسے کسی نے زور

وڑا اور جو آوازیں تھیں وہ اس کی نیم غنودہ فہم سے پرے کی تھیں۔

کرسٹین نے اسے جھنجھوڑا تھا — رات کے کسی پہر میں —

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں تمہاری محبت میں مبتلا ہو چکی ہوں —" اس نے جیسے کسی موذی بیماری کے وجود کا اعلان کیا۔

"اچھا —" وہ سونا چاہتا تھا۔

"ہاں —"

"ٹھیک ہے صبح بات کریں گے —" وہ کروٹ بدل کر سونے لگا...

"نہیں۔ تم سمجھ نہیں رہے" اس نے اسے پھر جھنجھوڑا "میں واقعی سچ مچ تمہارے ن میں مبتلا ہو چکی ہوں اور میں... بے بس ہو چکی ہوں"

"ٹھیک ہے.. لیکن ہم صبح بات کریں گے —" موم بتی ابھی تک جل رہی تھی پرندے کا سایہ...

"نہیں۔ یہ سنجیدہ مسئلہ ہے تم سمجھ نہیں رہے — جب تم مجھے کوپن ہیگن میں لے تھے تو تم کچھ بھی نہیں تھے۔ کوئی بھی نہیں تھے لیکن... میں نے ابھی ابھی احساس کیا ہے کہ... تم ہو... یہ میرے بس میں نہیں تھا لیکن میں بہت شدید طریقے سے تمہارے بس میں آ چکی ہوں۔ اور تمہیں اس کا جواب دینا ہو گا —"

"کس قسم کا جواب —"

"تمہیں پتہ نہیں ہے.. تم سمجھ ہی نہیں رہے —" وہ اتنی لمبی تڑنگی لڑکی فوم کے گدے پر بیٹھی روتی رہی... اس کی ہچکیوں سے وہ خود بھی ہلتا تھا کیونکہ وہ اُسی گدے پر اس پر — وہ تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بے شمار پانی تھا اور وہ کچھ بھی پہنے ہوئے نہ تھی جب ایسے ہچکیاں لے کر روتی تھی...

"تمہیں جواب دینا ہو گا —"

اسے اٹھ کر بیٹھنا پڑا...

"کہ تم مجھ سے شادی کرو گے یا نہیں —"

"نہیں —" مشاہد نے فوراً کہا جیسے وہ جواب کی تاخیر سے خوفزدہ تھا اگرچہ اس کا بدن اس کے بدن کے مَس سے دُکھا ہوا تھا..." میں.. تمہیں پسند کرتا ہوں.... لیکن تم سے

مُحبت نہیں کرتا۔"

"میں جانتی تھی —" وہ اس کے اوپر جُھک گئی... جیسے ایک کیکڑا اس ار... اسے اپنی لامبی آغوش میں لینا چاہتا ہو" میں جانتی تھی لیکن... مجھے اپنے آپ پر ا... نہیں..." وہ پھر رونے لگی اور اس کی آنسو نیلی آنکھوں میں سے ندیاں بنا کر نکلتے اور کی چھاتیوں پر بہتے ہوئے کہیں نیچے چلے جاتے —

اس کے گھٹنوں پر نیلے نشان تھے۔ چوپایہ اگر جنگل میں چلے اور بے شک ... قوم کا ہو تو اس کے گھٹنوں پر نیلے نشان تو وجود میں آئیں گے —

وہ ہچکیاں لیتی اور بُری طرح آنسو بہاتی اٹھی۔ سیدھی ہوئی اور پیانو پر بیٹھ گ... بیتھوون کا مون لائٹ سناٹا بجانے لگی...

پرندے سفید رنگ کے... اُون کا غبار... اور جہاں دھوپ وہاں اس کے ذرّ... اُون کے غبار کا قیدی... سانس کی نالی میں پھیپھڑوں میں... پوری زندگی کسی نِٹ... فیکٹری کے مشین روم میں — کھانستے ہوئے۔

پیانو اور پرندے کی قید اور اُون کے غبار کی قید میں فرق تھا —؟

ہوزری کی مشینیں ایک خاص غنائیت کے ساتھ مسلسل چل رہی تھیں۔ ا... پر کبھی سمندر کی آواز حاوی ہوتی تھی اور کبھی مون لائٹ سناٹا کی دھن... اور کبھی ... پرندے موت اور عدمِ وجود کی وادی میں سے گزرتے تھے...

ویوا... وی وا... ویوا ڈیگال... وی وا ڈیگال...

ٹیلی ویژن کی بلیک اینڈ وائٹ سکرین پر نوجوانوں۔ بچوں اور عورتوں کے ... نعرے لگاتے۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر ہاتھ لہراتے۔ لاکھوں کے ہجوم... پیرس۔ لی آنز... فرانس کے قصبوں میں کسان اور مزدور... اور ڈیگال ایک چھوٹے سے گاؤں میں ا... شرابے سے الگ لاتعلق اپنے آپ میں مگن اور مطمئن... باغبانی میں مصروف ... کو پیار سے دیکھتا ہوا... فرانس کی ہر دیوار پر ویوا ڈیگال... غیر مشروط اقتدار ہیرو ... لئے... عوامی نمائندے نامنظور...

اور ڈیگال — آلو اگاتا ہوا لاتعلق مسیحا —

"کیا اس سیاسی دلدل میں سے نکلا جا سکتا ہے جس میں دوسری جنگِ عظیم

... تک ۱۹۶۰ء تک فرانسیسی پھنسے ہوئے ہیں — کیا ڈیگال — کین ہی ڈلور دے گُڈز؟"

"کچھ پتہ نہیں ان فراگز کا —" امبرتو نے اپنے گٹھے ہوئے کندھے فرانسیسیوں ... طرح ہی سکیڑ کر کہا" وہ اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں جیسے وہ کوئی پیغمبر ہو — ذرا دیکھو" ... نے ٹیلی ویژن سکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں پلے ڈی کنکورڈ میں لاکھوں فرانسیسیوں ... گلے ڈیگال کے حق میں نعرے لگا لگا کر رندھ چکے تھے۔

امبرتو دو گھنٹے پیشتر اس کے کمرے میں غیر متوقع طور پر وارد ہوا تھا اور اس کے ...ں میں ابھی تک مختلف رنگوں کے اُون کے ریشے پھنسے ہوئے تھے۔ مائی برادر مسلم ...لستانی — مجھے معلوم ہے کہ یہ وہ وقت ہیں جب ہوزری کی مشینیں تمہارے حواس پر ...وار ہو چکی ہیں اور تم ایک گھوڑے کی طرح اپنے فائنل پروجیکٹ میں جتے ہوئے ہو... ...ں لئے... میں تمہارے لئے تمہارے تھکے ہوئے اعصاب کے لئے اپنے ہاتھوں سے ...پاگیٹی بولانیز بنا کر لایا ہوں — ذرا دیکھو —" اس نے ایک ڈبے کا ڈھکن جو بہت مضبوطی سے کسا ہوا تھا۔ کھولا... تو پنیر کے پگھلنے کی خوشبو اور رس بھرے قیمے کی مہک کمرے میں پھیل گئی..." کاش اس کے ہمراہ سرخ وائن کیانتی کی ایک ٹوکری ہوتی تو ڈنر آسمانی ہو جاتا —"

ڈنر اگرچہ آسمانی نہ ہوا لیکن اس کے اختتام پر وہ آسودہ اور پُر آسائش لمحوں میں ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے —

بہت ناتواں اور دُبلا اور گھنگھریالے بالوں والا لارڈ رَسل — ٹریفالگر سکوئر میں ایک پروٹسٹ ریلی سے مخاطب تھا — فرانس مسٹ کوئٹ الجیریا...

سکرین پر ایک شارپ کٹ آتا ہے اور رَسل کی بجائے پستہ قد سارتر اپنی عینک درست کرتا ہوا پیرس کی ایک پروٹسٹ ریلی کے آگے آگے چل رہا ہے — سیکنڈ سیکس سیمون ڈی بووئر جو اُس سے کئی بالشت بلند ہے اُس کے ساتھ قدم ملا رہی ہے — بینرز پر الجیریا کی فرانس سے آزادی کے نعرے لکھے ہوئے ہیں —

"میڈ پیپل — آئی ٹیل یُو کریزی پیپل..." امبرتو نے ہوا میں ایک مکّا چلایا "یہ پاگل لوگ ہیں مثل... اپنے ملک کے خلاف جلوس نکالتے ہیں، پروٹسٹ کرتے ہیں... لارڈ رسل کا تو انگریز بھی باقاعدہ مذاق اُڑاتے ہیں کہ یہ اولڈ مین... سویٹ اولڈ مین جب تک روزانہ کسی پروٹسٹ ریلی میں شریک نہ ہو اُسے رات کو نیند نہیں آتی — لیکن سارتر کو

کیا ہوا ہے۔ اپنے ملک کے خلاف سڑکوں پر آ جاتا ہے.... یہ کیا چاہتا ہے... الجیریا تو از ہے... الجیریا از پارٹ آف فرانس جسٹ لائک پیرس..."

"نہیں —" مشاہد نے سر ہلایا "اگرچہ میں نے ابھی ابھی تمہارا نمک کھایا لیکن تم ایک متعصب یہودی ہو — نہیں — تم ایک طوطے کی طرح فرانسیسی حکومت نکتہ نظر بیان کر رہے ہو —"

"کیا میں فرانسیسی ہوں جو ایسا کرتا ہوں —" امبرتو نے اپنی مضبوط چھاتی پر مانسوں کی طرح مکے چلائے... "بولو..."

"نہیں... تم اطالوی ہو — اور یہودی ہو اور الجیریا از مسلم..."

"اینڈ ہُو آر یُو" — امبرتو نے آنکھیں میچ کر ایک ایسی متانت سے کہا جو وہ تار اور مذہب کے بارے میں گفتگو کرنے سے پیشتر اپنے آپ پر طاری کر لیتا تھا — "تم کیا ہو؟ تم بھی تو آدھے یہودی ہو — ابھی سپا گیٹی بولانیز چکھنے سے پیشتر تم نے ذرا اح سے دریافت کیا تھا کہ اس پر جو قیمہ ہے وہ حلال ہے یا نہیں... اور میں نے تمہیں بتایا حلال ہے... کوشر ہے — تم ہمارا ذبیحہ کھا سکتے ہو... ہمارا شلوم تمہارا سلام ہے اور صرف ہم دونوں... میں اور تم ہزاروں لوگوں میں سے بآسانی الگ کیے جا سکتے ہیں کیونکہ ہمارے جسموں پر ایک ایک بوٹی دوسروں کی نسبت کم ہے — کیا میں ٹھیک کہتا ہوں؟ اور Skull Cap بھی پہنتے ہو — نازی ہمیشہ یہودیوں کو ہیٹ اُٹھا کر چیک کرتے تھے کہ انہوں نے اُن کے نیچے یہ خصوصی یہودی ٹوپی تو نہیں پہن رکھی — ہمارے ربائی بھی پہنتے ہیں اور تم بھی نماز کے لیے یہی گول ٹوپی پہنتے ہو... تو پھر یہ سب کیا ہے؟"

مشاہد کو اپنی مسکراہٹ پر کم اختیار تھا — "یہ سب اللہ تعالیٰ کے درست احکام کی پیروی ہے اے متعصب یہودی — تم نے انحراف کیا ہے۔"

"اس کے باوجود تم آدھے یہودی ہو —"

"سب کانٹیننٹ کے مسلمان کے لیے یہ بڑی مصیبت ہے کہ اُسے رسوم حوالے سے آدھا ہندو بھی کہا جاتا ہے اور اب تم ہمیں آدھا یہودی کہتے ہو تو... ہم کیا ہیں؟"

سکرین پر سارتر ٹھہرے ٹھہرے لفظوں میں تقریر کر رہا تھا — الجیریا... الجیریا... بااللہ —

"کریزی پیپل —" امبرتو نے دانت پیستے ہوئے چھاتی پر مکے چلانے سے اجتناب کیا "کیا تم پاکستان میں اسرائیل کے حق میں جلوس نکال سکتے ہو؟ کیا میں فلسطین کے حق میں تل ابیب میں تقریر کر سکتا ہوں؟ انہیں پاگل کتے نے کاٹا ہوا ہے" اس فلسفی کو اس کی بیوی کو —"

"وہ شادی شدہ نہیں ہیں —"

"میڈ پیپل — لیکن میں چلتا ہوں" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "مجھے ابھی چند انڈر گارمنٹس کے ڈیزائن تیار کرنے ہیں لیکن — متعصب تم ہو —"

"نہیں —"

"تم ہو —"

"اور غیر متعصب کہلانے کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا؟"

"میرا نکتۂ نظر سننا پڑے گا —" وہ اپنے انڈر گارمنٹس فراموش کر کے پھر بیٹھ گیا۔ امبرتو کا یہودی عقیدہ اور اس کے قبیلے کی المناک تاریخ اس کے خون میں رچ چکی تھی اور وہ اُس سے الگ ہو کر شائد زندہ نہ رہتا۔ اُس کے آس پاس جو انگریز تھا وہ اُس کے تجسس سے مکمل اتفاق کرتا تھا کہ اِس میں اُس کا اپنا کوئی خسارہ نہ تھا اور یوں بھی بالفور ڈیکلریشن اُن کا اپنا "بچہ" تھا۔ اُدھر عرب اُس سے بات کرنا تک پسند نہیں کرتے تھے اور اگر کرتے تھے تو جھینپے ہوئے رہتے تھے کیونکہ اُن میں سے بیشتر تاریخ کا وہ شعور نہیں رکھتے تھے جو امبرتو کے دلائل کو باطل ثابت کر سکتا تھا۔ البتہ مشاہد اُسے سنتا تھا اور تحمل سے سنتا تھا اور اُس میں جواب دینے اور سامنا کرنے کی ہمت بھی تھی... امبرتو کو زندگی میں پہلی بار احساس ہوا تھا کہ یہودی نکتہ نظر اتنا ناقابل تردید نہیں اور دیگر ممکنات کا بھی وجود ہے۔ "ہم صرف واپس چلے گئے ہیں... اپنی زمین پر۔ اپنی تاریخ کا تسلسل برقرار اور زندہ رکھنے کے لیے واپس چلے گئے ہیں... بس اتنی سی بات ہے —"

"تاریخ کا تسلسل برقرار رکھنے کی توجیہہ تمہیں اور اسرائیلیوں کو بہت مرغوب ہے۔ دنیا میں کب اور کہاں یہ تسلسل برقرار رہا ہے جو اِسے جواز قرار دیا جائے... تاریخ ایک بے جان شے ہے اور اِسے برقرار رکھنا گویا ایک مردے کو گھسیٹنا ہے...." مشاہد نے اُٹھ کر ٹیلی ویژن آف کر دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا "اسے اگر قانون مان لیا جائے تو یہ کیا ایک غیر قانونی عمل ہو گا اور اس زمین پر بہت اتھل پتھل ہو گی — مجھے اپنا ملک

دراوڑوں کے لیے چھوڑنا پڑے گا اور پورا امریکی کانٹینٹ خالی کر دینا ہو گا انڈینز کے
لیے... نہیں امبرتو نہیں۔"

"دراوڑوں اور انڈینز میں اگر زورِ بازو ہے تو وہ بھی بے شک ایسا کر لیں ـــ"

"تو پھر بحث کرنا اور تاریخ کے تسلسل کو جبر اور بے دخلی کا قانونی جواز بنانا فضول ہے... تم کہو کہ ہم نے طاقت کے استعمال سے ایسا کر لیا ہے اور جس نے جو کرنا ہے کر لے..."

"لیکن ہمیں زمین تو چاہئے ـــ ہم کہاں جائیں؟"

"یہ سوال تم صرف ہم سے کیوں پوچھتے ہو..."

"اگر تم سے پوچھیں تو تم کیا جواب دیتے ہو ـــ"

"پتہ نہیں۔ لیکن دوسروں کے گھروں اور زمینوں پر قابض ہو کر سٹار آف ڈیوڈ کی مُہر ثبت کر دینے کے لیے اخلاقیات کا سہارا مت لو ـــ"

"دوسروں کے گھر اور زمینیں ـــ نہیں نہیں" امبرتو اضطراب اور بے چینی میں تھا "نہیں ـــ یہ گھر سدا سے ایک مکین کا نہیں مشیل ـــ رہنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہمیشہ ایک Love hate کا رشتہ رہا ہے... اُندلس میں سے عیسائیوں نے دونوں کو نکالا تھا... غرناطہ کے کتنے وزیراعظم یہودی تھے یاد ہے؟.. تو میں کہہ رہا تھا کہ گھر کے مکین تاریخی تسلسل کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں... یروشلم میں پہلے کون تھا؟ داؤد کا یروشلم... ہم تھے... پھر رومن... پھر عیسائی ـــ پھر اسے حضرت عمرؓ نے لے لیا... رچرڈ اور پھر سلادین... انگریز اور پتہ نہیں کون کون ـــ اور اب اُردن کا ـــ ـــ یروشلم ایک یہودی شہر ہے اور مارک مائی ورڈز یہ مستقبل کا اسرائیلی کیپیٹل ہے۔ یروشلم ایک مرتبہ پھر یہودی شہر بنے گا اور ہم دیوارِ گریہ کے ساتھ لپٹ کر آنسو بہائیں گے ـــ"

"نیور ـــ"

"اور مدینہ ـــ یثرب بھی ایک یہودی شہر تھا ـــ ہم ـــ"

"نیور ـــ"

"کیا تم تاریخ سے انکار کر رہے ہو؟" امبرتو اُٹھا اور سپاگیٹی بولانیز والا خالی ڈبہ اُٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

"نیور ـــ" مشاہد نے ایک مرتبہ پھرپورے یقین سے کہا۔

اور کیا مکمل یقین اور صرف عقیدے کی پختگی سے تاریخ سے انکار ہو سکتا ہے؟

اگرچہ انگلستان میں ویرانی کا تصور ممکن نہیں لیکن وہاں مکمل ویرانی تھی۔ وہاں بے آبادی اور سناٹا بھی تھا — جیسے ایک گھوسٹ ٹاؤن میں ہوتا ہے۔

سڑک پر کاغذوں کے پُرزے ہَوا کے زور سے اُڑتے تھے اور دونوں جانب بوسیدہ اور مخدوش حالتوں والے بدرنگ مکان تھے جن میں سے بیشتر کے گیٹ ٹوٹے ہوئے تھے اور اُن کے باغیچوں میں گھاس نہ تھی، کاٹھ کباڑ کے ڈھیر تھے۔

مشاہد نے جیب میں سے ایک چٹ نکال کر پتہ ایک بار پھر چیک کیا — پھر سامنے ایک شکستہ نیم وا گیٹ پر کوئلے سے لکھا ہوا نمبر پڑھا۔ یہی مکان تھا۔ وہ گیٹ کو دھکیل کر اندر چلا گیا۔ اندر گھاس آنکھوں کی سطح پر سرسراتی تھی اور ایک عجیب متلی آور بُو تھی جو فضا میں تھی۔ دوسری منزل کی کھڑکیوں کے چوکھٹوں میں پرانے اخبار چسپاں تھے۔ آنکھوں کی سطح پر سرسراتی گھاس میں سے ایک کُتیا نے سر نکالا اور غرائی اور اُس کے پیچھے پیچھے چھ سات پلّے گرتے پڑتے مست آنکھوں سے اُس شخص کو دیکھنے لگے جو اُن کے ملک ٹائم میں مخل ہوا تھا۔

مشاہد نے کُتیا کو ہمہ وقت نظر میں رکھتے ہوئے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔

دروازہ بہت دیر کے بعد کُھلا۔ اس طرح کُھلا کہ کوئی اُسے بہت زور سے دھکیلتا رہا اور تب جا کر وہ چراتا چراتا ہوا بمشکل کُھلا۔ اور جب کُھلا تو اُس کے سامنے ایک عجیب و غریب "شے" کھڑی تھی۔ کچھ کچھ میکبتھ کی — سو وِدرڈ اینڈ وائلڈ اِن دیئر اٹائر — تین چڑیلوں سے مشابہ لیکن قدرے زیادہ ہونق — وہ ٹھگنے قد کی گوشت سے ٹھنسی ہوئی ایک ادھیڑ عمر "خاتون" تھی جس کے بالوں نے برسوں سے کنگھی یا برش کا لمس محسوس نہیں کیا تھا اور وہ ایک قحط زدہ ملک کی گھاس کی طرح خشک اور بے جان بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا بے ربط لباس بھی کسی مردہ خانے کا عطیہ لگتا تھا اور اُس کی ایک آنکھ سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا جسے وہ ایک غلیظ چیتھڑے سے پونچھتی تھی۔ مشاہد کو دیکھ کر اُس

آمیز کے طور پر ایک لمبی "شُوں" کر کے ناک صاف کی اور پھر ہنسنے لگی... اس بھی گنتی میں بہت کم تھے "تم اُس کے دوست ہو ناں؟ ویلکم... آ جاؤ باہر کیوں تمہارا اپنا گھر ہے — آ جاؤ، اندر آ جاؤ — میں مسز برٹن ہوں اُس کی لینڈ لیڈی"

مشاہد کو اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامنا پڑا، وہ کچھ بڑبڑایا اور اندر چلا گیا۔

اندر کے حالات باہر سے بھی زیادہ ہولناک تھے۔ سیلن زدہ اور گرتا ہوا مکان اور بھی ایک ناقابلِ بیان بُو جو نہ انسانی تھی اور نہ حیوانی اور بہت عرصے کے بعد اسے علم کہ یہ بُو مسز برٹن کے جسم سے آتی تھی کیونکہ وہ کئی برسوں سے غسل خانے میں — کرنے کے لیے نہیں گئی تھی اور یوں بھی انگریز پانی نہیں ٹائلٹ پیپر استعمال کرتے

دیواروں پر جو وال پیپر جہاں کہیں تھا بوسیدہ تھا اور اُتر رہا تھا۔

مسز برٹن نے اسے ایک اندھیرے سے کمرے میں پیار سے دھکیلا اور لائٹ آن کر دی۔ پردے کھنچے ہوئے تھے۔ صوفے پر بیٹھتے ہی وہ اُس کے کُل سپرنگوں کی تعداد جان گیا اور ایک اور بُو کو جان گیا جو اُس ماحول کا ایک حصّہ تھی — وہاں متعدد بلیاں تھیں۔ دکھائی نہیں دیتی تھیں بلکہ سنائی دیتی تھیں اور شاید یہ اُن کے ٹائلٹ کی بُو تھی جو اُس کا ایک حصّہ تھی۔

"میں اُسے بلاتی ہوں —" مسز برٹن پُرمسرت ہاتھ ملتی، لڑھکتی ہوئی چلی گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ تشریف لائے... ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس، سگار کے کش لگاتے اور دھوئیں کے مرغولے بناتے اور مسز برٹن کے کندھے پر ہاتھ رکھے —

"کیوں مشیل تمہیں میری خوبصورت لڑکی پسند آئی؟"

مشاہد کو بجلی کی ننگی تار نے چھُو لیا "خوبصورت لڑکی" وہ ہکلا گیا "کون؟ —"

"مسز برٹن اور کون — اسے میں ہمیشہ مائی بیوٹی کہتا ہوں — کیوں ڈارلنگ؟"

اور مائی بیوٹی مسکرا رہی تھی اور ایک عجیب شان کے ساتھ ایک عجیب پُرمزاح مسکراہٹ کے ساتھ۔ اُس کے دانت یقیناً نقلی تھے اور وہ بھی جھڑنے کو تھے لیکن وہ بڑھاپے کے باوجود چوکس اور خبردار تھی۔ صحت مند اور پھرتیلی۔

نوٹنگھم کے مرکزی چوک کے بس سٹاپ پر کھڑے ہوئے ان دونوں نے ایک ہی

لمحے میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا... دونوں اپنا ردِ عمل طے نہ کر سکے اور ا
آمیز مسکراہٹ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر بابو نے پہل کی اور وہ اُس
آ گیا "ہیلو مشیل —"

"ہیلو —"

سیال آنکھیں اُن کے درمیان بہہ رہی تھیں اور وہ مخالف کناروں پر تھے... فاطمہ حائل ہو چکی تھی اور وہ گئے وقتوں کے جذبوں کی راکھ پر کھڑے تھے طرزِ تخاطب کو حدت دینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے.. بہت سا پانی بہہ چکا تھا ا
بچ کے عقب میں بہتے ہوئے ٹرینٹ کے پلوں کے نیچے سے...

"لونگ ٹائم نو سی —"

"ہاں.. میں مصروف رہا.. اور تم کیسے ہو؟"

"ماتا جی نے تمہارے لیے بھنی ہوئی دال اور آم کا اچار بھیجا تھا اور...
مصروف رہا..."

غلافی آنکھوں والا ہندو بچہ ایک مدت بعد اُس کے سامنے تھا.. لیکن وہ ایک بابو تھا. گندمی رنگ نکھرا ہوا اور مطمئن لگتا تھا. سوٹ استری شدہ اور بوٹ انتہا
شدہ.. فاطمہ؟.... لیکن اُس کی اُنگلیاں خالی تھیں.. شائد اس نے ویڈنگ رنگ اُتار
اور، "اِن دنوں کہاں ہو؟"

"ایک خوبصورت لڑکی کے پاس..." وہ ہنسنے لگا- اپنی لاپرواہ اور بینجو بجاتے ہ
اُس کے بدن کو بھرتی تھی اُس میں گھلی ملی ہنسی... فاطمہ؟.... "تم کل صبح کیا کر ر
میں جانتا ہوں کہ فائنل پروجیکٹ کے لیے تم گھر پر ہی کام کرتے ہو کالج نہیں جا
کل ناشتہ ہمارے ساتھ کرو... میرے اور میری خوبصورت لڑکی کے ساتھ اور بابا
کے ساتھ مُحبت کرتا ہوں..." اور وہ جان گیا کہ بابو ایسی آسانی سے فاطمہ کے بار
بات نہیں کر سکتا تھا... یہ خوبصورت لڑکی کوئی اور تھی... تھینک گڈنیس یہ کسی ا
جانب مائل ہو گیا ہے..

"پلیز مشیل —" اور یہ پلیز مشیل کہتے ہوئے بابو گلوگیر ہو گیا اور وہ انکار
سکا- اور اب بابو اپنی خوبصورت لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے سگار کے کش لگا رہا تھا
ایک مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ چاہت، بھری نظروں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا "ا

"وِتھ ہر —"

"آئی لَو ہر —" مشاہد قدرے مایوس تو ہوا کہ وہاں فاطمہ کی جگہ اور کوئی نہیں ہے اور پھر مسکرانے لگا-

"اوہ —" مائی بیوٹی نے اپنی غیر معینہ کمر تک جھک کر ایک رائل کورنش بجا لانے کی کوشش کی "تھینک یُو ایور سو مچ — بریکفاسٹ؟"

"شکریہ —"

وہاں سے "کچن" کا منظر بھی صاف نظر آ رہا تھا- مائی بیوٹی میلا اور پھٹا ہوا ایپرن اپنی توند پر لپیٹے مسلسل گنگنا رہی تھی اور ناشتہ بنانے میں مصروف تھی-

بابو میز پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا اور ٹیپ ریکارڈر پر پاکستانی اور ہندوستانی گانوں کی جو دھنیں سنائی دیتی تھیں اُن کی بیٹ پر اُسکے پالش شدہ سلیپر ایک خاص ردھم کے ساتھ ہلتے تھے-

جب ناشتہ سرو ہوا تو مشاہد کے فرائی انڈے پر ایک کالی لکیر تھی-

مشاہد نے اسے بہت دیر تک دیکھا-

بابو نے اُسے دیر تک دیکھتے دیکھا اور پھر وہ دیکھا جو وہ دیر سے دیکھ رہا تھا اور اُسے اپنی چھنگلی سے اُٹھا کر بولا "مائی بیوٹی، کیا یہ تمہارا بیوٹی فل ہیئر ہے؟"

مائی بیوٹی بہت پچھتائی اور شرمندگی سے لبریز ہو کر کہنے لگی "اوہ سوری بابو... غلطی ہو گئی — لاؤ اسے پھینک آؤں —" اُس نے بال کو انڈے کی سفیدی پر سے چُٹکی سے اُٹھایا اور باہر لے گئی-

ناشتے کے بعد بابو اسے اپنے کمرے میں لے گیا- اور وہ بھی کاٹھ کباڑ کا ایک مجموعہ تھا جس میں کہیں ایک پلنگ تھا- دو صوفے تھے جن کے سپرنگ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے بے چین تھے- غسل خانے کا دروازہ غیر ضروری اور میلے کپڑوں کا ایک ڈھیر اور اُن میں ایک بلی — اور اُس کی بُو؟.... یہاں وہ کیسے آ سکتی ہے- فاطمہ کیسے آ سکتی ہے!

شام تک دونوں اکٹھے رہے، مشاہد اپنے پروجیکٹ کو بھولا رہا اور وہ گانے سنتے رہے، قہقہے لگاتے رہے- وہ چائے نوش کرتے رہے جو ہر دس منٹ بعد "یُو مائی لَو..." مسز برٹن اُن کے لیے خاص طور پر برو کر کے لاتی رہی "میں بابو راؤ پٹیل بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مشاہد علی، مسز برٹن اور اس گھر کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو لیکن تمہیں

یقین کرنا ہو گا کہ اس جیسی خوبصورت لڑکی پورے انگلستان میں نہیں ہے —
بیٹوں کی طرح یا شائد اُن سے بڑھ کر میرا خیال رکھتی ہے... اگر اس کے بیٹے ہیں تو
نہیں جانتا کہ کبھی اس کی شادی ہوئی یا نہیں... اگرچہ ہوئی ہو گی کیونکہ یہ مسز برٹن
اور یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی کوئی اولاد ہے.. اگر ہے تو کہاں ہے کیونکہ وہ اس کے با
میں کبھی گفتگو نہیں کرتی — مائی بیوٹی کبھی حساب کتاب کے بکھیڑوں میں نہیں پڑتی
کچھ ادائیگی کر دوں تو خوش ہو جاتی ہے، نہ کروں تو بھی خوش رہتی ہے — میں اس
میں جو جی چاہے کر سکتا ہوں — لوئی ایمسٹرانگ کا "کنگ اولیویئر" فل والیوم پر سن
ہوں... غسل خانے میں پانی اُچھال اُچھال کر خوب مزے سے اشنان کر سکتا ہوں... میں
بیمار پڑ جاؤں تو ہماری بڑی بوڑھیوں کی طرح پتہ نہیں کیا کیا جڑی بوٹیاں اور پتے اُبال
مجھے پلاتی رہتی ہے اور یقین کرو میں تندرست ہو جاتا ہوں — کیا مسز برٹن ا
خوبصورت لڑکی نہیں ہے؟"

"گندی بہت ہے"

"بس وہ قدرے لاپرواہ ہے اپنے بارے میں لیکن — لوگوں کی دل و جان سے
پرواہ کرتی ہے... مجھے ناشتہ سَرو کر کے گلی میں نکل جاتی ہے اور ہر گھر میں جھانکتی ہے ا
کوئی کام تو نہیں.. کبھی کسی کے قالین کی ڈسٹنگ کر دی، کبھی کسی لاچار جوڑے کے برتن
دھو دیئے... شاپنگ میں مدد کر دی.... کسی کے لان کی گھاس کاٹ دی —"

"اور بے شک اپنے لان میں کُتیا بچے جنم دے —"

"ہاں۔ اُسے اپنی پرواہ نہیں ہوتی، مائی بیوٹی کو —"

وہ مسلسل باتیں کرتے رہے۔ ہندوستانی فلمی گانوں پر سر دُھنتے رہے۔ کبھی ما
بینجو کے آگے سر جھکا کر بیٹھ جاتا اور اُس کی پسندیدہ دُھن یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں.... چھیڑ
دیتا.... لیکن ان قہقہوں اور بینجو کے سروں کے باوجود اُن کے درمیان فاصلہ رہا اور
دونوں اس کا احساس رکھتے ہوئے بے آرامی کی کیفیت میں بیٹھے رہے اور اُسے کوشش
سے اپنے چہروں تک آنے سے روکتے رہے — حجاب برقرار رہا۔ دیوار موجود رہی اور
پردہ درمیان میں رہا۔ اِس پردے سے پرے فاطمہ تھی

ایک مجرمانہ چُپ سے پرے فاطمہ تھی۔

واپسی پر اُسے ایک اور مجرمانہ چپ؟ — کا سامنا تھا۔
پُر آسائش اور نفیس ذوق سے سجے ہوئے کمرے کی سٹڈی ٹیبل پر حسب
لِ اُن کی ڈاک ایک مخصوص کونے میں رکھی تھی — اُس میں مسز مے فیلڈ کے
کا سلیقہ پہچانا جاتا تھا..

ب سے اوپر جو سفید لفافہ تھا اُس کے سامنے کھُلا اور اُس میں سے ایک پرندہ باہر
پرندہ شائد اُسی لفافے کے کاغذ سے بنا تھا جس میں سے وہ باہر آیا تھا.. اُسے قید کرنے
اُس کے تعاقب میں، بے یقینی کے سمندر اور ان جانی بلندیاں عبور کر کے یہاں
پہنچ گیا تھا اور اُس کے سامنے پچ نہیں تھا... سی مرغ نہیں تھا — وہ تھا، مشاہد علی —
اُس سے کچھ کہنا چاہتا تھا — کل رات روشندان کے سامنے جھولتے ہوئے کاغذی
کے سامنے پیانو بجاتے ہوئے — پہلی حرکت ہوئی — ابورشن کا راستہ دشوار
ان میں اِسے رکھنا چاہتی ہوں — میں تمہیں یہ خبر صرف اس لیے دے رہی ہوں
جان جاؤ کہ تم ادھر ڈنمارک میں میرے پاس ہی رہ گئے ہو، کہیں نہیں گئے...

"پچ — پچ" مشاہد نے ایک گہرا سانس لے کر دانت پیسے اور خط ردّی کی ٹوکری
ل دیا — اُس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا — ورنہ "کائل" کی موجودگی میں یہ
ن تھا..

ردّی کی ٹوکری میں صرف ایک پرندہ تھا، یا شائد ایک اور چھوٹا سا پرندہ تھا اور
لیے اور مُڑے تڑے تھے...

پیانو اور پرندے کی قید سے فرار ممکن نہ تھا۔

اگلے اتوار اور پھر اُس سے اگلے اتوار بھی مشاہد اُس بدبُو دار سیلن زدہ گھر میں تھا..
کی بدبُو کم ہوتی جا رہی تھی.. وال پیپر کی رنگت بھی بہتر ہو گئی... صوفے کے
کم آزار ہو گئے اور اگر لان میں گھاس آنکھوں تک سرسراتی تھی تو یہ گھاس کی
سرسراتی رہے... یوں بھی پہلے دن کے علاوہ اُس کے فرائی انڈے پر کبھی کوئی
ائی نہیں دی تھی... مسز برٹن کے ماتھے پر بھی اس نے کبھی کوئی شکن نہ دیکھی
تو صرف اُس کے پہناوے پر — جہاں شکنوں کے سوا اور کچھ نہ تھا.. اور اُس
کا بے وجہ محبت کے سوا کچھ نہ تھا..

مشاہد اُسے ہمیشہ مسز برٹن کہہ کر مخاطب کرتا تھا — لیکن ایک روز اس
کہ "مائی بیوٹی" کہنا زیادہ آسان ہے —

اُوپر ایک صاف آسمان میں نمکین سمندری ہوا کے دوش پر آبی پرند
ٹھہراؤ کی کیفیت میں دکھائی دیتے تھے۔

دھوپ میں... انگلستانی دھوپ میں جو برائے نام حدت تھی اُسے پانی کی تر
کر رہی تھی اور مشاہد کپکپا رہا تھا — اُسے بھاری وولیز پہن کر آنا چاہیے تھا... کا
سائن سیلنگ بوٹ کے بادبان تھامے نامعلوم سمندروں کے سفر پر نکلنے والے تد
رانوں کی سنجیدگی چہروں پر طاری کیے افق پر نظریں جمائے کھڑے تھے جیسے تصو
رہے ہوں...

رکلف اُس کی تازہ ترین لینڈ لیڈی مسز ے فیلڈ کا بیٹا تھا۔ اُس کی بطور لاجر
پیشتر وہ ایک بہت نپی تلی اور روکھی سوکھی انگریز زندگی گذار رہا تھا... ایک پکا صا
ٹائٹ اپر لپ... آئی سے اولڈ بوائے... جالی گڈ... وہاٹ روٹ اور سپورٹس کار، گا
دو پائنٹ بیئر ہر ہفتے کی شام۔

مشاہد نے رکلف کے لیے وہی کیا جو چار برس پیشتر کوکی نے کیا تھا... لیے
باقاعدہ "جنٹل مین" بنایا بہت سے راستے دکھائے اور زندگی سے آشنا کیا۔

سائن، رکلف کا بچپن کا سویٹ ہارٹ تھا۔ اور اُس کا کام چپ رہنا تھا۔ وہ
تھا کہ اُس پر بار بار گونگا ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ بہت ہوا تو آدھ پون گھنٹے کے با
رئیلی" کہہ دیا۔ سیلنگ بوٹ رکلف کی ملکیت تھی اور اس سے ویسٹ رکلف کے
سے ایک کلومیٹر اندر بہت روانی سے ایک خاموش سمندر پر تیرتی تھی — اور ا
عین اوپر ٹھہراؤ میں آبی پرندے۔

مشاہد اپنی بدنی فطرت میں ایک میدانی آدمی تھا... دریاؤں کی قربت اُ
دیتی تھی لیکن سمندر کے سامنے وہ بے آرام محسوس کرتا تھا... ادھر سمندر کی نمکی
آس میں رکلف سارا ہفتہ آہیں بھرتا رہتا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے سیلنگ
میں شریک ہو جاتا۔

مئی کا مہینہ تھا... یہاں یہ چوٹی سے ایڑھی تک کے پسینے کا مہینہ نہ

ے" تھا اور ہوا میں سردی کی کاٹ بدستور موجود تھی۔

اُوپر اُن آبی پرندوں میں کہیں ایک گیلا کاغذی پرندہ بھی تھا جو اُسے نیچے بادبانی
ہما اپنی جانب اوپر دیکھتے ہوئے دیکھتا تھا.. وہ یقیناً وہاں تھا۔ کرسٹین نے میرے ساتھ
کیا ہے — جان بوجھ کر — وہ پھر تلملایا۔ اُسے اپنا آپ ڈنمارک کے ایک تہہ
ہما چھوڑ آنا پسند نہ تھا۔

"آئی سے اولڈ بوائے... وہاٹ اے سپلینڈڈ جاب... اے ڈگری وِد آنرز... بہت
باد"

"میری جانب سے بھی —" سائن بمشکل بولا۔

"شکریہ —"

"ہم تمہیں مِس کریں گے... میں اور سائن اور مم... یقیناً تم وطن لوٹ رہے

"نہیں... شائد ابھی نہیں۔" وہ وطن واپسی کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا

"اوہ رئیلی؟" سائن نے مسرت کا اظہار کیا۔

"شائد میں ادھر ہی ٹھہر جاؤں.. آج پرنسپل نے مجھے خصوصی ملاقات کے لیے بلایا
انہوں نے مجھے اِسی کالج میں ٹیچنگ جاب کی آفر دی ہے — شائد میں واپس نہ
ا"

"سپلینڈڈ اولڈ بوائے.." رکلف نے سر ہلاتے ہوئے ہاتھ ملے "یہ تو بہت اچھی خبر
مجھے فوراً مم کو اطلاع کرنی چاہیے کہ اُس کا کرائے دار ابھی کمرہ خالی نہیں کرے گا۔"

"میں اگر نہ گیا تو... میں نے لینڈ لیڈیز کے ڈسپلن میں بہت زندگی گذار لی ہے
لب میں اپنی مرضی کے مطابق کسی فلیٹ میں رہائش رکھنا چاہوں گا... میں اگر ٹھہرا
لیے مسز ے فیلڈ سے ابھی کچھ نہ کہنا —"

"اوکے ڈوکس —"

لیکن اُس کی بے آرام کیفیت کا سبب تھا۔ ایک اتھاہ گہرائی میں کاغذ کی کشتیاں ڈوبتی
اور سانس نہیں آتا تھا۔ یہی کہ اب اُسے ہمیشہ کے لیے انگلستان میں رہنا ہے... بقول
سپلینڈڈ فیوچر لیکن اس کے لیے کتنا کچھ تیاگ دینا پڑتا تھا۔ وہ یورپی رہن سہن میں

آسائش محسوس کرتا تھا لیکن چوہدری اللہ داد کی وجاہت بار بار اُس کے سامنے آ
— سفید مونچھیں اب ڈھلک رہی تھیں اور نیلی آنکھیں بجھ رہی تھیں ماند پڑ رہی تھی
اُنھوں نے زندگی کے کسی بھی فیصلے کے لیے اُسے کبھی مجبور نہیں کیا تھا... دباؤ ڈالنا ا
فطرت میں شامل نہ تھا... وہ اپنی خفگی کا اظہار بھی نہیں کرتے تھے صرف چند راتیں کر
بدلتے گذار دیتے تھے۔ اس سیلنگ سیشن پر آنے سے پہلے ایک مختصر خط میں اُس
انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا... ٹیچنگ جاب کی پیشکش اور یہ کہ میں انگلستان می
عرصہ رہنے کے بعد کسی دُھول آلود قصبے کی قربت میں کسی نیم تاریک فیکٹری میں سارا
اُون اور سوت کے غبار میں سانس نہیں لے سکتا تھا.. وہ جانتا تھا کہ جواب کیا آئے گا۔
برخوردار تم نے مناسب فیصلہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی دے اور صحت دے ا
خوشی دے۔ — ابھی ربط ختم نہیں ہوا تھا۔ رشتوں سے بندھی ڈوری منقطع نہیں ہوئی ت
لیکن اُس کے اندر کچھ کٹتا تھا اور اذیت دیتا تھا... شائد ناڑو کے کٹنے پر بچوں کو اسی اذ
میں سے گذرنا پڑتا تھا۔

سورج ذرا نیچے ہوا تو خنکی ناقابل برداشت ہو گئی۔

کِلف نے کشتی کا راڈر موڑا اور بادبان کا رُخ ساحل کی جانب کر دیا۔

سٹڈی ٹیبل پر حسب معمول اُس کی ڈاک ایک خاص ترتیب سے پڑی تھی ا
اُس میں مسز رے فیلڈ کا سلیقہ پہچانا جاتا تھا —

پیارے مشاہد بھائی جان،

ہم سب کی طرف سے آپ کو امتحان پاس کر لینے پر بہت بہت مبارکباد ہو.... آ
جی بہت خوش ہیں۔ اباجی کو گذرے ہوئے آج دو ماہ ہو گئے ہیں۔ آپا جی نے منع کیا تھا ک
مشاہد کو اطلاع نہ کرو اُس کے فائنل امتحان ہیں وہ پریشان ہو گا۔

آپا جی دوپہر کی روٹیاں پکا رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ مشاہد کا ارادہ اگر پاکستان واپ
آنے کا نہیں تو اللہ تعالیٰ اُسے خوش رکھے۔ میری دعائیں شامل حال رہیں گی... باجیاں بھ
سلام کہتی ہیں — آپ کا چھوٹا بھائی مردان علی۔

مشاہد کی آنکھیں بالکل خشک رہیں — اتنی خشک کہ چبھنے لگیں جیسے قحط زدہ زم

دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔
شیروڈ فارسٹ میں بہت سارے قدیم درخت تھے — اُس نے ایک ایسے درخت
انتخاب کیا جس کے تنے کو وہ اپنے دونوں بازوؤں میں بخوبی سمیٹ سکتا تھا اور پھر اُس
گلے لگ کر رونے لگا۔

From The Destined Walls'
of Cambalia' Seat of Cathian Can
And Samarchand By Oxus' Temir's Throne'
To Paquin of Sinaean Kings : And Thence
To Agra And Lahore of Great Mugal.

Pardise Lost Bk XI, I

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں...

برگیتا جھکی ہوئی دسمبر کی اُس پیلی دھوپ میں جس میں لاہور کی مٹّی کے ذرّے معلق رہتے ہیں اور اُس دھوپ کو نرم حدت کے ساتھ ساتھ ایک خاص زور دیتے ہیں انارکلی کے فٹ پاتھ پر پیلی دھوپ میں ایک چھُٹّی کی صبح میں برگیتا جھکی ہوئی حد درجہ احتیاط برتتی کتاب کے زرد پڑتے بے لوچ خستہ ورقوں پر جھُکی وہ پڑھتی جا رہی تھی اور مگن تھی۔ آس پاس جو بیشتر لوگ تھے وہ بھی جھکے ہوئے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں بھی کتابیں تھیں جن پر وہ جھکے مگن تھے۔ بند دوکانوں کے تھڑوں پر اور کھوکھوں میں اور فٹ پاتھ پر ایک کتاب دنیا آباد تھی جس میں چند لمحوں کے لئے بسنے کے لئے اُس کاغذی دنیا کو آباد کرنے کے لئے لوگ آتے تھے... اُن کی نظریں کتابوں کی ترتیب پر سفر کرتی اٹک اٹک کر چلتی یکدم رکتی تھیں اور وہ جھُک کر نہایت دھیان اور تقدس سے کتاب اُٹھا کر اُسے پہلے تو جھاڑتے اور اُس میں سے اُٹھنے والی دُھول کے بیٹھنے سے پیشتر ورق گردانی میں مشغول ہو جاتے۔ بہت کم ہوتے تھے جو ایسے ہوتے تھے جو کتاب کو چاہے وہ کتنی خستہ حالت میں ہو کیوں نہ ہو احتیاط اور پیار سے نہیں اُٹھاتے تھے۔ چھٹی کے دن انارکلی کے یہ فٹ پاتھ اور سڑک کا بیشتر حصہ پرانی کتابوں اور جرائد سے ڈھک جاتا اور اُن پر ہمہ وقت لوگ جھکے ہوئے ملتے۔ اُن کتابوں کے بیوپاری ایسے باشعور لوگ ہوتے ہیں جنہیں رقم سے زیادہ اس

ں کی فکر مندی ہوتی کہ گاہک جس کتاب کو خرید رہا ہے وہ اُس کی اہمیت سے بھی آگاہ ے یا نہیں — وہ بہترین فیشن میگزینز۔ فنِ تعمیر۔ طب یا باڈی بلڈنگ کے رسائل سے ے کر دنیا کے ہر اہم مصنف کی ہر کتاب اور اُس کے متن سے آگاہ ہوتے ہیں اور اُس کی رو قیمت جانتے ہیں۔ اِن میں ایک ریٹائرڈ سرکاری آفسر بھی ہیں جن کے بچے ہونڈا اکارڈ ن کی کتابوں کے صندوق لاد کر صبح سویرے یہاں چھوڑ جاتے ہیں بمعہ والد صاحب کے ر شام کو واپس لے جاتے ہیں۔ اِن قریشی صاحب کی زندگی ہی یہی ہے۔ وہ فٹ پاتھ پر ن کتابیں سجاتے ہیں اور پھر کوئی ایسی کتاب اُٹھا کر مطالعہ میں محو ہو جاتے ہیں جسے گھر میں وتے پوتیوں کے شور و غل کی وجہ سے اطمینان سے پڑھ نہیں پاتے تھے۔ کتاب کی ونت سے زیادہ اُس کے بارے میں گفتگو کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ کلرک ہیں جو قریشی صاحب کی طرح قطعی طور پر گاہکوں میں دلچسپی نہیں رکھتے اور اگر ن سے کسی کتاب کی قیمت دریافت کر لی جائے تو اِنہیں سخت ناگوار گزرتا ہے کیونکہ نہیں اپنی کامک بُک سے توجہ ہٹانی پڑتی ہے —

لیکن سب کے سب کتابوں والے خبطی نہیں ہوتے سیانے بھی ہوتے ہیں اور اک کاروباری بھی ہوتے ہیں۔ ملک میں بس اسی فٹ پاتھ پر مکمل جمہوریت تھی — پ یہاں کچھ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ کچھ بھی خرید سکتے ہیں۔ یہاں کوئی سنسر نہیں.. حکومتی یا ی۔ آپ اگر فلپ ہتی کی ممنوعہ "ہسٹری آف عربز" خریدنا چاہتے ہیں تو آسانی سے مل ئے گی۔ اگر "سٹانک ورسز" کی تلاش ہے تو وہ بھی کہیں نہ کہیں ذرا سرگوشی سے تیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک حقیقت اِن فٹ پاتھوں پر بہت انوکھی تھی یہاں مذہبی ب بہت کم دستیاب ہیں... آپ کو دنیا کی ہر شے مل جاتی ہے لیکن مذہب بہت کم ملتا ہے

مشاہد نے بہت آہستگی سے کیونکہ وہ اُسے چونکانا نہیں چاہتا تھا اس کے کندھے پر ذرکھا "برگیتا" لیکن وہ چونک گئی اور چونکتے ہوئے ایک ہچکی بھری "ہاں۔ مشاہد"

وہ اُس خستہ کتاب پر جھُکا جس کے اوراق پر وہ جھُکی ہوئی تھی "کیا پڑھ رہی ہو؟"

"جائس کا "یولیسز" — میں نے یہ ایڈیشن کبھی نہیں دیکھا۔ ذرا دیکھو اِس کے ق ٹوٹے ہیں..... کیسی حیران کن بات ہے کہ یہاں لاہور کے انارکلی بازار کے فٹ پاتھ یولیسز" کا ایک یُونیک ایڈیشن مل جاتا ہے اور جائس اس میں لاہور کا تذکرہ کرتا ہے۔"

"نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اِسے پڑھا ہے — اور" پھر وہ شرمندگی
سے کھانسا "خیر پڑھا تو نہیں — کئی بار دل کڑا کر کے شروع کی اور پھر ہمت ہار گیا
اس کے ساتھ نہیں چل سکا... پھر ایک مرتبہ صرف اس شرمندگی سے بچنے کے لیے اور اپنی
دانشوری کی عصمت بچانے کے لیے کہ یہ ہے وہ شخص جو اپنے آپ کو ادب کا رسیا
ہے اور — اس نے "یولیسز" نہیں پڑھا میں نے پھر کوشش کی اور بس کہیں کہیں سے
کچھ ہاتھ آیا..... اب یہ مت کہنا کہ تم نے اسے پڑھ رکھا ہے؟"

"ہاں میں یہ کہوں گی — صرف میں نے اسے سویڈش میں پڑھا تھا — مکمل"

"اور اُس میں بھی لاہور کا تذکرہ تھا"

"تم یقین نہیں کرتے — اُس نے بوسیدہ ورق پر جھکے ہوئے کہا..." یہ شروع
ہوتا ہے... صفحہ 196 God I Would Not Mind اور آخر میں ہے...

O How the Waters Come Down at Lahore —

تسلی ہو گئی؟"

"لیکن جائس نے پتہ نہیں اِسے کن معنوں میں استعمال کیا ہے مالی بلوم... یہ
پانیوں کا نیچے آنا ہے یہ ذرا فحش ہے —"

"کوئی بھی معنی ہوں.. لاہور تو — لاہور ہے" برگیتا ہنسی — اگرچہ وہ شلوار
قمیض میں تھی لیکن اُس کا آبنوسی بدن دسمبر کی اُس پیلی دُھوپ میں کپڑوں سے الگ ہو
تھا ایک جانور کی طرح رسّے تڑواتا — زور لگاتا — الگ ہوتا تھا۔

یہ اُن کی روٹین تھی — چھٹی کے دن کی صبح..... انارکلی کے کتابوں سے آ
فٹ پاتھوں پر دل پسند اور غیر متوقع کتابوں کا شکار — لیکن آج وہ براہ راست اسلام آباد
سے واپس آ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں سفر کی تھکاوٹ اور نیند بھری ہوئی تھی۔

سی ڈی حسین اُسے اُن نظروں سے کیوں دیکھ رہا تھا — پُر ستائش یا پُر خواہش
نظریں اُس کے لیے ایک معمول تھیں.. لیکن وہ شخص اُسے کسی اور طرح دیکھتا تھا.... جیسے
پہچاننے کی کوشش میں ہو۔

وہ تین پیکنگ کی پُتلیاں تھکتی ہی نہ تھیں اور کیسے تھکتیں — اُن کے انگ انگ
سے ہزار ہزار کے نوٹ لپٹ کر انہیں مسلسل تازہ دم کیے جاتے تھے — فیصل مسجد
فجر کی اذان بلند ہوئی تو وہ سب چپ ہو گئے اور تینوں پُتلیوں نے سر جھکا کر اپنے دامن

لیے۔
ارشد اپنے اعزاز میں منعقد کیے جانے والے مجرے کے اختتام سے بہت پہلے جا

مشاہد اور برگیتا نے بھی کالیے کے ہاں رکنے کی بجائے یہی مناسب جانا کہ اُسی وقت
کے فوراً بعد لاہور روانہ ہو جائیں — وُہی وِلیز بالا کوٹ والی جیپ اور راستے میں
آف لوٹسز... سادھوکے کے کنول... اور مشاہد کے دانتوں میں ایک خلاء...
جب اُنہوں نے اُس ڈانسنگ پارٹی کو چھوڑا تو کالیا ایک گیان دھیان میں گم بدھا کی
اپنے ڈرائنگ روم کے درمیان لوٹس پوزیشن میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور تینوں
یاں اُس کے گرد ناچ رہی تھیں —
اور اُس کا برادر عزیز ان پُتلیوں کے گھومتے ہوئے لبادوں کو دیکھ کر اچھلتا تھا اور
ف... ف۔

راوی کے پُل کے پار... سنگ میل پبلی کیشنز سے دائیں جانب ٹاؤن ہال اور
زمزمہ توپ کے قریب سے گزرتے ہوئے سفر کی تھکان کے باوجود انہیں خیال آیا کہ آج
ٹی کا دن ہے اور انارکلی کے فٹ پاتھوں پر...

"میرا خیال ہے میں اس ایڈیشن کو خریدنا پسند کروں گی" — برگیتا نے مشاہد کی
طرف دیکھا "یقیناً تمہاری رقم تمہارے بٹوے میں محفوظ ہے کیونکہ میں نے تو پچھلی رات
ہیں فضا میں نوٹ اُڑاتے ہرگز نہیں دیکھا —"

"نہیں —" مشاہد نے فوراً کہا اور سُبکی محسوس کی "ایک بار میں نے بھی جی کڑا
کر کے تقریباً پانچ سو روپے کے نوٹ اُن پر نچھاور کیے تھے... ذرا اپنے آپ کو جینوئن جاٹ
ثابت کرنے کے لیے"

"تم جانتے ہو کہ ڈانسنگ پارٹی میں — میں کس مہمان پر بُری طرح عاشق ہو گئی
تھی...؟"

"اور بے چارے مشاہد کو یکسر فراموش کر کے..."

"ہاں —"

"کون تھا وہ — میرا چہرہ دیکھ کر بتاؤ کہ کیا حسد کا رنگ واقعی سبز ہوتا ہے؟"

"تم ایک پپی سے تو حسد نہیں کر سکتے... وہ کُتورا جو ہر دو چار منٹ کے بعد اُچھل

کروَف وَف کرتا تھا — بس وُہی — میں اُسی پر عاشق ہوئی تھی —"

یہ ہم ہیں برگیتا — یہ ہم ہیں"

"کیا مطلب؟" برگیتا نے "یولیسز" کو بند کر کے اُسے حیرت سے دیکھا "کو

ہیں؟"

"ہم — اور کون — یہاں ریلیجس بک سوسائٹی کے سامنے پنجاب بُک مارٹ کے آگے سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی قدیم مہک میں گم ہوتے ہوئے ابھی — سرد ہوا نرگس کے پھولوں کی پہلی مہک آ سکتی ہے... اُس وے سائڈ ہوٹل کے پچھواڑے میں آلوچے کا درخت ہے — ابھی تو دسمبر ہے، ابھی بہت دن ہیں اُس کے شگوفے کھلنے — لیکن وُہ ابھی کِھل سکتے ہیں اور اُن میں سے ایک شگوفہ یہاں تمہارے ہاتھ میں تو ہوئے "یولیسز" کے عین اوپر آ گرے یہ بھی ممکن ہے — وہاں جہاں جائس نے لاہ تذکرہ کیا ہے وہاں آ گرے —"

"ہوں —" برگیتا نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی شلوار کی الاسٹک ذرا ڈھیلا کیونکہ وہ اُس کی کمر میں کھُب رہی تھی" ابھی... تم وہاں ہو... اُن پُتلیوں کے پاس — لیے ایسی باتیں کرتے ہو شائد میری توجہ اس کتاب کی خریداری سے ہٹانے کے لیے میں نے تم سے چند روپوں کی گذارش کی تھی —"

"اوہ شوُر —" مشاہد نے بے دھیانی میں اُسے بٹوہ تھما دیا۔

ریلیجس بک سوسائٹی کے فٹ پاتھ پر ایک خوانچہ فروش سنگھاڑے فروخت کر تھا — اُس نے سادھوکے کے قرب و جوار میں جوہڑوں میں جہاں کنول کھلتے تھے اُن دُبلے پتلے مزدوروں کو لنگوٹ باندھے سردیوں کی سویروں میں اُترتے دیکھا تھا سنگھاڑے نکالنے کے لیے... انہیں پکانا اور پھر نفاست سے اُن کی سیاہ چھال ایسے کاٹنا کہ کے سفید بدن کی صرف ایک جھلک نظر آوے۔ ایک فن تھا — جیسے بیسن کے پیٹھیاں والے خستہ اور کرارے بنانا بھی ایک فن ہے —

She Disliked Umbrella With Rain. He Liked Woman With Umbrella. She Disliked new Hat With Rain...

برگیتا پڑھتے پڑھتے رُک گئی — "مشاہد آر یُو شوُر یہ ایک عظیم ناول ہے؟"

"میری رائے کی کوئی حیثیت نہیں، اسے ایک عظیم ناول قرار دیا جا چکا ہے

مکمل طور پر پڑھا ہے میں نے نہیں — آؤ آگے چلتے ہیں"

بھرے ہوئے شٹرز اور بند دروازوں اور سڑک کے درمیان تک خواہش کی اور انارکلی کی ہر شے نمائش پر تھی۔ فریم شدہ مذہبی قطعے بھی اور براز بھی... چھتریاں، جرابیں، پرانے کپڑے... سیکنڈ ہینڈ شوز اور جینز اور ملک شیک اور بہت کچھ... اور بہت کچھ... یہاں اپنی ٹانگوں کو سائیکلوں کے گھومتے ٹائروں سے بچانا دشوار تھا اور ہر کوئی ذرا اپنے آپ بچا کر چلتا تھا اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور برگیتا صرف ایک گہری ہچکی بھرتی تھی۔

"دِس از لائف —" برگیتا نے کہا۔

"یہ ہم ہیں برگیتا —" برگیتا نے کہا۔

انارکلی کے اختتام پر مسلم مسجد کا اونچا مینار لاہور کے آسمان میں اپنے آس پاس اڑتی پتنگوں اور گڈیوں کی موجودگی میں بے آرام لگتا تھا۔

فارمن میموریل چیپل کی جرمن/ سوس/ آسٹرین طرز کی جیومیٹریکل عمارت — اپنے اردگرد کے مشرق.... بلکہ مشرق کی بند کھڑکیوں، ٹوٹے ہوئے شیشوں والے دروازوں۔ لکڑی کی بالکونیوں اور اُکھڑتے پلستر کے درمیان ایک بے جوڑ پیوند تھی۔

لوہاری چوک پر انارکلی کا اختتام کھیر کی ایک وسیع پرات پر ہو رہا تھا جس میں سے دکاندار.... سکوپ در سکوپ کھیر نکالتا تھا اور چینی کے پیالوں میں اُلٹ کر گاہکوں کے منتظر ہاتھوں میں تھماتا چلا جاتا تھا۔ سنٹرل ہوٹل کی عمارت اُس پر جھکی ہوئی تھی...

"واپس چلیں؟"

"نہیں دسمبر ہے — اور چار چیزیں ہیں اور اُن میں سے ایک چیز میں تمہیں آج دکھانا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہاری وِلیز؟"

"وُہ نولٹن مارکٹ اور فٹ پاتھ کے درمیان وہاں ہے جس کونے میں لاہور میں مفت کے اخبار پڑھنے والے فی مربع فٹ سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں.. یوں بھی وُہ کسی اِرادے سے سٹارٹ نہیں ہو گی... کچھ جیپیں اور کچھ عورتیں بھی۔"

سیاہ آنکھوں کی اوٹ سے برگیتا نے اپنے مرد کو دیکھا اور اُس نے مسکراہٹ کو لبوں پر آنے سے پہلے ہی سمیٹ لیا — وہ اُن عورتوں میں شامل تھی۔

عینک ساز اور پھلیرے .... لوہاری دروازہ۔

مسلم مسجد کے نیچے بھٹیروں کی دوکانوں کے پہلو میں سے ایک تنگ راستہ
فصیل... یا جو کچھ ملبے اور بھربھری سرخ اینٹوں کی صورت میں یہاں... کہیں وہاں کچھ
تھا اُس کے گرد جو سبزے اور پانی تھے اُن کی طرف نکلتا تھا — ایک زمانے میں وہاں
اور پانی تھے اور اَب وہاں کچھ بھی نہ تھا... اُس زمانے میں مشاہد موچی دروازے کی
سے اُترتے گوالمنڈی چوک سے ذرا اِدھر ایک مکان میں رہتا تھا.. وہ کیا اُس کے والدین
بہن بھائی رہتے تھے... جس کی بلند چھت پر شہر بھر کی پتنگیں اور گڈے گرتے تھے اور
عالمی کی آگ سے جنم لینے والے راکھ پرندے گرتے تھے... چودھری اللہ داد کو گرم
دوپہروں میں خس کی ٹٹیوں کی مہک اور نمی میں منہ کھولے خراٹے لیتے ہوئے دو چکے
چھوڑتا اور لوہاری اور موچی دروازے کے درمیان میں فصیل کے ساتھ ساتھ جو
سائے والے گھنے درخت تھے اُن میں آجاتا اور وہاں ایک دنیا آباد ہوتی — پہلوان اور
کے پٹھے ... کہ وہاں مختلف اکھاڑے بھی تھے۔ اندرون شہر کے شوقین اپنے بٹیروں
پنجروں کے ساتھ ... کہ وہ اپنے پرندوں کو شہر کے تنگ حبس سے نکال کر کھلی فضا میں
سائے میں، اس سائے میں بہتی چھوٹی سی نہر کے کنارے سانس لینے کے لئے لے آتے
ہر عمر کی خواتین کپڑے دھو رہی ہوتیں اور محلے میں ظہور پذیر ہونے والے سکینڈلز
بارے میں ایسی اشاریاتی زبان میں تبادلہ خیال کر رہی ہوتیں جو ابھی مشاہد کی سمجھ سے با
تھی۔ اُن کے بچے نہر میں بے دریغ چھلانگیں لگا رہے ہوتے اور مشاہد بھی اُن میں شامل
کر ایک آزاد اور بے دھڑک بچہ بن جاتا... وہ چار چھلانگوں اور ڈبکیوں کے بعد اُس
جسے کے لُوں بہت سرد پانی سے کھڑے ہو جاتے اور وہ اپنی نیکر دوبارہ پہن کر اطمینان
گھر واپس پہنچ جاتا اور وہاں ابھی تک — ہنوز — چودھری اللہ داد خس کی ٹٹیوں کی مہک
اور نمی میں منہ کھولے خراٹے لے رہے ہوتے...

لوہاری دروازے کی محراب کے نیچے ایک چھوٹے سے حجرے میں سے ایک ملنگ
گدڑیوں کے ڈھیر میں سمٹا بیٹھا تھا کیونکہ تمامتر ملنگی کے باوجود یہ دسمبر تھا اور وہ ایک عام
انسان تھا اور اُس حجرے میں دھوپ کا گذر کبھی نہ ہوتا تھا — تالوں کی دوکان۔ شفاخانہ
جراحی۔ کریانہ سٹور۔ بان کی رسیوں کی دوکان۔ تمباکو فروش۔ ٹوپیاں بنانے والا ایک ادھیڑ
عمر کاریگر... پھل فروٹ۔ اور کسی مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر مولوی صاحب گرجتے ہوئے... نگاہ
مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں... غیظ و غضب کے عالم میں پڑھتے ہوئے۔

یہاں برگیتا کی جانب بہت کم لوگوں نے توجہ کی۔
ناتواں کی پسلیوں کی طرح الگ الگ چھوٹی خستہ حال اینٹیں اور اُن کی درزوں میں
پرانے چونے کا سفوف جھڑتا ہوا — ایک جھروکہ.. کہیں چونے کا لیپ ابھی باقی کہیں
کی شکل نمایاں ہوتی۔ برسوں کی بارشوں اور موسموں کی سختی جھیلنے کے بعد اب بھی
تنگ بازار کے اُوپر معلق اور اُس پر "بیٹھک کاتباں" کا بورڈ آویزاں اور اِس کے
ایک اور خوشنما مگر مسمار ہوتا ہوا چھوٹا سا جھروکہ جس کے نیچے سے گزرنے والوں
ہمہ وقت خدشہ کہ یہ ابھی ریزہ ریزہ ہو گا اور اس پر اُبھرے گل بوٹے اُن کے دامنوں
آگریں گے — چند تنگ سیڑھیاں اُوپر جاتی دکھائی دیتی تھیں۔
مشاہد رک گیا۔
"ہاں" برگیتا نے ہچکی بھرتے ہوئے پوچھا۔
وہ سیڑھیوں کے اندر چلا گیا — "آ جاؤ"
چھوٹی اینٹ اور چونا اور بہت مخدوش اور گرنے والی تعمیر.. اتنی تنگ کہ ایک
بھی کندھے بچا کر اگلی سیڑھی پر قدم رکھتا تھا۔ برگیتا سانس روکے اُوپر چڑھتی رہی....
ایک دھواں زدہ چھوٹا سا کمرہ.... درجن بھر کاریگر جوتے اور سینڈلیں بنانے میں محو اور
ایک سیاہ رنگ کی بے دھڑک سی عورت اور ایک مرد کو یکدم اپنے اُوپر کھڑے دیکھ کر
ابھی متجسس بھی — کمرہ اتنا مختصر تھا کہ وہ مشاہد اور برگیتا کے داخل ہونے سے تقریباً
ہو گیا تھا..
جھروکہ اسی کمرے میں سے کھلتا تھا... کواڑ میں ابھی ایک پرانا اور گدلا شیشہ باقی
نیلے رنگ کا۔
"میں — ذرا اِس میں سے جھانکنا چاہتا ہوں.. اگر آپ اجازت دیں تو..."
کاریگر جوتوں کے تلووں پر سریش لگا کر اُنہیں جوڑتے رہے اور اُنہوں نے جواب
نہ سمجھا... مشاہد جھکا ہوا جھروکے تک گیا اور زور لگا کر وہ کواڑ کھولا جس میں
نیلے رنگ کا ایک شیشہ باقی تھا... کچھ گرا یا ٹوٹا.... نیچے لوہاری بازار تھا۔ شفاخانہ جراحی..
کی دوکانیں... تمباکو فروش...
کون تھا جو اِس جھروکے میں بیٹھتا تھا...
کون تھا —

اِس شُو فیکٹری کے پہلو میں ایک پرانی دیوار اور کچھ کھنڈر تھے اور اُن پر سینکڑوں کی تعداد میں قطار اندر قطار اپنی سریش کے سوکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ حویلی تھی جناب عالی — ہم تو کاریگر لوگ ہیں دہاڑی دار لیکن اِدھر کے بوڑھے کہتے ہیں کہ مہندی صاحب کی ماں یہاں پر مجرا کرتی تھی اور یہ حویلی اُسی کی تھی۔

ہاں جی بالکل... کوئی ساٹھ سال پہلے ناچ گانا اِس علاقے میں ہی ہوتا تھا اور سب گانے والیاں رہتی تھیں اور بڑی بڑی نامی گرامی... توبہ توبہ نام بھی اِس کا چوک چکلہ تھا...

پرانے مکینوں کے لئے اب بھی — اِن دنوں بھی۔ یہ چوک چکلہ ہے۔

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں — شکار — وادیٔ سوات — کامران کی بارہ دری اور — چوک چکلہ۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے — اور دھواں اُس سریش سے اُٹھ رہا تھا جسے بجلی کے ہیٹروں پر گرم کیا جا رہا تھا — سریش جتنی گرم ہو گی اتنی ہی جوتی پائیدار ہو گی۔ پتھر جوڑنا نال سریش کیہا —

کاریگروں کے ہاتھ نہایت مشاقی سے گرگابیوں کی ایڑھیوں پر سریش لگا رہے تھے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے... حویلی کے کھنڈر میں چند مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی سُریلی ہو رہی تھیں۔

اُس زمانے میں وڈیو کیمرے ہوتے تو آج ہم اپنی ٹیلی ویژن سکرین پر اِس حویلی اور اِس کے جھروکے کے سائے میں کسی مغل منی ایچر میں سے نکلتی ہوئی رقاصہ کی تصویریں حرکت میں دیکھتے... اور آج کیا دیکھتے ہیں — سریش۔ گرگابیاں اور تنگ کرتے کاریگر۔

وہ نیچے آ گئے۔

نیچے ہر سُو خوار کیں تھیں۔ اگر پیرس کے میکسیم میں دنیا کی بہترین خوراک میسر ہے تو لاہور کے لوہاری میں دنیا کا بہترین ناشتہ ملتا ہے کیونکہ اکثر لاہوری کھانے کے لئے زندہ رہتے ہیں کہ زندہ رہنے کے لئے کھانا تو مجبوری ہے جب کہ کھانے کے لئے زندہ رہنا ایک فن اور بلند آئیڈیل — پوری حلوہ... کچوریاں... چنے... دہی کلچے۔ لسی۔ سری پائے... کھد اور زبان اور حاجی کی نہاری اور ہر وہ شے جو آپ کا کولیسٹرول ہائی کر کے آپ

جلد از جلد مالکِ حقیقی سے ملا دے...

حویلی خراسیاں... نہ جی نہ... ایک خشمگیں دوکاندار اُن کا راستہ روک لیتا ہے — آپ اندر نہیں جا سکتے... اندر تو کُتا کھُلا ہوا ہے — اور کُتا صرف اِس لئے کھُلا ہوا ہے کہ اندر ایک پرانا مندر ہے، کہتے ہیں چند دیدہ زیب مجسمے بھی ہیں اور اِس متروکہ جائداد پر قبضہ کرنا ہے اور اگر محکمہ اوقاف کو خبر ہو گئی کے اندر مندر ہے تو مشکل درپیش ہو گی اِس لئے — اندر تو کُتا کھُلا ہوا ہے۔

اُدھر چوک جھنڈا کی چاول منڈی سے چڑیوں کا بے پناہ شور یہاں تک آ رہا تھا... جہاں ہر جانب چاول بکھرے ہوں گے وہاں چڑیاں تو ہوں گی اور شور تو مچائیں گی۔

بریگیتا نے ایک گلی میں جھانکا "یہ بورڈ پر کیا لکھا ہے؟"

"گلی مونج کُٹاں... یہاں جیلوں میں سے قیدیوں کو لا کر اُن سے مونج کُٹوائی جاتی تھی... اب پورا ملک مُونج کُوٹتا ہے — تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے —

ٹین کے بوسیدہ چھجے پر جھولتا "شاہد پٹیالہ بینڈ" کا بورڈ اور اِس مختصر نیم سیاہ بیٹھک میں جاتی ایک تاریک سیڑھی جس پر قدم رکھتے ہوئے بریگیتا گھبراتی تھی" کیا یہ لوگ مائنڈ نہیں کریں گے؟"

"نہیں" مشاہد اُس کے آگے آگے اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا" یہ اور طرح کے لوگ ہیں —"

"اوئے بسم اللہ..." بیٹھک میں داخل ہوتے ہی ایک آواز آئی اور اُس آواز کے ساتھ ہی موسیقار آقا نواز کا سراپا آیا اور یہ سراپا جو بنا تھا تو ایک پرانے کوٹ اور ایک بغیر پُھندنے کی ترکی ٹوپی سے بنا تھا اور یہ ترکی ٹوپی یہ فیض — اب سرخ نہیں کالک اور میل سے نیم سیاہ ہو چکی تھی اور بسم اللہ... کون آیا ہے — بسم اللہ... سوائے چرس کے طویل کشوں کے لہجے میں اتنی مہمان نوازی اور دوستی ممکن نہیں —

بیٹھک میں موسیقی کی غربت تھی۔

مختلف باراتوں کے ساتھ بینڈ کی تصویریں — گال پھلائے کلیرنٹ پھونکتا کوئی مونچھوں والا اُستاد اور یہ تصویر اتنی پرانی تھی کہ اُستاد کی سفید مونچھیں بھوری ہو کر سیاہ ہونے کو تھیں... چند اخباری تراشے... امانت علی خان۔ مہندی حسن۔ اُستاد شریف خان پونچھ والے... بڑے غلام علی خان... اُستاد برکت علی خان کہ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ

تھی... غلیظ دری پر جس میں بہت بُو تھی وہ دونوں بیٹھ گئے... موسیقار آقا نواز لہراتا
کے سامنے براجمان ہو گیا — "ہم جناب عالی باؤ بینڈ سے زیادہ سُر میں ہیں..... اس لئے
ڈولی کے پیسے الگ ہوں گے — سرکار میری آرٹسٹ کو سُر میں تو ہونا چاہئے.. باؤ بینڈ
سُر میں نہیں ہیں.."

"کونسے باؤ بینڈ والے؟"

"یہ —" موسیقار آقا نواز اُسی طرح اپنے اوورکوٹ اور تُرکی ٹوپی میں لہرا اٹھا — کاش کہ ٹوپی کے ساتھ پُھندنا بھی موجود ہوتا تو صورت حال زیادہ لہراتی.. "ہمارے سامنے بورڈ لگا کر اپنے آپ کو موسیقار کہتے ہیں —" وہ بالکونی پر ذرا جھول گیا

گلی کے پار مشاہد نے وہ بورڈ نہیں دیکھا تھا جو موسیقار آقا نواز کے دل میں کی طرح چُبھتا تھا اور جس پر "باؤ بینڈ لدھیانے والے" اب مشکل سے پڑھا جاتا تھا۔

"میں نے — میں نے" موسیقار آقا نواز نے اپنے کوٹ کی چھاتی پر ہتھیلی کہا "ایک ہزار سے زیادہ گانے کمپوز کئے ہیں — اور جناب عالی صدقے پنج تن پاک خواجہ صاحب — اپنے خواجہ صاحب خورشید انور سن لیتے تو کہتے موسیقار آقا نواز بس تم ہو — ہم کیا ہیں.. یہ کہتے خواجہ صاحب.. پر وہ تو فوت ہو گئے ہیں اب کیا کریں"

"ایک ہزار گانے؟"

"ہاں جی — پر ہم نے اُن کو ریکارڈ نہیں کرایا —"

"کیوں؟"

"اپنے فن کو بیچ دیتے — اپنی کمپوزیشن بیچ دیتے..." اُس نے پھر ہتھیلی اور کی چھاتی پر رکھ کر اعلان کیا "یہاں دفن ہیں میرے بچے — سرکار میری کمپوزیشن میرا بچہ ہوتی ہے — یہاں دفن ہیں — اور جب میں مروں گا اللہ بخشے تو اِدھر ہی ہوں گا اور میرے ساتھ یہ دفن ہو جائیں گے — فن کو بیچیں گے نہیں — خواجہ صاحب بیچتے تھے"

برگیتا مسکراتی رہی۔ وہ بہت زیادہ سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن اِس شخص کی انفرادیت اور طرز زندگی سے متاثر ہو رہی تھی — ایک چھوٹی سی بیٹھک، بازار میں سالِ خوردہ بالکونی، جہاں شام ڈھلے چند موسیقار آتے تھے اور اپنے ساز ساتھ لے آتے تھے.. اور اپنے اپنے سیکسافون۔ کلارنٹ یا ٹرمپٹ پر شادی بیاہ کے موقعوں پر پسند کی جانے

دھنوں کی پریکٹس کر کے چلے جاتے تھے... اگر کوئی بُکنگ آ گئی تو اپنی اپنی وردی اور بلیں نچھاور کرتے تھے وہ نصیب اپنا اپنا — دن کے وقت وہ کہیں خوانچہ لگاتے کہیں کلرکی کرتے تھے یا بیکار پھرتے تھے۔

مشاہد نے اُٹھتے ہوئے پچاس روپے کا ایک نوٹ موسیقار آقا نواز کی گود میں رکھ

"بسم اللہ —" موسیقار آقا نواز اُٹھا اور ذرا لہرایا.. "پر جنج ڈولی کے پیسے الگ ہوں اور راجہ کی آئے گی بارات، کے الگ ہوں گے..."

گلی کوچے... کوچے گلیاں..

بدن میں سفر کی تھکان تھی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی لیکن اس کے باوجود برگیتا پر آئی ہوئی تھی اور شوقن میلے دی — اور میلے کے شوقین تھکتے نہیں.. چلتے جاتے

چار چیزیں ہیں —

اور کیا خوشی کا چار مرغابیوں سے واقعی کوئی تعلق نہیں —

اور اگر یہ ہم ہیں تو شگوفے کہاں ہیں — وَف.. وَف.

کوچے گلیاں۔ گلی کوچے۔

کوچہ داروغہ نزول۔ کوچہ خیمہ دوزاں۔ کوچہ دھوبیاں... ماشکیاں... سیٹھیاں..

ہاں.. سید مٹھا بازار کے کوچے۔

مینوں دس خاں شہر لاہور اندر
کنّے بوہے تے کنیاں باریاں نیں،
تینوں دساں میں شہر لاہور اندر
لکھاں بوہے تے لکھاں باریاں نیں....
اِک کھولاں۔ اک کجّاں۔

قرۃ العین حیدر اپنے رکھ رکھاؤ میں بہت محو اور بہت بظاہر بے پرواہ ایک گلی میں کہتی ہیں "ارے — یہ تو بالکل لکھنؤ کی طرح ہے —"

"صرف ایک فرق کے ساتھ عینی آپا —"

"وہ کیا؟" عینی آپا کی تیوڑی چڑھ جاتی ہے۔

"لکھنؤ- کب کا اجڑ چکا- لاہور آباد ہے —"

عینی آپا شائد ری ایکٹ کرنا چاہتی ہیں پھر اُوپر تنگ بازار کے اُوپر آسمان کے اِس مختصر ٹکڑے کو دیکھتی ہیں "مے بی یو آر رائٹ —"

تینوں دساں میں شہر لاہور اندر —

اور چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں...

شاہ حسین باغبان پورہ سے عصر کے وقت چلتے تھے — دلی دروازہ- سنہری مسجد وزیر خان تنگ بازار اور پھر ورق والا بازار جہاں چاندی کے ورق کوٹنے جاتے تھے ایک ردھم ایسی جسے ورق کوب ہی پہچانتے ہیں — گہری دھمک اور دل پر ضرب لگانے والی ردھم جس کے آگے صرف بے بسی اور بے اختیاری ہے — جب شاہ یہاں پہنچتے صادق ورق کوب کی دوکان کے آگے تو فریدالدین عطار سے بندھ جاتے اور ورق کوبوں کی ضربوں پر دھمال ڈالتے — اور پھر مغرب راوی کے کنارے پر پہنچ کر ادا کرتے —

اَساں اندر باہر لال ہے — اَساں مرشد نال پیار ہے-

مشاہد بھی اِس ردھم سے آشنا تھا- رنگ محل مشن ہائی سکول سے واپسی پر دروازے کی جانب چلتے ہوئے — دھم دھم... کبھی مدھم کبھی بلند اور دھم دھمادھم ورق- ورق- ورق....

ایک ڈھکے ہوئے بازار میں ایک باریش شخص کی دوکان پر سب سے زیادہ آنکھوں والیاں اور سیاہ برقعوں والیاں پھوٹتی ہوئی کونپلیں تھیں اور وہ صرف سُرمہ بیچتا تھا — نور والا ہے اور سُک بھی بیچتا تھا جو — کشمیر والا ہے — اور یہ سیاہ ریش دوکان کا سُرمہ اپنی آنکھوں میں ڈالے کئی نسلوں سے صرف سُرمہ بیچتا تھا اور سُک بیچتا تھا — سیاہ اور پوشیدہ آنکھوں والیاں ہنستی تھیں اپنے برقعوں کی اوٹ میں جن کے چہرے بدن ابھی پھوٹ رہے تھے تو یہ نیم خواندہ اندرونِ شہر کی لہورنیں تھیں اور اُن کے دل کے اندر ہی عشق شاہ حسین والی دھمال ڈالتا تھا اور یہ وہی کھوئیاں تھیں جہاں سے ما پانی بھرتے تھے-

جنہاں کھوئیاں تے بھرن معشوق پانی —

لال حویلی کے بارے میں سرکاری کاغذات پر مرقوم ہے —

پراپرٹی نمبرD/749

لال حویلی کی چار منزلہ عمارت لوہاری منڈی بازار جو کہ پیر بھولا سٹریٹ کے شمال کی جانب واقع ہے- 1940ء میں عنائت علی ولد میراں بخش اِس کا مالک تھا- 1980ء میں یہ سہیل اکرم، ممتاز بیگم، ایم سعید اور ایم صدیق کی جائداد بن گئی — مقامی روائت ہے کہ یہ حویلی مہاراجہ کشمیر نے اپنی ایک رقاصہ دارو کے لئے تعمیر کی تھی- تاریخ تعمیر بیسویں صدی کے آخر میں بتائی جاتی ہے —

حوالہ پراپرٹی نمبرD/749 کا اختتام ہوتا ہے-

لوہاری منڈی بازار ڈھکا ہوا تھا... جیسے پاکستان بننے سے پیشتر شاہ عالمی کا سارا بازار ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈھکا ہوا ہوتا تھا اور اُس میں چلنے والیاں فربہ متمول زنانیاں جب نظر اُٹھا کر اُوپر دیکھتی تھی تو آگ برساتا آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ کپڑے اور ترپال کے سائبان تنے نظر آتے تھے- پر یہ تو سرما کے دن تھے اور چھاؤں نہیں دھوپ کی ضرورت تھی اور پھر بھی لوہاری منڈی بازار ڈھکا ہوا تھا... کہیں سے آسمان کا ایک حصہ اگر دکھائی دے جاتا تھا تو وہیں سے اِس بازار کے سائبانوں پر جھکی جھلک دکھتی تھی.. لال حویلی کی سرخ عمارت کے جھروکے اور کھڑکیاں حیرت کی ہیبت میں اتنے گم کہ اُن کی اینٹیں لرزتی تھیں اور پلستر لرزتا تھا اور وہ حیرت کی ہیبت میں گم — لاعلم کہ اینٹیں اکھڑ رہی ہیں اور پلستر لرزتا ہے —

راستہ ایک تنگ اور گندی نالیوں والی گلی کے اندر تھا اور دروازہ کھُلا تھا اور اِس دروازے میں سے بھی سریش اور چمڑے کی مخصوص بُو نیچے اُتر رہی تھی- سیڑھیاں جو اوپر جاتی تھیں دماغ کو گھماتی تھیں- اتنی تنگ اور عمودی کہ صرف دیکھنے سے یقین نہیں آتا تھا کہ اُن پر پاؤں رکھ کر اُوپر تک جانا ممکن ہے-

دروازے سے متصل ایک مخصوص لاہوری وضع کے مکان کی تاریکی میں سے ناگاہ ابھرا ہوا ایک نوجوان اِنہیں دیکھ کر مسکرایا بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ برگیتا کو دیکھ کر مسکرایا اور کھڑکی سے کود کر اُن کے پاس آگیا-

"آر یو ٹُورسٹ؟"

"نہیں —" برگیتا نے کہا" پاکستانی —"

نوجوان نے کچھ دیر اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچا جس میں

مایوسی سے سرہلاتے ہوئے اپنے مکان میں واپس لوٹ جانا سرفہرست تھا... دوسرے لفظوں صرف شغل میلے کے لئے اُن کے ساتھ گپ لگانا تھا ٹائم پاس کرنے کے لئے — چونکہ اُس نے سر کھجایا اور کہنے لگا... "میرا خیال ہے کہ آپ تو اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں؟" اُس نے مشاہد کو غور سے دیکھا۔

مشاہد خاموش کھڑا رہا —

"جنابِ عالی یہ کنجری کی حویلی ہے —" اُس نے لفظ "کنجری" کا ردعمل اُن کے چہروں پر نہ پا کر پھر سر کھجایا اور ٹائم پاس کرنے کے لئے باتیں کرنے لگا" ہاں جی، کنجری کی حویلی ہے۔ بہت لوگ دیکھنے آتے ہیں... بے غیرتی بہت ہو گئی ہے پاکستان میں۔ ہمارے مولوی صاحب نے پچھلے جمعے کہا تھا کہ اِس پر بُرجیاں بنا کر مسیت بنالیں تو پاک ہو جائے پر جی کون مانتا ہے —"

مشاہد نے نوجوان کے کندھے پر ایک دوستانہ تھپکی دی۔ "کیا نام ہے تمہارا۔"

"گفور — یہ لوگ کسی کو اندر نہیں آنے دیتے، کہتے ہیں ہمارے کام کا حرج ہوتا ہے۔ ایک بندہ بھی چکر لگا جائے تو کاریگر اُسے دیکھتے ہیں؟ اور کم سے کم تیس گرگابیاں کم بنتی ہیں"

"یہاں بھی گرگابیاں بنتی ہیں...؟" برگیتا نے پوچھا۔

"ہاں جی — وہ برگیتا کے التفات سے خوش ہوا" لیڈی شوز کی ایڑھیاں، گرگابیاں تھوک کے حساب سے بنتی ہیں درجنوں کاریگر لگے ہوئے ہیں۔ کارخانہ ہے موچیوں کا۔ اِدھر شہر کے اندر جتنی بھی پرانی حویلیاں ہیں اُن میں سے اکثر میں یہی کام ہوتا ہے... کرایہ بہت دیتے ہیں گرگابیاں بنانے والے... یہ ہر کسی کو اندر نہیں آنے دیتے پر میرے واقف ہیں آؤ — آجاؤ بہن جی —" اُس کی شہدی نظر برگیتا کے واضح بدنی زاویوں سے لپٹی تھی اور اپنی جنسی خواہش کو بہن جی میں لپیٹ دینا کتنا آسان اور محفوظ ہے۔

سیڑھیوں کی تعمیر جان بوجھ کر اِس انداز میں ترچھی کی گئی تھی کہ ہر قدم کے بعد اگلا شخص اوجھل ہو جاتا تھا — صرف اتنی گنجائش تھی کہ ایک شخص اُوپر جا سکے۔ بالکل سکے... سیڑھیوں میں کہیں کہیں چوکور روشندان تھے جن سے شہر کا شور اندر آتا تھا... اندر، گراؤنڈ فلور پر ایک فوارے کے خشک باقیات تھے جس کے گرد ایک ہشت پہلو تالاب میں جہاں پانی ہوتا تھا وہاں سریش کے ڈبے اور چمڑے کی کترنیں تہہ در تہہ

تھیں اور اوپر چوتھی منزل تک تمام کھڑکیاں... درجنوں رنگ دار شیشوں والی — بیل بوٹوں والی اور گلرنگ بیل بوٹوں والی کھڑکیوں کے پٹ پہلی سے چوتھی منزل تک سارے کے سارے اسی مرکزی ہال میں خشک پڑے فوارے پر کُھلتے تھے جس میں سریش کے ڈبے اور چمڑے کی کترنیں پڑی تھیں۔

وہ ہر منزل پر پہنچ کر کھڑکی سے نیچے جھانکتے اور نیچے موچی جوتے بناتے ہوئے اور فوارے کے تالاب میں سریش کے ڈبے اور چمڑا —

چوتھی منزل پر ایک مستطیل کمرہ تھا جس کا بڑا جھروکہ بازار پر کھلتا تھا اور جھروکے کی چھت پر کسی باکمال کاریگر کے ہاتھوں کی صناعی گُل بوٹوں اور پچی کاری کے کام میں اب بھی جھلک دکھاتی تھی.. رنگین شیشوں کے موزیک میں ایک کائناتی توازن تھا۔ اور ایسے اور بھی کمرے تھے جن کے سنگِ مرمر اور سنگِ سرخ کے فرش ایسے تھے کہ نظر اُن پر پڑتی تو وہیں رہ جاتی اور ان میں بھی کھڑکیاں اور جھروکے ایسے تھے کہ تصویریں تھیں۔

درجنوں کمروں میں — جھروکوں کی چھتوں پر جو شیش محل تھے تو اُن میں کسی رقاصہ کے رقص کے انداز عکس نہیں ہوتے تھے بلکہ گرگابیاں بناتے ہوئے کاریگر، کے ٹو کے تیز سگرٹ جلتے ہوئے، سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کے ڈائیلاگ دوہراتے ہوئے اور ٹھٹھے کھجاتے ہوئے کہ اُن کے سامنے ریما اور مدیحہ شاہ کے ہیجان خیز پوسٹر اُنہیں حرکت میں رکھتے تھے اور ایک بُو چمڑے، سریش اور کاریگروں کے غلیظ بدنوں کی ملی جلی — ان کا عکس ہوتا تھا اُن شیش محلوں میں۔

سلجوق دی... آرکیٹیکٹ کا کہنا ہے کہ اس حویلی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا فنکشنل ہونا ہے.... فنِ تعمیر میں اہم ترین ضرورت کسی بھی عمارت کا اس کے مکین کی طرزِ زندگی اور اُس کے پیشے کے مطابق فنکشنل ہونا ہے — اگر اس میں ایک کاروباری نے قیام کرنا ہے تو — اگر ادیب یا شاعر کو وہاں رہنا ہے تو — ایک سیاست دان کی ضرورتیں بھی مختلف نوعیت کی ہوں گی — لیکن ایک طوائف کے بھی تو فنکشنل مسائل ہوں گے.. پرائیویسی — نیم تاریکی، فوارے کے پانیوں کی ٹپ ٹپ کا رومانس، خواب گاہیں جن تک رسائی آسان نہ ہو — اور یہ سب فنکشن لال حویلی میں موجود تھے..

مرکزی جھروکے میں سے برگیتا نے نیچے بازار میں جھانکا... سائبانوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جس کے نیچے جو زندگی رواں تھی اُس کی یہاں سے خبر تک نہیں ہوتی —

اس شیشہ گری کے ہال میں سے جہاں ہر شیشہ یہ کہتا ہے کہ اور کون ہے آئینوں میں بڑا ہی تو ہے — شیشے کے جتنے زیادہ ٹکڑے ہوں گے اُن میں اتنے ہی عکس ہوں گے اُس کے... جو اپنے آپ کو حالتوں میں دیکھنا پسند کرتا ہے... شاہ جہاں نے ممتاز کی محبت کے باوجود ایک ایسا محل تعمیر کروایا تھا جس کی چھت ایک عکس در عکس شیشوں کی دنیا تھی کہ وہ اپنے سراپے کو دیکھ سکے اور کنیز کو صرف اپنا پسینہ آلود چہرہ نظر آوے...

مستطیل کمرے کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ایک تختہ نصب تھا اور یہ صرف تختہ نہیں ایک مخفی دروازہ تھا جو اپنی موجودگی سے حیران کرتا تھا۔ یہاں سے بھی تنگ سیڑھیوں کا ایک تاریک گھیرا اُوپر کو اُٹھتا تھا...

"اوپر کیا ہے گفور..." برگیتا نے پوچھا...

"گفور نہیں — غفور —" مشاہد نے کہا۔

"ہاں جی گفور ہی میرا نام ہے — اوپر بس جی کچھ بھی نہیں... آپ اُدھر آ کر ذرا کھڑکی سے نظارہ کریں — نیچے فوارہ چلتا تھا اور کہتے ہیں کہ فوارے کے ساتھ مہاراجے کے ملازم اُس وقت ڈیوٹی پر ہوتے تھے اور آتش بازی چھوڑتے تھے — یہ کھڑکیاں... چوتھی منزل کی... کھلی رہتی تھیں اور اس شیش کمرے میں جو کوئی بھی ہوتا تھا اُسے کھڑکی سے باہر انار چھوٹتے دکھائی دیتے تھے۔ بس جی عذابِ الٰہی تھا۔ عیاشی کی کوئی حد ہوتی ہے اسی لیے اب یہاں جُوتے بنتے ہیں —"

بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن ایک تأثر جُوں کا تُوں تھا۔ حویلی کے کھڑکیوں، روشن دانوں اور دروازوں میں سے اندر آنے والی روشنی کے آہستہ آہستہ تاریک ہوتے زاویے وہی تھے... عمارت کی گہری سرخی میں ایک نیم سیاہ کیفیت تھی — باہر دسمبر کی دوپہر تھی لیکن اندر شام ہو رہی تھی۔ خواہشوں کا ایک اندھیرا ہمہ وقت اُتر رہا تھا — ان دنوں جب حقیقت میں شام اُترتی تھی تو شائد ادھر چوکھٹوں پر اور جھروکوں میں اور رنگین شیشوں کے عقب میں دیئے جلتے تھے — اینٹ اور گارے میں کاما سُترا کی تفسیر۔

برگیتا نے ایک ہچکی بھری کہ اُس پر یہ حویلی جنس اور خواہش کے انکشاف کے طور پر ظاہر ہو رہی تھی "کیا ہم اوپر جا سکتے ہیں؟"

"اوپر کچھ بھی نہیں ہے —" مشاہد نے پلٹ کر کہا۔

ایک کاریگر جو بہت دیر سے برگیتا کی پُشت پر سریشی نظریں جمائے انہیں دیکھ رہا تھا

"اوپر مائی نُوراں ہے جی —"

مشاہد بھی مسکرایا اور دیوار میں نصب تختے کو ایک کونے سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا — جیسے وہ جانتا تھا کہ کس زاویے سے وہ کھلے گا۔ وہاں بھی سیڑھیاں تھیں۔

اور تنگ سیڑھیوں کے گھیرے میں دم گھٹتا تھا۔

ورٹیگو کی کیفیت ذہن پر سوار ہوتی تھی۔

سیڑھیوں کے گھیرے کا جہاں اختتام ہوتا تھا وہاں بھی ایک تختہ تھا لیکن وا تھا۔ وہ کھلا تو برگیتا کا ماتھا اُس کی کمر سے آ لگا...

وہ کھانسا اور آگے ہوا۔ آگے ایک مختصر سا نیچی چھت کا کمرہ تھا... اور چھت پر یہاں بھی شیشے کا نازک کام جیسے ٹوٹنے کو ہو۔ کمرے کی وسعت جتنا ہی ایک جھروکہ جس کے جھروکوں پر نیلے اور زرد رنگوں میں باریک بیل بوٹے اور دربار کے منظر تھے... جہاں جہاں سے یہ آرائش اکھڑ چکی تھی وہاں کہیں صرف لباس تھے اور سر نہ تھے اور کہیں درباریوں کے درمیان میں سے اینٹیں ظاہر ہو رہی تھیں — یہ نیم تاریکی میں کم دکھائی دے رہے تھے لیکن دربار کا جلال اور شاہی لباس ابھی تک بُرش جس نے انہیں بنایا تھا اُس کے رنگوں میں گیلے اور تازہ لگتے تھے۔ فرش سیاہ پتھر کی سلیں تھا جس پر چند اَن دُھلے برتن، ایک سلور کی دیگچی اور چینی کی کچھ پیالیاں جن کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے اور اُن کے درمیان میں بیٹھی ہوئی خاتون کی جھکی ہوئی پُشت اُن کے قدموں کی چاپ سے سیدھی ہوئی اور اُس نے مُڑ کر دیکھا — "مشاہد جی — بسم اللہ" وہ راکھ بھرے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر بمشکل اُٹھی کہ گھٹنوں کے درد کی ٹیس اُس کی زبان تک جاتی تھی — لنگھ آؤ —"

سیاہ آنکھیں جن میں مشاہد کے لیے شک کے جھروکے تھے اس کی جانب وا ہوئے کہ تم اسے جانتے ہو اور مجھے بے خبر رکھا۔

"یہ میری بیوی ہے —" مشاہد نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"لگتی تو دیسی ہو پر بڑا مشکل اور انگریزی نام ہے تمہارا —" وہ ابھی تک جوڑوں کے دردوں میں سے اُٹھ رہی تھی "مشاہد جی تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں — آ جاؤ۔"

اُس نے مشاہد نے، برگیتا کو دیکھا کہ اِسے دیکھ لو — اس کی شکل دیکھ لو۔ اِسے تم رکھنے کا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا — تم جوانی کے تناسب میں ہو اور یہ ایک بڑھیا ہے

— ستر سے اوپر — تمہیں اس سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود نے یہاں حسد کی وہی سُول اپنے سینے میں کُھبتی محسوس کی جو وہ مشاہد اور مردان الفت بھری ہنسی سے — سات کمروں والی کوٹھی کے مستطیل کمرے میں آتی ہنسی محسوس کرتی تھی۔

"بیٹھو — پر ادھر کوئی تمہارے لائق تو جگہ نہیں ہے —" اس نے ایک دیو کے ساتھ لگی ایک پیڑھی فرش پر سیدھی کر دی۔

وہ جب کھڑی ہوئی تو اُس کی ایستادگی میں ایک عجیب شاہانہ پن تھا۔ ایک حُسن گُم گشتہ غرور تھا... پر حُسن اَن جھرّیوں میں اور دھنسی ہوئی آنکھوں اور اُن کے گرد کوے کے پاؤں ایسے حلقوں میں تو نہیں تھا — "چائے پیو گے؟" اُس کا سراپا آئینوں میں چ تھا... اور کون ہے آئینوں میں... بس تو ہی تو ہے — جب آئینے تھے تو حُسن نہیں تھا اب آئینے ہیں پر حُسن کہاں —

وہ راکھ بھرے جُھرّیوں والے ہاتھوں سے ٹوٹے ہوئے کناروں والی چائے کی پیالیاں اُنہیں تھماتے ہوئے ایک خاص سُر میں حرکت کرتی تھی۔

"آج کا سکور کیا ہے؟" مشاہد نے اُس کی طرف دیکھے بنا پوچھا۔

وہ ہنسی — چند دانت، بہت سارے خلا اور خلا پر کروٹیں لیتے جھکتے ہونٹ جو مُرجھاہٹ سے مُردہ ہو چکے تھے — "میں تیس گرگابیوں کو ایڑھیاں لگا چکی ہوں۔ صرف بیس اور — اور میرے دن کا خرچہ نکل آئے گا — تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"بس یونہی —"

"اِسے بتایا ہے کہ میں کون ہوں —" اور جب اُس نے "اِسے" کہا تو آنکھ سے ایک اشارہ کیا اور آنکھ کے گرد جھریوں کے جال نہ ہوتے تو یہ اشارہ بہت پُرکشش ہوتا۔

"نہیں —"

"تو پھر بتاؤ ناں مشاہد جی —"

"یہ نُوراں ہے —"

اِسے چھپانے کا، مجھ سے راز رکھنے کا کوئی جواز تو نہ تھا پھر مشاہد نے ایسا کیوں کیا... آج تک اِس نے کوئی بات کوئی شخص مجھ سے خفیہ نہیں رکھا... وہ اپنی ناپسندیدگی کو ضبط کر گئی اور پھر نُوراں کی طرف دیکھا اور مسکرائی... اُس نے دیکھا تو وہ جھکی اور ہتھیلی

لے گئی اور جھکنے میں اُس کے جوڑوں کے درد نے اسے بہت اذیّت دی۔ "اِسے اس نے آنکھ سے پھر وہی اشارہ کیا "تمہاری بیگم صاحبہ کو — چھت پر لئے چلتے

اوپر چھت پر اُن کی آنکھیں چندھیائی ہوئی بند ہونے لگیں... جیسے قیدی اپنی کوٹھڑی میں سے باہر صحن میں قدم رکھتا ہے۔

وہاں ایک وسیع کمرہ بھی تھا — جس کے ایک چوتھائی حصے میں چھت کے ساتھ ہم بالکونی بھی تھی — بالکل خالی اور ویران اور شہر پر کُھلتی اگرچہ اب کیلوں سے بند ان کے رنگین شیشے کہیں تھے اور کہیں نہیں تھے —

"تم اپنی بیوی کو بتاؤ کہ یہ کمرہ کس کام آتا تھا؟"

"تم بتاؤ —"

"نہیں تم بتادو مشاہد جی —"

اُس نے اُس کا یہ "مشاہد جی" کہنا بھی ناپسند کیا۔

"یہاں دارو مہاراجہ کے لیے رقص کرتی تھی اور وہ اوپر بالکونی پر بیٹھ کر دیکھتا تھا ڈانسنگ رُوم تھا —"

"یہ بہت چھوٹا نہیں — ڈانسنگ کے لیے —"

"دارو عام طوائف تو نہیں تھی —" نُوراں ناراضگی سے بولی "مجرا تو نہیں کرتی — صرف ایک شخص کے لیے ناچتی تھی — تو ایک ناچنے والی کے لیے اور ایک والے کے لیے کیا یہ کمرہ اور بالکونی کافی نہیں —"

"ہے —" برگیتا نے فوراً مان لیا اور اُس کی نظریں اُس پتنگ کا پیچھا کرنے لگیں نگ رُوم کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے ڈولتی گرتی نظر آ رہی تھی اور اُس کے نظر میں مسجد وزیر خان کے دو مینار ساکت تھے، لاہور شہر کا شور تھا اور بُرج اور تھے —

"تاریخ لاہور" کا مصنف کنہیا لال ہندی کہ کایستھ باشند شائستہ قوم.... لال حویلی سے میں خاموش ہے کہ اُس کے عہد میں شائد یہ ابھی زیر تعمیر تھی لیکن اسی نقشے کی ار حویلی کے بارے میں مرقوم ہے کہ حویلی کلّو بائی المشہور اہلووالیہ محلّہ یکی دروازہ ملف کہی جاتی ہے۔ عمارت اس کی نہایت مستحکم و پختہ چُونہ گچ ہے۔ بیچ میں کھلا ہوا

صحن ہے اور چاروں طرف دو منزلہ، سہ منزلہ پختہ عمارتیں ہیں۔ نواب ذکریا خان بہادر
یہ حویلی اپنی محبوبہ عورت کلّو بائی کی خاطر تعمیر کی تھی جو قوم کی مطربہ تھی۔

دارو بھی قوم کی مطربہ تھی۔

اور موراں بھی قوم کی مطربہ تھی جس نے مسجد موراں طوائف بازار پاپڑ منڈی
علاقہ شاہ عالمی دروازہ میں تعمیر کروائی — بانیہ اس کی موراں طوائف، مہاراجہ رنجیت سنگھ
کی محبوبہ تھی — بازار پاپڑ منڈی، علاقہ شاہ عالمی دروازہ میں واقع ہے — اس کم
عورت کی رسائی مہاراجہ کے دربار میں یہاں تک تھی کہ کوئی کام اس کے مشورے کے
کے بغیر نہ ہوتا تھا۔

بفضلِ ایزدِ دارائے افلاک ۔ چہ موراں مسجدے آراست بر خاک

دارو عام طوائف تو نہیں تھی — مجرا تو نہیں کرتی تھی۔

"مشاہد جی — میں شائد ایک برس بعد اوپر آئی ہوں — میرے جوڑوں کا در
مجھے لے بیٹھا ہے اور ابھی مجھے گرگابیوں کے بیس جوڑے اور بنانے ہیں —"

وہ — نُوراں — اُس کمرے میں یوں چلتی تھی جیسے ابھی رُکے گی اور پھر او
بالکونی کی طرف دیکھے گی اور پھر بازو اُٹھا کر اُن کا گھیرا بنا کر گردن لچکا کر ذرا کولہوں کو ہ
حرکت دے کر ناچنے لگے گی۔

ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے جو آسمان دِکھتا تھا اُس میں رنگ بر
گڈّے اور پتنگیں نیلاہٹ میں تیکھی بل کھاتی کشتیوں کی طرح تیرتے تھے۔

"تم نے اِسے میرے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟" وہ بے دانت ہنسی دو مرجھا
ہوئے ہونٹوں میں سے ظاہر ہوئی۔

"یونہی —"

برگیتا کے اندر ایک اور سُول چبھی۔

وہ جیسے مشاہد سے مخاطب ہوتی تھی اُس میں — اُس کے طرز تخاطب میں ا
ایسی اپنائیت تھی جو صرف جنسی قربت کے بعد ظاہر ہوتی ہے — اور یہ ممکن نہ تھا —
عمروں کا تفاوت — اور کیا یہ واقعی ممکن نہ تھا —؟

ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے —
آسمان میں رنگ برنگے گڈّے اور پتنگیں کندھے مارتے ہوئے بلند ہوتے ہو

تیکھی بل کھاتی کشتیاں نیلاہٹ میں —
یہ کمرہ — جہاں ایک بالکونی — ایک شخص اور ایک ناچنے والی اور ٹوٹے ہوئے
ہونٹوں میں سے بل کھاتی کشتیاں — یہاں — جنہاں تھاواں تے عشق دھمال پائی —

نُوراں نے انہیں دیکھا "عبدالرحمٰن چغتائی جی کو جانتے ہو —"

"ہاں —"

"اُن کے بھائی عبدالرحیم جی کو جانتے ہو؟"

"نہیں —"

"وہ میرے مور ڈانس کا شیدائی تھا — میں اُن دنوں سچ مچ ایک مورنی تھی —
مشاہد جی —" بے دانت مسکراہٹ... جوڑوں کا درد، جھریاں اور ابھی شہر کی مورنیوں
کے پاؤں کے لیے بیس اور گرگابیاں۔

"یہ کون تھی؟" پیچ دار سیڑھیوں کی تنگی میں سنبھلتے اُترتے برگیتا کی اندھیرے میں
ندے ڈی آواز آئی۔

"دارو کی پوتی — نُوراں...."

اسی لیے تو چار چیزیں ہیں —

اور چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں — اُن میں سے ایک شکار ہے
ر آباد کے آس پاس — اور وادی سوات کا ایک سلیٹی منظر ہے — اور کامران کی
بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے — اور چوک چکلہ ہے — جہاں لال
حویلی ہے — جس میں نُوراں ہے...

ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے —

وہ لم ڈھینگ سا نوجوان باریش پادری تھا جو آنکھیں بند کر کے گردن لم
ہارمونیم پر اُنگلیاں چلاتا ایک عجیب عالمِ سرخوشی میں یا شائد عالمِ بالا میں پہنچا ہوا، جب
اُس کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے تھے وہ بہت ہی مگن گاتا تھا اور اُس کا گیت کچھ
لگتا تھا اور کچھ دیر بعد کھلتا تھا کہ وہ سویڈش یا انگریزی میں نہیں بلکہ پنجابی میں ال
یسوع اَج آیا سی — الاپ رہا ہے اور ڈھیروں ثواب کما رہا ہے۔ جب وہ "یسوع" کا
ادا کرتا تو اُس کی تان ایک قوال کی طرح — وہاں تک لے جاتا جہاں اُس کا سانس اکھ
کو آتا اور اُس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا۔

اپر مال کی ظفر علی روڈ کے آخر میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جہاں سے ا
کچی آبادی کا آغاز ہوتا ہے وہاں ایک پُر آسائش مغربی طرز کے گھر کے اندر قالین پر
گرم ماحول میں — چمکیلے بھڑکیلے اور شوخ رنگنے کپڑے زیب تن کئے خواتین جن میں
کی سیاہ رنگت مزید بہار دکھاتی تھی، رِبن لگائے اور سرخ ہیڈ بینگز تھامے، سرخ ہائی ہ
شوز میں اور جنٹل مین — بڑے بڑے جہازی کالروں کی نیلی پیلی قمیضوں کے ساتھ
باٹم پتلونیں یا پھر چیک دھوتیاں پہنے اور رنگین پگڑیاں باندھے پُر آسائش گھر کے ا
قالین پر سر جھکائے سر دُھنتے تھے اور جب راڈنی یعنی لم ڈھینگ پادری جی یسوع کی
لگاتے تھے تو وہ عقیدت سے اور جھکتے تھے لیکن — اُس کرسمس کیک پر بھی مسلسل
رکھتے تھے جو اُن کے درمیان رکھا گیا تھا اور اُس کی مٹھاس اور کریم کی حلاوت اُن
گلوں میں اُترتی جاتی تھی اور شائد کچھ کمزور عقیدے والے یہ خواہش رکھتے تھے کہ پا
جی کا کرسمس گیت ذرا شتابی سے اختتام تک پہنچے تاکہ یہ کیک نوش کیا جائے —

آج کرسمس ہے —
شہر میونخ میں آج کرسمس ہے
فاصلوں کی کمند سے آزاد

میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے...
میرا دل ہے کہ شہر لاہور ہے جہاں — آج کرسمس ہے اور راڈنی ایزبرگ
الحروف پو آنکھیں بند کئے ثواب کے ساتویں آسمان پر پہنچا یسوع کی تان پر اپنا چہرہ سرخ
ے سرخ کیے جا رہا تھا...

مشائلہ نے اپنا وائن گلاس اُٹھایا اور اُس کی خالی تہہ میں ایک مرتبہ پھر جھانک کر
واپس میز پر رکھ دیا۔ وائن کی مزید بوتلیں راڈنی کے ذاتی کپ بورڈ میں محفوظ تھیں جس
کی چابی ظاہر ہے راڈنی کی جیکٹ میں تھی اور وہ یہ جیکٹ اس وقت پہنے ہوئے تھا اور اگر
اِس لمحے جب وہ یسوع کی تان لگا رہا تھا مشائلہ اُس کے پاس جا کر اُس کی جیب چابی کے
لیے ٹٹولتی تو وہ اپنا کرسمس کیرل منقطع کئے بغیر اُسے ایک جھانپڑ رسید کر دیتا — اسی لیے
اپنی بوریت کا مظاہرہ کرنے کی خاطر اُس نے اپنا وائن گلاس اُٹھا کر اُس کی خالی تہہ میں ایک
مرتبہ پھر جھانک کر واپس میز پر رکھ دیا تھا —

اور پھر مشاہد کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی ایک اور جمائی روکنے کی کوشش میں ایک
ہزار شکل کا چند لمحوں کے لیے مالک بن چکا تھا۔

"سکول —" مشائلہ نے اپنا گلاس بلند کر کے لبوں سے چھوا "میری کرسمس
ٹو یو —"

"میری کرسمس ٹو یُو ٹو مشائلہ —" اُس نے شائد آج سترھویں بار مشائلہ کو
میری کرسمس کہا تھا۔

مشائلہ سکینڈے نیوین بھرے بدن، سنہری بالوں اور بے باک مسکراہٹ کا حسن
تھی۔ اُس کے گالوں پر جو لالی تھی وہ وائن کی کم اور کھلی فضا میں کام کرنے والی کھیت
مزدوروں کی زیادہ تھی۔ وہ موٹاپے سے ذرا اِدھر جہاں جنس کہتی ہے کہ بس ایں جا است...
بس ذرا اِدھر تھی لیکن سکینڈے نیوین اخلاقیات سے کوسوں دور تھی — وہ باقاعدہ ایک
کنواری اور باعصمت قسم کی دوشیزہ تھی — یعنی شادی سے پہلے تک — کیونکہ وہ دہلی میں
متعین ایک سویڈش مشنری کی اکلوتی اولاد تھی اور چرچ کے برآمدوں میں پلی بھی تھی اور
بڑی بھی تھی۔

ایک بہت ہائی نوٹ پر یکدم کرسمس کیرل ختم ہو گیا اور راڈنی نے ایک پاکیزہ لیکن
قدرے متکبر شرماہٹ کے ساتھ تالیوں کے جواب میں سر ہلایا اور پھر ایک مقدس فریضے

کے طور پر کیک کو احتیاط سے کاٹا — ایک مختصر دعا کی اور ہاتھ لہرا کر منتظر آنکھوں
"پلیز" کہا۔ اِس "پلیز" کہنے پر نزدیکی کچی آبادی کے غریب غربا عیسائی مکین جنہیں
غریب غربا پاکستانی بھی پاس نہیں بیٹھنے دیتا تھا کیونکہ اُس کے نزدیک وہ پاک صاف نہ تھا
چُوڑے تھے اور اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو بھی مصلّی ہی رہتے تھے۔ تو یہ ہاہائے کرتی
ہینڈ بیگوں اور ڈرٹی پنک رِبنوں والی لیڈیاں اور چپڑے ہوئے بالوں اور تیکھی مونچھوں
دراوڑی یا بھیل ناک اور ٹھوڑیوں والے جنٹل مین کرسمس کیک پر باقاعدہ پِل پڑے۔

راڈنی ایک گاڈفیئرنگ پادری تھا اس لیے کچی آبادی سے جمع کیے گئے بھیڑوں
Meek گلّے کے سامنے سرَمن دینے سے پیشتر ایک کریم کیک وہ عام دنوں میں بھی رکھ
اِس آسمانی وعدے کے ساتھ کہ یہ سرَمن کے بعد سرو ہو گا اور بھیڑوں کا گلّہ آسمانی
کی حکایتوں کی نسبت کریم کیک میں زیادہ دلچسپی رکھتا — ایک خاکروب، ایک چُوڑا
کے نزدیک سے گذرتے ہوئے پارسا ذرا لچک کر گذرتے تھے کہ اُس کے لباس کا کوئی
اُنہیں چھُو نہ جائے اور تادیر دیکھتے نہ تھے کہ نظریں پلید نہ ہو جائیں — اتنی عزت
اتنے احترام والا شخص اگر کسی صاف ستھرے ڈرائنگ رُوم میں مدعو ہو اور اُسے دو
کھانے کا چانس بھی نصیب ہو جسے وہ جھاڑو دیتا ہوا راحت بیکری کے شوکیس میں دیکھ
تھا اور اگر بالفرض محال اس کی جیب میں اتنی رقم جمع ہو جاوے کہ وہ کیک کھاوے تو
طرح کھاوے — اُسے تو بیکری میں کوئی گھسنے نہیں دیوے... اور صرف سویڈن کا صاد
اُسے قالین پر بٹھا کر یہ کیک کھلاوے —

"سوری —" راڈنی پسینہ پونچھتا ہوا ایمان کی تازہ کمائی میں مطمئن اُن کی طرف
آ گیا۔

مشائلہ نے کچھ نہیں کہا صرف اپنا خالی گلاس بلند کر کے ایک اور "سکول"
دیا۔

"سوری —" راڈنی ایزبرگ المعروف لپو نے پھر کہا اور لِونگ رُوم میں جا کر کب
بورڈ میں سے گہرے سبز رنگ کی ایک بوتل اور نکال کر لے آیا۔

اور راڈنی ایزبرگ اس لیے المعروف لپو تھا کہ مشاہد کے ایک اندرونِ شہر
دوست نے اُس کی بلند قامتی اور اُس قامتی میں لچک کے تناسب سے اُسے ایک ایسے
گُڈّے سے تشبیہ دی تھی جس کا تیر نرم ہوتا ہے اور وہ آسانی سے لف جاتا ہے اور

اُڑتا ہے تو ذرا خم کھاتا ہے اور دوہرا ہو جاتا ہے اور لپو کہلاتا ہے۔ راڈنی چلتے
ہوئے خم کھاتا تھا اور دوہرا ہوتا تھا اور اسی لیے وہ المعروف لپو تھا۔

باہر سرما کی پہلی بارش کی بوندا باندی کا آغاز ہو چکا تھا —

کیک کے ذرّے اُن کی مونچھوں پر یا گہری سرخ لپ سٹکوں پر... اب اُنہیں
ریلوے لائن کے پہلو میں اپنے کچے کیچڑ بھرے ٹپکتے کوٹھوں میں واپس جانا تھا۔ کرسمس کے
مختصر ہنی مون ختم ہو چکا تھا۔ انہیں واپس جانا تھا کہ راڈنی، مشائلہ اور صوفے پر بیزار
بیٹھا پاکستانی بھی منتظر تھے کہ وہ کیک تو کھا چکے ہیں اس لیے — میری کرسمس — اب
انہیں اپنی کچی اور کیچڑ آبادی میں — اُن کی ایک خاص بُو والی رفاقت تادیر نہیں سہی جا
سکتی — وہ ذرا جھجکتے ہوئے آسائش میں ایک اور بس ایک اور سانس لیتے ہوئے، قالین
کی نرمی کو پاؤں کی یاد بناتے ہوئے — روشنیوں میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے —
اٹھے — راڈنی کا شکریہ ادا کیا — مہربانی جی۔ صاحب جی تھینک یو.... تے ہیپی کرسمس
جی —

کرسمس کا اختتام نہیں ہوا تھا لیکن اَن دیکھے جھاڑوؤں پر اُن کی گرفت مضبوط
ہو گئی تھی کہ یہی اخیر تھا — عیسائی یا مصلّی — یہی اخیر تھا۔

وہ سب اس آسائش بھرے گھر کو بھاری قدموں سے خالی کر گئے۔

"سکول —" راڈنی نے بھی ایک سانس اطمینان کا لیا اور وائن کا گلاس اُٹھایا
میرے سب سے پہلے پاکستانی دوست کے لیے — سکول"

"سکول —" مشاہد نے اپنے سامنے بیٹھے پُراعتماد اور پاپولر پادری کی طرف دیکھ
رکھا —

اور صرف ایک برس پیشتر —

دھوپ میں جلتے صحن میں کھلے دروازوں کے آگے ایستادہ خَس کی ٹٹیوں پر وہ
بھری ہوئی بالٹی میں سے ڈونگے بھر بھر کے ڈال رہا تھا تاکہ اُن میں مہک آوے —
ٹھنڈک جنم لیوے اور اُس کی آپا جی... باجیاں اور مردان آرام سے گرمیوں کی دوپہر میں
سو لیں... پہلے یہ ڈیوٹی ابا جی کی ہوتی تھی... اُن کی وفات کے بعد، اب اُس کی تھی —
وہ آخری ڈونگا خَس کی چِک پر نچھاور کر کے اندر جانے کو تھا جب نیچے سے لکشمی
مینشن کے فلیٹ نمبر 17 کے نیچے سے گلی میں سے ایک آواز آئی۔ اُسے شائبہ ہوا کہ اُس کا

نام لیا گیا ہے لیکن اس ویران گرمی میں کون ہو سکتا تھا اور اُس نے لاپروائی کی اور جانے کو تھا جب ایک اور آواز گرمی اور بخارات کے ساتھ اُٹھتی ہوئی اس تک پہنچی یقیناً کوئی اسے بلاتا تھا۔

اُس نے اُن گملوں کے بیچ میں سے جھانک کر دیکھا جن کے بیچ میں سے بو سے کئی برس پہلے... کئی برس تو نہیں صرف چھ برس پہلے اُسے سمیعہ کا اُبھرتا ہوا بدن تھا — اب وہ پتہ نہیں کہاں تھی... وہاں نئے کرائے دار آ چکے تھے۔

نیچے گلی میں ایک غیر ملکی لڑکا منہ کھولے اوپر دیکھ رہا تھا اور اوپر گملوں کے درمیان میں سے نیچے دیکھتے مشاہد کو وہ دھوپ کی شدت کی وجہ سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ باون سیڑھیاں اُتر کر... نیچے چلا گیا "لیں —"

باریش لڑکے کا منہ ابھی تک کھلا تھا... اور وہ اوپر دیکھ رہا تھا۔ مشاہد کے "لیں" کہنے پر چونکا اور اُس کے قریب آ گیا "میرا نام راڈنی ہے... آئی ایم اے سویڈ — آپ ہی مشاہد ہیں؟"

"میں ہوں —"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر —" اُس لم ڈھینگ راڈنی نے کہا۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" مشاہد ابھی تک ذرا صاحب لوگ تھا۔

"وہ... کیا یہ ممکن ہے کہ ہم... کسی جگہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کر سکیں" بہت درخواست کرتا ہوا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

"اوپر آ جائیں —"

فلیٹ نمبر 17 کی باون سیڑھیاں طے کرنے کے بعد وہ سانس لینے کے لیے رُکا "بہت بلند —"

"جی فرمایئے —" جونہی وہ بیٹھک کے اندر داخل ہوا مشاہد نے پوچھا۔

"کیا میں — بیٹھ سکتا ہوں۔"

"پلیز —"

"کیا آپ امبرتو کو جانتے ہیں؟ وہ اطالوی ہے اور نوٹنگھم میں آپ کے ساتھ رہا ہے —"

"امبرتو —" ابھی تو ایک برس بھی نہیں گذرا تھا اور ابھی سے انگلستانی رفقا کے نام ذہن سے اُترنے لگے تھے — "ہاں امبرتو — میں اُسے جانتا ہوں۔"

"اس نے مجھے آپ کا پتہ دیا تھا —"

مشاہد چپ رہا۔ اتنی گرم دوپہر میں ایک باریش غیر دلچسپ غیر ملکی کو وہ کیا کرے۔

"ویل —" راڈنی ذرا سا کھانسا "میرا باپ پادری تھا اور میں... میں بھی کسی حد تک ایک پریچر ہوں تو یہاں لاہور میں مجھے ایک سویڈش سکول میں ٹیچر کے طور پر ملازمت مل گئی ہے... چنانچہ یُو سی اب میں ایک پریچر ٹیچر ہوں یا — ایک ٹیچر پریچر ہوں... ہاہاہا" اُس نے ذرا فری ہونے کے لیے ایک مختصر سا قہقہہ لگایا اور مشاہد کے چہرے پر اُس کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہ پا کر فوراً کہنے لگا "دراصل میں جانتا نہیں کہ کہاں سے شروع کروں۔"

"کہیں سے بھی —" مشاہد جلد از جلد اس سویڈش مولوی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"امبرتو میرے ایک اطالوی دوست کا کزن ہے اور جب کبھی میں انگلستان جاتا تھا تو اُس کے ساتھ مذہب پر طویل بحثیں ہوتی تھیں — وہ ایک متعصب یہودی ہے اور میں —" وہ شرمندگی سے مسکرایا "میں ایک متعصب عیسائی لیکن ہم ایک دوسرے کا نکتہ نظر کھلے دل سے سنتے تھے تو اس دوران مجھے یہ ملازمت مل گئی لاہور میں — اور مجھے لاہور کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہے اور کہاں ہے — مجھے لاہور کی بجائے ٹمبکٹو کا زیادہ پتہ تھا چنانچہ میں بہت فکرمند تھا — کیا وہاں ہاتھی ہوں گے — کیا وہاں بجلی ہے — شاید وہاں اور یہ بات میں غیر سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ وہاں جنگلی ہوں تو اُن کے لیے کچھ آئینے، شوخ لباس یا لائٹر وغیرہ لے جاؤں اُنہیں متاثر کرنے کے لیے.... پھر ایک بحث کے دوران میں نے یونہی امبرتو سے تذکرہ کیا تو وہ کِھل اُٹھا اور کہنے لگا، نو پرابلم... مشیل وہاں ہے — لاہور میں — تو اُس نے مجھے آپ کا ایڈریس دیا تو — کیا آپ مجھے ایک گلاس پانی دے سکتے ہیں۔ یہاں، لاہور میں گرمی ذرا زیادہ ہے —"

مشاہد پانی کا گلاس لے آیا۔

"اس سے میرا پیٹ تو خراب نہیں ہو گا؟"

"پتہ نہیں —"

"سکول —" اُس نے پانی کا گلاس ڈیک لگا کر پیا اور تپائی پر رکھ دیا۔

مشاہد اُن دنوں ابھی بہت بے سکون تھا... بہت بے سمت اور اکھڑا ہوا تھا — وہ

والد کی موت کے صدمے کے بوجھ تلے — انگلستان سے واپس تو آ گیا تھا لیکن ثقافت کی جڑیں بہت دور تک جا چکی تھیں اور وہ اپنے آپ کو اُس چار چفیرے میں غیر موزوں پاتا تھا۔ بہت جبر کے ساتھ اُس نے گوجرانوالا کی ایک ہوزری فیکٹری ملازمت کی... چند روز کے لیے اور پھر سوت کے غبار سے، گرمی سے اور مالک کی جہا سے تنگ آ کر لاہور واپس آ گیا۔

مشاہد اُن دنوں بہت بے سکون اس لیے بھی تھا کہ اُسے اپنے لیٹر بوکس میں ا ایسا لفافہ دکھائی دیا تھا جس پر انگلستان کے ڈاک ٹکٹ چسپاں تھے لیکن اُس میں کوئی خ تھا — صرف ایک تصویر تھی... بابو راؤ پٹیل کی اور — فاطمہ کی!

بابو ایک ٹکسیڈو میں چوڑی بو ٹائی سمیت، پورے دانتوں کی مسکراہٹ پر کیمرے کے لینز میں دیکھتا ہوا اور اُس کے بازو پر ہاتھ رکھے فاطمہ — دلہنوں کے ر سفید لباس میں اور وہ بھی کیمرے کے لینز کے اندر، بہت اندر اپنے سیاہ بالوں اور بڑی آنکھوں سے دیکھتی اور اِتراتی ہوئی.. لیکن وہ اُس لمحے صرف مشاہد کو دیکھ کر کہہ رہی — اب تم کیا کہتے ہو؟

تصویر کی پشت پر ایک مختصر عبارت تھی — ہم اب میاں بیوی ہیں۔ ہما شادی ہندو رواج کے مطابق ہوئی۔ میں اب اُوشا ہوں — فاطمہ نہیں — اب تم کیا ہو؟

چنانچہ مشاہد اُن دنوں بہت بے سکون تھا۔

اور اس بے سکون کیفیت میں اگرچہ یہ لم ڈھینگ لڑکا ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھا لیکن ایک فرار ایک تبدیلی ضرور تھا چنانچہ اُس نے کچھ بے جا التفات کا اظہار کیا اُسے لاہور کے تاریخی مقامات دکھانے پر اصرار کیا۔

"میں بہت زیادہ شکریہ ادا کرتا ہوں — " راڈنی بہت فرمانبرداری سے بولا "لیکن پہلے میں... کیتھڈرل اور سینٹ انتھونی چرچ دیکھنا پسند کروں گا... اور مجھے معلوم ہے کہ وارث روڈ پر ایک پادری تاک کشمیری ہے جو شعر بھی کہتا ہے تو... کیا یہ ہے؟"

تقریباً ایک برس تک وہ راڈنی ایزبرگ کو ایک نومولود بچے کی طرف اٹھائے — اور یہ بچہ ہمکتا ہوا ہمیشہ اُس کا شکر گزار ہوتا — ایک روز یہ بچہ بڑا ہو گیا "مشاہد تو

لاولی فرینڈ... آئی مین اِن پاکستان... یا شائد سویڈن میں بھی کوئی میرا اتنا نزدیک دوست ... — دلی میں میرے والد کے ایک دوست پریسٹ ہیں اور اُن کی بیٹی مشائلہ — ... کوئی فیصلہ نہیں ہوا لیکن وہ خاص طور پر پاکستان آ رہی ہے اور آپ نے میری ... ہے کی فیصلے پر پہنچنے کے لیے — "

لاہور ایئرپورٹ...

ایک بے چین گرمی والی دوپہر میں... اور لوہے کے ایک جنگلے کے ادھر آپ ہیں راہ ... وے ہے جس پر جہاز چلا آ رہا ہے اور اُس کے پنکھوں کی ہوا بھی گرم ہے اور ... ہے کہ آپ کی پتلون میں اُڑسی ہوئی قمیض نکل نکل جاتی ہے۔ اگر آپ زیادہ بے ... ہیں تو وہ تین فٹ کا جنگلا پھلانگ کر بآسانی جہاز تک چلے جائیں اور اپنے عزیز یا ... کو نفس نفیس سیڑھیوں کے قریب جا کر خوش آمدید کہہ لیں... سیکیورٹی کا کوئی وجود ... اور ایئرپورٹ کے اِکا دُکا اہلکار آپ کی اس بے چین لاقانونیت کو نظر انداز کر دیں ...

مشائلہ، سکینڈے نیوین... بھرے بدن، سنہری بالوں اور بے باک مسکراہٹ کا ... تھی۔

وہ جب اُن کی جانب چلتی ہوئی آ رہی تھی تو کچھ مسافر اپنے سفر کو بھول کر اُس ... خبری لڑکی کو دیکھتے تھے جو اپنے متوقع منگیتر کی طرف بڑھ رہی تھی اور متوقع منگیتر کے ... میں ایک پاکستانی لڑکا اُسے دیکھتا تھا۔

اُس میں... مشائلہ میں ایک بھولپن اور ایک اُداسی تھی جو دل پر فوراً اثر کرتی ...

"راڈنی تم بہت خوش قسمت ہو گے اگر..."

اُن کی چرچ ویڈنگ اگرچہ دلی میں ہوئی لیکن — اُسی روز لاہور واپس — کچی ... کا جو کہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اس کے قریب ایک پُر آسائش گھر میں ... بہت سختی سے کاربند اخلاقیات اور کسی بھی اور حقیقت یا سچ سے نا آشنا ناواقف لڑکی ... لہ —

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک منزل تک پہنچنے کے مختلف راستے ہوں — نہیں ... صرف ایک ہی راستہ ہے — عیسائیت کا — اور وہ بھی ہمارے فرقے کا۔"

"اور تمہارا فرقہ کیا ہے —"

راڈنی ایزبرگ المعروف لپو اُسے بہت عرق ریزی سے سمجھاتا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ روزِ قیامت حضرت عیسیٰ دنیا کی تمام زبانوں میں گفتگو کریں گے اور ہماری بخشش کا سبب بنیں گے اور اس کے علاوہ اگر کوئی شخص کچھ اور یقین رکھتا ہے تو وہ یقیناً غلط راستے پر چل رہا ہے —"

"نہیں —" مشاہد کبھی سنجیدہ کبھی مسکراتے ہوئے — "پادری جی منزل ایک ہے لیکن... راستے مختلف ہیں، عنب، نمرم، انسٹافل اور انگور — ترک، یونانی، ایرانی اور پاکستانی ایک ہی شے کی طلب میں ہیں... تکرار اور جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے... راستے جُدا ہیں اور پہنچنا وہیں ہے —"

راڈنی اس کی لاعلمی اور بے راہ روی پر داڑھی کھجاتا اور پھر کف افسوس ملتا۔ اُس میں اپنے عقیدے کا استحکام اور ایک خاص معصوم جہالت تھی جو مشاہد کو بُری نہ لگتی۔ کوئی بھی شخص اگر کومٹڈ ہو تو وہ معصوم جہالت سے مبرا نہیں ہوتا —

اور آج کرسمس تھی —

شہر میونخ میں ہی نہیں شہر لاہور میں بھی آج کرسمس تھی اور مشاہد ایک بیگا پچیس دسمبر گھر میں گذارنے کی بجائے اُس کے ہاں چلا آیا تھا اور وہاں راڈنی کچی آبادی کی بھیڑوں کا مجمع لگائے "ساڈھا یسوع اَج آیا سی — الاپ رہا تھا اور مشائلہ بار بار اپنا خالی گلاس اٹھاتی تھی اور اُس کے پیندے کو بغور دیکھ کر میز پر واپس رکھ دیتی تھی...

باہر جو سرما کی پہلی بارش ہو رہی تھی اُس میں شور اس لیے بھی کم تھا کہ آس پاس آبادی کم تھی اور جو تھی وہ کچے کوٹھوں کی تھی جن پر بارش برسے تو شور نہیں کرتی بے آواز گرتی ہے.... ڈیوڈ گِل کی بھی آج کرسمس تھی لیکن وہ صاحب اور بیگم صاحب کی خبر گیری کے لیے ابھی تک آس پاس منڈلاتا تھا... اِس مئووب منڈلانے سے اسے ا وائن کا ایک گلاس مل جاتا تھا اور اوون میں مشائلہ نے ٹولنٹن مارکیٹ کی برڈ مارکیٹ سے خرید کی ہوئی جو ٹرکی روسٹ ہونے کے لیے رکھی ہوئی تھی اس میں سے بھی مناسب حصہ ملنے کی اُمید تھی لیکن وہ مشاہد کو راڈنی صاحب کے دیگر تمام پاکستانی دوستوں کی طرح ناپسند کرتا تھا۔ وہ سویڈش صاحب کی قربت سے اپنے آپ کو مقامی لوگوں سے برتر سمجھتا تھا۔ مشاہد جب کبھی ملاقات کے لیے آتا تو دروازہ کھلتا اور پہلا تاثر کسی بھی مہمان

آمیز کہنے والا مسکراہٹ سے لبریز ہوتا لیکن اُسی لمحے ڈیوڈ گِل کا جبڑا اپنے سامنے کسی گورے کی بجائے کالے کو دیکھ کر لٹک جاتا... صاحب باہر گیا ہے — کتنے بجے آئیں گے؟ نہیں — اور دروازہ بند — لیکن آج ڈیوڈ گِل بھی دوستانہ موڈ میں تھا کیونکہ وائن کے علاوہ یہاں آنے سے پیشتر اس نے اپنے ریلوے کوارٹر میں مقامی شراب کا وافر نوش کیا تھا — ڈیوڈ گِل پاکستان ویسٹرن ریلویز میں خاکروب کا عہدا رکھتا تھا اور بچے پاس بقول اُس کے "پاٹ ٹیم" تھا۔

مشائلہ کا گلاس چونکہ اب اس کی خواہش کے عین مطابق لبریز ہو چکا تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں چند ستارے تھے — "سو — مشیل.... اب تم شادی کب کر رہے" اس نے گھونٹ بھرنے سے پیشتر دو سرخ رنگ کی لامبی موم بتیاں روشن کیں، گلاس کے اس کے اندر لہریں لیتے ہوئے مشروب کو طمانیت سے دیکھا اور کچھ ہنسی۔

راڈنی نے یہ سوال سن کر داڑھی میں کھجلی کر کے ایک مدبر سی شکل اختیار کر لی۔

"ہم خود شادی نہیں کرتے —"

"نائیں —" مشائلہ نے اُنگلی اُٹھا کر اس کی ناک کے عین سامنے لہرائی اور پھر تم یہ نہ کہنا کہ ایک عدد برائڈ تمہارے لیے چنی جائے گی اور تم اُسے دیکھے یا جانے بنا اس کے ساتھ شادی کر لو گے —"

"میں یہی کہہ رہا ہوں —"

"نائیں —" مشائلہ کی ہنسی میں خمار گھلتا تھا۔

بارش کے مدھم شور کے ساتھ بادلوں کی گرج کی گہری گونج ریلوے لائن کے پرے دکھتے اس پُر آسائش گھر کے اندر تک آتی تھی جس کے دروازے کے قریب اب بھی مقامی صاحب کو گورا لوگوں کی رفاقت اور دوستانہ رفاقت میں دیکھ کر کچھ جلتا تھا۔

"میری بہنیں بھی ناراض رہتی ہیں لیکن... میرا کوئی مناسب روزگار نہیں ہے اگر شادی کر لوں تو کھاؤں گا کہاں سے —"

"تم اِدھر آؤ —" راڈنی نے ایسے کہا جیسے کسی جنگلی کو ہاتھ میں تھامی ہوئی صلیب دکھاتا ہو "اِدھر یوٹے برگ میں — وہاں ہوزری کی بہترین مشینری مینوفیکچر ہوتی ہے اِدھر لاؤ اور اِدھر ایک فیکٹری لگا لو —"

"ہاں — شائد میں ایسا ہی کروں۔"

"لیکن تم یوٹے برگ تب آؤ جب ہم وہاں ہوں —" مشائلہ کرسمس کے موڈ میں کچھ کچھ ٹِپسی ہو رہی تھی اور یہ معمول کی بات تھی اور خوشگوار بات تھی کہ اُن تینوں میں سے کوئی ایک تو تھا جو کرسمس سپرٹ برقرار رکھے ہوئے تھا — ہاں ڈیوڈ گِلا پر بھی سپرٹ اثر کر چکی تھی۔

پانی کے برسنے میں شدت آ چکی تھی اسی لیے کال بیل کی آواز اُس میں دبی ہوئی بہت دور سے آئی۔

اُن تینوں نے اُدھر دیکھا جدھر ڈیوڈ کھڑا تھا اور وہ جا چکا تھا — فوراً ہی ایک سر سے پاؤں تک نچڑتا ہوا شرمندہ ہوتا ہوا مردان اپنے فوجی کٹ بالوں کے کھردرے پن کو سہلاتا اندر داخل ہوا اور قالین کو اپنے بدن سے نچڑتے پانی سے بچانے کی خاطر وہیں دروازے کے قریب رُک گیا "ہیلو —"

"ہیلو —" راڈنی نے اُٹھ کر اسے بغور دیکھا اور پھر پہچان گیا "ویل کم مردان... پلیز کم اِن..."

"تھینک یو لیکن میں بہت زیادہ بھیگا ہوا ہوں اور آئی ایم ساری آپ کا قالین۔"

"اِٹس کرسمس —" مشائلہ پھر ہنسی اور اس کی تمامتر توجہ ملٹری اکیڈمی کاکول کی جان لیوا ٹریننگ میں سے بچ نکلنے والے اس اکڑے ہوئے صاف اور سیدھے اور ہینڈسم لڑکے کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ اُسے بہت پُرکشش اور مختلف لگ رہا تھا اور اُس کرسمس نائٹ میں... اطالوی وائن کے بعد... متعدد گلاسوں کے بعد آنکھوں میں ظاہر ہونے والے ستاروں کی روشنی میں وہ بہت ہی دل فریب اور دل مسلنے والا تھا... اگرچہ کم سِن اور اُس نے ایک ہچکی بھری "نیور مائنڈ دے کارپٹ — آگے آ جاؤ۔"

وہ ذرا جھجکا "کم آن —" مشائلہ نے ہاتھ آگے کر دیا "کیئر فار سم وائن..."

"نو تھینکس — آئی ڈونٹ ڈرنک —"

"رئیلی —" مشائلہ نے اُس کا ہاتھ تھام کر برابر کے صوفے پر بٹھا دیا۔ اُس بیٹھتے ہی صوفے کی پوشش پانی جذب کرنے لگی اور اُس کا رنگ سیاہ ہونے لگا۔

"تم کیسے آ گئے؟" مشاہد کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ ہر ایک نے اس کی خنکی کو محسوس اور مردان جان گیا کہ اُس نے اُس کی آمد کو پسند نہیں کیا۔

"بھائی جان میں تو... آج قائداعظم ڈے کی چھٹی تھی اکیڈمی میں اور اس کے ویک اینڈ بھی جڑ گیا تو سب کیڈٹس گھروں کو دوڑے... میں بھی.. ٹرک پر بیٹھ کر آیا بسیں ویگنیں سب فُل اور اُن میں ماؤں اور... بھائی بہنوں سے سخت اداس کیڈٹ بھرے ہوئے... تو.. گھر آیا تو آپ نہیں تھے۔ آپا جی نے بتایا کہ آپ ادھر ہیں تو میں... بھی پریشان اور.. تو میں صرف آپ کو ملنے آیا تھا... میں چلتا ہوں —" وہ اُٹھا اور اکڑوں کھڑا ہو گیا۔

"مردان تم ہمارے ساتھ شریک ہو سکتے ہو —" راڈنی نے سر ہلایا۔

"ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ — پلیز" مشائلہ کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ ٹھہر جائے کھانے کے دوران وہ اُس کے ساتھ فلرٹ کرے لیکن ظاہر ایسے ہوتا تھا جیسے وہ مشاہد بہت قریب ہونے کے باوجود ایک فاصلے پر ہے۔

"نو تھینک یو... میں... وہاں بھی ڈنر تیار ہے.. سرسوں کا ساگ آپا جی نے... تو میں چلتا ہوں بھائی جان..." وہ دو تین بار اِدھر اُدھر جھکا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

مشائلہ اُٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی اور پردے پر ہاتھ رکھ کر باہر دیکھا۔ شیشوں پر بارش کی بوندیں پھسل رہی تھیں اور اُن میں موم بتیوں کی جھلملاہٹ اور باہر کی تاریکی جو کبھی کبھار بجلی کوندنے سے اُٹھ جاتی اور ریلوے لائن اور چند کچے کوٹھے ظاہر ہوتے اور پھر ذرا تاریکی کا پردہ پھر سے گر جاتا۔ "وہ پتہ نہیں کس مصیبت سے یہاں پہنچا تھا... تم اُسے رہنے کے لیے کہہ سکتے تھے۔"

"یہ آپ کا گھر ہے —"

"اوہ کم آن، آج کرسمس ہے.."

"آج کرسمس ہے اور اس کے باوجود مردان مجھ سے چھوٹا ہے اور ہم دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے جو ہم قائم رکھتے ہیں —"

"اِسے ہم مشرقی حجاب بھی کہہ سکتے ہیں —" مشائلہ کھڑکی سے الگ ہو کر اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ہاں — ہم اسے قائم رکھتے ہیں۔ ہم دونوں... ایک دوسرے کی موجودگی میں، ایک اجنبی گھر میں، بے آرام رہتے۔ وہ مجھ سے بہت اداس تھا میں اُس کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا — اور جب اُس نے مجھے یہاں بیٹھے دیکھ لیا تو اُس کی آمد کا مقصد پورا ہو گیا

—تو پھر اُسے جانا ہی تھا —"

راڈنی نے ایک مرتبہ پھر داڑھی میں کھجلی کرنا مناسب نہ جانا اور صرف کو سکیڑنے پر ہی اکتفا کیا "اگر میں یہ منطق نہ سمجھ سکوں تو آپ مجھے معاف کر دیجیے گا لیکن میری ایک خواہش ہے اگر آپ دونوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو..."

"مجھے اُمید ہے کہ اس خواہش میں میں شامل ہوں گی" مشائلہ خوش ہو کر کر کی سپرٹ میں مبتلا ہو کر ذومعنی انداز میں ہنسی.. اور وہ بار بار راڈنی کے سامنے ذرا تھی، آگے ہوتی تھی اور یوں اُس کا لو نیک لباس اُس کے بدن سے پرے ہوتا تھا اور کی بے خبری پر ماتم کرتا تھا... "تم جو خواہش کرو گے وہی پاؤ گے راڈنی ڈارلنگ —"

"میری خواہش ہے کہ میں اس مبارک دن کی رات میں — اس بابرکت را میں کھانے سے پیشتر ایک بار پھر 'ساڈھا یسوع اَج آیا سی... گاؤں — ہم تینوں پر بر نازل ہوں گی اس کا مجھے مکمل یقین ہے —"

وہ دونوں چپ سے ہو گئے تو راڈنی نے پھر کندھے سکیڑے "اگر آپ کی م نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، میں نہیں گاؤں گا —"

"نہیں — مجھے تو کوئی اعتراض نہیں —" مشاہد اس کے سوا اور کیا کہ تھا۔

"اور مجھے بھی — کوئی اعتراض نہیں" مشائلہ نے اپنی مایوسی کو عیاں نہ ہونے

"لیکن ہارمونیم کے سامنے بیٹھنے سے پیشتر پلیز وائن کی ایک اور بوتل کپ بورڈ میں نکال لاؤ... مجھے بہت ضرورت ہے" راڈنی کچھ دیر آنکھیں نیچی کیے بیٹھا رہا اور جب بو اُس کے بولنے میں ناپسندیدگی کے ساتھ اُلفت بھی تھی "وائن کے ساتھ تمہاری رغبت مناسب اخلاقیات سے تجاوز کر رہی ہے.. ایک پریسٹ کی بیٹی..."

"لیکن راڈنی — آج کرسمس ہے" اُس نے پروٹسٹ کیا اور اپنی دائیں ٹانگ بائیں پر رکھ کر گویا اپنی ناراضگی کے اظہار کے طور پر — ہلانے لگی۔

"اِسی لیے — آج کرسمس ہے اِسی لیے تو میں یسوع کی توصیف میں گانا چا ہوں... ہم پر برکتوں کا نزول ہو گا مشائلہ"

"برکتوں کا نزول بعد میں لیکن — پہلے کپ بورڈ کی طرف جاؤ۔"

راڈنی اُٹھا... اور اُس نے اپنی بیوی کی محبت میں ایسا ہی کیا۔

"اب میں برکتوں کے نزول کے لیے تیار ہوں —" مشائلہ نے نئی بوتل کو گھما کا لیبل پڑھا اور سنجیدہ ہو کر اُس کی جانب دیکھنے لگی۔

راڈنی نے ہارمونیم کے آگے بیٹھ کر پہلے چھت کی طرف دیکھا.. پھر کیز پر اُنگلیاں

ایا

ساڈھا یسوع اَج آیا سی...

رحمت دا مینہ ورسایا سی... ہا آ... ہا آ... آ

اوہنے کناں ساہنوں ترسایا سی...

رحمت دا مینہ... ہا آ... آ

ساڈھا یسوع...

رحمت دا مینہ...

اُس میں سکینڈے نیوین حُسن کی ہر جادوگری موجود تھی — اُس کی آنکھیں کانچ کی طرح بے جان اور بے بصر نہ تھیں بلکہ آئرش آنکھوں کی طرح نیلی اور آئی تھیں.. وین آئرش آئز آر سمائلنگ.. بال صرف بھورے یا راکھ رنگ کے نہ تھے، میں دریائے سندھ کی ریت میں جیسے سونے کے ذرے چمکتے ہیں ایسے ایک مسلسل ابن تھا۔ ہونٹوں میں ایک خم تھا جو وہ بولتی چلی جاتی اور وہ سیدھا نہ ہوتا جیسے وہ کوئی رکی تھی۔ لیکن یہ معذوری ایسی تھی کہ دیکھنے والوں کے لیے اُسے دیکھنا مجبوری بن تھی... اور پھر اُس کا بدن گویا رافیل کی نیوڈز کی کاپی تھا... قدرے موٹاپے پر مائل اور ے پن سے بال بال بچتا ہوا... اور نسل انسانی کے تسلسل کی ضمانت... اور اس کے دہلی کے ایک سویڈش چرچ کے سخت تنظیمی ڈھانچے میں ڈھل کر نکلنے والی مشائلہ شرقی لڑکی کی طرح اُن چیزوں سے تقریباً ناآشنا رہی تھی جن سے اُس کی ہم وطن بچہ ماحول سے پاؤں باہر رکھنے کے بعد ہی اپنی من مرضی سے آشنا ہو جاتی تھی۔

کیا وقت کے کسی آئندہ لمحے میں... ڈیلفی کے اوریکل نے کسی مستقبل کی ہوا پر ماتھا کہ... یعنی کیا یہ ممکن تھا کہ مشائلہ ایزبرگ اسی گھر میں اسی صوفے پر اسی انداز براجمان ہو گی اور کچھ زیادہ عرصہ بعد نہیں — یہی دو چار برس بعد — اور اُس کے کی جادوگری کا صرف شائبہ رہ جائے گا... ایک شک ایک سایہ باقی رہ جائے گا — اور ماتھے اور حسن کے سائے میں بے رنگ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، لٹکتی ہوئی کھال،

دُبلا اور گھلتا ہوا بیمار بدن اور سینے کے ساتھ لگی ہوئی بے رُوح چھاتیاں اور ٹانگیں الگ، دیکھنے سے خوف آوے بلکہ چہرے کی طرف دیکھ کر نہ صرف خوف آوے بلکہ اجتناب کرنے کو جی چاہوے۔

اِسی صوفے پر جہاں مشاہد ہے اور راڈنی کا سُاڈھا یسوع کا الاپ سن رہا ہے۔ اِ صوفے پر دو نوجوان جن کی آنکھوں میں شہوت کے سوا کچھ نہ تھا مشائلہ کو دیکھ کر جو آسان جنسی ملاپ سے بے چین ہوتے ہوئے بیٹھے ہوں گے اور مشاہد جو ابھی کچھ دیر پہلا آیا ہے خجالت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ مشائلہ سے کہے گا کہ میں تو تمہیں لاہور میں خوش آمدید کہنے کے لیے آیا تھا، مجھے آج ہی راڈنی کے خط سے علم ہوا ہے کہ تم گزشتہ ماہ سے یہاں ہو تو میں نے سوچا... تمہاری پاکستانی بیٹی برگیتا کیسی ہے؟... چلنے لگی ہے۔ بس یہی پوچھنے آیا تھا کہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں.. آئی ایم سوری تم... معروف ہو... میں چلتا ہوں.. اور وہ مشائلہ کے بازوؤں پر سرنجوں کے نشان نظرانداز کرتا اُن نوجوانوں سے آنکھیں ملائے بغیر باہر نکل جاتا ہے — صرف وہ دو نہ تھے.. ہر روز شہر میں یہ خبر پھیلتی ہے کہ ایرمال پر ظفر علی روڈ پر ایک پُر آسائش گھر میں ریلوے لائن کے پار میں کچی آبادی کے سامنے ایک سویڈش خاتون ہے جو سرنجوں کی تمنائی ہے اور اُن کے بدلے جو مزاجِ یار میں آئے...

کیا وقت کے کسی آئندہ لمحے میں... کسی مستقبل کی ہوا میں یہ لکھا تھا —

لیکن ابھی تو لمحۂ موجود میں مشائلہ کی معصومیت اور جادوگری موجود تھی اور اُس کی آنکھیں نیلے کانچ کی طرح بے جان اور بے بصر نہ تھیں... مسکراتی تھیں۔ دریائے سندھ کی ریت میں سونے کے ذروں کا تسلسل تھا اور رافیل کی نیوڈز اُسے حسد سے دیکھتی تھیں۔

پانیوں کا بہاؤ چھت پر سے گرتا لان کی گھاس میں بے آواز ہوتا تھا۔ بارش میں کمی ممکن معلوم نہ ہوتی تھی۔ جیسے یہ سدا جاری رہے گی۔ موسم آب دائمی ہو چکا ہے اب صرف بارش ہے اور بارش ہو گی — کہیں کہیں بجلی کا لشکارا اور تاریکی کا پردہ اُٹھتا ہے زمین کی صورت اور شکل دکھاتا ہے اور گر جاتا ہے... ڈیوڈ گل، ردسٹ ٹرکی، برسلز سپراؤٹس اور کرسمس کیک سرو کر کے اور کچن سے ڈائننگ روم میں آتے آتے انہیں مناسب مقدار میں چکھ کر.. اپنے ریلوے کوارٹر میں جا چکا ہے اور یہاں ایک مرتبہ پھر کوئی

پائل پر ہاتھ رکھتا ہے۔ مشائلہ میں خمار کی آلکس ہے اور وہ راڈنی کی طرف دیکھتی ہے "میں دیکھتا ہوں.. وہ اُٹھتا ہے — کیا وقت ہے؟ شائد تین بج رہے ہیں.. مشائلہ کا نشہ زینہ بہ زینہ نیچے آ رہا ہے اور وہ تھکاوٹ سے مسکراتی ہے "اس وقت کون ہو سکتا ہے؟"

— وہ بھی مردان کی طرح نچڑا ہوا تھا۔

"میں اس کی بات نہیں سمجھ رہا مشاہد — کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟"

وہ بھی مردان کی طرح نچڑا ہوا تھا... سیاہ رنگت کا ایک عام سا چُوڑا جس کے بارے سے لگتا تھا کہ یہ ابھی ابھی کسی کیچڑ بھرے جوہڑ سے نکل کر ادھر آ گیا ہے اور اس کے منہ سے اور آنکھوں سے سوائے غلیظ بھورے سیاہ بلبلے چھوڑتے کیچڑ کی گندگی کے اور کچھ نہیں نکل رہا... اُس نے اگرچہ معزز لگنے کے لیے ایک سفید پگڑی باندھ رکھی تھی اور اپنی سفید ہوتی مونچھوں کو بل دینے کی کوشش میں بے ربط کر لیا تھا لیکن اُس کی بے چارگی اور ذات کی کمینگی اُس پر بوجھ بنی اُسے جھکائے جاتی تھی۔

"صاحب جی اللہ بھاگ لگے رہیں... جی میں کامونکی سے آیا ہوں، عیسائیوں کی بستی ہے... ابھی ابھی آ رہا ہوں صاحب جی۔ کرایہ بھی ایک یار بیلی سے پکڑا ہے۔ گریب آدمی ہوں.. یہ سویڈن کا پادری صاحب ادھر ہمارے پاس آتا ہے اور ہمیں یسوع کی باتیں سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جب کبھی گلے کی بھیڑوں کو کوئی تکلیف ہو تو اِسے آ کر بتائیں.. تو آ گیا ہوں صاحب جی اور مجھے آج بہت تکلیف ہے — " وہ سردی سے، پانی کی ٹھنڈک سے اور اپنی بے حیثیتی سے کانپے چلا جا رہا تھا۔ اُس کی سیاہ ٹانگیں ناکافی اور گیلی شلوار میں کینچوؤں کی طرح دوہری ہوتی جا رہی تھیں اور سوائے اُس کے لشکیلے دانتوں کے جو بھی جب وہ بات کرتا تھا تو سوائے اُن کے اور کچھ اُس کی شخصیت میں واضح نہ ہوتا بلکہ لفظ "شخصیت" اُس کے لیے نہ تھا...

مشاہد نے راڈنی سے جو کچھ اُس نے بیان کیا تھا کہہ دیا۔

"ہاں ہاں — " راڈنی نے ایک مذہبی راہنما کے تقدس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دانائی سے سر ہلایا اور مزید دانائی سے داڑھی میں کھجلی کی "اس کو کیا تکلیف ہے؟"

"مجھے صاحب جی.. بہت جو تکلیف ہے تو ایسے ہے کہ میری جنانی نے اِکو داری

— یکدم جی۔ تین بچے جن دیئے ہیں۔ ایک تو باہر آتے ہی مر گیا اور دو باقی ہیں۔ یہ
تو صاحب جی گیارہ پہلے سے ہیں... شیت بارہ ہیں۔ تو میری جنانی کا دودھ سوکھ گیا ہے۔
جو کچھ نہیں۔ باقی جو دو ہیں وہ بھی مرنے والے ہیں۔ پتہ نہیں اب تک مر گئے ہوں۔
اللہ بھاگ لگائے اِس سویڈن والے کو بتاؤ جناب جی کہ مجھے اُن کی کوئی لوڑ نہیں... یہ کہ
جی کہ مصیبت ہو تو آ جائیں...“

”میں اس کی سٹوری پر یقین نہیں کر رہا“ راڈنی نے مشاہد کی طرف دیکھا
لوگ اگرچہ میرے گلّے میں سے ہیں لیکن مجھ سے پیسے بٹورنے کے لیے طرح طرح
کہانیاں تراشتے ہیں۔ میں کامونکی جا کر خود چیک کرتا ہوں۔“

”اس وقت؟“ مشائلہ نے بیزاری سے بلکہ شدید بیزاری سے کہا۔

”صرف اس لیے کہ وہ سب یسوع کی بھیڑیں ہیں —“

”لیکن یہ تو کوئی وقت نہیں —“

”مشاہد — کیا یہ ممکن ہے کہ تم... اور میں بہت شکر گزار ہوں گا کہ تم اتنی
مشائلہ کے پاس بیٹھو... میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔“

اُس سیاہ فام پگڑی باندھے ہوئے سوکھے اور بے توقیر بندے نے مشاہد کو ایک نظر
دیکھا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چلا گیا۔

جب صبح کا اجالا ہوا اور بارش تھم چکی تھی تو دونوں موم بتیاں اپنی بلند قامتی
پگھل پگھل کر مختصر کرتی میز کی سطح تک آ کر سرد موم کی تہہ میں بدل چکی تھیں۔

صبح کے اجالے میں، تو نے ہم سفر دیکھا۔ چھاؤں کی خلیجیں ہیں۔ دھوپ
جزیرے ہیں۔ جب راڈنی کامونکی سے واپس آیا اور وہ یسوع کی طرح پھیلے ہوئے بازوؤں
میں دو چیتھڑے سے اُٹھائے ہوئے تھا — ”میں یسوع کی ان دو نومولود بھیڑوں کو
یا کامونکے سے لے آیا ہوں۔ میں نہ لاتا تو یہ مر جاتیں۔ اُٹھو مشائلہ اِنہیں دودھ پلاؤ
مقدس باپ نے تمہیں دو بچوں کی ماں بنا دیا ہے —“

ساڈھا یسوع اَج آیا سی۔

ایک Stray Bullet کیا ہے؟

Stray — راہِ راست سے ہٹ جانا — گمراہ ہو جانا، بھٹکنا، بھٹک جانا، بچھڑ جانا
بھٹکا ہوا، آوارہ، لاوارث، اتفاقی — بھولا بھٹکا۔

Bullet — گولی

صرف ایک گولی اور اُسے کیسے کیسے عارضے لاحق ہو جاتے ہیں۔ راہِ راست سے
ہٹ جاتی ہے۔ گمراہ ہو جاتی ہے۔ بھٹک، بھٹک اور بچھڑ جاتی ہے — لاوارث ہو جاتی
ہے۔

مجھے کسی بھی تعین پر اختیار نہیں اور یہ کوئی اور میرے راستے بدلتا ہے۔ کسی بھی
گولی پہ اِس لیے اختیار نہیں کہ وہ راہِ راست سے ہٹ چکی ہے۔ اُس نے اللہ کی رسی کو
مضبوطی سے نہیں تھاما اور صراطِ مستقیم سے ہٹ چکی ہے۔

ڈیم اِٹ تمہارے گٹس میں وہی فیلنگ ہوتی ہے جیسے سب کچھ باہر آنے کو ہو
— دِس اِز نو ایسٹ پاکستان — ویرانی اور بھٹک جانے والی گولی کا موسم ہر جگہ ایسا
ہوتا ہے کہ تمہارے گٹس میں وہی قے آور فیلنگ کلبلاتی ہے.... جیسور میں؟ — نہیں
برہمن باڑیا میں؟ — نہیں...

نارتھ ناظم آباد جاتے ہوئے — لیاقت آباد میں —

سنسان سناٹے میں داخل ہو کر اُس کا ایک حصہ بن کر سفر کرتے ہوئے۔ جب کہ
اِرد گرد فضا خالی اور منتظر ایک... سٹرے بلٹ کے لیے۔

ریڈ الرٹ اِن سٹی —

مذہب، نسل اور سیاست...

جغرافیائی حیثیتیں بدل رہی ہیں... کراچی یا بیروت...

ہوا پورب کے رُخ چل رہی ہے

میں اپنا منہ دکن کی طرف موڑ لوں گا۔

کیونکہ ہوا نے میرے دماغ کو مُردوں کی عفونت سے پریشان کر دیا ہے۔

خلیل جبران میڈیکل کا سٹوڈنٹ نہیں تھا اور اسی لیے اس کے دماغ کو مُردوں کی عفونت پریشان کر دیتی تھی... یہاں سب میڈیکل کے سٹوڈنٹ ہیں۔

لاشیں آغا خان ہسپتال پہنچا دی گئی ہیں۔ براہ کرم تشریف لائیں اور اپنے اپنے عزیز و اقارب کو پہچان کر گھر لے جائیں... مُردے کی طرف دھیان دیں خواتین و حضرات — بلکہ مُردوں کی طرف۔

کرفیو تو نہیں تھا.. رینجرز کی جیپیں ایک ویران خلا میں ناک کی سیدھ میں چلتی جا رہی تھیں... وہ بھی ہر آہٹ پر ٹھٹھکتی تھیں اور اُن میں اپنے سناٹے میں بند وردی پوش اپنی قسمت کو کوستے تھے۔ ایک بلند آدرش کے لیے قربانی دینے کے لیے ضروری ہے کہ زخم کی نشاندہی ہو — بلکہ آدرش کی نشاندہی ہو جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ پر یہاں Stray Bullet کیا ہے؟ — راہِ راست سے ہٹ جانا... گمراہ ہو جانا — بھٹک جانا۔

اور کون بھٹک جانے والے کے راستے میں آئے.. نہ جنت میں قیام نصیب ہوا نہ قبروں میں رزق ملے۔

لیکن — ڈیوٹی اِز ڈیوٹی ڈیم اِٹ... ریٹائرڈ جنرل صاحب کمال.. رینجرز کے اُس دستے کے درمیان میں ویرانی اور سناٹے میں کوئی بھٹکنے والی آواز کے لیے چوکس کان لگائے... ناٹ دِس ٹائم یُو راسکلز... وہاں کمک نہیں آ سکتی تھی اور ہم گھرے ہوئے تھے اور یوں بھی اُن کے خون میں میر جعفریت تھی... سراج الدولیت کے بارے میں لاعلم مناسب ہے۔ لیکن یہاں... نو وے.. ناٹ دِس ٹائم یُو راسکلز...

زاہد کالیے کی گرینڈ پارٹی کا ہینگ اوور اب تک تو نہیں چل سکتا تھا — لیکن رہا تھا.. بے شک ایک گرینڈ پارٹی سوائے اُس سی ڈی باسٹرڈ کے... صاحب کمال جی کرم ان نوٹوں کی ایک گڈی تو ان کشتیوں پر وار دیجیے مجھ پر احسان ہو گا... میری خوشی کا خیال کیجیے... اور وہ ڈیم نوٹس ہیلی کاپٹروں کی طرح الگ الگ دھیرے دھیرے نیچے اتر رہے تھے... اور نیچے جنگل نہ تھا پیکنگ کی پتلیاں تھیں۔

نرسیں اور زخمی جوان سر —

کچھ مضائقہ نہیں — اس لیے کہ ریکارڈ پر تاریخ کے صفحات پر کچھ درج نہیں والا اوریئنٹ ایکسپریس کے مرڈر میں تمام مسافر شامل ہیں اس لیے کون درج کرے گا کون؟.. سب نے اپنے اپنے حصے کے وار کیے تھے... اپنے خلاف کون گواہی درج کرے۔ چنانچہ کاغذ کورے کے کورے رہتے ہیں... اس لیے کچھ مضائقہ نہیں.. برما کے بنگلوں پر ہیلی کاپٹر کا سایہ لڑھکتا ہوا چلا جا رہا تھا اور پیچھے بہت پیچھے نرسیں اور زخمی جوان تھے جنہیں اُتار کر وہ سوار ہو گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مستقبل میں کاغذ کورے رہیں گے۔

ویرانی میں سڑکیں کتنی وسیع اور فراخ ہو جاتی ہیں..

اس وُسعت میں ایک سفید فوکس واگن کھڑی تھی۔

کانوائے رُک گیا۔

تمام آنکھیں اُس مینڈک نما پرانی کار پر رُکتی گئیں جو گہری خاموشی میں.. سکوت میں تھی.. گویا اُس کے وہاں ہونے سے یہ خاموشی تھی — سکوت تھا۔ وہ نہ ہوتی تو وہاں شور و غوغا ہوتا اور شہر کی ٹریفک رواں دواں رہتی۔

اُس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

کانوائے تب تک رُکا رہا اور صاحب کمال کا سانس بھی جب تک کہ فوکس واگن کے پچھلے حصے میں سے کسی نے سر اُٹھا کر رُکے ہوئے کانوائے کو خوف سے نہ دیکھا۔

اُنہوں نے کچھ توقف کیا... اگر کچھ ہونا تھا تو اس وقفے میں ہو سکتا تھا — لیکن کچھ نہ ہوا — اس لیے صاحب کمال جیپ سے اُترا — اُسے اتنے برس گذرنے کے باوجود ایمبوش سچوایشن کی عادت تھی — یہ بھی ایک ایسی سچوایشن ہو سکتی تھی — لیکن وہ جیپ سے اُترا۔

فوکس واگن کے انجن پر سے سر اُٹھائے سیاہ آنکھوں والی ایک دھان پان لڑکی نے اُسے اپنی طرف آتے دیکھا تو اُس کی آنکھیں حیرت اور شرمندگی سے مزید کھل گئیں۔

"ینگ لیڈی، کین آئی ہیلپ یُو؟"

صاحب کمال کے پیچھے ہتھیاروں کی بہتات پورے منظر میں سیاہی کو زیادہ نمایاں کر رہی تھی.. اس کے باوجود یہ ایک پرفیکٹ ایمبوش سچوایشن تھی۔

"جی — " ینگ لیڈی کے ہاتھ میں متعدد تاریں تھیں اور اُلجھی ہوئی تھیں اور

اُس کے گندمی چہرے پر کہیں اُس کی اپنی اُنگلیوں کے نشان سیاہی میں ثبت تھے ــــ "فز
کلاسیوں اور نقُرے حضرات کے لیے فوکسی سے بہتر اور کوئی کار نہیں سر ــــ صرف اِس
کا الیکٹرک سسٹم بندے کو ذلیل و خوار کرتا ہے... تو یہ ابھی ابھی... کھڑی ہو گئی ہے... پتہ
نہیں کونسی تار کہاں سے پلٹ پڑی ہے ــــ"

صاحب کمال نے گردن موڑ کر ہتھیاروں کی سیاہی کے پس منظر کو دیکھا اور اُن
میں سے اِی ایم اِی کا ایک ریٹائرڈ حوالدار آگے آ گیا۔ حوالدار شاہ زمان کی ایک عمر نوجوان
نیم لفٹینوں کی فوکسیوں کی تاریں مرمت کرتے اور بیٹریاں درست کرتے گذری تھی اِس
لیے وہ آگے آیا اور انجن پر جُھکا، چند تاروں کو ادھر ادھر جوڑ کر اور اُنہیں ٹھیک کر کے پیچھے
ہٹ گیا "سر سٹارٹ کریں ــــ" اُس نے ینگ لیڈی سے کہا۔

سر، یعنی ینگ لیڈی نے ایک بھیگی سی مسکراہٹ حوالدار کی جانب دکھائی اور ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھ کر ایک مرتبہ پھر چابی گھمائی... اُس کی کلائی دُکھنے کو آئی تھی اسے گھما گھما کر
لیکن اس بار فوکسی کا انجن زندہ ہو کر پھڑپھڑانے لگا۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسی طمانیت
اور مسرت آئی جس نے چند لمحے پیشتر کی مکمل بے بسی اور خوفزدگی کو بھلا دیا۔

"تھینک یُو سر ــــ"

صاحب کمال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جب ینگ لیڈی نے، تھینک یو سر کہا
اُس کے بدن کے اَن گنت پُرزوں میں سے ایک پُرزہ جھٹکے کے ساتھ رُکا اور فوراً پھر سے
چلنے لگا لیکن اُس ایک لمحے کے رُکنے میں، اُس سکوت میں شکلیں اور صورتیں نقش ہوئیں
جو مٹتی تھیں اور بنتی تھیں اور پھر مٹتی تھیں اور وہ بہت کوشش کرتا تھا کہ وہ نہ مٹیں اور وہ
انہیں مسلسل اور غور سے دیکھ کر جان لے کہ یہ کس کی اور کہاں کی شکلیں تھیں۔
لیکن وہ غور کرنے سے پیشتر ہی مٹ جاتی تھیں اور کاغذ کورا ہو جاتا تھا۔

"اِن حالات میں تمہیں گھر سے نہیں نکلنا چاہئے ینگ لیڈی ــــ"

ینگ لیڈی کے سلونے چہرے اور ہونٹوں پر دانتوں کی سفیدی نمایاں ہوئی "ادھر
ہمیشہ ایسے ہی حالات ہوتے ہیں سر ــــ فائنل ایئر ہے ــــ آئی کانٹ افورڈ ٹو مس دا
کلاسز!..."

"فائنل ایئر؟"

"جی سر ــــ آغا خان یونیورسٹی میڈیکل کالج..."

"اوہو۔ ڈاکٹر اِن دے میکنگ ــــ"

"بچر اِن دے میکنگ سر ــــ وُئی آر آل بچرز ــــ"

ینگ لیڈی نے مزید مذاکرات فضول سمجھے کہ ان کے دوران فوکسی ایک مرتبہ پھر
بائی گوڈ بائی کہہ دینے والی پھٹ پھٹ کر کے خاموش ہو سکتی تھی اور وہ ایکسلریٹر دبا کر دانتوں
کی سفیدی نمایاں کرتی ہوئی ہاتھ ہلا کر چلی گئی۔

صاحب کمال وہیں ایبوش پچوایشن میں تادیر کھڑا رہا۔ اُس کے عقب میں رینجرز
کے نوجوان منظر میں ہتھیاروں کی سیاہی بھر رہے تھے اور بے راہ رو، بھٹک اور بہک جانے
والی گولی کی جھجک میں مبتلا کھڑے تھے۔ صرف اپنے اندر یہ سوال دوہرائے جاتے تھے کہ یہ
یہاں سے ہلتا کیوں نہیں ــــ واپس اپنی جیپ میں جا کر کیوں نہیں بیٹھتا ــــ یہاں کھڑا
اِس معدوم ہوتے ہوئے فوکس واگن کے نقطے کی جانب کیوں تکے جا رہا ہے۔

وِی آر آل بچرز ــــ

وہ پُرزہ ایک لمحے کے لیے پھر سے تھمے تو شکل دکھائی دے...

ینگ لیڈی کی فوکس واگن لیاقت آباد کے سناٹے میں اور ایک مکمل ویرانی میں
جب تک دکھائی دیتی رہی، وہ دیکھتا رہا۔

"مُردے کی طرف دھیان دیں خواتین و حضرات ــــ"

فارملین کی بُو میں ڈائی سیکشن ہال میں ہر مُردے پر دو دو سر جھکے رہے اور اُن میں
سے کسی نے بھی کچھ نہ کہا ــــ کسی بھی رد عمل کا اظہار نہ کیا کیونکہ وہ مُردے کی طرف
دھیان دے رہے تھے۔

"واہ ــــ" صباحت بیگم نے حسب عادت زبان سے ایک پٹاخہ سا چلایا اور یہ ایک
احتجاجی قسم کا پٹاخہ تھا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ اُس کی، مُردے کی طرف دھیان دیں خواتین
و حضرات، کی درخواست کے ری ایکشن میں کوئی نہ کوئی بچر کچھ نہ کچھ کہے گا ــــ اور
کسی نے کچھ نہ کہا اور سب اپنے اپنے مُردوے یا مُردے کے کسی حصے پر جھکے رہے۔

وہ سب لوگ بمشکل پہنچے تھے۔

ویرانی جو شہر میں طاعون کی طرح پھیلتی تھی وہ اُس میں سے گزر کر بمشکل یہاں
تک پہنچے تھے۔ اُن کے حواس پر ابھی تک اُس سناٹے کی چپ تھی جس میں سے گزر کر وہ

بمشکل یہاں تک پہنچے تھے اور اب اِس ڈائی سیکشن ہال میں آغا خان میڈیکل کالج کے سیکشن ہال میں پہنچ کر اطمینان محسوس کر رہے تھے.. اور سست ہو رہے تھے.. اور ان بدنوں میں بے چینی اور ویرانی بھی بہت تھی اور اِسی لئے وہ آپس میں گفتگو کم کرتے تھے اگرچہ ڈائی سیکشن کا پیریڈ سچرز کی زبان میں بک بک پیریڈ تھا لیکن آج وہ بک بک نہیں کر رہے تھے.. رحمان گل نے آخر کار سر اُٹھا کر مُردہ ردم کی مُردہ خاموشی کو توڑا "یار میڈیکل سسٹم جو بے غیرت انگریز کا بنایا ہوا ہے بالکل خانہ خراب ہے۔ اِدھر کیا ضروری ہے کہ مُردہ جو ہے اِدھر ہال میں ہی ہو اور ہم گولیوں اور دھماکوں سے صرف ایک مُردے کے جگر کو چیرنے کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر — یوں —" اُس "یوں" کہنے پر اپنی ہتھیلی پر خشک اور اکڑے ہوئے ماس کا ایک ٹکڑا رکھا جو اُس نے ا حصے کے مُردے کی ٹانگ میں سے چیر کر الگ کیا تھا — "یُوں — یہاں پہنچیں پاکستانی اور مناسب سسٹم یہ ہو کہ ہم مُردے کو اپنے ساتھ گھر لے جائیں اور اطمینان مغرب کی نماز کے بعد ڈائی سیکٹ کریں —"

"پورا مُردہ بغل میں داب کر گھر لے جائیں خان صاحب... اور اماں جان اور گھر والوں کو بے ہوش کر دیں — ہمارے گھر میں تو نخلخہ بھی نہیں جو شنید ہے کہ گھروں میں ہوتا ہے اور جسے سونگھنے سے پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے —" بیزاری اور ... کی جو علامتیں ہوتی ہیں وہ اِظہار اعوان کے چہرے پر تھیں۔

"اِظہار اعوانا —" رحمان گل نے توجہ اُدھر کی جدھر وہ بار بار اپنی عینک درست کرتا اپنے مُردے کے رخسار پر ہلکے ہلکے کٹ لگا رہا تھا... Kindest Cut... "پورا ڈیڈ باڈی نہیں یارا صرف وہ حصہ جسے ڈائی سیکٹ کرنا ہوتا ہے — اب پچھلے برس معلوم کیا ہوا میں ایک مُردے کا پورا بازو کاٹ کر — اِدھر کوٹ کی اندرونی جیب میں اڑس کر ا ہوسٹل لے گیا تھا.... ایمان سے —"

"اوئے نسوار خاناں — یونہی نہ چھوڑا کر یار —" داؤد احمد نے ایک لگڑ بگڑ قہقہہ لگا کر کہا۔ دانش نے بھی سر اُٹھایا۔ پہلے اپنے ماتھے پر آئے ہوئے اُس پسینے کو پونچھا اُس کی آبنوسی رنگت کی بنا پر کسی اور کو دکھائی نہ دیتا تھا — "نہیں نہیں — ا... جی نہیں چاہتا —"

کمند علی خان البتہ اپنی چیر پھاڑ چھوڑ کر ٹہلتے ہوئے رحمان گل کے قریب آگیا

کے کندھے پر ایک مربیانہ تھپکی دے کر بولے — "کوٹ کی جیب میں مُردے کا ... — واللہ"

"بہت افسوس کا بات ہے یارا۔ ایک مسلمان مسلمان کی بات کا اعتبار نہیں کرتا.. ن ترتیب ہے.. میں تمہیں ایمان سے بتاتا ہوں کہ اِدھر جو لاش ماش میرے حصے میں آتو جاتے ہوئے میں نے اُس کا بازو کاٹا اور اِدھر کوٹ میں — ہوسٹل لے گیا۔ سویرے ہمارا دوست ہے تو اُس کی فیکٹری میں تیزاب کا کام ہوتا ہے۔ بازو تیزاب کے ڈرم ڈالا تو گوشت الگ اور ہڈی الگ۔ صاف ستھرا خوبصورت ہڈی یارا۔ کسی ٹیکسٹ بک اناٹومی نہیں تھا۔ مجھے ایک ایک ہڈی سپارے کی طرح ازبر ہوگئی.. ایمان سے"

"رحمان گل — اگر تمہارے دماغ میں اتفاق سے کوئی اچھوتا دانش مند خیال ئے تو وہ قید تنہائی سے تنگ آ کر فوراً کوچ کر جاتا ہے — تم موٹی عقل کے مالک ہو" ان اِظہار اعوان نے دیا تھا اور صرف وہی دے سکتا تھا۔

رحمان گل نے تیوڑھی چڑھا کر اُس کی جانب دیکھا۔ کچھ دیر کے لئے اپنا ڈائی نالیڈ مُردے کے اُس حصے میں رکھا جسے وہ چیر رہا تھا کچھ غور و حوض کیا اور پھر اُس نے نتاب سمجھا کہ اِظہار کے اِس فقرے پر کسی قسم کے رد عمل کا اِظہار نہ کرے.. اب لاش کرتا ہے تو وہ جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں میں مل نہیں رہا۔

"میں تمہیں موٹی عقل کا مالک اِس لئے کہتا ہوں کہ تم بنیادی طور پر ایک ذہین ہونے کے باوجود تاریخ کا شعور نہیں رکھتے۔ تم نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے... ایک وہ تاریخ ہے جو تمہیں نرسری سے پی ایچ ڈی تک رٹائی جاتی ہے اور ایک اُدھر دوسری تاریخ ہے جس کے بارے میں تمہیں لاعلم رکھا جاتا ہے، تم اُسے جان نہیں سکتے، اُس کا نہیں کر سکتے۔ اگر کرو گے تو پوری اسٹیبلشمنٹ کمربستہ ہو جائے گی تمہیں برباد کرنے لئے —"

رحمان گل کا منہ کھلا ہوا تھا اور اُس کی حیرت کی کوئی سرحد نہ تھی اور صرف اِس تھی کہ اُس نے تو صرف مُردے کے ایک حصے کو ہوسٹل لے جانے کی بات کی تھی گر اِظہار اعوان کا بچہ تاریخی شعور وغیرہ جیسی مہمل اصطلاحات کا بے دریغ استعمال کر

"یارا میں نے تاریخ ماریخ کی تو کوئی بات نہیں کی —"

"تم نے نہیں کی تو میں کر رہا ہوں —" اِظہار کی سیاہ آنکھیں از حد خشمگیں اور

ناراض تھیں" تم نے کبھی سوچا ہے کہ آج جو ویرانی ہمارے اندر ہے ہمارے شرمساہے
— یہ کہاں سے آئی... آج کے اخبار میں تم نے وہ تصویر دیکھی ہے جس میں کرتے شلوار
میں ملبوس ایک بلند قامت نوجوان گولیوں کی چوڑی بیلٹ گلے میں ڈالے بندوق کو کندھے
سے لگائے، نشانہ لگائے بغیر، دو پُر اطمینان سپاہیوں کی موجودگی میں ایک ویران سڑک کے
درمیان تنہا ایک طاقت... ایک ناقابل تسخیر طاقت کی طرح کھڑے ہوئے — جس کے
عقب میں صرف عامل بنگالی بابا — کالے سفلی علوم کے ماہر بنگالی بابا کی ہتھیلی دکھائی دے
رہی ہے — اور وہ فائرنگ کر رہا ہے۔ کیا تم نے وہ تصویر دیکھی ہے خلن صاحب... اگر
نہیں تو۔ تم تاریخ کے ارتقا اور اِس ارتقا پر اپنی بے بسی کا شعور نہیں رکھتے..."

"چلئے مُردوں کو چیرتے پھاڑتے آپ ذرا — بلکہ ذری کی ذری ہمیں تاریخی
شعور کی آگہی بھی بخش دیجیے —" صباحت خانم نے بور ہو کر یہ بات کی۔

"برصغیر کے مسلمان ایک ابنارمل ریس ہیں —" اِظہار نے کہا اور کہنے کے بعد
لاپرواہ ہو کر اپنے مُردے پر جھک گیا لیکن سب کے سب بچر سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگے۔
مختلف رد عمل ظاہر ہونے لگے۔

"چھوڑو یار اِظہار — تمہاری پرابلم یہ ہے کہ تم نے عشق نہیں کیا.. شراب نہیں
پی.. اِس لئے تم ذرا میٹر ہو گئے ہو۔ اوٹ پٹانگ اور بے ہودہ ہو گئے ہو۔ کیا میں ابنارمل
ہوں؟ میں داؤد احمد؟"

"ہم پلٹ ہی نہ پڑیں —" صباحت خانم نے موقع غنیمت جان کر اپنا پسندیدہ بیانہ
بجایا "اِظہار تم ہم تلیروں کے ڈیڈلی مخالف ہو لیکن ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے.. مرنے والا
کوئی.. زندگی چاہتا ہو جیسے اِس لئے اعتراض نہیں کرتے اے باریش اور پیارے دوست"

"اوکے۔ اوکے" کمند علی خان نے لچک کر کہا "آج فیصلہ ہو جائے کہ برصغیر کے
مسلمان اگر ابنارمل ہیں تو کیوں ہیں.. ویسے آپ سب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جب
کبھی ہم برصغیر کے مسلمانوں کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اُس میں ہرگز موجودہ پاکستان
کا کوئی خطہ شامل نہیں ہوتا... صرف علی گڑھ لکھنؤ اور بہار وغیرہ مائنڈ یو — کیوں
نورالہدیٰ؟"

"ہاں —" اُس نے صرف اتنا کہا۔

صرف دانش نے ایک گہری آواز میں سنجیدگی سے اِس خواہش کا اِظہار کیا کہ اِظہار

تھیس کی وضاحت کرے کہ خاص طور پر — برصغیر کے مومنین ہی ابنارمل
اور ابنارمل کا مطلب ہوتا ہے — بے قاعدہ۔ نقطۂ اعتدال سے دور — عجیب

"ڈیئر بچرز —" اِظہار نے خطاب کیا" ہم اِس کانٹینٹ آف سِرے کے
ہیں۔ میں اگرچہ فہم میں نراد چودھری کا ہم پلہ نہیں ہوں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں
مومنین تھوڑے سے ابنارمل ہیں"

"تھوڑے سے یا مکمل طور پر؟" نور نے سوال اُٹھایا" یہ نکتہ بالکل صاف ہونا

"کافی حد تک نورالہدیٰ — میں محمد بن قاسم کے عہد سے شروع کرتا ہوں..
اِس نوجوان کی آمد سے بہت پہلے اِن خطوں میں مسلمان آچکے تھے اور عرب گورنر
راج کر چکے تھے لیکن اِس کے باوجود ہمیں یہ اسرار ہے کہ نہیں محمد بن قاسم ہی برصغیر
وارد ہونے والا پہلا مسلمان تھا... سُوٹ یور سیلف میں اعتراض کرنے والا کون ہوں...
اُن کے سامنے اعتراض کرنا یوں بھی دانش مندی نہیں — کیوں دانش؟.. بہرحال میں
کے عہد سے شروع کرتا ہوں اگر وہ کوئی باقاعدہ عہد تھا تو... لیکن میں قاسم بھائی کی
میں لپٹی ہوئی بے آرام اور بے سانس موت برداشت نہیں کر سکتا۔ اکثر کِڈز یہ
ہیں کہ اگر محمد بن قاسم سے ہماری تاریخ کا آغاز ہوتا ہے تو کیا اُن کے آنے سے پہلے
ہر طرف پانی ہی پانی تھا —"

"اِظہار بھائی — اگر آپ توقف کر سکیں تو میں — یہ بندۂ ناچیز حقیر پُر تقصیر
عرض کرنا چاہتا ہوں —" یہ کمند علی تھا۔

"آپ بنا شک کیجئے — میں نے آج ہی اخبار میں وزیر اعظم کا ایک بیان پڑھا ہے
ایک آزاد ملک ہیں — آپ فرمایئے؟"

"اگر آپ ذرا نزدیک آ جائیں تو ہمیں آسانی ہو جائے گی — محمد بن قاسم سے
دوتوں تک پہنچتے پہنچتے اِس ڈائی سیکشن ہال کے مُردوں کا زندہ ہونے کا ٹیم آ جائے

"درست... اچھا پوائنٹ ہے" اِظہار نے فی الفور اتفاق کیا" ہم 1857ء کو بھی چھوڑ
ہیں اگرچہ مجھے ہمیشہ قلق رہے گا کہ اگر میرے پردادا یا اُن کے والد گرامی انگریزوں

کے ادنیٰ پٹھو وغیرہ ہو جاتے تو آج میں بھی کسی قانون ساز ادارے یا کسی عظمیٰ عہدے متمکن ہوتا اور میرے والد فتح جنگ میں مونگ پھلی کاشت کر کے یا بچوں کو عربی فارسی درس دے کر میری تعلیم کا خرچہ پورا نہ کرتے... بہرحال آپ کی خواہش کے مطابق ذرا نزدیک آجاتے ہیں.... یہ جو آپ لوگ گھربار چھوڑ کر افغانستان ہجرت کر گئے تھے برادر افغانیوں نے جس طور آپ کی "پذیرائی" کی تھی وہ کس سلسلے میں تھی... آج بھی شہید گنج کا گرو دوارہ موجود ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ تمامتر اختیارات جائز اور نا جائز مومنین کے ہاتھوں میں ہیں لیکن کسی نے بھی ادھر دھیان نہیں دیا... اِس لئے کہ کسی ہمارے دھیان کا رخ اِدھر نہیں کیا.. ہم انتظار کرتے ہیں کہ کوئی — کوئی اور ہمارے دھیان کا رخ اُدھر کرے... کدھر کرے؟ کسی بھی طرف کر دے ہم نثار ہونے کو تیار۔ شہید گنج کی عصمت کے لئے جو تحریک چلی۔ جو جانیں نثار ہوئیں وہ سب Impulsive تھیں جسے Spur of the Moment کہتے ہیں — ایک لمحے کا خیال اور اُس لمحے کے بعد مکمل فراموشی... تحریک پاکستان بھی تو آخری لمحوں کا خیال تھی.. پہلے تو صلح اور آشتی کی باتیں ہوتی تھیں"

یو آرا ے رِسک — " صباحت نے ناک چڑھا کر اعلان کیا" دیٹ از واٹ یو آر"

"نہیں میں رِسک نہیں ہوں — میں تاریخ کو اُس کے غیر نصابی اور غیر جذباتی تناظر میں دیکھتا ہوں —"

"نہیں نہیں — " کمند علی یونہی شغل کے لئے بولا" برادر اِظہار ہرگز رِسک نہیں ہے.. کچھ اور ہے"

"لیکن سب کانٹینٹ کے مسلمان ابنارمل ہیں اور ڈرے ہوئے"

"تم جاری رہو اِظہار اعوان — میں جو تمہیں سُن رہی ہوں —" نور الہدیٰ بولی اگرچہ وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"یہ ہندوؤں سے زیادہ ہندو ہیں اِسی لئے بنیاد پرست ہو جاتے ہیں۔ اِن کے اندر ابھی تک تمام تر بُت اور براہمنی موجود ہے اور وہ اُس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ ایک ترک کو ایک شامی کو یہ پرابلم نہیں ہے۔ بہرحال... پاکستان بننے کے بعد ... میں اپنا بیان بوجوہ مختصر کرتا چلا جا رہا ہوں — چند طالب علم لنڈی کوتل سے غیر ملکی مصنوعات کی شاپنگ کر کے لوٹتے ہیں اور راولپنڈی میں اُن کی چیکنگ ہو جاتی ہے اور جناب ایوب کتنا ہائے ہا

مہنگائی نے مار ڈالا — فیصل آباد میں ہاکی میچ کھیل کر لڑکے واپس آ رہے ہیں ربوہ میں کھڑی ہوتی ہے تو قادیانی تحریک زور پکڑ جاتی ہے... بھٹو کے خلاف الیکشن کے الزامات ہیں اور زبردست ری ایکشن ہو رہا ہے.. دوبارہ الیکشن کی ڈیمانڈ اور کہیں بیچ میں سے چپکے سے تحریک نظام مصطفیٰ آجاتی ہے.. یہ تحریک آج کہاں ہے؟ افغان جہاد کے "ثمرات" کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا.. لیکن کوئی منصوبہ نہیں ہے... Impulsive اور لمحے کا خیال، یہی ہماری تاریخ ہے.. چنانچہ آئندہ بھی ہماری قسمت ہے — لمحے کا خیال"

"کیا ہم ایک قوم نہیں ہیں اِظہار اعوان؟" یہ داؤد احمد تھا ایک کھچری اور صحت کراہٹ کے ساتھ۔

"ہاں ہم ہیں — آپ سب بچر زیہ فیصلہ کر لیں کہ ہم ہیں یا نہیں ہیں.. کیونکہ یہ فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے — لیکن مجھے شک ہے.. کہ ہم نہیں ہیں"

"یہ کون ہے جو وطن کی عصمت کا رکھوالا نہیں ہے؟" کمند علی خان ٹیک پڑے نہایت بردباری سے معترض ہوئے۔ "ہم ہیں —"

"میں اُس کا ٹیٹوا دبا دوں گا یارا — جو یہ کہے کہ ہم ایک قوم نہیں ہیں —"

"آپ دبا دیجئے — " اِظہار نے صرف اتنا کہا اور رحمان گل کی طرف دیکھا جو اُس کی خشمگیں نگاہوں کی تاب نہ لا کر فوراً دھیما پڑ گیا اور بولا" ہماری یہ مجال — لیکن یارا... قوم ووم تو ہم ہیں —"

نور الہدیٰ کی مسلسل مسکراہٹ میں کمی نہیں آ رہی تھی اور وہ پھر بولی" ہم آپ کی نہیں گے خاں صاحب.. اور یاد رہے کہ آج ہی وزیراعظم نے فرمایا ہے کہ ہم ایک ملک ہیں.. اِس لئے فائر اوے..."

"یارا میرے مُردے کا تو جگر خراب ہے... میرا خیال ہے اُم الخبائث کا رسیا تھا..." گل فکرمندی سے بولا۔

"اگر اِس کا جگر خراب نہ ہوتا تب بھی یہ مُردہ ہوتا خاں صاحب — آج نہ ہوتا تو بعد ہوتا" داؤد احمد سر ہلانے لگا" اناطول فرانس کیا کہتا ہے" تھائیس "میں... ایک کہہ کر... یہ مُردہ ہے لیکن اِس نے زندگی بسر کی تھی اور تم زندہ ہو لیکن تم زندگی سے محروم ہو —"

"میں بھی حیران تھی کہ داؤد بھائی نے ابھی تک" تھائیس "کا حوالہ کیوں نہ دیا... آفٹر آل ایک ہی تو کتاب پڑھی ہے موصوف نے پچھلے دس برسوں میں" صباحت مسکرائی..

"ہائے ہائے صباحت خانم آپ کی یہ مسکراہٹ دیکھنے کے لئے ہی تو اس خاکسار نے یہ حوالہ دیا تھا —" داؤد کا قہقہہ ہولناک حد تک بلند تھا۔

"لیکن ہم موضوع سے ہٹتے جا رہے ہیں خواتین و حضرات اور زندوں کی بجائے مُردوں کی طرف دھیان دے رہے ہیں... رحمان گل ہم آپ کی بیش قیمت آراء سننے کے لئے بے چین ہیں —" نور نے دونوں ہاتھ درخواست کی صورت میں پھیلا دیئے۔

"ہاں —" رحمان گل نے سر جھٹک کر کہا "تو یہ جو ہمارا بارلیش اور پرہیزگار ساتھی ہے اور کہتا ہے کہ ہم ابنارمل ہیں تو یہ بہت Extreme پر جا کر فیصلہ دیتا ہے۔ قوم تاریخ اور اپنے ردعمل کے بارے میں اپنا مخصوص رویہ رکھتی ہے یارا — اور وہ کسی اور قوم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ہم جو ہیں تو مزاج میں گرم سرد شتابی سے ہو جاتے ہیں اپنے موسموں کی طرح تو ہم بھی ایک مخصوص صورت حال میں اپنے مزاج کے مطابق ردعمل ظاہر کرتے ہیں — مسئلہ وغیرہ تو یہ ہے کہ ہم اپنا موازنہ انگریز بے ایمان سے کرتے ہیں —"

"بے ایمان تمہارے نینوا... وغیرہ" یہ پھر صباحت تھی۔

"یارا سلسلۂ خیال میں ٹانگ مت اڑاؤ — تو ہم اپنا موازنہ انگریز... سے کرتے ہیں — ہر شے میں... یارا یورپ میں صرف انگریز اور جرمن ہی تو نہیں اور بھی تو ہیں — اپنے اطالوی اور ہسپانوی بھائی جو ہیں تو اُن کا رویہ کیا ہے تاریخ کے ساتھ — کیا وہ آف دی مومنٹ نیشنز نہیں ہیں؟..."

"کیا دل پذیر تقریر ہے —" کمند علی خان کے دونوں ہاتھ خون سے لتھڑے ہوئے تھے ورنہ اُن کا مصمم ارادہ تالی پیٹنے کا تھا۔

"میں نے اپنا آرگومنٹ مکمل نہیں کیا — اجازت ہے اِظہار بھائی —" رحمان گل نے اُدھر دیکھا جدھر اِظہار ڈائی سیکشن کو فراموش کر کے انتہائی انہماک سے دانت کھجاتا ہوا اُسے سُن رہا تھا "تحریکیں کسی حادثے یا وقوعے کے حق میں نہیں ہوتیں بلکہ اپنے وجود کے دفاع کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ بادی النظر میں ایک خاص ڈیمانڈ یا ایک خاص...

...ہی باقی ہیں لیکن اُن کے عقب میں نادانستہ طور پر دفاع کی ایک دیوار ہوتی ہے — اگر ہم یہاں سے ایک انچ بھی ہٹے تو ہمیں کل وہ بہت ساری زمین تیاگنی ہوگی جو آج ہمارے قدموں تلے ہے اور اسی لئے ہم بنیاد پرست ہو جاتے ہیں... مسجد تو بنا دی شب بھر ایمان کی حرارت صرف شب بھر کے لئے تو نہیں تھی یہ تو اپنے ہونے کا اپنے وجود کا اعلان تھا —"

"مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا —" اِظہار کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"آج تک کسی کو کسی بھی سوال کا جواب ملا ہے —" داؤد پھر ہنسا۔

"اِظہار خاناں تم ذرا غور سے سنتے تو تمہیں مل جاتا —"

"ویل سیڈ —" صباحت نے فوراً کہا۔

"کیا آج نفری پوری ہے —" کمند علی خان نے سر اُٹھا کر تمام بچرز کے سفید اوور آلز کو دیکھا۔ دانش نے بھی نگاہ دوڑائی "ستار نقوی دکھائی نہیں دے رہا —"

"وہ قدرے بکتر بند قسم کے علاقے میں قیام پذیر ہے — ایک نظر کھڑکی سے باہر — اور کھڑکی سے باہر ویرانی — جلتے ہوئے ٹائر۔ رینجرز کی گاڑیاں اور آوارہ گولیاں اور ستار بھائی دبک گئے ہوں گے"

"میں نے عرض کیا تھا ناں کہ مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ اور داؤد تم چپ رہو گے —" اِظہار نے موضوع سے ہٹ جانے پر ناپسندیدگی کا اِظہار کیا۔

"آہم —" رحمان گل کھانسا — "ایک لمحے کا خیال صدیوں کی سوچ اور انسانی کے ردعمل پر مبنی ہوتا ہے۔ شہید گنج کا گردوارہ ابھی تک وہاں موجود ہے تو اس لئے کہ اب باگیں ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں اور ہم ایک وسیع اگرچہ نان پریکٹیکل دل رکھتے ہیں کہ کل جس کے لئے ہم جانیں قربان کر رہے تھے آج چونکہ ہمیں کوئی کامپلیکس نہیں ہے اس لئے... یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ تحریک پاکستان بھی ناانصافی کے خلاف ایک ردعمل تھا اگر یہ کہا گیا کہ پاکستان تو دراصل ہندوؤں نے بنایا تو ایسا غلط نہیں کہا گیا یارا... یہ سپر آف دی مومنٹ نہیں تھا — بہت برسوں کے اِنکار جمع ہو کر اس کلائمکس پر آئے تھے.. اب کے خلاف جو کچھ ہوا وہ ایک اوپننگ تھی جیسے گیس پائپ کہیں سے لیک کر جاتی ہے اور وہاں شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ قادیانیوں کے بارے میں بھی ہم نے — یا ہمارے علماء نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا —"

"اور جو کچھ اُن کے ساتھ اب ہو رہا ہے؟ جو برتاؤ عظیم ڈاکٹر عبدالسلام سے کیا وہ انصاف ہے؟"

"یہ ایک الگ موضوع ہے —" رحمان گل پھر اپنے مُردے کی طرف دھیان دینے لگا" سارے سوالوں کے جواب دینے کا ٹھیکہ رحمان گل کے پاس نہیں ہے — ہوئی بارشِ سنگ" اور شعلہ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد —"

شوبھا جھکی رہی —

شوبھا جھکی رہی اور گاڑھے سیاہی مائل گوشت کی طرح ہی ٹھنڈے سکڑے ہوئے خون میں اُسے وہ رگیں نہیں مل رہی تھیں جن کی اُسے تلاش تھی — وہ سب کچھ کر رہی تھی لیکن اُس کا دھیان اُدھر لیاری کے اُس برآمدوں والے سکول میں تھا جس کے ایک برآمدے میں بابا چاک، ہاتھ میں لئے اپنے سامنے چٹائیوں پر بیٹھے بیزار اور بھولی شکلوں والے اُن بچوں کو دیکھ رہے تھے جن کے بال کسی ایک ہی نائی نے ایک ہی مشین سے تراشے تھے اِنہیں مختلف سائز کے تربوزوں میں بدل دیا تھا اور وہ اپنے آس پاس سے بے خبر شوبھا کو بھی بھولے ہوئے اُنہیں مطالعہ پاکستان کے کسی باب کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شوبھا نے اِنہیں دیکھا تھا — آج اُنہیں سکول جانے کی ضرورت نہ تھی — ویسے تو شوبھا کو بھی یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی — برآمدے کے آخری ستون کے ساتھ جس کا پلستر جابجا اکھڑا ہوا تھا اُن کی سپورٹس سائیکل ٹیک لگائے اُن کی طرف دیکھ رہی ہو گی۔

وہ اپنے بابا کے بارے میں فکر مند ہو رہی تھی اور اُس کا دل مٹھی میں آتا تھا فکر مندی سے اور اِسی لئے وہ رگیں سرد خون کے انجماد میں تلاش کرنے پر بھی نہیں مل رہی تھیں اور اُس کے ہاتھ کانپتے تھے۔

فارملین کی بُو میں تادیر کوئی بات نہ ہوئی۔

"یارا اب میں سوال پوچھتا ہوں۔ یہ مارکٹائی یہ جھگڑا مگڑا کدھر سے آگیا؟ پہلے امن و امان تھا — کدھر سے آگیا؟"

"میرا خیال ہے تم تشدد کی بات کرتے ہو —"

"وہی وہی —"

"کراچی اور تشدد — جسے کہتے ہیں کہ چولی دامن کا ساتھ —" اِظہار نے

بات ناگواری میں ہی بولا" اردو کے محاورے بھی کتنے واہیات ہوتے ہیں... چولی اِن ڈیڈ" خواتین کے ہاتھ اپنے نکس درست کرنے کے لئے اُٹھے اور رُک گئے۔

"غزہ — موسک آف دی پٹیرچ — نیزرتھ — اور بائی دے رِور آف بابلون —" داؤد نے حسب معمول غیر سنجیدگی سے سب کو آنکھوں میں شرارت کی چمک لئے دیکھا، اپنی ناک کو دونوں اُنگلیوں میں کس کر جھٹکا دیا اور پھر ورزش کرنے کے انداز میں دونوں بازو ہوا میں پھیلائے۔

"فلسطین نے تشدد کو جنم دیا۔ اگر فلسطینی نہ ہوتے تو ہم سب امن اور چین اور سکھ کی بانسری وغیرہ اگرچہ بے سُری لیکن بجا رہے ہوتے —"

"ہمارے بھائی ہیں یارا —" رحمان گل نے اِسے گھورا۔

داؤد نے سینے پر ہاتھ باندھ دیئے" میرے بھی ہیں —"

"اور میری بھی ہیں —" صباحت نے زبان کا پٹاخہ چلا کر تائید کی۔

"تم بات کرو داؤد —" اِظہار نے اُنگلی اُٹھا کر اُسے جیسے حکم دیا" یہ لوگ ہمیشہ اپنی تاریخ سے روگردانی کرتے آئے ہیں اور اِس مسخرے پن کے رویے نے اِنہیں قوموں میں ایک مذاق بنا دیا ہے"

"تھینک یُو یار —" داؤد نے پھر سینے پر ہاتھ باندھ کر جُھک کر سر ہلایا" تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سراسر قصور فلسطینیوں کا ہے۔ اُنہوں نے قوت کو اور بین الاقوامی غنڈہ گردی اور ناانصافی کو "لیس سر" نہیں کہا اور امن کی شاخ اور فاختہ وغیرہ سے روگردانی کرتے ہوئے احتجاج کیا.. اور اِسی احتجاج سے تشدد اور دہشت گردی کی پہلی کونپلیں پھوٹیں — وہ ذمہ دار ہیں.. محمود درویش بھی درویش نہ رہا — پین ایم کے بلاسٹ ہوتے ہوئے طیاروں کا منظر — مجھے تو اتنا حسین لگا تھا کہ میں اُس کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا اور پھر ڈارلنگ لیلئے خالد — اُنہوں نے راستہ دکھایا ورنہ ہائی جیکنگ سے کون واقف تھا یہی ذمہ دار ہیں —؟"

"اور تم سمجھتے ہو کہ اُن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی.. تاریخ کی سب سے بڑی ناانصافی — بلکہ غنڈہ گردی اُن کے ساتھ نہیں ہوئی؟" دانش کی گہری پاٹ دار آواز ہال میں گونجی۔

"اگر ایسا ہوتا تو برادر یاسر عرفات آگے بڑھ کر انکل کلنٹن اور بھائی اِسحاق سے

دست پنجہ نہ لیتا —" داؤد بولا "بہرحال یہ آغاز تھا پھر خیر سے افغانستان آگیا —"

"جہادِ افغانستان —" رحمان گل نے لقمہ دیا۔

"جی بالکل۔ اور اِس کے فال آؤٹ سے آپ آگاہ ہیں.. ہیروئن۔ کلاشنکوف ایسے جنرل جنھوں نے پاکستان کے لئے کچھ نہیں کیا لیکن وہ فاتح افغانستان تھے —ا جینئس جنہیں اپنے ملک کی خبر نہ تھی اور وہ افغانستان کے چپے چپے کو جانتے تھے اور جا آباد میں آباد تھے —"

"ہاں داؤد —" دانش سر ہلا رہا تھا اور تاسف اُس کے چہرے کو مزید سیاہ تھا "ہم نے ایک شاندار جہاد کیا۔ ہماری فوج کا رُخ اِدھر کی بجائے اُدھر ہو گیا اور ہم نے زمین کی مُحبّت محسوس نہ کی۔ ہم افغانستان کے بارے میں پُر تشویش رہتے تھے —"

"میری خواہش ہے کہ —" شوبھا نے بالآخر بولنے کی کوشش کی "کہ — — پتہ نہیں میری کیا خواہش ہے"

"ہاں —" اِظہار نے رحمان گل کو پہلی بار گھور کر نہ دیکھا "اپنے وطن میں ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور دوسروں کی زمین کے لئے ہم ہتھیار اُٹھا لیتے ہیں —"

سٹریچرز چونکہ قدیمی ہو چکے تھے اِس لئے اُن کے پہیّوں کو جوڑوں کا درد لاحق اور وہ بہت آواز کرتے تھے اور ڈائی سیکشن ہال میں بیچر ز کی بَک بَک کے علاوہ خاموشی اِسی لئے ایک سٹریچر جب چوُں چوُں چرَخ چوُں کرتا اندر آیا، خود بخود تو اندر نہیں اُسے بابا ننھے میاں بمشکل دھکیلتا اندر لا رہا تھا اور بابا ننھے میاں کا سٹریچر ہمیشہ ایک لاوار لاش کو جھلاتا ہوا اندر آتا تھا — تو وہ سٹریچر اندر آیا۔

بیچر ز نے بک بک منقطع کر کے اُدھر دیکھا اور مسرت سے مغلوب ہو کر اُدھر دیکھا کہ شائد چیر پھاڑ کے لئے ایک اور مردہ دستیاب ہو جائے۔

"یہ میرا ہے —"

"نہ جی —" کمند علی خان بولے "ہم نے تو ایڈوانس بکنگ کروا رکھی ہے اَب ہماری باری ہے"

شوبھا نے آگے ہو کر اُس کا معائنہ کیا —

ستار نقوی نے کہا تھا کہ مُردے انتظار کر سکتے ہیں زندہ نہیں۔

چنانچہ ستار نقوی اُس چرَخ چوُں سٹریچر پر منہ کھولے انتظار کر رہا تھا اور ایک نیم

کی طرح لگ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ صاف تھا، کوئی زخم نہ تھا — نیچے بدن میں جانے کہیں ایک یا شاید دو... راہ سے بھٹک جانے والی گولیاں تھیں اور وہ مُنہ کھولے انتظار رہا تھا۔ اس کُھلے مُنہ میں تالُو اور دانت بھی موت کی زردی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وہ پیچھے ہٹی اور اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہری ہونے لگی۔

"شوبھا —" اظہار سب سے پہلے آگے آیا۔

"ارے ارے —" کمند علی خان اُس کا بازو تھاما "طبیعت ناساز ہو رہی ہے کیا؟"

نورالہدیٰ نے شوبھا کو نہیں سٹریچر پر اکڑی لاش کو دیکھا اور اُس کے چہرے کی پہچان اور ایک ہچکی بھر کر گلے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دباتے ہوئے پیچھے ہو گئی۔

باری باری سب بیچر ز کے چہرے زرد ہو گئے اُس کے تالُو کی زردی کی طرح.....

شوبھا اُن کے ہاتھوں اور سہاروں سے ٹوٹ کر الگ ہوئی اور اُسی طرح پیٹ پر ہاتھ رکھے دوہری ہوتی ہوئی اَندھا دُھند بھاگتی ہوئی ہال سے باہر نکل گئی... باہر دنیا وہیں کی وہیں تھی اور دھوپ چمک رہی تھی۔ اُس کے اندر جو کچھ تھا باہر آنے لگا.. اس کے بدن کا سَرد اُس کی قے کے دھچکوں سے جھُولتا اور زمین کی سطح تک جھکتا چلا جاتا تھا۔ آنکھوں میں سے تھا پانی رخساروں پر راستے بناتا قے کے ڈھیر پر گرتا تھا۔ وہ ناک صاف کرتی اور ایک بیمار بکری کی طرح ڈکراتی وہیں بہت دیر جھولتی رہی اور اپنے آپ کو بحال کرنے کی کوشش کرتی رہی — وہ اُٹھی تو اُس کی ٹانگوں میں جان نہ تھی۔

فوکسی فوراً سٹارٹ ہو گئی۔

اگرچہ وہ کچھ دیر پہلے اُسی سناٹے اور خالی پن میں سے گذر کر کالج پہنچی تھی لیکن اب اُسی میں دوبارہ داخل ہوتے ہوئے وہ جھجکی۔ اِس سناٹے کے اندر کوئی ٹوٹنے والی شے تھی جو شائد اُس کی فوکسی کی پھٹ پھٹ سے ریزہ ریزہ ہو سکتی تھی... اُس کی کرچیاں بم بلاسٹ کی طرح فضا میں اُڑ سکتی تھیں — اُس کی آنکھوں سے پانی بہتا جاتا تھا اور وہ بار بار اُسے ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتی لیکن گدلی وِنڈ شیلڈ کے آگے جو کچھ دکھائی دیتا تھا ایک آبی پردے کے آگے دکھائی دیتا تھا.. راستے دھندلا رہے تھے۔

ایک چیک پوسٹ پر وہ رُکے بغیر پوری رفتار سے گذر گئی۔ بیک وِیو مِرر میں چند لمحے حرکت میں آتے ہوئے وردی پوش اور اُن کے بے یقین چہرے دکھائی دیئے اور پیچھے رہ گئے۔ مرڈر شل بریڈ مرڈر نِل دے اینڈ آف ہسٹری — آ ویٹ ان دے نیم آف جسٹس۔

یہاں کراچی میں مرڈر بریڈ کرنے کی سب سے بڑی انڈسٹری اس مملکت خداداد
اللہ کے فضل سے قائم ہو چکی تھی۔

وہ پہلا قتل کس نے کیا تھا جس نے دوسرے قتل کے لیے انصاف کا جواز مہیا
— یقیناً ستار نقوی نے نہیں۔

دُور ایک چوراہے کے درمیان میں سے اور اُس چوراہے کی دُوری بتدریج ہوتی جا رہی تھی، جلتے ٹائروں کا دھواں اطمینان اور سکون سے آسمان کو اُٹھتا تھا — کہاں سے اُٹھتا تھا؟ چوراہے کے بیچ میں سے اٹھتا تھا۔

فوکسی کے بس میں جتنی رفتار تھی وہ شائد اس سے بھی تیز جا رہی تھی اور شو ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کو پونچھنے کو تھی جب اُس نے دھویں کے برابر میں سے، ہوئے ٹائروں کے قریب کھڑے ایک ٹین ایج لڑکے کو سپاٹ کیا، نرم رخساروں اور بکھرے پریشان بالوں والے ایک ایسے لڑکے کو سپاٹ کیا جو ایک منی ایچر کلاسس آف رہوڈز مانند اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا اور اُس کا ایک بازو گویا سلو موشن میں آہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا تھا اور جب وہ بازو سیدھا ہوا تو اُس کے اختتام پر جو اُنگلیاں تھیں ان ایک اُنگلی اُس پستول کی لبلبی پر تھی جسے وہ تھامے ہوئے تھا — اور اُس کی نالی فوکسی وِنڈ شیلڈ پر فوکس ہو رہی تھی — شوبھا نے جان بوجھ کر نہیں ایک اداس اور بے پرا اضطراری حالت میں ایکسلریٹر کو مزید دبا دیا — وہ لڑکا بازو سیدھا کیے نشانہ باندھے وِنڈ شیلڈ میں آنے کے لیے بڑا ہوتا گیا اور بالآخر شوبھا اُس کی ہلکی مونچھیں اور لرزتے ہونٹ ایک بگ کلوز میں دیکھ سکتی تھی جب ایک ڈھکی ہوئی دھپ کی آواز آئی ا دوسرے لمحے وہ جلتے ٹائروں کے چوراہے سے دوسری جانب ایک اور سناٹے میں داخل چکی تھی — اُس کی وِنڈ شیلڈ سلامت رہی تھی۔ بیک وِیو مرر میں اُسے منی ایچر کلاسز آف رہوڈز سڑک پر گرا ہوا دکھائی دیا... پستول ابھی تک اُس کی اُنگلیوں میں پھنسی ہوئی تھی اُس نے دیر کر دی تھی۔

ہم اپنے آس پاس سے کب تک لاپرواہ رہ سکتے ہیں — جب تک کہ آپ کے اپنے کلیجے پر ہاتھ نہیں پڑتا — مرڈر شل بریڈ مرڈر —

لیاری ایک بے آسرا منظر تھی۔

بے ترتیبی، گندگی، غربت حیوانی سطح کی — کسی بھی سطح کی انسانیت کی رہائش کے

کی ناموزونیت... آپ تب یقین کرتے تھے جب اُسے دیکھتے تھے۔

بازار بند تھے۔ مرزے یار کی غیر موجودگی میں بھی گلیاں سُونی تھیں۔ ایک دوکان کے نیم وا دروازے میں سے قمیض تیری کالی سوہنے پھلاں والی — باہر ایک خوفزدہ حالت میں سنائی دے رہی تھی۔ برآمدوں والے سکول کی پوری عمارت خاموش اور خالی تھی — اور کوئی بھی نہ تھا... لیکن وہاں آثار تھے کہ یہاں تھوڑی دیر پہلے کچھ آبادی اور کچھ شور تھا۔ شوبھا نے برآمدوں کا ایک چکر لگایا... ایک بلیک بورڈ پر — مسلمان ایک اُمت ہیں.... لکھا ہوا سفید چاک اور ایک ڈسٹر... وہ فوکسی کی عافیت میں واپس آ گئی — بابا راستے میں ہوں گے، اُسی چوراہے میں سے گذریں گے جہاں ٹائر جل رہے ہیں اور کلاسس آف رہوڈز گرا پڑا ہے۔ یا شائد اُس کی جگہ ایک اور ٹین ایج کلاسسن نے لے لی ہے اور وہ بازو اُٹھائے اپنی جانب آہستگی سے سفر کرتے سپورٹس سائیکل پر جھکے بابا کا منتظر ہے۔

تنگ گلی میں سے کار بیک کرتے ہوئے اُسے بہت دیر لگی۔

اور ایسا ہی تھا —

وہ آس پاس سے لاتعلق سپورٹس سائیکل کے ہینڈل پر جھکا اپنے آپ میں مگن اور بے پرواہ ایک مخصوص دباؤ کے ساتھ پیڈل مارتا اُس چوک کے نزدیک ہو رہا تھا اور وہ جوان تو تب دیکھتا اگر نگاہ اُٹھا کر سامنے دیکھتا اور تب اُس کے عین پیچھے شوبھا نے بریک پر پاؤں رکھ کر ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے بے تابی سے مسلسل بجانے لگی۔ وہ کسی بھی عمل پر قطعی طور پر متوجہ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا لیکن اُس کے کان اس ہارن سے شناسا تھے اور ہمہ وقت منتظر رہتے تھے... مردان خان نے فوراً پاؤں سڑک پر رکھ کر سائیکل روکا اور مڑ کر دیکھا... اس دوران شوبھا ایک مکمل طور پر حواس باختہ شخص کی طرح جو لرزہ تھی تیزی سے کار سے اُتری اور مردان کے پاس دوڑتی ہوئی آئی... اُس نے اُسے کچھ نہیں کہا لیکن پوری قوت سے اُس کی آستین پکڑ کر اُسے سائیکل سے الگ کیا اور زبردستی دھکیلتی ہوئی کار تک لے گئی "آپ بیٹھیں بابا —"

"کیا ہو گیا ہے؟"

"آپ بیٹھیں —"

اُس کے لہجے میں اتنا حکم تھا کہ وہ یقین نہ کر سکا کہ یہ دھیمی آواز والی شوبھا ہی

وہ چپکے سے بیٹھ گیا۔

شوبھا اُسی مخبوط الحواسی میں واپس گئی اور سائیکل اُٹھا لائی اور اُسے کیرئیر پر رکھ دیا جہاں وہ کسی ایک دھچکے سے آسانی سے گر سکتی تھی اور پھر اپنی نشست پر بیٹھ کر چابی گھما دی..

"کیا ہو گیا ہے؟" مروان نے پھر کہا "میں تو کچھ حیران پریشان اور کچھ بے بیابان۔"

"ہاں —" شوبھا نے ایک مرتبہ پھر ہتھیلی سے اپنی آنکھوں کو پونچھا۔

"کچھ ہوا ہے —" مروان واقعی پریشان۔

"نہیں —"

اگرچہ تینوں بیرکوں کی جانب جانے والا کچا راستہ بھی شہر کی طرح ویران تھا لیکن جونہی فوکسی کے ٹائر اُس پر آ کر ڈھول کو اتھل پتھل کرتے اُس کے ذروں کے غبار کو ہوا میں بلند کرنے لگے تو شوبھا نے مدتوں بعد ایک گہرا سانس لیا جو اُس کی بدن کی ہر رگ اور ہر نس میں گیا۔ مروان نے اس کے حواس کی واپسی کو محسوس کیا اور بھنچی ہوئی ہتھیلیوں کو کھول دیا۔

بیٹ مین بشیر صبح سے بے آرام اور بے چین تھا اور بار بار کانوں پر لٹکتی جھالر میں اُنگلیاں چلاتا تھا اور بیرک سے نکل کر کبھی برآمدے میں کھڑا ہوتا تھا کبھی اس سے نکل کر کچے راستے پر کسی واضح مقصد کے بغیر چلنے لگتا تھا — رُکتا تھا — ہاتھ آنکھوں پر جما کر وہاں تک نگاہ دوڑاتا تھا جہاں سے تارکول کی سڑک میں سے یہ ڈھول راستہ الگ ہوتا تھا اگرچہ وہ مقام نظر کی انتہائی حدود سے بہت پرے تھا — اور پھر بے چینی میں کھلبلی کرتا ہوا برآمدے میں واپس آ جاتا تھا بالآخر اُس نے ڈھول کا غبار دیکھا — اس میں اُس کی جانب سفر کرتی فوکسی نظر تو نہ آئی تھی لیکن وہ اُس کی ڈھول کے پھیلاؤ کو دیکھ کر جانتا تھا کہ اس کے اندر ملفوف شوبھا کی فوکسی ہو گی۔

اُس نے ایک شانت سادھو کی طرح بیرک میں آ کر چائے کے لیے پانی رکھا اور انتظار کرنے لگا۔

حیرت انگیز طور پر بلکہ حیرت ناک طور پر بھی سپورٹس سائیکل بغیر کسی بندھن کے کیرئیر پر مسلسل کھسکتی اور جھولتی ہوئی گم ہوئے گرے بغیر ابھی تک وہیں قائم

"تم نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سٹریچر پر ایک عام، بے نام، بے تعلق جسم کی بجائے ایک ایسے اکڑے ہوئے جسم کو دیکھا ہے جسے تم پہچانتی تھیں اور تم نے شوبھا اُس کو چلتے پھرتے ہنستے اور آنکھیں جھپکاتے اور کبھی تم پر — ایک توصیف بھری نظر ڈالتے بھی دیکھا تھا — انسان صرف اُس روز مکمل ہوتا ہے جب وہ اپنے کسی عزیز کی لاش دیکھتا ہے... اس سے پیشتر وہ اپنے آپ کو اپنے جاننے والوں کو ہمیشہ کے لیے وجود میں قائم رہنے کے لائق سمجھتا ہے اور بقیہ دنیا کی فنا سے الگ سمجھتا ہے — صرف اُس روز جب وہ کسی عزیز، کسی دوست، کسی جاننے والے کو بے جان اور نیم وا فرائی انڈے کی بے جان زردی ایسی آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ آنکھیں جو متوجہ نہیں ہوتیں، لاتعلق رہتی ہیں.. جن میں آپ دیکھتے ہیں وہاں نہیں دیکھتیں اور کھلے منہ کے اندر تک کی زردی بے جان ہوتی ہے اور وہ غسل دیتے ہوئے بے اختیار ایسے ہلتا ہے جیسے کسی جوہڑ میں تیز ہوا کے چلنے سے لہروں کے زور سے کوئی ایک سرکنڈہ ہلتا ہے... تب وہ مکمل ہوتا ہے۔"

"شائد وہ کوئی اور ہو —"

"موت میں سب کوئی — اور ہو جاتے ہیں۔ زندگی اور موت میں کیسے لامتناعی فاصلے ہیں — یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ موت میں بھی انسان وہی رہے جو کہ وہ تھا — آج مکمل ہوئی ہو —"

وہ سب بہت احتیاط سے اور بہت چوکنے ہو کر لیکن دِلوں میں پردیس کے خوف کے ساتھ — اپنے بچوں سے دوبارہ ملنے کی آس لیے، جیسے کینچوؤں کی طرح رینگتے ہوئے — بیرکس کی طرف جا رہے تھے۔ — ایک رپورٹ آئی تھی۔ اُن کے بہاری دوستوں نے ایک رپورٹ دی تھی جو ذہن میں یقین کے لیے جگہ تو نہیں بناتی تھی لیکن — وہ چوکنے ہو کر بیرکوں کی جانب سازش اندھیرے میں اور جیسے ایک دشمن ملک میں بیرکوں کی جانب بڑھتے تھے۔

اور بڑھتے ہوئے وہ ٹھٹکے تھے، یکدم رُک گئے تھے۔

اُن کی نظریں میں کچھ خرابی تھی۔

اس بن یا بنگال میں کچھ بھی ٹھیک نظر نہ آتا تھا۔ ہر شے اُلٹی تھی۔ اور اپنی
وہ سب اُلٹے نظر آتے تھے۔ کھلنا بیرکوں کے شہتیروں سے لٹکے ہوئے — انہوں نے اپنی
مرضی سے شہتیروں کے ساتھ بندھ کر اُلٹے لٹکنے کی کیا ضرورت تھی — وہ تو
پلٹنیں تھیں۔ وہ جب یکدم رُکے تھے تو اُن میں شرمندگی بہت تھی اور وہ اُدھر نظر بچا کے
دیکھتے تھے صرف اس لیے کہ اُن کے ستر نہ تھے اور اُن کے تن بدن پر کچھ نہ تھا — وہ
مادر زاد ننگے لٹکتے تھے۔ شائد اُنہیں ننگے کہنا بہت مناسب نہ تھا کیونکہ اُن کے نفس کٹے
ہوئے تھے اور وہاں صرف خون کے لوتھڑے تھے اور اُن کے کان بھی نہیں تھے اور ناک
صرف دو سوراخ تھے اور خون تھا جما ہوا — اُنہیں بے خبری میں مُکتی باہنی نے آ لیا تھا اور
پورے بنگال کا بدلہ اُن کے کانوں، ناکوں اور نفسوں سے لیا تھا۔

وہ ایک عجیب بے ہنگم ردھم کے ساتھ اُلٹے جھولتے تھے۔

ہر ایک کے سر میں ایک سودا تھا — ایک سوراخ تھا جس پر سیاہ خون کے پپڑ
جمے ہوئے دھبے تھے —

کیپٹن مردان سب سے پہلے اپنی فورس سے الگ ہو کر اُن کے قریب ہوا تھا۔ اور
وہاں اُس نے اپنی گردن ٹیڑھی کر کے اُن کے خدوخال پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ بہت
والے اور کڑیل جوان جنہیں جنگ کا چارہ بنایا گیا تھا۔

کھلنا بیرکس میں وہ بے بس پتلیوں کی طرح اُلٹے لٹکتے تھے — اپنے کچھ اعضا کے
بغیر۔

کیپٹن مردان ہونٹ بھینچے ضبط کیے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے جھکا ہوا اُن کے
چہروں کے مقابل ہوتا ہوا چلتا جا رہا تھا جب اُس نے کیپٹن علی شیر کے کھلے منہ اور بغیر کانوں
کے اور بغیر ناک کے چہرے کو دیکھا — شائد اُس شے کو کچھ اور کہتے ہوں جو ناک اور
کانوں کے بغیر ہوتا ہے — چہرہ شائد نہیں —

یہ لوگ ظلم کرنے نہیں آئے تھے —

کیپٹن علی شیر تو بالکل نہیں۔ اُسے تو جیمز ڈین پسند تھا
Rebel without a cause پسند تھی لیکن وہ ہمیشہ کاز کے لیے ریبل کرتا تھا اعتراض
کرتا تھا — ہمیشہ انکار کرتا تھا۔ اس نے اپنی ملازمت کی حدود سے ذرا باہر قدم رکھ کر
مشرقی پاکستان آنے سے انکار کیا تھا اور صرف کمانڈنگ آفیسر کے دل میں اُس کے لیے

وہ تھا صرف اُس کی بدولت کورٹ مارشل سے بچا تھا...
مردان یار تم نے نذرل اور ٹیگور کو نہیں پڑھا تم رٹو طوطے صرف اقبال پر اڑے
ہو۔ یار ادھر ان کی نرمی اور گداز دیکھو... لگتا ہے انسان کے اندر جو کائنات ہے اس
اور ایک حیرت اور حسن کا سفر ہے.. اردو ترجمے کے باوجود ذرا دیکھو کہ ٹیگور کی "راج
ہنس کی پرواز" کا آغاز کیسے ہوتا ہے...

دریائے جہلم کی چکر کھاتی ہوئی لہریں
ایک خمیدہ تلوار کی طرح شفق کے رنگوں میں چمکتی ہوئیں
تاریکی میں مدغم ہو رہی ہیں..

اور پھر کہتا ہے..

میرے گیت پانی کے پودوں کی طرح ہیں..
وہ اُسی مقام پر ساکت نہیں رہتے
جہاں وہ جنم لیتے ہیں
اُن کی تو جڑیں نہیں ہیں
صرف پھول اور پتے ہیں
روشنی کی سرخوشی میں
وہ لہروں پر رقص کرتے ہیں...
نہ اُن کا کوئی گھر ہے نہ دولت
وہ نا آشنا مہمانوں کی طرح ہیں
کوئی نہیں جانتا
کب وہ آتے ہیں
اور کب چلے جاتے ہیں...
میرے گیت پانی کے پودوں کی طرح ہیں..

کیپٹن علی شیر بھی وہاں تھا۔ ٹیگور کا راج ہنس ایک پُتلی کی طرح برہنہ۔ لٹکتا ہوا

— منہ کھلا۔ ناک نہیں کان نہیں اور کچھ بھی نہیں... وہاٹ اے سائٹ۔

مردان اُسی روز مکمل ہوا تھا۔

اور اُس سے اگلے روز ٹکا خان نے کہا تھا کہ مجھے بنگالی نہیں بنگال کی زمین چاہیے

— شوٹ دے باسٹرڈز... بچرز آل آف دیم۔

"بابا — ہی مکلڈ سو سٹرینج —"

"ڈیتھ اِز اے سٹرینج بزنس شوبھا ڈارلنگ — موت سے تمہاری کبھی واقفیت نہیں ہو سکتی" مردان نے اُس کے ماتھے کو اپنے لبوں سے گیلا کیا اور تسلی دی "— اِس سے کبھی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔"

شائد وہ بھی مکمل ہو گئی تھی اس لیے — اُس کے ذہن میں جو سوال گردش میں تھے، جو وہ پوچھنا چاہتی تھی، دریافت کرنا چاہتی تھی، وہ سب کچھ پہلے ایک جھجک میں تو اجتناب میں پوشیدہ تھا اور اب ظاہر ہونا چاہتا تھا — اور اسی لیے اُس نے اپنی سیاہ آنکھیں کھول کر کہ جنہیں آنسوؤں نے بہت صاف اور سیال کر دیا تھا اُس سے پوچھا — "بابا کبھی ماں کے بارے میں بات نہیں کرتے —"

مردان کا بدن ٹھٹکا — جیسے جھاڑیوں کو ایک ہاتھ سے ہٹاتے شکاری چلتا ہے یکدم سامنے کسی جانور کی تیز چمکتی آنکھیں اُسے گھور رہی ہوتی ہیں۔ وہ کچھ دیر بہت گم خاموشی میں رہا... ایک منجمد نیم مسکراہٹ کے ساتھ جو خوشی غمی کچھ بھی ظاہر نہیں کر رہی تھی اور اپنی مرضی سے خواہش سے بولنے لگا" — میرے اباجی چوہدری اللہ داد جب پہلی مرتبہ ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پاکستان گئے اور اُن دنوں پنکھوں والے جہاز ادھر کرتے تھے تو میں نے انہیں اپنا بوکس کیمرہ تھما دیا کہ اباجی — وہاں کی تصویریں اُتار لانا... یاد رکھئے گا کہ بٹن دباتے وقت سورج آپ کی پشت پر ہونا چاہئے اور ایک تصویر اُتار کر فلم آگے کرنا نہ بھولئے گا...

وہ واپس آئے تو اُن کے سامان میں بانس کی خوبصورت ٹوکریاں اور اناسوں سے بھرے ہوئے ٹوکرے تھے اور چند آؤٹ آف فوکس تصویریں تھیں... اور ان میں تیز ہوا سے دوہرے ہوتے ہوئے پام کے درخت تھے اور کسی سمندر گمان دریا میں بڑے بڑے بادبانوں والی کشتیاں تھیں — بس میرے لیے اُن دنوں مشرقی پاکستان جو اُن دنوں میرا

تھا — صرف یہی تصویر تھا... اور جب میری پوسٹنگ ہوئی تو — میں نے اپنی آنکھوں سے تیز ہواؤں اور برساتوں میں جھکے ہوئے وہی بلند پیڑ دیکھے اور انہیں دیکھتے ہوئے میرا سرخ سکارف بھی ایک پام کے پتے کی طرح اُڑتا تھا... اور میں نے وہ کشتیاں بھی بوڑھی گنگا میں ایک مطمئن اور شانت انداز میں تیرتی ہوئیں..."

"اتنی ساری گفتگو میں ماں تو کہیں نہیں آئی —"

"وہ بھی وہیں تھی.... میں یونٹ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کی بجائے نزدیکی گاؤں کی مسجد میں جایا کرتا تھا... ابھی حالات وہ نہ تھے جو بعد میں ہوئے لیکن آہٹوں کا آغاز ہو چکا تھا اور وہ سب مجھ سے پرے پرے رہتے — پھر آہستہ آہستہ وہ میرے قریب آئے اور میرے اپنے جو تھے میرے بہت قریب ہوئے۔ مولوی احتشام الدین... مجھے ایک روز گھر لے گئے.. وہی پھونس کا جھونپڑا، ایک تالاب، ناریل سپاری اور تاڑ کے چند درخت اور اس سادگی میں ایک قناعت اور ٹھہراؤ... مولوی صاحب اکثر اپنے ہارمونیم پر مجھے نذرل کے گیت سناتے —"

"Really Baba?"

"ہاں — اور تمہاری ماں بھی وہیں تھی —"

اُن کے درمیان ایک خاموشی آئی جس کے اندر ایک کیفیت بھرے اندھیرے میں جیسے کونپلیں پھوٹ رہی تھیں — ایک جنگل جس کے پات اور ڈال معدوم ہو چکے تھے صرف کونپلیں دکھتی تھیں جو پھوٹتے ہوئے دھیرے دھیرے سر اُٹھاتی تھیں۔ کوئی ایک کونپل ایسی پھوٹتی کہ اُس میں صرف ایک ناخن برابر پرندہ ہوتا کسی ایک رنگ کا — تھی اور اس نادیدہ جنگل کے بھید میں ایک اور کونپل اٹھتی تو اُس کی گود میں سے ایک اور پرندہ ایک اور رنگ کا چونّی جتنا بچے کی طرح کلکاریاں مارتا اُڑتا۔ یہ سب کچھ ایک رُکتی ہوئی آہستگی سے ہو رہا تھا، ایسی ردھم میں تھا جو خون کے بہاؤ اور ذہن میں قبولیت کے سطح کے ساتھ ساتھ آہنگ میں ہوتی جاتی ہے — پھر ایک اور پرندہ، ایسے رنگ میں جو کہیں اور نہ تھا صرف اس کے پروں میں تھا اور ابھی اُسی کے لیے تخلیق کیا گیا تھا — لیکن ان پرندوں کے رنگ اتنے کچے تھے کہ وہ جہاں سے بھی گذرتے اُن کے پروں سے رنگ کے ذرے الگ ہو کر اُن کی پرواز کے راستے میں کہیں کہیں ہوا میں معلق ہوتے جاتے اور اس نیم اندھیرے میں ہولے ہولے طرح طرح کے رنگوں کے راستے بن رہے تھے۔

کوئی بھی پرندہ کسی اور پرندے کے چھوڑے ہوئے رنگ راستے میں نہ داخل ہوتا نہ اُ
عبور کر کے جاتا۔ اُن کے الگ الگ راستے فضا میں رنگین دُھول صورت دکھتے تھے۔ بڑے
عدم کی چپ تھی ہر طرف ایک خاموشی تھی جو جنگل پر تیرتی تھی پھر کونپلوں کے پھوٹنے کی
سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ پرندے جہاں کہیں تھے اُس ایک لمحے کے لیے جب سناٹا ہوا
وہیں فضا میں اپنی اڑان میں منجمد ہو گئے اور پھر اگلے ہی لمحے رُکے ہوئے پر حرکت میں آ
گئے۔ وہ اتنے چھوٹے اور مختصر تھے کہ نظروں کا دھوکہ لگتے تھے، بہت دور لگتے تھے اُن پر
آنکھوں کے سامنے سے گذرتے تھے اور اپنے رنگوں کی دُھول چھوڑتے جاتے تھے۔
کونپلیں چھوٹی ٹہنیوں میں تبدیل ہوتیں اور پھر اُن میں سے سفید ذرّے سے پھوٹتے ہو
دیکھتے دیکھتے شگوفے بن جاتے۔ یہ سارے کے سارے سفید تھے اور اُن پر بھی ہوا میں
معلق کچے رنگ اثر کر رہے تھے۔ اُن کے ذرّے سفیدی پر تہہ در تہہ بیٹھتے تھے — یہیں
کہیں ایک پھونس کا جھونپڑا تھا، ایک تالاب، ناریل کے درخت اور قناعت اور ٹھہراؤ۔ اور
وہ بھی وہیں تھی — شوبھا اُسے دیکھ سکتی تھی لیکن اپنے سے دور ہوتے دیکھ سکتی تھی کہ
اُس کے لانبے بال اُس کی پیٹھ پر سے ایک جھٹکے سے اُٹھتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے اور اُس
کی ساڑھی کا پلّو راستوں میں سے گذرتا رنگ جمع کرتا جاتا تھا —

ایک شگوفہ ملیر کینٹ میں واقعی تیسری بیرک میں بیٹھے مردان اور شوبھا کے عین
سامنے آ گرا — اُس کی سفیدی پر رنگوں کے ذرّے ایسے تھے کہ شوبھا کے اُٹھانے پر اُس
کی اُنگلیوں کی پوریں رنگ آلود ہو گئیں —

بابا مردان کی موجودگی میں اُسے کبھی بھی کسی اور سائے یا اطمینان کی ضرورت
نہیں پڑی تھی — وہ باغ بہاراں جو تھا جس میں وہ سدا رہتی تھی — صرف ایک بار اُس
کے بدن نے زور دے کر کہا تھا کہ مجھے ماں چاہئے لیکن اُس ایک بار کے بعد وہ پھر باغ
بہاراں میں چلی گئی تھی۔ یہ تب ہوا تھا جب اُس کے بچپن کا اختتام ہوا تھا اور وہ جاننا چاہتی
تھی کہ اس کے بیچ اس قدر بے چینی اور رطوبت کیوں ہے اور آج ہی کہاں سے جنم لیا
ہے۔ صرف تب اُس نے ماں کی موجودگی کی آرزو کی تھی لیکن آج — آج وہ بھی مکمل
ہوئی تھی کہ اس نے ستار نقوی کے زرد تالو اور فرائی انڈے ایسی ٹھہری ہوئی لاتعلق
آنکھوں کو دیکھا تھا.. اور آج دوسری بار ماں کے ماحول میں سانس لینے کی خواہش کی تھی۔

"آنٹی بابر بھی تو آپ کو وہیں ملی تھیں؟"

"ہاں۔ وہیں۔"
"اور آپا عارفین بھی —"
مردان نے لب چبا کر سر ہلایا۔
"تو ان میں سے کون تھی بابا — آپا نازنین یا آپا عارفین —"
اس نے کچھ نہ کہا صرف اسے ایک نظر دیکھا کہ یہ بے سود تذکرے کیوں کرتی
—

"پھر؟" شوبھا نے اپنے آپ پر رُکی مردان کی آنکھوں میں دیکھا۔
"پھر کیا؟ — پھر کچھ بھی نہیں — بس تمہاری ماں بھی وہیں رہتی تھی —
پولی احتشام الدین کی بیٹی... اور جب وہ چلتی تھی تو اُس کے بال اُس کی پیٹھ پر ایک جھٹکے
سے اُٹھتے اور بیٹھ جاتے تھے اور اس کی ساڑھی کا پلّو —"
"پرندوں کے دُھول راستوں میں گذرتا رنگ جمع کرتا جاتا تھا —"
مردان کو ایک صدمہ سا ہوا۔ شوبھا اِس فریب اِس راز سے آگاہ نہیں تھی۔ یہ
سب کچھ تو شائد اُس کی نظر میں تھا تو اُس نے کیسے جان لیا "ہاؤ ڈو یُو نو؟"
"آئی نو بابا — میں نے اُسے دیکھا ہے؟"
"کب؟"
"ابھی ابھی —"
"نہیں —"
"ہاں بابا —" اُس نے اپنی بھنچی ہوئی مٹھیاں مردان کی آنکھوں کے سامنے
کیں اور اُنہیں آہستہ آہستہ جیسے اُن کے اندر ایک راز ہو کھول دیا... پوروں پر رنگوں
کے ذرّے چپٹے ہوئے تھے "آپ دیکھ رہے ہیں بابا؟"
"میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا سوائے تمہاری اُنگلیوں کے...." اُس نے نظریں پرے
کر لیں اپنی حیرت کو چھپانے کے لیے...
شوبھا نے اُنگلیوں کو اُسی آہستگی سے بند کیا اور کہنے لگی "کھیل ختم —"
مردان اپنے ہونٹوں پر ہتھیلی جمائے فرش کو دیکھتا رہا اور شوبھا چپ بیٹھی اُسے
تکتی رہی اور اُسے اُس کی آنکھوں میں وہی رنگ دکھائی دیئے جو اُس کے پوروں پر تھے..
مردان نے سر اُٹھایا اور شوبھا کو ناراضگی سے گھورا، سر ہلایا اور بیٹ مین بشیر کو "بابا.. بلیک

شیپ" کہہ کر زور سے پکارا۔

بلیک شیپ بابا ظاہر ہے بیرک سے ٹیک لگائے اسی آواز کا منتظر تھا چنانچہ شتابانہ اندر آ گیا اپنی جھالر کھجاتا ہوا اور ٹن ہوا اور سلیوٹ کیا اور پھر — "یس سر۔ کپتان صاحب۔"

"شوبھا کی طرف غور سے دیکھو —" آرڈر ملا۔

بشیر کو مردان کی اس قسم کی مخبوط الحواس حرکتیں بہت مرغوب تھیں اور وہ انہیں انتہائی سنجیدگی سے قبول کرتا تھا چنانچہ وہ باقاعدہ ایک پُر وقار سنجیدگی سے شوبھا کی طرف بڑھ آیا اور اُسے کپتان صاحب کے حکم کے مطابق جھک کر نہایت باریک بینی سے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے سر اُٹھایا "کپتان صاحب کتنی دیر غور سے دیکھوں؟"

"کافی ہے —"

بشیر پیچھے ہٹ گیا۔

"اب یہ بتاؤ کہ شوبھا میری بیٹی لگتی ہے؟"

"یس سر —" اُس نے سیدھے ہو کر رپورٹ دی "وہی ناک نقشہ، وہی رنگ رُوپ... اِس کو چھپائیں تو آپ کو دیکھیں.. آپ کو چھپائیں تو اِس کو دیکھیں — ہو بہو۔"

"نہیں۔ ایسے نہیں۔ ناک نقشہ نہیں — یہاں" مردان نے اپنی کنپٹی پر رکھ کر اُنگلی کو گھمایا "میں جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ میں... ذرا ڈھیلا ہو چکا ہوں.. مجھے ڈر ہے کہ میری ڈارلنگ بیٹی پر بھی کچھ اثر ہو چکا ہے۔"

"نہیں جی۔" بابا بشیر نے فوری طور پر سر ہلایا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میرا خیال ہے ایسی بات ہے — یہ ابھی ابھی کہہ رہی تھی کہ اس نے ابھی ابھی اپنی ماں کو دیکھا ہے حالانکہ یہ یہاں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی... میرے سامنے"

"ماں تو کسی وقت بھی دیکھی جا سکتی ہے کپتان صاحب —"

مردان اگرچہ بیٹ مین بشیر کو ہی دیکھ رہا تھا لیکن وہ چونکا اور اُسے ذرا آنکھیں تنگ کر دیکھا۔ اُسے توقع نہ تھی کہ وہ اُس سطح پر بات کرے گا جس پر پہنچنا قدرے محال ہوتا ہے "اچھا..."

"ہاں جی — یہ تو جوان جہان ہیں خیر سے — میری بے بے جی کو مرے ہوئے تو

نہیں کتنے برس ہو گئے۔ آپ اُتنے کے نہیں جتنے برس ہو گئے اور پھر بھی — میرا جی چاہتا ہے میں انہیں دیکھ لیتا ہوں۔ اس میں اچنبھے کی بات تو نہیں کپتان صاحب"

"تم چلو —"

"یس سر —" وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔

"آپ کو یقین نہیں تھا؟"

"مجھے یقین تھا لیکن بے یقینی والا یقین تھا —"

"اور وہ کیا ہوتا ہے براہ کرم آگاہ کیجئے —"

"جو تم ہو — وہ — تم بھی ایک بے یقینی والا یقین ہو — کون ہو گا اس زمین کے سامنے ایسی بیٹی ہو جس نے ابھی ابھی ماں کو دیکھا ہے... جو نہیں ہے اور اُس نے کبھی نہیں دیکھی.. اور وہ باپ کو دیکھ ہی نہیں رہی تھی — جو ہے — میں بہت ناز کرتا ہوں اپنے نصیب پر جس میں تم آئیں —"

"اوہ جانے دیں بابا —" شوبھا کو کبھی بھی مردان کی اتنی بے وجہ اور بے بہا محبت کا اظہار نہ ہوئی اور اُس کے دل سے ستار نقوی کی موت کا تھوڑا سا بوجھ کم ہوا اور اُس نے صبح کے بعد پہلی بار اپنے بالوں پر ہتھیلی چلا کر انہیں سنوارا۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے شوبھا —" لہجے میں رکاوٹ تھی اور جھجک تھی رشاید شرمندگی بھی.... "ذرا میرے ساتھ باہر آؤ۔"

ملیرکینٹ کی بیرک نمبر دو جس کی جھریوں میں سے ایک آنکھ صرف یہ دیکھ سکتی تھی کہ اندر پرانے گرینڈ فادر کلاک ہیں اور وہ بند پڑے ہیں اور پتہ نہیں کونسے وقت میں تھم گئے ہیں اور فرش پر سمآیا کلہوڑہ خاندان کی قبروں کے شاندار تعویز اور بیل بوٹوں والے پتھروں کی سلیں پڑی ہیں... ڈھلتی دھوپ والی زردی ایسے پتھر.. سیاہی مائل، درخت اور پھول پتے.. اور سب کچھ پتھرایا ہوا — یہاں ایک دروازہ بھی تھا جس کا کبھی شائبہ بھی نہ ہوا کہ وہ وہاں ہو سکتا ہے اور اسی دروازے کو مردان نے کھولا تو اندر پڑے، دھول اور نمی کے موسم میں ساکت پڑے گرینڈ فادر کلاک اور قبروں کے سنگی تعویز یکلخت اندر داخل ہونے والی سورج کی سفید توانائی سے چندھیائے اور اُن میں سمٹی سمٹی ہوئی دو عورتوں نے ساڑھیوں کے پلّو اپنے چہروں پر کھینچ لئے.... شوبھا نے انہیں

دیکھا اور پھر فوراً مردان کی طرف نگاہ کی۔

"یہ یہاں بہت دنوں سے ہیں۔"

"کون ہیں؟"

عورتوں نے دونوں کی موجودگی محسوس کی لیکن تعویزوں کی طرح پتھرائی پڑی رہیں۔

"شہر میں پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے — ناجائز طور پر پاکستان میں داخل ہونے والے غیر ملکیوں کو گرفتار کر کے ڈیپورٹ کیا جا رہا ہے —"

"یہ کون ہیں؟"

"بنگالی ہیں —"

شوبھا کے کلیجے پر جیسے ایک ہاتھ پڑا ہو۔ "تو... تو یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"سونار بنگلہ میں ہر شے جو چمکتی ہے سونار نہیں ہے — اس کی — جو ساڑھی کے پلّو کو منہ میں چبا رہی ہے دو بیٹیاں تھیں۔ اُن میں سے ایک کو ایجنٹس نے ایک سندھی وڈیرے کو فروخت کر دیا۔ یہ اس میں بھی خوش تھی کہ اُسے وہاں لباس، خوراک اور چھت تو ملے گی۔ پھر پولیس ایکشن شروع ہو گیا۔ یہ لیاری کے نالے کے پل کے نیچے ایک گاربیج ڈمپ میں رہتی تھیں، اُسی کو کرید کرید کر کچھ کھانے کو تلاش کر لیتی تھیں۔ یہ وہاں بہت دنوں سے تھیں... خوف سے، ہراساں ہو کر، سہمی ہوئی یہ وہاں تھیں — یہ اپنے دیس میں چھپتی پھرتی ہیں —"

شوبھا اُن کے قریب ہوئی — وہ اور سمٹ گئیں بن دیکھے کہ کون آیا ہے کون قریب ہے — ایک گرینڈ فادر کی چابی جو پتہ نہیں کن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اَن وائنڈ نہیں ہوئی تھی.. اب ہوئی اور نمی سے زنگ آلود پرزے ایک دوسرے کے ساتھ گھسٹ گھسٹ کر وقت کے دھارے میں شامل ہوئے اور ٹن ٹن منادی دینے لگے۔ تما اور کلہوڑہ خاندان کے تدفینی پتھروں میں سہمی ہوئی عورتوں میں سہم اور آ گیا۔ شوبھا نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی کہ یہ کس کا وقت آ پہنچا ہے اور کونسا گھڑیال منادی دے رہا ہے۔ لیکن سارے کلاک بظاہر ایک جیسے تھے اور اُن میں سے کوئی بھی یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ وقت اُس کے ہاں رواں ہوا ہے... شائد اُن میں سے کوئی بھی نہ تھا.. ایک عورت نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا.. ساڑھی کا پلّو چہرے سے کھسکا... شوبھا پیچھے ہٹ گئی... اُس کا پلّو پرندوانا

...راستوں میں سے گذرتا رنگ جمع کرتا جاتا تھا اور جب وہ چلتی تھی تو اُس کے بال... پیچھے ہٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی وقت پھر تھم گیا... گھڑیال نے جو کچھ کہنا تھا کہا اور ...وش ہو گیا۔

"عارفین بی بی آئی ہیں" بیٹ مین بشیر اُن کے عقب میں کھڑا تھا۔

"عارفین؟" مردان پلٹا۔

"یس سر —" جو سلیوٹ وہ بھولا ہوا تھا وہ کیا اور کہنے لگا "بی بی ٹیکسی پر آئی ہیں اور اُن کے پاس ڈرائیور کو ادائیگی کے لیے رقم بھی نہیں تھی... اور وہ بہت کانپ رہی تھیں سر —"

"واقعی عارفین ہے؟"

"جی سر —"

"یہ تو نہیں ہو سکتا... وہ تو آج تک اپنے گھر سے باہر نہیں نکلیں.. یہ کیسے ہو سکتا ہے —؟"

"ہاں — یہ تو بالکل نہیں ہو سکتا... اور اگر وہی ہے تو کچھ ہوا ہے — کچھ ہے۔"

ڈیفنس کے اُس مینشن نما گھر کے پورچ میں جسے باہر کی دیوار کے ساتھ بلند ہوتے ربڑ کناؤ والے پتوں کے ناریل درختوں کی وجہ سے ناریل والا گھر کہا جاتا تھا اب بھی — اور آج بھی — جب کہ عارفین ایک گھیرے میں آ جانے والے جانور کی طرح حواس ...ہوتی ہوئی اندر آئی تھی اور اُس کے ہمراہ شوبھا اور مردان کے وجود آئے تھے قدیم لیکن تقریباً شوروم کنڈیشن کی دو کاریں آگے پیچھے اینٹوں کے چبوتروں پر پالش شدہ عرصے سے Rest in Peace کر رہی تھیں۔

اندر بلند چھت سے بظاہر ایک کمزور زنجیر سے لٹکتے فانوس کے صرف چار بلب روشن تھے بقیہ بجلی بچانے کی غرض سے اُتار لیے گئے تھے اور ڈبوں میں محفوظ کر لیے گئے تھے۔ اُس فانوس کے نیچے آرام کرسی میں آنٹی بابر Rest in Peace کر رہی تھیں۔

دوہرے پردے کھنچے ہوئے تھے۔

دو صوفوں پر سفید کور نہیں تھے اور یہی ایک اشارہ تھا کہ آپ صرف ان پر بیٹھ

سکتے ہیں۔ شوبھا مردان کے بازو کا سہارا لے کر ایک صوفے میں گری اور وہ اُس کے سر
ایک تسلی بھرا پیار دے کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔

عارفین اُن سے پرے ہو کر پہلی منزل کے مرکزی دروازے میں سے نکلتے ہو
قوسوں کی شکل کے بائیں زینے کی آخری سیڑھی پر کھڑی ہو کر ایک مجسمے کی طرح ساکت
ہو گئی۔

شائد وہ اونگھ رہی تھیں۔ دیکھنے میں ایسا ہی لگتا تھا۔ لیکن ایک فرق تھا۔
خراٹے نہیں لے رہی تھیں۔

ہال کی چھت سے اُترتے نیم اندھیرے میں فانوس کے چار بلبوں، کھنچے ہو
پردوں، سفید کورز سے ڈھانپے ہوئے صوفوں، لوئی سوئم کرسیوں اور بدخشانی قالینوں
آس پاس ایک بُو تھی جسے صرف وہ جانتے تھے جو موت کے فوراً بعد ڈھیلے پڑتے اعضاء
سے اخراج کی بُو کو جانتے تھے۔ وہ یقیناً مر چکی تھیں۔

شوبھا کے لیے ستار نقوی کے بعد آج ہی کے دن یہ موت
One death too many تھی اور وہ بہت زرد ہو رہی تھی — یہ حواس باختہ عورت ا
اُسے ماؤں سے بڑھ کر محبوب رکھتی ہے یا عینک کے دیوار شیشوں کے پیچھے جو آنکھیں
روپوش ہیں اُن میں شوبھا کے لیے ایک ایسی ناپسندیدگی ہے جو نفرت کو اپنے دماغ سے
دھکیلنے کی کوشش میں جنم لیتی ہے۔ انہوں نے بہت کچھ دیکھا ہوا تھا — بابا نے اُسے بہت
کچھ بتایا ہوا تھا۔ عارفین اور نازنین کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اُس سے کسی حد تک آگاہ
تھیں۔ آنٹی بابر جب بھی اُسے دیکھتیں یا پردہ پوش شیشوں میں شائبہ ہوتا کہ وہ اُس کی
طرف دیکھ رہی ہیں تو وہ ایک انجانے احساسِ جُرم کی کسک محسوس کرتی — صرف اس
لیے کہ اُس کے بابا نے اُسے بتایا تھا کہ وہ بنگالی ہے۔ اور صرف اس لیے کہ عارفین اور
نازنین کے ساتھ جو کچھ ہوا... بنگالیوں نے کیا — تبھی اُسے شک تھا کہ آنٹی بابر اُسے دیکھنا
بھی گوارہ نہیں کرتیں اور وہ اپنے وسیع تن و توش کے فساد کے پیچھے اپنی نفرت کو پوشیدہ
رکھتی ہیں۔

"I did not know what to do" — عارفین، زینے کی آخری سیڑھی پر
کھڑی عارفین نے اپنے آپ سے کہا۔

مردان اُٹھ کر اُس کے قریب گیا۔

وہ اُسی انداز اور جھجک میں اُس کے قریب گیا جیسے آنٹی بابر کے گھر میں برپا کسی
ہنگامہ خیزی کے دوران وہ چپکے سے اُٹھ کر اُس کے قریب جایا کرتا تھا اور ہمیشہ کہتا
"میرا نام کیپٹن مردان علی ہے —" اور عارفین کا جواب کبھی نہ بدلتا — "یقیناً آپ
..." اور اس کے بعد اُس کے ہونٹ ایک ناقابلِ فہم جنسی آہستگی سے اُس کے سفید
دانتوں پہ سے ہٹتے جاتے اور وہ بالکل خالی الذہن ہو کر مسحوریت میں مبتلا اُسے دیکھتا چلا جاتا۔

"عارفین... حوصلہ کرو۔ Its all right"

"— My mother is dead and you say its all right" وہ اُسے ایک
...ن کی طرح دیکھنے لگی...

"نہیں — میں — نازنین کہاں ہے؟؟"

"اوہ مائی گاڈ... اُسے کون بتائے گا —"

مردان نے منہ کے کناروں کو گیلے کرتے ہوئے لعاب کو پونچھا — "وہ نہیں
...؟"

"نہیں —" وہ اپنے آپ سے ہی مخاطب رہی "وہ سو رہی ہے... میں... میں نیچے
آئی تو ممی اسی طرح — یہاں بیٹھی تھیں... اور میں... اُن کے سامنے بیٹھ کر اُن دنوں کی
باتیں کرتی رہی جب پاپا زندہ تھے اور ہم ایسٹ میں تھے... اور تم جانتے ہو ناں کہ پاپا کے
ساتھ ... باسٹرڈز نے کیا کیا تھا... ممی... شی نیور لائکڈ ایسٹ پاکستان... وہاں کا موسم...
... زبان... شی نیور لائکڈ دیم... لیکن وہ اُس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔ عجیب
...ت اور محبت کا رشتہ تھا — میں باتیں کرتی رہی اور پھر مجھے احساس ہوا کہ — وہ
جواب نہیں دے رہیں اور میں اُٹھ کر اُن کے قریب گئی تو وہ سوئی ہوئی تھیں لیکن —
خراٹے نہیں لے رہی تھیں... میں نے کہا ممی... اور ان کے گال پر ہاتھ رکھا... تو...
اُن —" وہ زینے کی آخری سیڑھی سے اُتر کر اپنی جانب مسلسل دیکھتے مردان کے سینے
سے آ لگی "شی از ڈیڈ مردان — اور مجھے پتہ نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے — مجھے نہیں پتہ تھا
کہ ایک ڈیڈ باڈی کا کیا کرتے ہیں — اُسے لٹاتے ہیں یا اُسی حالت میں کرسی پر بیٹھے رہنے
دیتے ہیں... اور اُس کے بعد اُسے — ڈیڈ باڈی کو کن رچولز کے ساتھ بری کرتے ہیں.. تم
جانتے ہو مردان؟"

"تم فکر نہ کرو —"

"اور تم جانتے ہو مردان کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا؟"

مردان نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے — اگر وہ وہی کچھ تھا جو اُس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے تو اُسے — عارفین کو کیسے علم ہوا کہ وہ جانتا ہے —

"تم فکر نہ کرو —" اُس نے پھر کہا۔

"مجھے میرے سوال کا جواب دینے میں تو کوئی قباحت نہیں —" اُس کی آنکھیں بے حد سرخ ہونے لگیں — "جب وہ کھڑکیاں توڑ کر اندر آئے تھے تو کیا تم جانتے ہو کہ انہوں نے... میرے ساتھ.. نازنین کے ساتھ کیا کیا — اُن باسٹرڈز نے —"

"وہاں پن پوائنٹ نہیں ہو رہا تھا کہ کون کس کے ساتھ کیا کر رہا ہے —"

"ہوز سائڈ آر یو آن؟ —" عارفین جواب تک اس کے سینے پر سر رکھے بولے جا رہی تھی تڑپ کر الگ ہوئی "ہر سائڈ —" اس نے ایک الزام بھری انگلی شوبھا کی طرف کی اور شوبھا نے اُس انگلی کو خوفزدگی میں ایسے دیکھا جیسے اُس میں سے ابھی ایک تیر نکلے گا اور اُس کے بدن کے پار ہو جائے گا۔

"تم فکر نہ کرو عارفین — میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

"ممی نے کبھی اِسے پسند نہیں کیا تھا —" اُس کی ہسٹریکل اُنگلی نے پھر شوبھا کو نشانہ بنایا "کبھی نہیں... اس کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا — اِس — اِس کو۔"

"پھر تو مجھے بھی یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا —" مردان کی سابقہ نرمی اور دُکھ کے لہجے میں ایک ایسی تبدیلی آئی جو حیران کرتی تھی... وہ یکلخت پتھر ہوا اور درشتگی سے کہنے لگا

"یہ... یہ میری بیٹی ہے عارفین — اینڈ کیپ یور فکنگ ماؤتھ شٹ —"

عارفین نے اپنے سر کو جھٹکا، جیسے اپنے آپ کو ایک مکمل بے اختیار خمار سے باہر لانا چاہتی ہو۔ پھر پہلی بار اُس کی آنکھوں میں آنسو آئے اور اُس کے رخسار بھیگنے لگے۔ وہ ہچکیاں لیتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی شوبھا کے قریب ہوئی — شوبھا سہم چکی تھی۔ اُس کی پپڑیاں جمے زرد ہونٹوں کو جاں کنی کے عالم میں مبتلا تتلی کی طرح بے اختیار کھولتی اور بند کرتی تھی "آئی ایم سوری شوبھا..."

"نو پرابلم —" شوبھا نے مسکرانے کی ایک کوشش کی "نو پرابلم آپا عارفین۔"

"وہ کھڑکیاں توڑ کر اندر آئے تھے اس لیے... آئی ایم سوری شوبھا —"

"تم فکر نہ کرو عارفین —" مردان نے پھر کہا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

مُردہ جسم کی بے بسی کہ اُسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا اور وہ سب کچھ خارج دیتا ہے اور اُس کی بُو خون کے رشتوں کو بھی ناگواری سے پرے دیکھنے پر مجبور کر دیتی

ظہیرالدین بابر کا گھر مرجع خلائق تھا۔

لیکن اُس شام وہ سب بہت بجھے بجھے تھے۔

اپنے اپنے صوابی، چکوال اور گوجر خان سے دور ایک ہوسٹائل انوائرمنٹ سے پناہ کے لیے وہ اِس گھر میں آتے تھے اور اس کی چوکھٹ پار کرتے ہی ہمیشہ "یو آر ویلکم —" آنٹی بابر کی طرف سے اور — "اوہ ہیلو —" کانونٹ کے غیر ملکی لہجے میں نرم اور نسوانی اور جنس سے بھرپور اور اس — اوہ ہیلو — کی "و" بہت طویل ہو

آرمی یا فوج — کتنا طاقتور اور بظاہر ناقابلِ تسخیر لفظ ہے لیکن اس کے عناصر سب کے سب انسان ہوتے ہیں.. ڈسپلن اُنہیں باندھے رکھتا ہے اور اُنہیں الگ کر دیکھا جائے تو وہ ایک عام انسان سے بھی زیادہ زود رنج ہوتے ہیں.. اُن میں کچھ ایسے جو آنٹی بابر کے سامنے رو دیتے تھے کہ وہ اپنی ماؤں سے دُوری اِسی گھر میں آکر زیادہ محسوس کرتے تھے۔ وہ بلکتے ہوئے ڈبڈباتی آنکھوں والے بچے ہو جاتے تھے — اگلے روز پارٹی کے اگلے روز اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنی ماؤں کی ایسی ڈھلکی چھاتیوں والی بوڑھی اُن کو صرف Enemy Sir کی خطرناکی کی آڑ میں بے دریغ شوٹ کر دیتے —

لیکن اُس شام وہ سب بہت بجھے بجھے تھے۔

کیپٹن مردان کھلنا بیرکس کا اِنسی ڈینٹ ریلیٹ کر چکا تھا۔ وہ سب بھی اُن جیسے اور وہ سب اس گھر کی عافیت اور رومانس کے باوجود بہت احتیاط سے اور چوکنے ہو کان کھڑے کیے دِلوں میں پردیس کے خوف لیے، اپنے بچوں اور پیاروں سے دوبارہ ملنے کی آس لیے جیسے رینگتے ہوئے کھلنا بیرکس کی طرف بڑھ رہے تھے —

شہتیروں سے بندھے... اپنے کچھ اعضا کے بغیر وہ خود بے بس پتلیوں کی طرح لٹکتے تھے.. مردان ریلیٹ کر چکا تھا —

بابر صاحب اپنے گھر میں ایک آؤٹ سائڈر تھے۔ وہاں اُن کی بیگم اور بیٹیوں کا راج چلتا تھا۔ بہت کم لوگ ایک کونے میں مگن بیٹھے لیمپ کے نیچے چند نقشے پھیلائے... کبھی کبھار ایک گلاس میں سے مختصر گھونٹ بھرتے بابر صاحب کی جانب متوجہ ہوتے — صرف گھر میں داخل ہوتے وقت انہیں ایک رسمی "بابر صاحب آپ کیسے ہیں؟" کہہ کر پوری شام کے لیے فارغ کر دیا جاتا —

اُس شام بھی وہ کراچی سے روانہ کیے گئے اپنے آرکی ٹیکٹ کے ترمیم شدہ نقشے پر جھکے کسی راہداری کی اونچائی پرکھ رہے تھے کہ کیا یہاں وہ فانوس لٹک سکتا ہے جو وہ چیکوسلاویکیہ سے لائے تھے اور کسی غسل خانے کے طول و عرض پر غور کر رہے تھے کہ کیا امریکہ سے بمشکل شپ کی گئی سینٹری فٹنگز اس میں رفٹ ہو جائیں گی۔ وہ لاتعلق ہو کر نقشے پر جھکے ہوئے تھے۔

عارفین اور نازنین بار بار ریڈیو گرام پر ریکارڈ بدل رہی تھیں لیکن کوئی بھی دھن اُنہیں مسرت دینے میں معاون ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

آنٹی بابر مغرب کی نماز پڑھ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو اُنھوں نے فوراً اُس آزردگی اور خاموشی کو محسوس کر لیا جو آج اُن کے گھر کے اندر تک آ گئی تھی۔

"وَیل لیڈز چیئراَپ —" اُنھوں نے عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے سے اُن لیڈز کو دیکھا جو پناہ کے لیے آئے تھے۔

لیڈز نے چیئراَپ ہونے کی کوشش کی۔

"آنٹی بابر — اور عارفین نازنین آپ اپنے کان بند کر لیجیے پلیز — تو کیا آپ جانتی ہیں آنٹی چند فوجی افسروں میں جب یہ بحث ہو رہی تھی کہ کیا — میکنگ لَو — محبت کرنے کا عمل سراسر مشقت ہے یا لطف ہے تو پاس سے گذرتے بیٹ مین نے کیا کہا تھا۔"

"شٹ اپ گل ریز —" مردان نے غصے سے کہا اور اپنی ہنسی کو بھی روکنے کی کوشش کی۔

"سوری —" گل ریز فوراً بیک آؤٹ کر گیا۔

"میں جانتی ہوں کہ بیٹ مین نے کیا کہا تھا — اُس نے کہا تھا کہ اگر اس عمل میں ذرہ بھر بھی مشقت ہوتی تو افسران یہ کام بھی ہم غریبوں سے ہی کرواتے — کیوں لیڈز؟"

لیڈز ذرا سے شاکڈ ہوئے اور پھر اُن کے اعصاب کا تناؤ ذرا سا کم ہوا اور وہ لیکن لطف اُٹھاتے ہوئے ہنسنے لگے — آنٹی بابر بھی کمال کی خاتون تھیں۔

رنفاء — کیپٹن گل ریز مسلسل اپنے لرزتے ہاتھوں کو اپنے اختیار میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا — اُن میں لرزش اتنی تو نہ تھی کہ برابر میں بیٹھا کوئی شخص جان جاتا لیکن وہ خود جانتا تھا کہ اُسے اختیار نہ تھا۔ وہ اُٹھا اور مردان کے پاس آ بیٹھا اور بہت آہستہ سے ایک سرگوشی میں بولا "مردان سر... کیا تم ہدایات پر عمل کر رہے ہو؟"

مردان ایک مکمل پروفیشنل، ایک مکمل ملٹری مشین تھا اور وہ خوب جانتا تھا کہ کن ہدایات لیکن اُس نے اپنے عزیز ترین دوست کیپٹن گل ریز خان کو بھی ایک ابرو اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ کونسی ہدایات —

"جو شخص —" وہ اُسی سرگوشی میں ذرا احتیاط سے بولتا تھا "اپنے گھر پر.. بلکہ اپنی گاڑی پر.. رکشا یا سائیکل پر قومی پرچم نہیں لگاتا — شوٹ دے باسٹرڈ —"

"ہاں —" مردان نے صرف اتنا کہا۔

"یار — شوٹ دے باسٹرڈ؟" اُس کے ہاتھ بہت زیادہ کانپے.. اور اُس نے انہیں پھڑپھڑا کر آزاد ہو جانے والے کبوتر کی طرح قابو کیا۔

"ہاں —"

"لیکن دے آر مسلمز سَر —"

"سو وہاٹ کیپٹن —" مردان نے آواز کے غصے سے گل ریز کا گویا گریبان پکڑ

"کھلنا بیرکس کے بعد چیف اور کیا کہتا — کیا کرتا — وہ بالکل درست کہتا ہے ...ن چاہیے۔ بنگالی نہیں —"

"لیکن یار وہاٹ اباؤٹ پاکستان؟"

"ٹو ہیل وِد پاکستان —" وہ بڑبڑایا "گل ریز تم نے انہیں نہیں دیکھا — ...لٹکائے مادر زاد ننگے لٹکتے ہوئے" مردان بمشکل اپنی آواز کو قابو میں رکھتا تھا کہ پارٹی ...ل خراب نہ ہو "تم نے نہیں دیکھا — کہ اِن باسٹرڈز نے کیا کیا ہمارے جوانوں کے ...ھ — ہم فوج ہیں... لیکن تمہارا کیا خیال ہے کہ ہماری کوئی فیلنگ نہیں ہے — علی ...والا تھا — اور گل ریز میں نے..." اُس کی آواز بیٹھ گئی۔ وہ ایسے بولتا تھا جیسے

کنویں میں گرا ہوا ایک فاتر العقل شخص بولتا اور بڑبڑاتا ہے "میں اُن کے ساتھ ساتھ لٹکے کے لٹکتے جسموں میں سے رِستے خون پر سے اپنے پاؤں بچاتا گردن ٹیڑھی کیے انہیں پہچانتا ہوا آگے بڑھتا تھا۔ یہ نہیں کہ میں اُن میں سے کسی ایک کو خاص طور پر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں صرف تاریخ کے جبر کے مختلف چہرے دیکھ رہا تھا جن کے کان نہیں تھے، ناک نہیں تھے اور... میرے ذہن کے پردے پر اُس لمحے، جھکے ہوئے، ٹیڑھے چلتے ہوئے، اپنے پاؤں کو رِستے خون سے بچاتے ہوئے جو تصویریں تھیں اُن میں یومِ آزادی کے موقع پر سال ہا سال سے چھپنے والے قومی دانشوروں کے بصیرت افروز مضامین تھے کہ تحریکِ پاکستان کیا ہے — ابھی تک اُنہیں یہ علم نہیں ہو سکا کہ تحریکِ پاکستان کیا ہے اور پاکستان کا مطلب کیا — میں اُس مقدس مطلب کو جاننے کی کوشش میں سر ٹیڑھا کیے اُن مُردہ نوجوانوں کو نہیں تحریکِ پاکستان کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا — جب میں نے علی شیر کو دیکھا —"

اور یہی وہ precise لمحہ تھا جب ڈرائنگ رُوم میں مسز حسین داخل ہوئیں۔ اُن کے ہمراہ اُن کے خاوند مسٹر حسین بھی تھے لیکن تاریخ کے لیے وہ بے وجہ اور بے مقصد تھے اس لیے یہی وہ precise لمحہ تھا جب ڈرائنگ رُوم میں صرف مسز حسین داخل ہوئیں۔ بیگم بابر "ہاؤ سویٹ آف یُو" کہتے ہوئے اُن سے لپٹ گئیں اور اُن کے وسیع وجود میں مسز حسین کا مختصر سراپا تقریباً روپوش ہو گیا۔

وہ بہت منی ایچر اور بہت نازک تھیں —

اور اس کے باوجود اُن کے بدن کے مختلف حصے بہت الگ الگ اور بہت واضح دکھائی دیتے تھے۔ وہ ساڑھی میں تھیں لیکن اُنہیں بڑی آسانی سے ساڑھی سے جدا کر کے دیکھنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اُن کی آنکھیں بہت زندہ اور بہت تیرتی ہوئی لگتی تھیں اور اُن کی نظر ایک لاپرواہ تتلی کی طرح ہر نوجوان پر بیٹھتی اور اُسے فوراً پرکھ کر اُٹھتی ہوئی مردان پر بھی رُکی اور ایک ثانیے کے لیے ذرا دیر سے اُٹھی اور کسی اور چہرے کی جانب اُڑان کر گئی...

اُن کے آ جانے سے رونق آ گئی —

کھلنا بیرکس یکسر ماضی کا حصہ بن گئیں —

ڈنر سرو ہوا تو اس ڈائننگ روم کی تاریخ میں پہلی بار توجہ عارفین اور نازنین سے

بھی اور طرف گئی۔

ڈنر کے بعد توجہ مردان کی طرف گئی اور تھوڑی دیر وہ تتلی وہیں پر ٹھہری۔

"مجھے یقین ہے کہ تم مسز حسین کو جانتے ہو —" بیگم بابر ایک پرفیکٹ ہوسٹس کی طرح ایک نازک اور فیصلہ کن لمحے میں فوراً آگے آ گئیں "ان کے خاوند ساردا پولیس کالج کے پرنسپل ہیں —"

"جی بالکل —" مروان ساردا کا نام پہلی بار سن رہا تھا۔

مسز حسین کی گہری سیاہ اور سیال آنکھیں اوپر اُٹھیں اور اُن کے اندھیرے اور پانی مردان کے چہرے میں پور پور جذب ہو کر اُسے بھگونے لگے — وہ جانتی تھیں کہ درشت اور کٹھن چہرے والا نوجوان کپتان نہیں جانتا کہ ساردا کہاں ہے لیکن وہ وطن سے، اپنے لاہور سے دور ہے اور اُس کے سامنے سیاہ آنکھوں والا ایک ایسا دل کو مٹھی میں لینے والا چہرہ ہے جو ہوسٹائل اینوائرمنٹ میں ایک معجزہ ہے اور اگر اس لمحے وہ یعنی مسز حسین پیغمبری کا دعویٰ کر دے تو وہ پہلا شخص ہو گا جو ایمان لے آئے گا — یہ تاریخ کا اُن حالات کا جبر تھا جس میں مسز حسین ہمیشہ بالادست رہتی تھیں۔

بیگم بابر بہت آسانی سے اور آسائش سے بلکہ آسودگی سے ذرا فاصلے پر ہو گئیں اور اُن دونوں کو اُن کے حالات پر چھوڑ دیا۔

"ڈو یُو رائڈ؟"

"جی —" مردان چونک گیا۔

"کیا آپ کو گھڑسواری پسند ہے — گھوڑے پسند ہیں؟"

"پتہ نہیں —" مردان گفتگو میں گم ہو رہا تھا "کاکول کے بعد — نہیں جی... یہ مہنگا شوق ہے۔"

"آپ کسی وقت اکیڈمی آئیں۔ ہمارے پاس بہت اعلیٰ نسل کے عربی گھوڑے ہیں ہم رائڈنگ کر سکتے ہیں۔"

مسٹر حسین دوسرے کونے میں ظہیر الدین بابر کے کراچی والے متوقع گھر کے نقشے پر جھکے اتنے محو تھے کہ اُنہیں قطعی طور پر کوئی خبر نہ تھی کہ اُن کی بیگم صاحبہ کہاں اور کس کے ساتھ محوِ گفتگو ہیں۔ یہ بے خبری بہت احتیاط سے پرورش کی گئی تھی اور اسی بے خبری کا اعجاز تھا کہ وہ ایک انتہائی نامناسب انٹیلیکٹ اور شک بھری استعداد کے

باوجود اتنے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے تھے۔

"کیا آپ رقص میں دلچسپی رکھتے ہیں کیپٹن؟" مسز حسین ایک ایسی بے توجگی سے مسلسل اُس کی طرف دیکھتی تھیں جو مکمل توجگی سے کہیں زیادہ چھید کرنے والی اور ظالم تھی۔

"پتہ نہیں جی —" مردان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"گولف؟"

"نہیں جی —"

وہ بہت دنوں سے مشرقی پاکستان میں تھا۔ اتنے دنوں سے کہ اُس کے کھردرے صحت مند بدن میں بہت کچھ جو اُسے مردانگی اور شہوت دیتا تھا جمع ہو چکا تھا اور زور مارتا — اور مسز حسین کی بظاہر بے توجگی اسی زور کو شہ دیتی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو اس گرفت سے نکالنے کے لیے ایک نامناسب سوال کیا۔

"آپ کے بچے ہیں؟"

"ہاں —" اور اُس کی ہاں میں بھی وہی شہ پوشیدہ تھی کہ — ہاں۔ "تین ہیں... ابھی چھوٹے ہیں۔" وہ اُٹھیں اور سامنے بیٹھے ایک نوزائیدہ قسم کے لفٹین سے اُس کے شب و روز کا قصہ دریافت کرنے لگیں۔ اُس کے بعد وہ آنٹی بابر کے نیم روشن ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کے پاس گئیں اُسے کسی حد تک اسیر کیا لیکن مردان ایک شکنجے میں آئے ہوئے پرندے کی بے بسی سے اُنہیں ہمہ وقت دیکھتا رہا۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا کہ کسی زن کا وجود یوں کسی باہوش شخص کو بے وقوف اور بے اختیار کرتا ہے۔ یہ صرف وجود تھا — اُس کا سحر تھا جو کشش رکھتا تھا اور پھر سیال آنکھیں تھیں جن کی رطوبت اور گرمی وہاں اثر کرتی تھی جہاں بے اختیاری ہوتی ہے...

مردان شرمندگی سے آنکھیں نیچی کیے بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

باہر — گھنے اور دشمن درختوں کے ذخیرے تھے جن میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ وہ بھی جنہوں نے کیپٹن علی شیر کی کمپنی کو آ لیا تھا — لیکن یہاں عافیت تھی — آنٹی کے گھر کے اندر چین تھا... تب اُسے احساس ہوا کہ عارفین بہت دیر سے ایک بند کھڑکی کے قریب بیٹھی باہر دیکھ رہی ہے حالانکہ باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب وہ کسی اور جانب دیکھتا ہے تو وہ فوراً اُس کی طرف دیکھ لیتی ہے... وہ اُٹھ کر اُس کے

قریب جا بیٹھا۔ عارفین نے اُسے ایک ناراض نگاہ سے نوازا۔

"کھلنا بیرکس میرے حواس پر سوار تھیں —" اُس نے توجیہہ پیش کی۔

"صرف کھلنا بیرکس؟"

"Naturally —"

وہ آنٹی حسین کی عادتوں کو جانتی تھی۔ اُن کی سحر طرازی سے آگاہ تھی۔ اسی لیے اُس نے پوچھا تھا کہ صرف کھلنا بیرکس — عمر میں فرق تو بہت تھا لیکن آنٹی حسین کی پک اینڈ چوز کی عادت اسے بہت کھلتی تھی۔ اب اُنہوں نے مردان کو پک کر لیا تھا... کم از کم اگلے چند روز تک۔ اُس نے آج صبح ممی سے بات کی تھی... ممی دوست تھیں اور وہ اُن کے ساتھ اپنی زندگی کا تقریباً ہر راز شیئر کر سکتی تھی۔ جذبات اپنی جگہ — ممی نے بہت کہا تھا — مردان بہت ہینڈسم ہے لیکن اس کے علاوہ کیا ہے۔ ایک مڈل کلاس کا لڑکا ہمیشہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر اپنی اپر کلاس بیوی کی زندگی میں زہر بھرتا رہتا ہے۔ تم بے شک اُس کے ساتھ فلرٹ کرتی رہو لیکن عارفین ڈارلنگ میں تمہارے لیے ایک سُوٹ ایبل رشتہ تلاش کروں گی — یقین رکھو۔

چنانچہ وہ اس وقت یقین رکھتے ہوئے مردان سے بات کر رہی تھی۔

مسز حسین جدھر جاتی تھیں وہ بھی ایک یقین کے ساتھ جاتی تھیں کہ مردان اُن کو دیکھے جا رہا ہے۔ یہ یقین انہیں مردان ایسے درجنوں نوجوانوں کو زیر کرنے کے بعد خود بخود حاصل ہو گیا تھا۔

"مسز حسین —" بیگم بابر نے ایک مرتبہ پھر محبت سے مغلوب ہو کر انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

"آج اتنی خاموشی ہے — پلیز کچھ بجائیں۔ کیوں لیڈیز؟"

لیڈیز نے بے تحاشا تالیاں پیٹیں اور پھر یکدم خاموش ہو گئے۔

مسز حسین نے لاپروائی سے گرینڈ پیانو کا ڈھکن اُٹھا کر کیز کو چھیڑا۔ اُن کے سُروں کو سنا اور پھر اُن کی لامبی اُنگلیاں کی بورڈ پر بے چینی اور کبھی پُرسکون پرندوں کی طرح بیٹھنے اور اُڑان کرنے لگیں...

اپریل او —

اپریل کی محبت صرف بہت نوخیز لوگوں کے لیے ہے...

اپریل کی محبّت۔

ایسی بارشوں کی طرح ہے جو موسم سے پہلے آ جاتی ہیں۔

مسز حسین کی اُنگلیاں صرف پیانو کیز ہی پر اُٹھتی اور بیٹھتی نہیں تھیں بلکہ اُس گرمائش کی رگوں پر بھی اُٹھتی اور بیٹھتی تھیں اور اُسے بے حال کرتی تھیں۔

بہت ساری دُھنوں اور کپتانوں اور میجروں کی پُرجوش تالیوں کے بعد جب بزم برخواست ہو رہی تھی تو وہ سب سے الگ ہو کر آنٹی بابر کی اجازت سے اوپر — سیڑھیاں طے کر کے لاؤنج کے باتھ رُوم میں اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے لیے گیا۔

اس نے دروازہ کھولا اور بند کیا اور ایک کونے میں مسز حسین تھیں۔

"تمہیں واقعی رائڈنگ نہیں آتی؟" اُنھوں نے ایسے پوچھا جیسے وہ کسی ملازمت کے لیے انٹرویو کے لیے آیا ہو۔

اپریل لَو —

لیکن یہ تو دسمبر تھا —

اور اپریل تمام مہینوں میں سے ظالم ترین مہینہ ہے یا دسمبر —

نازنین دوہری نیم قوس والی سیڑھیوں سے اپنے آپ میں مگن اُترتی آ رہی اور آنکھیں مل رہی تھی کہ وہ ابھی تک نیند میں تھی اور نیچے ہال میں بے وقت آوازیں سن کر وہ نیچے آ رہی تھی جب اُس نے مردان اور شوبھا کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ آپا عارفین بھی وہاں تھی... انھوں نے آنے سے پہلے فون پر اطلاع تو نہیں کی تھی...

نازنین آخری سیڑھی پر کھڑی عارفین کے پاس رُکی۔ اُسے ایک نظر دیکھا اور مردان اور شوبھا اور آرام کرسی پر فروکش ممی کے برابر میں سے گذر کر لان پر کھلتی وِنڈوز کی طرف گئی اور پردے دھکیل کر پیچھے کرنے لگی۔

"نہیں —" عارفین آخری سیڑھی سے اتر کر فوراً اُس کے پاس پہنچ گئی "پردے مت ہٹاؤ۔"

"کیوں؟"

"ممی — سو رہی ہیں"

"پھر سو گئی ہیں —"

ہوئے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے جو آسمان دکھتا تھا اُس میں رنگ برنگے اور پتنگیں نیلاہٹ میں تیکھی بل کھاتی کشتیوں کی طرح — نہیں تیرتے تھے...

باہر بلیک آؤٹ تھا۔

رنگین شیشوں سے پرے شہر لاہور کے بُرج منارے اور ممٹیاں اور کوٹھے تاریکی لپیٹ میں خاموش اور چپ ایسے تھے جیسے اُن کے مُنہ کے آگے جنگ کی اُنگلی رکھ کر کہا ہے کہ بس چُپ... بولنا نہیں۔

وہ اور عام طوائف تو نہیں تھی... مجُرا تو نہیں کرتی تھی... صرف ایک شخص کے ناچتی تھی۔ وُہ — نوراں — اُس کمرے میں یوں چلتی تھی جیسے ابھی رُکے گی اور پھر بالکونی کی طرف دیکھے گی اور بازو اٹھا کر اُن کا گھیرا بنا کر گردن لچکاتے ہوئے ذرا کولہوں کو ایک حرکت دے کر ناچنے لگے گی۔ لیکن وُہ دِکھتی نہ تھی۔ باہر ستمبر 65ء کا بلیک آؤٹ

ابھی اس کے ہونٹ مرجھا کر دانتوں کے خلا میں لٹکتے نہ تھے۔ اس کی دعوتی آنکھوں کے گرد کوّے کے سیاہ پنجوں ایسے نشان ابھی واضح نہ تھے — پھر بھی وہ اُس سے عمر میں بہت بڑی تھی۔

ابھی اُس لال حویلی میں سریش اور گرگابیوں کا کاروبار شروع نہیں ہو رہا تھا اگرچہ بڑا فوارہ اب بھی خشک تھا لیکن اس کے تالاب میں جرمن سریش کے خالی ڈبے، مزدوروں کے ٹفن کیریئر اور گرگابیوں کے ڈھیر نہ تھے۔

انگلستان سے واپسی پر وہ ایک بے کیف زندگی بسر کر رہا تھا۔ بیکار شب و روز نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا... وہ اپنے وطن کو سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اُس کی سمجھ کے دھارے اس کے رکھ رکھاؤ اور اخلاقیات سے پھوٹتے تھے... وہ ایسا رنگا گیا تھا کہ اُس کا رنگ اترتا تو اس کے لیے وقت درکار تھا... گوجرانوالہ کی نٹنگ مل میں مختصر ملازمت کے بعد وہ

یکدم فارغ اور بیکار ہو گیا تھا۔ ایک گرد آلود گھٹن تھی جس کی اُسے عادت نہیں ہو پا رہ تھی — انہی دنوں اُس کے بچپن کے ایک دوست بلاول بٹ کا فون آیا تھا "اوئے مشاہدی۔ اوئے بے وفا — گجرات سے لاہور آیا تھا کچھ قالین اور دریاں فروخت کرن — لاہور ہوٹل کے کمرہ نمبر 21 میں انتظار کر رہا ہوں — آ جا"

مشاہد لاہور ہوٹل کے کمرہ نمبر 21 میں داخل ہوا تو بلاول بٹ عصر کی نماز کی نیت ب رہا تھا... اُس نے کن اکھیوں سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر مکمل خشوع و خضوع سے نماز کی ادائیگی میں مشغول ہو گیا... سلام پھیرنے کے بعد وہ اٹھا جا نماز کو جھٹک کر تہہ کیا او پھر سر سے گول ٹوپی اُتار کر کہنے لگا — "غسل خانے کے ٹب میں بیئر کی بوتلیں برف م لگی ہیں — پی لو — یا نہا لو"

باہر میکلوڈ روڈ پر شام کی آمد سے ایک مختلف قسم کی زندگی وجود میں آ رہی تھی۔

ایک بہت سجیلا جھالروں والا تانگہ کہ جس کا گھوڑا اتراتا ہوا چلتا تھا اُن کے قریب آیا۔ بلاول بٹ جیسے اُسی کا منتظر تھا۔ پچھلی نشست پر براجمان ہوا مشاہد کو برابر میں تقیم کیا اور کوچوان کی طرف دیکھے بغیر سگرٹ کا ایک طویل کش کھینچتا ہوا کہنے لگا "چل بھئی؟"

تانگہ چلنے لگا۔ گھوڑا سر ہلاتا ہوا۔ پھندنے اچھالتا ہوا اور گلے میں بندھی گھنٹیو کے ترنم سے لطف اندوز ہوتا چلنے لگا جیسے وُہ خوب جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے اور رہیں؛ کر رکا جہاں جانا تھا —

ہارمونیم کے سُروں سے چھیڑ چھاڑ... طبلے کی گہری تھاپ اور آوازیں۔ روشنیوں میں بھیگتی دل کو خوشی دینے والی مترنم اور بنی ٹھنی آوازیں۔ لوگ جیسے نمائش گاہ میں چلے جاتے تھے اوپر دیکھتے ہوئے جہاں وُہ تھیں۔ بیٹھکوں کے دروازے کھلے تھے اور اُن کے اندر کے منظر روشن دکھائی دیتے تھے۔ جونہی کوئی تماش بین اندر جاتا تو دروازوں کے کواڑ بند ہونے لگتے اور موتیے کے پھول اور گجرے۔ عطر کے تُونبے اور قربان جایئے کی شے گے؟

بلاول بٹ اس علاقے میں یوں چلتا تھا جیسے اپنے حلقہ انتخاب میں گھوم رہا ہو — ہر جانب سے بٹ صاحب سلاما لیکم — بٹ صاحب آپ نے ابھی تک وہ دین محم مجسٹریٹ والا کام نہیں ناں کیا... بٹ صاحب بڑی بے رونقی کر دیتے ہو اتنے دن جدائی ڈال کے — ہم تو مرنے والے تھے شکر ہے چہرہ دکھائی دیا ہے — بٹ صاحب بچے کو گرامر

سکول میں داخل کرا دیں جان... اِسے اپنا ہی بچہ سمجھیں — ناں ضروری ہے کہ فارم میں بچے کے باپ کا نام بھی درج ہو —

دو تین پسندیدہ کوٹھوں پر ایک ایک گانا سُن کر۔ بائی جی پر مناسب مالیت کے نوٹ نچھاور کر کے بلاول بٹ کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے یہاں آنے کے بعد یوں بھی پہلی بار مشاہد کی طرف دیکھا تھا کہ یہ — اُس کا شعبہ نہیں... اور وہ اس کارِ خیر میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا —

واپسی پر بھی وہی تانگہ منتظر تھا۔ بلاول بٹ نے پچھلی نشست پر اپنے آپ کو آزادہ کیا اور پھر اتنا ہی کہا کہ — چل بھئی۔

لوہاری دروازے کے اندر رات کے اُس پہر صرف حاجی نہاری والے کے ملازم دیگچے صاف کر رہے تھے۔ مٹھائی کی ایک دوکان کے باہر صرف ایک بلب روشن تھا اور چند لوگ اُس کے نیچے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ تنگ گلیوں میں جب تانگہ چلتا تو اُن کو بھر دیتا اور گھنٹیوں کی آواز دو چند ہو کر اوپر اٹھتی اور جھروکوں اور بالکونیوں میں جذب ہو کر مدھم پڑ جاتی...

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"مشاہدی یار تجھے ایک ٹُوئیں ورگی رَن سے ملاتے ہیں۔ ہے تو ذرا وڈیری پر کیا نخرہ ہے.. اور کیا قرینہ ہے اور قرینہ ایسا جانِ من کہ روح کھینچ لیتی ہے —"

"تم جانتے ہو کہ میں —"

"اوئے تو چل تو سہی —"

پیچ دار اندھیری سیڑھیوں پر اندازے اور احتیاط سے قدم رکھتے اوپر جاتے تھے۔ محلے میں خاموشی تھی اور کسی کو شک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اندھیری سیڑھیوں پر اندازے اور احتیاط سے قدم رکھتے اوپر جا رہے ہیں۔

اوپر بھی تاریکی تھی اور اُس میں ایک شاندار عمارت کی پرچھائیاں تھیں۔ برآمدے۔ ایک بہت بڑے صحن پر کھلتی درجنوں کھڑکیاں۔ اندھیرے میں بھی کبھی کبھار جگنوؤں طرح شیشے لَو دے جاتے اور نیچے صحن میں ایک فوارہ بند پڑا تھا۔

اُسے انہوں نے سوتے میں جگایا — بسم اللہ — باؤ بلاول بٹ جی۔ بسم اللہ۔ نُورا ... ذرا تماش بینی والا کمرہ کھول کر ہمارے یار کو وہاں بٹھاؤ جہاں راجے

مہاراجے بیٹھتے تھے اور پھر ذرا —

نُوراں کے پاس بہت کم لوگ آتے تھے بلکہ مہینوں کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ بہت احتیاط برتتی تھی کہ انہیں، محلے والوں کو علم نہ ہو۔ لیکن ان دونوں کو دیکھ کر وہ سوکھی ہوئی ہری ہو گئی تھی —

بہت دنوں سے اُس نے پیٹ بھر کر روٹی پانی نہیں کیا تھا — مہینوں سے اُس نے کوئی کپڑا لتا نہیں بنایا تھا... یہ آئے تھے اور رات کے اس پہر آئے تھے تو نیکی کے فرشتوں کی طرح آئے تھے۔

مشاہد نے ایک بار راستہ دیکھ لیا تو پھر اُس راستے کو یاد کر لیا۔

باہر بلیک آؤٹ تھا اور ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں میں اندھیرے کے پیوند تھے۔

بابر کو یہ شہر سخت ناپسند تھا۔ اُسے تو پورا ہندوستان اس کے باسی اور موسم اور پھل پھول سب ناپسند تھے... اس کے باوجود وہ ادھر آیا تھا تو پتہ نہیں کیوں آیا تھا۔

شیر شاہ سوری نے بسترِ مرگ پر مایوسی کا اظہار کیا — لاہور جیسے شہر کو مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہئے... جو بھی ہندوستان کی سرحد پار کرتا ہے وہ اس شہر میں اپنے آپ کو ہتھیاروں سے لیس کرتا ہے اور صحت مند سپاہی بھرتی کرتا ہے اور پھر دلی پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا اور اتنا اہم شہر دلی کے راستے میں نہیں ہونا چاہیے۔

پہلی بار حملہ آور دلّی سے لاہور کی جانب آ رہے تھے۔

باہر اندھیرے کے پیوند آہستگی سے روشن ہو رہے تھے۔ ستمبر کے چاند کی کرنیں اگرچہ مدھم تھیں لیکن اہل لاہور اپنے صحنوں میں سفید پھول رکھتے جھجکتے تھے کہ کہیں دشمن جہاز اندھیرے میں اُن کی سفیدی کا تعین نہ کر لیں۔

اُس صبح مشاہد ایک خصوصی اجازت نامہ حاصل کر کے بی آر بی نہر کے کنارے تک گیا تھا... نہر کے پار ہندوستانی فوج کی نقل و حرکت باآسانی دیکھی جا سکتی تھی۔ انہیں ادھر آنا تھا اور لاہور کے جِم خانہ کلب میں ایک پٹیالہ پیگ پینا تھا — وی آنا کے محاصرے کے دوران تُرک کمانڈر نے اپنے مدِ مخالف کو پیغام بھجوایا تھا کہ کل ہم دوپہر کا کھانا آپ کے ہاں کھائیں گے ذرا مناسب بندوبست کر دیجئے گا۔ شدید لڑائی اور بھرپور حملے کے باوجود وِی آنا فتح نہ ہو سکا۔ دوپہر ہوئی اور گذر گئی۔ ادھر سے تُرکوں کو پیغام آیا

کہ آپ آئے نہیں آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے — جِم خانہ کلب لاہور کا بلند اور پوروں سے جگمگاتا ہال بھی انتظار کرتا رہا لیکن — اُن کا پٹیالہ پیگ وہیں کسی میز پر پڑا رہا، اور شائد اب تک پڑا ہے۔

بی آر بی کے کنارے — بہت دُھول اور بہت دہشت تھی۔. جنگ کا لفظ کسی سرسوں کے کھیت کی زردی کو بھی خوف سے بھر دیتا ہے۔

میجر شفقت بلوچ چھوٹے سے قد اور چھوٹی سی داڑھی کے ساتھ مورچے میں سے برآمد ہوا اور وہ مشاہد کی جانب نہیں دیکھتا تھا، نہر کے پار مسلسل دیکھتا تھا اور جب باتیں کرتا تھا تو ایک ایسے جانور کی طرح پریشانی میں کرتا تھا جس کے شکار کے لیے شکاری نے ایک دو نہیں سینکڑوں جال پھیلا رکھے ہوں...

سات کمروں والی کوٹھی کی ویرانی ابھی نئی نئی تھی۔

مردان کاکول اکیڈمی میں زیرِ تربیت جنٹل مین کیڈٹ تھا اور مشاہد ہر ماہ اس کے پسندیدہ چاکلیٹ اور تاریخ کی کتابیں لے کر ایبٹ آباد جاتا تھا۔ چند لمحے اُس کی اداسی دور کرنے کی کوشش میں، اُسے تسلی دے کر اُسی روز واپس آ جاتا تھا۔

تو باہر ستمبر 65ء کا بلیک آؤٹ تھا۔ اہل لاہور جنگ کے اس ہیجان انگیز کھیل کو انجائے کر رہے تھے، صرف اس لیے کہ یہ کھیل پہلی بار کھیلا جا رہا تھا۔ وہ ابھی تک ایک مکمل جنگ کی مکمل تباہی سے ناآشنا تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جب جنگ دنوں کو عبور کر کے مہینوں اور برسوں میں داخل ہوتی ہے تو کیا ہوتا ہے.. جب لاہور، کراچی اور پشاور کھنڈر ہو جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ ایک محدود جنگ ایک قسم کا جذباتی رومان ہے جس میں آپ کا جذبۂ حب الوطنی بغیر کسی خدشے کے پروان چڑھتا ہے اور آپ وطن کی آزادی کی جنگ میں باآسانی سرخرو رہتے ہیں۔

یہاں لوہاری دروازے کے اس بازار تک سکھ سردار کی بگھی آیا کرتی تھی۔ وہ اُترتا تھا اور بگھی واپس چلی جاتی تھی۔ اس جھروکے سے داروُ اس کی خالی بگھی کو جاتے دیکھتی تھی۔

"مشاہد جی — "اس نے اندھیرے میں آواز دی۔ ایک ایسی آواز جس کا چہرہ نہ دیکھا جائے تو اُس میں شدید سپردگی کی خواہش تھی "میں ایک موم بتی جلا لوں؟"

"ہاں — "اُس نے کہا۔

موم بتی کے روشن ہوتے ہی پوری حویلی میں آشنائی اور شناسائی کی سفید تتلیاں پھرنے لگی۔ صرف ایک لَو جھروکوں، شیش محل کمروں، فواروں اور اُن پر کھلتی کھڑکیوں کو روشن کرنے لگی۔

"آپ ذرا ادھر بالکونی میں جا کر بیٹھ جاؤ جان —" نُوراں نے سر جھٹک کر ایک آنکھ بند کی اور وہ کم روشنی میں بھی نظر آئی کہ اِک ادائے دلبرانہ تھی۔

اسے یہ عمل حماقت آمیز لگا کہ وہ مشاہد علی بیسویں صدی کی ماڈرن ازم کا پروردہ کسی سکھ سردار کی رقاصہ کے بوسیدہ ڈانسنگ رُوم کے اوپر ایک بالکونی میں تن تنہا 65ء کی جنگ کے دوران ایک بلیک آؤٹ کی رات میں براجمان ہو — لیکن وہ اُٹھا اور چرچراتی لکڑی کی سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتا بالکونی میں پہنچ گیا۔

ناکافی جھلملاتی روشنی میں ایک مختصر کمرے میں، ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں والے تیسری منزل پر واقع کمرے میں — اور دن کے وقت یہاں سے مسجد وزیر خاں کے ٹھگنے مینار دکھائی دیتے تھے وہاں — نُوراں ایک عجیب لباس میں تھی۔ مشاہد نے اُسے کبھی اتنے بھاری سرخ اور مدھم پڑتے گوٹے کناری کے کام والے لباس میں نہیں دیکھا تھا...

نُوراں نے اوپر بالکونی میں اُسے دیکھا جہاں اُس کی دادی ایک سکھ سردار کی نیلی آنکھوں اور بے ترتیب داڑھی کو دیکھتی تھی اور وہ اُسے — ایک نیلی جین اور ٹی شرٹ میں دیکھ رہی تھی۔

وہ کوئی عام طوائف نہ تھی — مجرا تو نہیں کرتی تھی — صرف ایک شخص کے لیے ناچتی تھی۔

وہ رقص کے لیے اپنی ایڑھیاں دھیرے سے آہستگی سے اُٹھاتی تھی تاکہ گھنگھرو زیادہ شور نہ کریں.. جیسے ایک مائن فیلڈ میں چلتی ہو۔ آفٹر آل باہر بلیک آؤٹ تھا اور جنگ ہو رہی تھی۔

وزیر آباد کے قریب چھ ستمبر کی نیم گرم دھوپ میں سرسبز چارے کے کھیتوں میں، گنے کی فصل کے قریب کہیں کہیں — آہنی سکریپ کے چند ٹکڑے — اُن میں سے ایک شکستہ مشین گن کی نالی کا رُخ آسمان کی جانب۔ پہلا ہندوستانی جیٹ فائٹر جو ادھر آیا تھا۔ پائلٹ کے خون سے سکریپ کی جستی رنگت نیم سیاہ اُس دھوپ میں جو نیم گرم تھی — مشاہد اُسے دیکھ کر رنجیدہ ہوا۔ تمام جنگوں کا اینڈ ریزلٹ کیا ہے — زیرو پلس زیرو...

ڈہ کے بیل فیلڈ میں کھیتوں پر دُھول کے غبار جن کے اندر لوہے کی مشینیں گندم اور کو روندتی گڑگڑاتی ہوئی چلتی تھیں — ٹکا خان — 65ء — ہیرو — اور پھر 71ء آل دے بچرز۔

"اوئے — یہ اوپر کس... نے بتی جلا رکھی ہے — بند کرو اوئے۔" نیچے گلی میں کچھ آوازیں آئیں اور اُن کے اوپر پہنچنے کے ساتھ ساتھ ایک پتھر آیا جس نے اکلوتے رنگین شیشے کو توڑا اور کھڑکی میں یہی تو ایک شیشہ تھا جس نے کبھی دارو کو اور سکھ سردار کو اس کمرے کی تنہائی میں دیکھا تھا، اور اندر وہ پتھر آیا — نُوراں رُک گئی۔ وہ جو اپنی ایڑھیاں دھیرے سے اور آہستگی سے اُٹھاتی تھی تاکہ شور نہ ہو۔ رُک گئی — خوفزدہ ہو کر تھم گئی۔

"بتی بند کرو اوئے نہیں تو ہم اُوپر آتے ہیں —" ایک اور دھمکی سے لبریز آواز سول ڈیفنس کے پُرجوش رضاکار گلیوں محلوں میں گھوم کر ایسی کھڑکیاں تاک رہے تھے جن کے اندر کہیں غلطی سے یا پوشیدگی سے روشنی ہوتی تھی۔

نُوراں نے اُسی انداز میں، جس انداز میں "میں ایک موم بتی جلا لوں؟" کہا تھا... اب "میں موم بتی بجھا دوں مشاہدی —" کہا۔

"ہاں —" اُس نے کہا — اور پھر اُٹھ کر — اُس چھوٹے سے دَرشنی جھروکے کے سامنے سے اُٹھ کر بوسیدہ کرم خوردہ سیڑھیوں پر پاؤں سوچ سمجھ کر دھرتا اور پھر بھی اُن سے گر جانے اور اُن کے ٹوٹ جانے کے خدشے اُس کے بدن میں رچتے تھے وہ نیچے آیا اور اس دوران نُوراں گال پھُلائے موم بتی کے اُوپر جھکی آنکھیں سیڑھیوں کی جانب لگائے کہ جب وہ باحفاظت اُتر آئے تو میں پھونک مار دوں۔ وہ قریب ہوا تو نُوراں کی پھونک شعلے کو تھرتھرانے لگی — اور موم بتی گل ہو گئی۔

"مشاہدی —" وہ اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی آگے آئی — مشاہد اُس کی باس کو پہچانتا تھا کہ وہ اندھیرے میں آگے ہوئی تو وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کتنی قریب ہے "مجھے ڈر لگتا ہے... اپنا ہاتھ مجھے دو —"

پھر وہ بہت دیر اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہی... بلاول بٹ کے ہمراہ اُس کا پہلی بار آنا اور اُس نے چند روز سے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا —" جان میں نے تمہیں کبھی گاہک نہیں سمجھا... یہ تو تم جانتے ہو ناں —"

"ہاں —"

"تو جان ناراض نہ ہونا —" اندھیرے میں اب بھی مشاہد آگاہ تھا کہ وہ فاصلے پر ہے" تمہیں تین برس ہو گئے ہیں میرے پاس آتے ہوئے — تو تمہیں خواہش نہیں ہوئی — ہیں؟؟"

مشاہد کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔

"میں ذرا وڈیری ہوں — لیکن اتنی بھی نہیں — ہیں؟؟"

مشاہد پھر خاموش رہا۔

"مشاہد جی میں رانی ہوں اِس حویلی کی — ابھی فیصلہ ہونا ہے — میری دا یہاں راج کرتی تھی"

کھڑکی کا آخری شیشہ فرش پر کرچیوں کی صورت میں تھا... یا ہو گا — کہ دکھا نہیں دیتا تھا... اور ان میں — ان کرچیوں میں جانے کیا کیا صورتیں تھیں جو پنہاں ہو گئیں اور جو چوکھٹے اور خلاء تھے کھڑکی کے — اُن کے باہر لاہور کے بلیک آوٹ آسمان میں بہت دیر دیکھنے سے مسجد وزیر خان کے مینار شائبے سے دکھتے تھے۔ نیلے نین نقش وا مینار اب سرمئی دکھتے تھے۔

تو اب جیسا کہ آغا حشر کے ڈراموں میں بدلتا ہے تو منظر بدلتا ہے۔

یہ وہی آغا صاحب ہیں کہ اگر آپ چوک مزنگ سے چوبُرجی کی جانب سفر کرتے ہیں، آپ کے دائیں بائیں آگے پیچھے اہل وطن بھی ایک بھگدڑ کے عالم میں سفر کرتے ہیں تو رُکتی اور بمشکل بحال ہوتی ٹریفک کی غلیظ دلدل میں اپنے آپ کو شدید گرمی میں کوستے، یعنی اگر گرمیوں کا موسم ہے تو، جب آپ میانی صاحب قبرستان کی گذرتی قبروں کو دیکھتے ہیں تو وہیں ایک لوح پر موصوف کا نام دیکھتے ہیں... اور نقل کتبہ کتبہ باشد۔

مزار پُرانوار جناب آغا سید محمد شاہ صاحب
المعروف انڈین شیکسپئر حضرت آغا حشر کاشمیری
28- اپریل 1935ء
"اظہار حقیقت مبنی بر حقیقت"

ایک اک تمثیل تیری وقت کا تھی شاہکار
پھر گئی تیری دہائی مچ گئی تری پکار
تیری تصنیفات کے اوصاف آئینے بے شمار
لکھنے بیٹھوں میں تو صبح حشر بھی ہو آشکار
پھر بھی نظم و ضبط سے باہر ہو جولانی تیری
بند سے باندھی گئی کب حشر طغیانی تیری

منشی دل لکھنوی

تو جناب آغا حشر سٹائل منظر بدلتا ہے اور 65ء کے بلیک آوٹ سے براہ راست اور پرواز کرتا ہوا 92ء میں آ جاتا ہے۔ کردار وہی رہتے ہیں۔ وقت بدلتا ہے یا کرداروں کے چہروں کی جھریاں اور دانت اور باقی رہ جانے والی زندگی کے مہ و سال بدلتے ہیں — لال حویلی کا سیٹ تقریباً وہی رہتا ہے صرف گرگابیاں اور کاریگروں کے چہرے اِن ہو گئے ہیں۔ مسجد وزیر خان کے مینار بھی خالی چوکھٹوں میں ہیں... اور ایک چوکھٹے کا آخری شیشہ جس نے سکھ سردار کی پگڑی کے رنگ جذب کئے تھے 65ء کے بلیک آوٹ پتھر کی زد میں آکر کرچی کرچی ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ اُس ڈانسنگ روم میں کہ جس میں دارو چلتی کرتی تھی فرش پر اُس کا ایک ذرہ ایک شائبہ بھی موجود نہ تھا۔ اگر ایک کرچی بھی ہوتی تو اُس میں سکھ سردار کی رنگین پگڑی کے رنگ لشکارے مارتے۔ تو ہم 92ء میں آ گئے ہیں۔

"ہیں مشاہد جی یہ کیا کہہ رہے ہو — چوڑی سے شادی کرو گے؟" ابھی تک اس کی ایستادگی میں ایک شاہانہ پن تھا۔ حُسن کے تکبر کی جھلک تھی جس میں جھریوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں اور حلقے تھے... راکھ بھرے ہاتھ تھے اور پچاس گرگابیوں کی ایڑھیاں جن سے روز کا دانہ پانی چلتا تھا۔

"مجھے برگیتا چاہئے —"

"چاہئے کے لئے شادی کرنا ضروری ہے؟"

"ہاں —"

"اتنی حیاتی آپ نے یونہی گزار دی ہے۔ اب ادھیڑ عمر میں آئے ہو تو شادی کرنا

چاہتے ہو... اور وہ بھی... ناں ہے تو چوڑی ناں —"

پہلی بار جب شہر میونخ میں نہیں شہر لاہور میں کرسمس تھی ظفر علی روڈ کے اُس پُر آسائش گھر میں... کچی آبادی اور ریلوے لائن کے ساتھ ابھی ابھی راڈنی ایزبرگ العروف لیو — ساڈھا یسوع اج آیا سی، گا چکا تھا اور باہر کچی دیواروں پر بارش گرتی تھی اور خاموش ہوتی تھی ایک سیاہ فام پگڑی باندھے سوکھے اور بے توقیر شخص کی بھیگی ہوئی مونچھیں — جیسے ابھی جوہڑ میں سے نکل کر آیا ہو... کیچڑ بھرا — بے چارہ اور کمینہ — صاحب جی۔ گریب آدمی ہوں میری جنانی نے یکدم اکو واری تین بچے جن دیئے ہیں۔

اُٹھو مشائلہ انہیں دودھ پلاؤ۔ مقدس باپ نے تمہیں دو بچوں کی ماں بنا دیا ہے۔

وہ کالٹو مالٹو سیاہ بدہیئت چیتھڑے ایک زبردست فرانسیسی سائن کی جھالروں والی Cot میں پڑے مشائلہ کے ہاتھوں سے دودھ پیتے رہے اور متعدد فیڈر پینے کے باوجود اُن کے پیٹ بڑے نہ ہوتے تھے اُسی طرح چپکے رہتے تھے۔ چند دنوں بعد جب اُن کے سانس چلنے لگے تو وہی سوکھا اور بے توقیر شخص آ گیا صرف اس بار اُس کی سفید مونچھیں بھیگی ہوئی نہیں تھیں کہ باہر بارش نہیں تھی، تیز دھوپ تھی اور وہ ہاتھ جوڑ کر منتیں کرنے لگا — صاحب جی، ان میں سے ایک کاکا ہے، یہ مجھے واپس کر دو — میرا ہاتھ بٹائے گا جھاڑو پکڑ کر صفائی ستھرائی کرے گا۔ لوگوں کے کوٹھے اُتارے گا — باقی کاکی کو بناشک آپ رکھ لو۔"

مشائلہ یقین نہ کر سکی کہ کوئی بھی شخص چاہے وہ کاموں کی کا رہنے والا ہی کیوں نہ ہو کیسے اپنے دو بچوں میں صرف بیٹے کی بازیافت میں دلچسپی رکھ سکتا ہے۔

چند ماہ بعد راڈنی ایزبرگ اپنی پوتر تا اور اپنے سچ کی آخرت میں یقین رکھتا ہوا مشائلہ اور اُس ابھی تک سیاہ بدہیئت چیتھڑے کے ساتھ سویڈن واپس چلا گیا۔

پانچ برس بعد جو تصویر دریائے یوٹا کے کنارے بیٹھے ہوئے ایزبرگ خاندان کی مشاہد کے لیٹر بکس میں سے کرسمس کے دنوں میں ہی برآمد ہوئی اُس میں راڈنی۔ مشائلہ اور اُن کے دو موٹے تازے بچوں کے علاوہ ایک حیران اور بڑی بڑی آنکھوں والی سیاہ بلکہ کوئلہ سیاہ بچی بھی تھی — وہ اب ایک چیتھڑا نہ تھی۔ ایک بچی تھی۔

اور کافی برس بعد جب مشاہد ایک ٹیکسٹائل فیئر میں شرکت کے لئے یوٹے بورگ گیا ... شام کو مختلف کمپنیوں کے بروشر اور اشتہاری پمفلٹ اور ٹیکسٹائل سے متعلق

اُٹھائے ہانپتا ہوا اپنے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے خیال آیا کہ یہاں بڑن کے اس ساحلی شہر میں راڈنی ایزبرگ عرف لیو بھی رہا کرتا تھا اور وہ ایک زمانے میں اُس کا عزیز از جان دوست بھی رہا تھا... یہ خیال ظاہر ہے اُسے یک لخت نہیں آیا تھا — مسلسل اُس کے ساتھ رہا تھا۔

اس نے فون اُٹھا کر انکوائری سے ایزبرگ کا نمبر دریافت کیا — اور یہاں ہزاروں بڑگ ہیں تو پہلا نام کیا ہے — راڈنی — جواب آیا راڈنی بھی بے شمار ہیں لیکن ہم ...ش کرتے ہیں۔

دریائے یوٹا کے کنارے ایک بے آرام کرنے والے سرد اور دُھند بھرے موسم بہت ہی ٹھنڈے لینڈ سکیپ میں ایک ایسا گھر تھا جس کے اندر مشرق کے رنگوں کی گرمی

راجستانی پگڑیاں۔ فیکٹریوں میں وسیع پیمانے پر تیار ہونے والی راجپوت اور مغل ...ایجز۔ پیتل کی دیویاں۔ ادنکس کی ایش ٹریز۔ اونٹ کی کھال کے بدوضع لیمپ۔ ...لی میزیں اور سندھی رلیاں... ایک پوری دیوار موٹے شیشے کی تھی جس پر کہر جمتی تھی سامنے کے منظر کو دھندلاتی تھی اور سامنے کے منظر میں بھی ایک سرد لینڈ سکیپ کے ...ے دریائے یوٹا جیسے منجمد ہونے کو تھا۔

"ہائی فرینڈ —" راڈنی کی داڑھی راسپوٹین کے ہم پلہ ہو چکی تھی اور اُس کی ...ھوں کے گرد مہ و سال کے حلقے تھے اور دانت جو پہلے ہی زردی مائل تھے اب بوسیدہ ...اتے تھے۔

"مشائلہ کہاں ہے؟"

"ہا — مشائلہ" راڈنی نے ایک ہچکی بھری "وہ ذرا دیر سے گھر آتی ہے۔ لیکن ...موجود ہے اور وہ جانتی ہے کہ تم آ رہے ہو۔ ہم نے اسے تھوڑی سی پانجابی اور اُردو ...لی ہے جتنی ہمیں آتی تھی... دونوں بچے سو چکے ہیں۔ لیکن — میرا خیال ہے کہ ...ے وقتوں کی یاد میں تم ہمیں اتنا وقت تو دو گے کہ ہم اکٹھے ڈنر کر سکیں... تم میرے پہلے ...تا دوست ہو —"

سویڈز کا بس چلے تو وہ اپنی ہچکیوں کے زور سے بجلی کو نیست و نابود کر دیں اور

صرف موم بتیوں کی روشنی میں پوری زندگی ہنسی خوشی گزار دیں۔

سوئیڈزیوں بھی نیم تاریکی کے پجاری ہیں...

راڈنی نے ڈائننگ ٹیبل پر پانچ موم بتیوں کو روشن کیا اور پھر تمام لائٹیں اُڑا دیں۔

وہ بہت دیر تک اور بہت غیر ضروری تفصیل کے ساتھ پاکستان میں عیسائیت کے اپنے فرقے کے پھیلاؤ کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ میز پر خوراک کی ورائٹی حیرت انگیز تھی... اس کا جواز راڈنی کے پاس موجود تھا۔ مشائلہ نے پچھلے ایک برس میں مختلف دعوتوں اور تہواروں کے موقع پر اپنی مشرقیت ثابت کرنے کے لئے تیز مصالحوں والے پاکستانی کھانے تیار کئے تھے اور اُن میں سے کچھ بچا کر اُن کے پیکٹ بنا کر فریزر میں محفوظ کر لئے تھے ــــ اِن میں بینگن گوشت بھی تھا جو مشاہد نہایت رغبت سے کھا رہا تھا جب برگیتا ہال نما کمرے میں جہاں شیشے کی دیوار کہر آلود ہو رہی تھی اور اُس کی ٹھنڈک بدن میں سرائت کرتی بے آرام کرتی تھی ــــ داخل ہوئی۔

دریائے یوٹا کے یخ اور آلودہ پانی کہ وہاں بندرگاہ میں درجنوں ٹرالر ــــ آئل ٹینکر اور کارگو کیریئر اپنی آلودگی انڈیل رہے تھے، اندر اس شیشے کی دیوار کے اندر راڈنی ایزبرگ کے گھر کے اندر یہ پانی اتنی آہستگی سے داخل ہوئے جیسے وہ بھی ڈنر پر مدعو تھے۔ صرف مشاہد نے انہیں دیکھا، مشرقی دستکاریوں اور گوڑھے رنگوں کے درمیان وہ پانی رواں تھے اور اُن کے درمیان برگیتا کا سیاہ جسم تھا جو اُس نے دیکھا جو اُس تک بہتا ہوا آیا... اُن کی یخ بستگی میں سے اُس لمحے بھاپ اُٹھتی تھی جب وہ اُن کے پس منظر میں چلتی ہوئی آئی... کھڑکی سے باہر سلیٹی اور سیاہ لینڈ سکیپ میں کوئی سفید شگوفہ نہ تھا جو اس کی گود میں گرتا

یہ وہی چیتھڑا ہے ــــ پچیس برس پہلے کا ــــ ظفر علی روڈ کی رات میں برستی بے آواز بارش میں ایک بے حیثیت گیلی مونچھوں والے شخص کی اولاد ــــ کیا وہ اُس کے سامنے ہے جسے وہ دیکھتا چلا جا رہا ہے ایک بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں...

وہ اُٹھا اور اس کی جانب بڑھا اپنا ایک ہاتھ کسی پنجابی بزرگ کی طرح آگے کیا اُس کے سر پر پیار دینے کے لئے کہ اس عمر کی لڑکیوں کو ایسے ہی شفقت اور بزرگی سے پیار دیتے ہیں اور پھر وہ رک گیا ــــ اُس کے جذبات کا دھارا بالکل مخالف سمت کو بہہ رہا تھا ــــ وہ رُک گیا۔

برگیتا نے مڑ کر اپنے باپ ــــ راڈنی ایزبرگ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ا جس کا ترجمہ راڈنی نے آسان اردو میں کر دیا" میری بیٹی... یسوع کی یہ پاکستانی ہے کہ..." وہ ایک پاکیزہ ہنسی ہنسا "اس شخص کا رنگ مجھ جیسا ہے ــــ"

"ایک چوُڑی سے بیاہ کرو گے مشاہد چوہدری جی ــــ"

مشاہد بہت دیر چپ رہا۔ وہ مشورہ کرنے آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ نُوراں ایک بزرور کی حیثیت سے درست رائے دے گی لیکن واضح طور پر وہ بھی ایک پارٹی

"برگیتا ایک سویڈش لڑکی ہے۔ مکمل طور پر۔ وہ... اُس نے تو پاکستان دیکھا بھی

"پر ہے تو کاموں کی کے چوُڑے کی بیٹی مشاہد جی۔ چاہے سویڈن میں کھاپی کے جوان ، کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو۔ عشق تو کوئی چیز نہیں ــــ"

"ہے ــــ" اُس کی آواز میں اتنی سختی اور قطعی آخریت تھی کہ نُوراں ڈر گئی ۔مجھے برگیتا چاہئے"

اب تک لال حویلی کی ملکیت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ پہلے اکبری منڈی کے ایک نے اُسے گرم مصالحے، ہلدی اور مرچوں کے گودام کے طور پر کرائے پر حاصل کیا رائی نئے مالکوں کو چند متمول موچیوں نے دوگنا کرایہ آفر کر دیا۔ اب وہاں بتی تھیں اور اُسے فیکٹری کہا جاتا تھا... نُوراں کی "گاہکیاں" اختتام پذیر ہوئے چکی تھیں... وہ اپنے پیشے سے مطابقت رکھتے ہوئے فکر فردا سے آزاد رہی... تم ہوئی تو کچھ ہاتھ پلے نہ تھا... کوئی ٹھکانہ نہ تھا... چنانچہ روزانہ چالیس پچاس ئی ایڑھیاں جرمن سریش کے ساتھ اور روٹی پانی کا بندوبست۔ نُوراں سر جھکائے کے گرد حلقے اور کم دانتوں والے منہ پر جھریاں بھرے ہونٹ لٹکتے ہوئے... بس ر مشاہد جی آجاتے۔

کاریگر جن میں سے بیشتر چمار تھے اُسے شک کی نظروں سے دیکھتے کیونکہ جب وہ تا اُس کی پشت سے قطعی طور پر عمر کا اندازہ نہ ہوتا تھا اور جوان کاریگر ایک بار تو کر اپنے بدن کو اینٹھتا ہوا محسوس کرتا تھا۔

"جے فیصلہ کر کے آئے ہو مشاہد جی تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو — بسم اللہ"

"عشق چیز ہے —" مشاہد کی آواز بہت بھرائی ہوئی تھی کہ اُس کے سامنے بر... کی سیاہ جنبش اور بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔

"ہو گی —" راکھ بھرے ہاتھوں نے اپنے آپ کو جھٹکا۔

یہ جو سیاہ اور پوشیدہ آنکھوں والیاں ہنستی تھیں اپنے برقعوں کے پلّوں میں ا... جن کے چھریرے بدن ابھی پھوٹتے تھے — زور لگا کر — موسم آنے سے بہت پہلے — ٹہنیوں میں سے اُبھرتے ہوئے... تو یہ اندرون شہر کی نیم خواندہ لاہورنیں تھیں اور ا... کے دلوں کے اندر ہی اندر عشق شاہ حسین والی دھمال ڈالتا تھا اور یہ وہی کھوئیاں تھیں جہاں سے عاشق پانی بھرتے تھے۔

پر نہیں — ایک اور کھوئی بھی تھی جہاں سے مشاہد پانی بھرنا چاہتا تھا۔

جنہاں کھوئیاں تے بھرن معشوق پانی —

برگیتا۔

دونوں باجیوں پر فی الفور اور بیک وقت غشی کے دورے پڑ گئے۔

غش کھانے سے پیشتر انہوں نے اپنے سینوں پر دوہتڑ مار کر بین کئے "ہائے ہا... چوہدری اللہ داد کا بڑا بیٹا — ہمارا بھائی اور ہائے ہائے — چوڑی کو گھر لا رہا ہے —"

مناسب وقفوں کے بعد وہ غشی سے ہوش میں آتیں، متعدد ٹشوز گیلے کرنے... بعد سیون اپ یا کوکا کولا کی ایک ایک بوتل پینے کے بعد پھر بے ہوش ہو جاتیں۔

آہستہ آہستہ اُن کے لئے مزید غش کھانا ممکن نہ رہا اور وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چارپائیوں پر آلتی پالتی مارے سیپارہ پڑھنے والے بچوں کی طرح آگے پیچھے ہلتی بین کرنے لگیں... اور دیر تک کرتی رہیں...

مردان کراچی سے لاہور آنے والی ست ترین ٹرین میں بیٹھا ہچکولے کھاتا، دھول پھانکتا اپنے آپ میں ہنس رہا تھا، خوش ہو رہا تھا... بھائی جان... حیران پریشان اور بنگل... بیابان... بالآخر... ایک عدد بھابھی اور وہ بھی سویڈش — پاک سرزمین شاد باد!

برگیتا ایک عجوبہ تھی۔

گوٹے برگ میں سیاہ رات جیسی سیاہ وہ بچی جس کے نین نقش آسٹرو منگوائڈ تھے ...عجوبہ تھی... بلکہ ایک غیر فطرتی چیز تھی کہ سویڈن میں ہر شے ہر رنگت سفید اور بے ...تھی، اُن کی مدسمرنائٹس بھی سفید تھیں۔

وہ ہمہ وقت مانگ میں رہتی — ایک گڈلک چارم کے طور پر۔ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے ایک سیاہ گڑیا کے طور پر — اور ایک سیاہ فام کے لئے سفید فیاضی کے مظاہرے کے طور پر۔

کہیں نہ کہیں کوئی شدید گڑبڑ تھی جو اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اُس کے ماں باپ ویسے ہی تھے جیسے سب بچوں کے تھے لیکن وہ سب بچوں جیسی نہ تھی — اور اس کے علاوہ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی ویسے ہی تھے جیسے سب بچے تھے لیکن وہ نہ تھی — ...نہ تھی — بس یہی گڑبڑ تھی۔

پہلی بار جب اُس کے بچپن کا بند اندر کی رطوبتوں سے ٹوٹا تو مشائلہ نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے... اُسے زندگی کے حقائق بتاتے ہوئے جنہیں وہ بہت عرصے سے جان چکی تھی پہلی بار اس کے سیاہ وجود کا سبب بتایا — تم پاکستانی ہو — تمہارے ماں باپ... اور میں اور پاپا تمہیں بے حد چاہتے ہیں...

وہ بہت دن سو نہ سکی۔ اُس کی خصلت میں تشدد نے زور پکڑا۔ سکول سے شکایتیں آنے لگیں... وہ ایک وحشی ٹیگرس کی طرح Behave کر رہی تھی۔

اگر یہ میرے ماں باپ نہیں ہیں تو میں یہاں کیوں ہوں — اُن کے پاس کیوں نہ ہوں —

راڈنی اپنی داڑھی کھجلاتا بہت مدبر دکھائی دینے کی کوشش میں اُسے سمجھاتا کہ ادھر دشواری اور تنگی ہے۔ تمہارا باپ — ایک سویپر ہے اور تمہارے بہن بھائی لوگوں کا ...کام کرتے ہیں اور تم اب وہاں نہیں رہ سکتیں اور تم بہت اچھے نصیب کی ہو کہ یہاں ہمارے پاس سویڈن میں ہو اور ہم تمہیں اپنی سگی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

بہت ادب کرنے والی اور ازحد دھیمی بچی میں تشدد اور نافرمانی کی جڑیں گہری ہو گئیں ...وہ اب راڈنی اور مشائلہ پر چیختی تھی اور دیر سے بہت دیر سے گھر آتی تھی — ...انہیں بھی آتی تھی۔

گوٹے برگ میں اب بھی اُس کی مانگ تھی — لیکن اس مانگ میں فرق تھا۔

وہ بہت مختلف بدن کی اور سفید بیڈ شیٹس کو بھی گرمی سے بھورا کر دینے کی صلاحیت رکھنے والی ایک آسٹرو منگولائڈ لڑکی تھی اور عام سویڈ لڑکیاں بہت بے ذائقہ اور ٹھنڈی تھیں... اسی لئے یوئے برگ میں اب بھی اُس کی مانگ تھی۔

راڈنی اُسے واقعی دل سے چاہتا تھا' وہ پہروں متفکر بیٹھا داڑھی کھجلاتا رہتا۔

شاید انہی زمانوں میں مشائلہ سفید سفوف کی طرح مائل ہوئی اور اُن کی آمدنی کا بیشتر حصہ ادھر صرف ہونے لگا۔ راڈنی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ اپنی سیاہ فام بیٹی کے لئے اور نہ اپنی جنگلی بیوی کے لئے۔ وہ بھی راتوں کو دیر سے آتی اور جب بھی آتی اُس کے ہمراہ "راڈنی میٹ مائی فرینڈز —" عجیب قماش کے نوجوان ہوتے — وہ سفید سفوف کی آسان دستیابی کی کشش میں ہی ایک بار اکیلی پاکستان بھی گئی تھی۔

راڈنی ایک شام فکر مندی کی انہی سوچوں میں گم ٹیلی ویژن کی خالی سکرین کو دیکھے جا رہا تھا جب مشاہد کا فون آ گیا — میں یوئے برگ میں ہوں۔

برگیتا کے سامنے جب وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آئی' شیشے کی دیوار کے آگے سے گزر کر اُس کے سامنے آئی... تو وہ ٹھٹک گئی — اس کے سامنے ایک سچ تھا... اُسی رنگ اور نسل کا... وہی جس کی تلاش میں منطق الطیر کے پرندے نکلے تھے اور اُس سچ کی شکل اُس جیسی تھی۔ ہو بہو وہ آپ تھے جیسے آئینے کے مقابل ہوں اور برگیتا کے سامنے آئینہ تھا جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی تھی... کون آیا پہن لباس کڑے... کون آیا؟

جب اگلی شام پاپا راڈنی نے ایک ناپسندیدہ لہجے میں اُسے بتایا کہ مشاہد جو اُن کا عمر ہے اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو برگیتا کے سامنے ایک آئینہ تھا اور وہ اپنے آپ اس میں دیکھتی تھی اور ہمیشہ دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔

ٹھکر دوپہر کی خاموشی میں جب کھنکتی چوڑیوں کی آواز تادیر کھنکتی تھی لوگ منہ پر ے ڈالے ٹاہلیوں کی چھاؤں میں الانی چارپائیوں پر گھوک سو رہے تھے اور کچے پکے ں کی کھڑکیاں باہر کی لُو روکنے کے لئے کواڑ بند تھیں اور پھر بھی ان کے اندر منہ ل کر سونے والوں کے کانوں میں خشک بے رنگ آسمان میں سیاہ ستارہ ہونے والی ں کی چیرتی آوازیں ایک ناگوار ارتعاش کے ساتھ اُترتی تھیں۔

جوہڑ کی سطح پر کہیں کہیں کائی تھی جو گرمی کی شدت سے جیسے پہلو بدلتی ایک ناگوار تی تھی۔ پانیوں کی گدلاہٹ میں ایک گرم موٹائی تھی۔ کناروں پر کان بوٹی ہلتی تھی اور کے کاسنی خوشنما پھول ٹھکر دوپہر میں خوش تھے اور اُن پر ایک باریک گُتی فضا میں جیسے ں تھی لیکن ایک چھوٹے سے متحرک بادل کی طرح کبھی اس پھول پر کبھی بدبودار کائی

جوہڑ اپنے غلاظت بھرے وجود اور گہرے ٹھہرے ہوئے اندھے پانیوں کی نیم گرمی کہ وہ پانی اُبلنے سے ذرا ادھر تھے تو یہ جوہڑ سطح پر ایک سٹل لائف تصویر کی مانند ٹھہرا اور بے جان لگتا تھا سوائے کان بوٹی کے جو ہلتی تھی اور گُتی کے جو رک رک کر اُڑتی

سب جدھر دیکھتے تھے برگیتا بھی ادھر دیکھتی تھی۔

اور سب جوہڑ کے کنارے سے ذرا دور جہاں خود رو بوٹی پانیوں کو ڈھکنے میں ناکام تھی وہاں دیکھتے تھے — اور دیکھتے دیکھتے ٹھہری ہوئی لُو سے لُوستے بدبودار پانیوں میں کیچڑ کا ایک ہیولے سا باہر آیا — اور سب لوگ ذرا آگے ہوئے — برگیتا اور مشاہد ا کھڑے رہے...

وہ گہرے پانیوں میں سے نکل کر بوٹی کو ہاتھوں سے پرے کرتا کیچڑ میں سے پاؤں نکالتا باہر آیا تو اُس کے بدن پر جوہڑ کی تہہ کی تمامتر غلاظت اور گارا ایک رواں اور جاندار

اور نیم سیاہ لیپ کی صورت میں گرتا تھا۔ اُس کے نتھنوں، کانوں اور منہ میں سے گو
ایسے دھیرے دھیرے رس رہی تھی جیسے اُس کی رگوں میں خون کی بجائے کا موٹی
جوہڑوں کا گارا گردش کرتا ہے۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ فخر سے بلند کیا جس میں کانسی کا
کٹورہ تھا اور اُس میں سے بھی گارا گر رہا تھا۔

برگیتا نے اپنے چہرے کو جو گرمی کی شدت سے ہر لحظہ بھیگتا اور نچڑتا تھا ایک ر
پھر پونچھا اور کانسی کے کٹورے سے نظر ہٹا کر مشاہد کی جانب دیکھا — مشاہد نے اثبات م
سر ہلایا۔

بوڑھے بکّو ساہ پکّے کا اب سر ہلتا تھا اور وہ سر صرف ایک لحظے کے لئے ہلنا تر
موقوف ہوا جب اُسے بشیراں بی بی نے اپنے جہیز کے کٹورے کو جوہڑ میں سے نکالنے پر دس
روپے کا نوٹ تھمایا۔ نوٹ اُس کی مٹھی میں آتے ہی گارا ہو گیا اور اُس کا سر پھر سے ہلنے
لگا۔

تماشہ ختم ہو گیا۔

جو ٹاہلیوں کے نیچے بچھی الانی چارپائیوں سے اُٹھ کر آئے تھے اور جو اپنے کچے
گھروں کی نیم تاریک ٹھنڈک میں سے لُوستی لُو اور خشک آگ برساتے آسمان تلے صرف
اس لئے آئے تھے کہ ایک مرتبہ پھر بکّو ساہ پکّے کا ساہ دیکھیں، واپس چلے گئے۔

کہیں اُن میں سے کچھ کو وہم تھا۔ کچھ کی خواہش تھی کہ اس مرتبہ بکّو جوہڑ کے
اندر ڈبکی لگائے گا تو پھر اُبھرے گا نہیں — وہیں رہے گا۔ اور اُنہیں اس موقع پر موجود ہونا
چاہئے...

وہ اپنی آنکھوں پر سے کیچڑ کے لیپ کو سمیٹتا، لنگوٹ کو سنبھالتا اُدھر گلی کی جانب
ایک نابینا شخص کی مانند جا رہا تھا، اور کیونکہ اُس کی مٹھی میں دس روپے کا نوٹ تھا اور اس
کے سوا دنیا میں کوئی اور مذہب کوئی اور سچائی نہ تھی جب — برگیتا نے اُس کے کیچڑ
بھرے سوکھے سیاہ ٹہنی بازو پر اپنا ہاتھ رکھا — "ڈیڈی —"

"ہیں جی —" وہ ڈر گیا کہ شاید کوئی اُس کا نوٹ واپس لینے آیا ہے۔ اس نے
پپوٹوں پر سے گرتے اور اب گرمی سے تیزی سے خشک ہوتے کیچڑ کو پھر سے پونچھا اور اپنے
سامنے کھڑے ایک صاحب اور ایک بیگم صاحبہ کو دیکھا اور بیگم صاحبہ کا رنگ اگرچہ اُس
جیسا تھا لیکن اُن کا ہاتھ اُس کے بازو پر تھا... وہ سمٹ کر اور جھجک کر ذرا فاصلے پر ہو گیا

پلید تھا اور وہ بیگم صاحبہ تھیں... بیگم صاحبہ کا ہاتھ وہیں رہا اور جب اُس کے بازو سے،
اُس کے سمٹ کر پیچھے ہٹنے سے، الگ ہوا تو اُس پر بھی کثافت کا لیپ تھا۔

"آپ برکت مسیح ہو؟" مشاہد نے پوچھا...

بکّو یکدم انسان سے قدموں میں لوٹنے والا ایک جانور ہو گیا — آج تک جب
بھی اُس سے یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا تم برکت مسیح ہو تو ہمیشہ اُس پر کوئی نہ کوئی مصیبت
نازل ہوئی تھی... کسی چوری کے شک میں تھانے میں حاضری — پھر چھتر کٹ اور ٹھُک مکا
— یا پھر چوہدریوں کی بیگار — یا پھر محکمہ ایکسائز والے... کہ پرمٹ پر شراب لے کر
مسلمانوں کو بیچتے ہو — تو وہ ایسے تمام موقعوں پر قدموں میں لوٹنے والا جانور بن جاتا تھا
صرف چاؤں چاؤں نہیں کرتا تھا باقی ہو بہو وہی بن جاتا تھا — نہ بنتا تو اتنے انصاف پرست
معاشرے میں زندہ کیسے رہتا "ہاں مائی باپ... آہو جی... حکم حضور..." — چاؤں۔ چاؤں
اُس نے دونوں ہاتھوں سے گرتے ہوئے لنگوٹ کو تھام لیا جو گارے کی وجہ سے کھسک رہا
تھا۔

برگیتا پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاید ایک خلائی مخلوق دیکھ رہی تھی جو کہیں ٹھنڈے
ہوتے لاوے میں سے جنم لے کر پانیوں میں سے اُبھر کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔
گرم دوپہر میں شکر دوپہر میں اس کے سیاہ غلاظت بھرے بدن میں سے جیسے بدبو اور بھاپ
اُٹھتی تھی... اوہ کرائسٹ یہ... یہ شخص... یہ کیچڑ — ہی از مائی فادر... میرا باپ ہے — میرا
وجود اس کے اندر کی نمی سے بنا ہے — میں اس کا حصّہ ہوں... اس کا — اوہ کرائسٹ۔

بکّو ساہ پکّے کے ویہڑے میں کپاس کی من چھٹی کے ڈھیر تھے۔ ایک دیوار پر تازہ
گوبر کے اُپلے تھوپے ہوئے تھے اور جو ایک کچی کوٹھڑی تھی اُس کے اندر وہ سب فرش پر
— کچے فرش پر گڈمڈ سوئے ہوئے تھے —

اوئے اُٹھو — اوئے حرامیو اُٹھو — جیرے — بھجو — چُنی — دیکھو تو سہی
کون مہمان آیا ہے... وہ سب بدبودار اور گندے چیتھڑوں میں اپنے بدنوں کو بیزاری سے
کھجلاتے اُٹھے اور انہوں نے نیند کی گھوک میں اپنے باپ سے ایسے لفظ کہے جو نہیں کہے
جاتے۔

"بیگم صاحب —" بکّو نے ڈرتے ڈرتے کہا "تم سے ملنے آئی ہیں —"

برگیتا کی سانسوں کے آگے رکاوٹیں آنے لگیں، بدبُو اور بے چینی کی، اُبکائیاں

آنے لگیں... وہ کوشش کے باوجود اس ماحول میں زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہ سکتی تھی اور اوہ کرائسٹ دے آرڈرلی....

"بیگم صاحبہ — تمہاری سسٹر ہیں —"

وہ درجن بھر تو ہوں گے۔ سب سے بڑا بال بچوں والا تھا اور اُس کے بال بچے بھی اِسی کوٹھڑی میں پسارے ہوئے تھے اور سب سے چھوٹا دس برس کا نہ تھا —

"اوئے سلامت — ایدھر آ"

سلامت ابھی تک اس میلے میں شامل نہیں ہو رہا تھا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔

"صاحب جی —" وہ مشاہد کی جانب پلٹا "یہ... سلامت اور بیگم صاحبہ اکٹھے آئے تھے — سلام کراوئے بیگم صاحبہ کو — سسٹر ہیں۔"

"سلام اے" اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور اپنی جانب دیکھنے والی بیگم صاحبہ کی نظروں کی تاب نہ لا سکا — یہ کیوں میری طرف ایسے دیکھتی ہے... بابے حرامی کا دماک خراب ہو گیا۔ کہتا ہے ہم اکٹھے آئے تھے — کہاں سے اکٹھے آئے تھے بھائی!

مشاہد بہت دیر سے صرف مشاہدہ کر رہا تھا "تمہیں وہ رات یاد ہے؟"

"آہو جی —" برکت مسیح اپنے جانور وجود سے واپس آ رہا تھا "اُس رات مینہ پانی بہت ہی زیادہ تھا — تو میری جنانی نے — یکدم اِکو واری تین نیانے جن دیئے — ایک تو باہر آتے ہی فوت ہو گیا مجھے یاد ہے جی — اور میری جنانی کا دودھ سوکھ گیا تو میں — کرایہ اُدھار لے کے لہور گیا سویڈن والے صاحب جی کے پاس — بھاگ لگے رہن انہوں نے یسوع کی بھیڑ کا ہاتھ پکڑ لیا..."

مشاہد نے سر ہلایا — جب صبح کا اُجالا ہوا تھا اور دونوں موم بتیاں اپنی بلند قامتی کو پگھل پگھل کر مختصر کرتی میز کی سطح پر آ کر بکھر چکی تھیں جب راڈنی کامونکی سے واپس آیا تھا — اُٹھو مشائلہ... انہیں دودھ پلاؤ — ساڈھا یسوع اَج آیا سی۔

لاہور واپسی پر وہ کامونکی ریلوے سٹیشن کے قریب سے ہو کر نکلے۔

ابا جی نے اخبار کھول رکھا تھا اور اُن کی اُنگلیاں اس پر گرفت نہیں کر رہی تھیں اور لرزتی تھیں... اسی سٹیشن پر —

باہر مت دیکھو —

ایک اور ٹرین بھی تھی جو کھڑی تھی۔

اک مریل سا کُتا اپنے وزن سے کہیں زیادہ کی کوئی شے گھسیٹتا آ رہا تھا اور اُس کا ایک چھوٹا سا سر اور دو خون آلود آنکھیں تھیں۔

دن بھی یہی تھے جب جوہڑوں میں سے بھی گرمی کی شدت سے بساند اُٹھتی ہے تو ...وں میں سے تو بُو اُٹھنی ہی تھی...

ایک سیاہ۔ ننگ دھڑنگ بچہ — سرخ رنگ کا بھاری کپڑا... پلیٹ فارم پر گھسیٹتا ... اُس کے نین نقش آج پہچانے گئے تھے۔

"تھانکس اے میکے — بہت شکریہ" برگیتا نے سٹیئرنگ کو تھامے ہوئے اس کے ...و پر ہاتھ رکھا اور اُسے دبایا اور تب وہ کامران کی بارہ دری کو دیکھ رہے تھے "میں آج ...ل ہو گئی ہوں۔"

"وَف —— وَف" کتورا اپنی کمینی حیثیت سے بڑھ کر بلند آواز میں "وَف" کرنے کی کوشش میں دوہرا ہو کر گرتا گرتا بچا۔

کالیے نے ٹھٹک کر پیچھے دیکھا۔

"اوئے برادر عزیز تو کہاں چلا آ رہا ہے۔ اگر چلا ہی آیا ہے تو ذرا دیکھو اور اپنی چُ آنکھوں سے ریت کے ذرّوں میں سے کسی ایک ذرّے کو فوکس میں لا کر دیکھو جو کرنیں جذب ہو چکی ہیں اُن کی مدھم لَو دیکھو جو... ہم انسان نہیں دیکھ سکتے —— لیکن تو دیکھ برادر عزیز"

سورج کب کا ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو چکا تھا لیکن ریت کے ذرّوں میں —— لانا پھوگ، کترن۔ کھپ، کھار اور چھپری کی جھاڑیوں میں جو روشنی جذب ہوئی تھی اب اُن کی نس نس میں سے پھوٹتی تھی۔ بہت ہلکی لَو کے ساتھ —— افق پر کیکر کے درختوں کی جھالر شاخوں کے اُوپر ایک یخ سرخ تمازت پھیلی ہوئی تھی جیسے صحرا کے اندر کہیں اندر آگ پوشیدہ ہو جیسی دہکتے اُپلوں میں ہوتی ہے اور اُس کی سرخی آسمان پر جھالر شاخوں کو جو سیاہ ہو رہی تھیں اُن کے اُوپر پوچا پھیرتی ہو —— یہ عجیب ناواقف ناقابل اعتبار روشنی تھی جو ڈیراور قلعے کی بلند اور کچی دہشت دیواروں بلکہ اہراموں سے نیچے آتی تھی اور جامع مسجد کی ویرانی میں سفر کرتی ہوئی اُس کے قدیم سنگ مرمر کے ناآشنا جھروکے کی شکستہ جالیوں میں ذرا کی ذرا رُک کر ایک نظر ڈیراور کے بڑے چوبی دروازے پر ڈال کر اُترتی تھی —— اور اُترتی تھی جھروکے سے دکھتے بازار میں، تو اُس ریت اٹے کچے کمروں۔ اینٹوں کی محرابوں اور ڈھئے ہوئے مٹی کے ستونوں کے بازار میں —— اور وہاں صرف کچے کھنڈر تھے اور صرف ایک دو دوکانیں کھلتی تھیں جن میں جدید مشروبات کے کریٹ، پوٹیٹو چپس اور بسکٹوں کے علاوہ مرونڈے اور دالیں تھیں اور ہاں پنکچر لگانے کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا —— لیکن اب اس گہری سرخ شام میں وہ دو دوکانیں بند تھیں۔ تو اُس بازار میں جو یورپین

بزار کی تصاویر میں مڈل ایجز کا ایک فراموش شدہ بازار پینٹ ہوتا تھا... وہ روشنی —— اگر یے صرف روشنی کہنا جائز ہے تو... کہ اُس میں کوہ طور کی الوہیت تھی —— تو وہ روشنی اُن ریتلے، کچے، مسمار ہوتے بازار میں تادیر ٹھہرتی تھی اور وہیں دم توڑتی تھی... کالیا اس بازار میں ایک مسافر کی تصویر جو ابھی ابھی تھکا ماندہ صحرا پار کر کے یہاں پہنچا تھا۔ ٹھکانا تلاش کرتا... اپنے قدم گھسیٹتا حالانکہ اُس کا ٹھکانہ تھا ریت میں قدم گھسیٹتا چلتا تھا جب اُس کے برادر عزیز نے "وَف" کیا تھا اور وہ ٹھٹھک گیا تھا۔

وہ دونوں —— ایک کُتورا اور ایک انسان بہت دیر تک —— اُس روشنی کے اسیر جسے صرف روشنی نہیں کہا جا سکتا —— اتنی دیر جتنی دیر میں انسان نے چار پاؤں کی بجائے دو پاؤں پر چلنا سیکھا اُتنی دیر اسیر رہے۔

کیمپ کے جنریٹر کی بھدی آواز صحرا کی خاموشی کی بے حرمتی کرتی ہوئی یہاں تک آ رہی تھی اور کبھی کبھار ہوا کے شانوں پر کسی چولستانی گویے کی تان اس خاموش ریتلے کچے ناقابل بیان بازار کے کھنڈروں تک آ جاتی جس میں کالیا قدم گھسیٹتا چلتا تھا۔

"دیکھ برادر عزیز —— دیکھ" وہ جھک کر پھر کُتورے سے مخاطب ہوا" میں تمہارا شکرگزار ہوں... تم میرے ساتھ تین مہینے مردان جیل میں رہے —— تم واقعی برادر عزیز ہو —— اسی لئے تو میں یہاں آیا ہوں —— جیل کے بعد مجھے صحرا چاہیے تھا۔"

آج شام عباسیوں کے شاہی قبرستان میں بھی ایک اَن دیکھی اور ناواقف روشنی جو خواتین کے نازک مدفنوں پر ایسے اثر انداز ہوتی تھی جیسے اُس میں روح ہے جو قبرستان کے دل میں ایستادہ ایک برباد اور بے آباد لینڈ سکیپ کی ریتوں کے درمیان —— ناپوشیدہ رہنے کی آرزو کرتے مقبروں میں دبے پاؤں چلتی تھی۔ اس میں ہمیشگی کی ایک کیفیت تھی کہ مقابر بالآخر کھنڈر ہوں گے، ریت میں ریت ہوں گے لیکن یہ جو ناواقف روشنی ہے یونہی دبے پاؤں چلتی رہے گی۔

ایک بڑے مستطیل شکل کے فانوس زدہ بلند ہال میں پہلو بہ پہلو نوابین کی قبریں نواب فلاں —— نواب —— ڈسٹ ٹو ڈسٹ اینڈ ایشز ٹو ایشز اور اینڈ رزلٹ کیا اور اینڈ رزلٹ میں —— اُس شاہی تدفین گاہ کے آخر میں ایک قبر کی جگہ خالی تھی... کھدی ہوئی تھی صرف سنگِ مرمر کی سِل اُٹھا کر مناسب نواب کو اس کے اندر رکھنا تھا پھر ڈھک دینا تھا... مٹی مٹی میں اور راکھ —— راکھ میں۔

"بمن یا — یہ اخیر ہے بندے کا —" کالیا بڑبڑایا تھا اُس شاہی مدفن کی خاموشی میں اور قدرے آزردہ تھا کہ اُس کا برادر عزیز کُتا ہونے کے شبہے میں باہر ہی روک لیا گیا تھا۔ اس شاہی قبرستان کو صرف وی آئی پیز اور مقامی اعلیٰ حکام یا غیر ملکی ہی دیکھ سکتے تھے کہ شاہی خاندان کی خواتین کے مقابر کو نامحرموں کی نظروں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی... البتہ ان کی تصاویر غیر ملکی جرائد میں بے خطر چھپ سکتی تھیں۔ یوں بھی ایک بیگم صاحبہ... متعدد میں سے ایک غیر ملکی تھیں اور وصیت کے مطابق یعنی اپنی وصیت کے مطابق اپنے محبوب خاوند کے قدموں میں یوں خوابیدہ تھیں کہ اُن پر ایک مغربی طرز کا شاندار سنگ مرمر مقبرہ جالیوں سمیت بوجھ ہو رہا تھا۔

انہوں نے ایک کُتورے اور ایک انسان نے — ان مقابر کو اُس نا واقف روشنی کے اندر فنا کی نیلی ٹائلوں، سنگ مرمر کی محرابوں اور جالیوں کی کشتیوں میں آہستہ آہستہ ڈوبتے دیکھا تھا...

کالیا کچے بازار کے بھید میں ریت پر قدم گھسیٹتا چلتا تھا اور وہاں روشنی تا دیر ٹھہر کر دم توڑ چکی تھی اور اسی لئے اندھیرا تھا...

کل صبح تک وہ اپنی کوٹھڑی میں تھا۔

کہنے کو تو یہ جیل کی کوٹھڑی تھی لیکن اس میں وہ تمامتر آسائشیں تھیں جو کسی فائیو سٹار ہوٹل میں میسر ہو سکتی تھیں۔ کالیے کے ایک دوست نے ایک عمر یورپ میں گذار دی اور بالآخر اپنی تمامتر دولت سمیٹ کر پاکستان واپس آ گیا — کیوں؟ — اس لئے کہ پاکستان وہ واحد ملک تھا جس میں اگر آپ کے پاس پیسہ ہو تو ہر آپ چیز خرید سکتے تھے — انصاف بھی — بیسٹ کنٹری اِن دے ورلڈ مائنڈ یو... بی پاکستانی اینڈ بائی پاکستانی — وہاں اُس کو کوٹھڑی میں اسے تلی ہوئی ٹراؤٹ مچھلی اور ٹارٹر ساس کے ہمراہ سفید فرانسیسی وائن بھی مہیا ہو سکتی تھی اگر وہ خواہش کرتا تو — لیکن... ہمیشہ فرق رہتا ہے ایک پُر آسائش جیل کی کوٹھڑی میں اور کسی پس ماندہ گاؤں کے ایک کچے مکان میں... آزادی کا۔ بیل آؤٹ ہوتے ہی وہ واپس اسلام آباد نہیں گیا تھا بلکہ اس شہر سے نظریں چراتا ایک کرائے کی کار میں سیدھا لاہور پہنچا تھا اور آدھی رات کے وقت پہنچا تھا اور سات کمروں والی کوٹھی کے اندر پہنچا تھا... تھوڑی سی شرمندگی کہ کیسے وقت آ گیا ہوں اور کچھ نجات

مشاہد آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا اور پس منظر میں برگیتا کی آواز — احتیاط کرنا مشیل... پتہ نہیں کون ہے۔

"زاہد؟... مشاہد اُس کی شرمندگی سے لطف اندوز ہوتا آگے آیا اور وہ اتنے عرصے کے بعد اسے دیکھ کر جی جان سے خوش ہوا "اوئے تم؟"

"میں اور — برادر عزیز" کالیے نے جھک کر اپنے بوٹ چاٹتے کُتورے کو کانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور مشاہد کے سامنے کر دیا" ہم دونوں صبح تک تمہارے مہمان ہیں اور پھر چولستان چلیں گے... جیل کے بعد صحرا بہت ضروری ہو جاتا ہے —"

"اگر ناگوار نہ گذرے تو میں بھی تمہارے ساتھ جانا پسند کروں گا —"

برگیتا کی آواز پھر آئی — اور مجھے نہ بھولنا زاہد —

"آہو —" کالیے نے خوش ہو کر کہا "تو میں آیا کس لئے ہوں — تم دونوں کے لئے... جیل تو تمہارے بغیر مجبوری تھی، صحرا تو نہیں"

"اندر آ جاؤ — اور میں نے رنجیت سنگھ کی پوتی پرنس بمباں سدرلینڈ کی قبر تلاش کر لی ہے..."

"ہیں —" کالیا یکدم حواس باختہ ہو گیا اور بہت ہو گیا "اوئے پُت پینڈو، ابھی تو میں جیل سے نکلا ہوں اور ابھی تم مجھ سے ایسے قاتل قسم کے مذاق کرتے ہو —"

"نہیں میں مذاق نہیں کرتا — وہ یہیں لاہور میں دفن ہے ایک کرسچین گریویارڈ میں، پنجاب کی واحد ڈاؤن ٹو ارتھ شہزادی — پرنس بمباں سدرلینڈ — لیکن ابھی تم آؤ"

"صرف میں نہیں، میرا برادر عزیز بھی"

مشاہد نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ پتہ نہیں وہ ابھی تک نیند میں تھا اور شائد وہ نیند میں پنجاب کی رانی کی قبر کہیں دیکھ آیا تھا۔

بمن یا کسٹم سپرانٹنڈنٹ مال بھی کھا گیا اور اُس کے مال کو پکڑ بھی لیا۔ کیا جواب دیں گے یہ لوگ روزِ قیامت — اور بے شرم شخص جیل میں ملاقات کے لئے بھی آ گیا اور کالیے اوپر سے سخت آرڈر تھا، مجبوری تھی... معافی دے دو — بمن یا معافی تو میں تمہیں باہر آ کر دوں گا۔ جب تمہارے بمن یا پورے خاندان کو لنڈن ویکیشن کے ریٹرن ٹکٹ کے ہمراہ شاپنگ پونڈ نہیں ملیں گے اور تمہاری بیٹی کو بی ایم ڈبلیو کا تازہ ماڈل نہیں

ملے گا اور جب پی ایم ہاؤس سے تمہارے اگلے گریڈ کا آرڈر نہیں نکلے گا تب میں تمہیں
تمہیں معافی دوں گا... یا پھر قیامت کے روز تم سے پچھ پڑتیت ہو گی کہ مال بھی کھا گئے اور
مال پکڑ بھی لیا... کوئی خدا کا خوف ہی نہیں رہا لوگوں کے دلوں میں...

اُس کے کانوں میں صحرا کی بے حرمتی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جنریٹر کی بے تکی اور بے ڈھب آواز۔

میرا خیال ہے برادر عزیز تھک گیا ہے، اُس نے جھک کر کُتورے کو دیکھا جو ایک کان کھڑا کر کے "وَف" کرنے کے انتظار میں تھا اور جونہی اُس نے تھکاوٹ کا ایک "وَف" کیا، کالیے نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور واپس کیمپ کی جانب چلنے لگا۔ کُتورا اب نام کا ہی کُتورا تھا وہ تقریباً ایک کُتا ہو چلا تھا — راستے کا تعین صرف جنریٹر کے بے ہنگم شور سے ہوتا تھا۔

وہ نُور جو صرف کوہِ طور کی ایک جھاڑی میں سے ظاہر ہوتا تھا یہاں پورے صحرا پر اُترتا تھا اور قلعہ ڈیراور کے کچے اہراموں، مسجد کے شکستہ جالی دار جھروکے پر جہاں سے بازار کی کھنڈر خوش نمائی جھلکتی تھی وہاں — اور قلعے کے اندر جہاں مقامی داستانوں کے مطابق ایک بھیڑ اُس درخت تلے جو اب بھی موجود ہے بھیڑیوں سے محفوظ رہی تھی وہاں — شاید زیر زمین اُن کمروں میں بھی جن پر پورے صحرا کا بوجھ تھا اور جہاں صرف ایک روشندان میں سے روشنی نیچے آتی تھی اور اُن کچے کمروں میں یوں پھیلتی تھی کہ یہاں بھی حیران کرتی تھی کہ کیا سورج کی کرنیں اتنی غیر معمولی، اتنی محیرالعقول اور غیر قدرتی ہو سکتی ہیں — یہاں بھی کوہِ طور کا نور اُترتا تھا...

وہ جب سیڑھیاں اُتر کر ایک نابینا کی طرح ہاتھ پھیلائے ان زیر زمین گرتے اور مخدوش حالتوں والے کسی بھی لمحے اُس پر بوجھ ہو کر ملیامیٹ کر دینے والے زندہ درگور کمروں میں گیا تھا تو وہاں ایک ٹھنڈک اور ایک پرائیویسی تھی — اُس نے اُن لوگوں کی قسمتوں پر رشک کیا جو بجلی کی آمد سے پہلے اس صحرا میں — یہاں قلعہ ڈیراور کے نیچے تہہ خانوں میں — مکمل آسائشوں کے ساتھ — اپنے عشق کے ساتھ شب بسر کرتے تھے — وچ روہی دے راہندیاں... اُس نے رشک کیا... قلعے کے چٹیل دُھول آلود میدان پر ایک چھوٹا سا کمرہ نما روشندان نمایاں تھا، زمزمہ توپوں کے قریب، پھانسی گھر سے ذرا پرے، نیچے بہت نیچے اُس کی روشنی ایک شہتیر کی صورت اندھیرے میں گرتی تھی — اس

کے اردگرد وہ پوشیدہ کمرے تھے جن میں... کسی نے اپنے عشق کو برہنہ دیکھا ہو تاریکی اور ناواقف روشنی میں دیکھا ہو گا — اس نے رشک کیا... اور قدم گھسیٹتا ی جانب چلتا رہا۔

گاؤں ڈیراور کی ریت گلی کے آس پاس چند کچے کوٹھے تھے اور جو ڈھے چکے تھے مویشی بندھے تھے اور اُن میں کہیں ایک اونٹ شاید جان بوجھ کر ایک خاص وقفے گردن ہلا دیتا تھا کہ اُس کے گلے سے لٹکتی گھنٹیوں کی آواز خود اُسے ہی مسحور کرتی ب بھی تاریکی میں سفر کرتی یہ آواز ان تک پہنچتی کُتورا جو اب کالیے کی گود میں ریت پر استراحت فرما رہا تھا ایک کان اُٹھا کر اسے بغور اور مکمل سنجیدگی سے

الٰہی روشنیوں میں بھیگے رنگ بدلتے شاہی مقابر اب تاریکی میں روپوش ہو چکے

اُن سے پرے — صحرا کے بیچ چند بلب جیسے تاریکی میں معلق ہوں بجھی ہوئی ٹنی پھیلا رہے تھے اور اُن کی روشنی سے بڑھ کر جنریٹر کا شور تھا جو صحرا کے سکون ریزہ کر رہا تھا — جھاڑیوں میں سے کالیے کے قدموں کی چاپ سن کر پرندے تھے — اُڑتے تھے یا اُڈاری مار کر ذرا آگے تاریکی کی عافیت میں جا بیٹھتے تھے اور کے قدموں میں آہٹیں تھیں، کُربل کُربل کی آوازیں — جو شاید چوہے تھے، ریاں تھیں جو آہٹ سے سر نکالتی تھیں اور اِدھر اُدھر ہو جاتی تھیں...

صحرا میں جیسے بارات اُتر آئی تھی۔

خیمے، قناطیں، جنریٹر، سوزوکی وینیں، سامان کے انبار۔

کھدر کے کُرتوں اور تہمدوں میں اور سر پر بیٹھی ہوئی پگڑیوں میں سر جھکائے ے اِدھر اُدھر ہوتے لوگ — جیسے وہ بھی صحرا کی چپ میں یکدم آہٹیں سن کر ے نکل آئے تھے اور اب گلہریوں کی طرح ادھر ادھر ہوتے تھے۔

یک ٹریکٹر ٹرالی سے ایک عالی شان ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں اُتاری جا رہی تھیں۔

ں شاہی بندو بست سے الگ ذرا فاصلے پر الاؤ روشن تھے جن پر چولستانی بکروں کے ٹ ہلا رہے تھے۔

فلش سسٹم کا بھی بندوبست ہو چکا تھا۔

"یہ کس بہن یا نے ایسا پاگل خانہ بندوبست کیا ہے —" کالیا بڑبڑایا اور ا
بڑبڑاہٹ سے کُتورے نے اندازہ لگا لیا کہ مالک غصّے میں ہے — زاہد کالیا
حس جمال رکھتا تھا اور اسی کمیاب حس کی وجہ سے کسی بھی قدیم شے کے سامنے آ
جان جاتا تھا کہ وہ کیا ہے اور اُس پر قربان ہوتا تھا' وہ اگر ان اشیاء کی سمگلنگ کرتا تھا
بھاری دل کے ساتھ۔ کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ وہ ایئرپورٹ پر اپنے کونیکشن کو فون کرکے
پر لوڈ ہوتی کنسائنمنٹ رکوا لیتا کہ اُسے رات کے کسی پہر خیال آ جاتا کہ اُس جاپا
کنسائنمنٹ میں بدھا کا ایک ایسا ہیڈ جا رہا ہے جسے اگر ایک خاصی روشنی میں دیکھا جا
اُس کی آنکھیں زندہ لگنے لگتی ہیں' تمہاری طرف دیکھتی ہیں اور کالیا اس کی
برداشت نہ کرپاتا اور اپنے کرم فرما کسٹم سُپر سے کہتا' یار ابھی نہیں — پوری لا
سے وہ ہیڈ نکال کر گھر لے آتا اور اُس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہتا — اوئے تر
تمہیں جانے دیتا تھا جاپان — چنانچہ کالیے نے اس وسیع پُر آسائش بندوبست کو بھی
کیا جو اُس کے مقامی کونیکشن نے آرگنائز کیا تھا — یہاں سے ہندوستان کا بار
نزدیک تھا اور کالیا کبھی کبھار منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اُن علاقوں سے بھی مستفید
تھا۔

کھدر کی بڑی پگڑی والا جھکا ہوا ایک اور سر ٹھہری ہوئی تاریکی میں سے نکل
کے پاس آ گیا "سائیں میں اللہ دوایا نمبردار ہوں —"

"یہ تمہارا بندوبست ہے؟"

"سائیں —" اللہ دوایا دوہرا ہو گیا۔

"بہن یا یہ کیا بندوبست ہے؟"

اللہ دوایا فیصلہ نہ کر سکا کہ عباسی صاحب کے حکم کے مطابق اس نے قلعہ د
کے سائے میں جو شاندار ڈیرے لگائے ہیں اُن سے سائیں خوش ہیں یا ناخوش!
"سائیں یزمان سے ڈیننگ ٹیبل آیا ہے' اور جنریٹر تو ملتان سے منگایا ہے اور ادھر ا
شرقیہ سے سینٹری فٹنگ کے لئے مستری دین پناہ کو حاضر کیا ہے۔ سائیں ٹینکی ایسی
ہے کہ بٹن دباؤ تو فرفر پانی فلش میں بہتا ہے — بیٹھ کر دیکھو سائیں —"

کالیے نے اللہ دوائے کو زیر لب جو کچھ کہا وہ کسی کے بھی سننے کے لائق

اس بھونکتے ہوئے جنریٹر کو بند کرو — موم بتیاں ہیں؟"

"موم بتیاں؟" اللہ دوایا پریشان ہو گیا "سائیں بلب جلتے ہیں۔"

"جنریٹر سوچ آف کر دو اور — یہ جو قالین بچھا رکھے ہیں اور اُن پر قطار اندر
یاں لگی ہیں انہیں اُٹھاؤ اور ان قناطوں اور خیموں سے کم از کم ایک ہزار گز پرے
لے جاؤ"

"حکم سائیں —" وہ پھر دوہرا ہوا اور اپنے چہرے پر ناپسندیدگی کو یوں نہ چھپایا کہ
یں سائیں دیکھ تو نہیں سکتا تھا۔

یکدم بلب ٹمٹما کر بجھ گئے۔ جنریٹر کی مشینی گڑگڑاہٹ رُکی اور ایک سکوت اُترا۔
گئی اور اس کے ساتھ گیارہویں کے چاند کی ہلکی روشنی بھی بے آواز آئی۔

"بہن یا یہ بات ہوئی ناں — کیوں برادر عزیز؟" اس نے کُتورے کے کان میں
ی اور جھک کر کی اور پھر گویا اندھیرے سے گویا ہوا "اوئے مشاہدی — اوئے پُت
ل ہو؟" وہ آس پاس بیٹھے لوگوں کے قریب ہو کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگا لیکن
یا تھا کہ ہلکی چاندنی کے باوجود ابھی کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا کہ آنکھیں عادی نہیں
تھیں۔

"سائیں —" اگر اندھیرے میں سایہ چل سکتا ہے تو اللہ دوایا ایک سائے کی
آ گیا "سائیں صاحب اور میم صاحب اندر گئے ہیں"

"اندر؟"

"اُدھر چولستان کے اندر سائیں — جدھر جھاڑیاں اور نرم ریت ہے"

"یہ باز نہیں آتا مشاہدی کا بچہ —" کالیا ایک کرسی پر براجمان ہو گیا "جھاڑیاں
ریت"

ایک وسیع تاریکی میں اُس کے عین سامنے کچھ ٹمٹماہٹ سی نظر آئی۔ روشنی کی
لیر لہرائی جیسے بجلی کی پوشیدہ سی رلشک ہو۔ پھر روشنی تیز ہو کر کسی جیپ کی
یٹس میں بدل گئی۔

"یہ کون ہے؟"

"ساجد قریشی صاحب اُدھر بارڈر کے قریب ایک گوپے کی طرف گئے تھے سائیں
بلانے والوں کو لینے —"

"ہیں؟" کالیا بہت راضی ہوا" بن یا صحرا میں مُجرا ہو گا؟"

"ہو گا جی اللہ کے فضل سے ہو گا —" نمبردار دانائی سے سر ہلانے لگا۔

جیپ قریب آ گئی اور اُس کی ہیڈ لائٹس کالیے کی آنکھوں کو چندھیانے کے فوراً گل ہو گئیں۔ چند سائے اُترے اور سامنے ریت پر بیٹھ گئے۔

نہ اُن کی عمر نہ اُن کی جنس اور نہ اُن کی شکل کا پتہ چلتا تھا۔

وہ اپنے ساز درست کرنے لگے، سر جھکائے تاریکی میں، صرف ہلکی چاندنی م کی موجودگی برقرار نظر آتی تھی۔ وہ ایک گروہ کی شکل میں نہ دکھائی دیتے تھے اور نہ میں ربط رکھتے تھے، سب الگ الگ اکائیاں تھے اور اپنے آپ سے کام رکھتے تھے میں بات بھی نہیں کرتے تھے، اُن کے سازوں کی آوازیں بہت دیر کے بعد فطرت الگ ہوتی تھیں، جھاڑیوں میں سرسراہٹ سے چلتی ہوا کے ساتھ، جو پرندے ادھر دکھتے نہ تھے لیکن اُڑتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے اُن کی پرواز کی ردھم کے ساتھ اور کی خاموشی کے ساتھ اُن کے سازوں کی لَے ہم آہنگ ہو کر بلند ہوتی تھی۔

"قربان —" کالیے نے اپنی ہپ فلاسک کا پہلی بار استعمال کیا اور ایک طمانیت اور خواہش بھرے گھونٹ سے کہا "بسم اللہ —" اُس نے ہاتھ لہرا کر موسیقارو گویا اِذنِ گویائی دیا۔ لیکن موسیقار اُس کی جانب دیکھ ہی نہیں رہے تھے، اپنے سازوں دِلوں پر جھکے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر کچھ اور سکوت رہا۔ یہ مکمل سکوت تو نہ تھا کہ اس میں صحرا کی اور ڈھکی ہوئی نامعلوم آوازیں تھیں، آگ کی سرسراہٹ تھی جس پر پکوان پکتے تھے کانوں کی سائیں سائیں بھی تھی جو ہر خاموشی پر حاوی ہو جانے کی قدرت رکھتی ہے ریت پر رُکی ہوئی اُن کے سازوں کی دھنیں ایک ایک الگ الگ لَے میں بلند ہو لگیں۔

"بسم اللہ —" کالیے نے ایک طویل گھونٹ بھر کر اپنے آپ کو شتابی سے کرنے کی کوشش کی... الگ الگ لَے — صحرا میں — جو صحرا میں اور اس کے ا پوشیدہ اور مقیم تھے اُن کی سرسراہٹوں میں یہ لَے بلند ہونے لگی۔

"آپ کدھر چلے گئے تھے —" آواز برگیتا کی تھی اور کدھر سے آئی تھی اس تعین کالیا بالکل نہ کر سکا اور وہ اپنی چوری پر پکڑے جانے والے ایک بچے کی مانند ذرا

شرمندہ محسوس کرتا ہوا ادھر ادھر اندھیرے کو دیکھنے لگا۔

"ادھر —" برگیتا کی آواز پھر آئی۔

مشاہد ہنسا اور اُس کی ہنسی تو وہ پہچانتا تھا۔ یہ بھی قریب ہی تھی اور برگیتا بھی قریب تھی۔

"ہیلو زاہد —" مشاہد اُٹھا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"تم دونوں کہاں دفع ہو گئے تھے اوئے —"

"ہم یہی سوال تم سے پوچھ سکتے ہیں —" آہستہ آہستہ تاریکی میں برگیتا کی سیاہ کا شائبہ نظر آنے لگا۔

"میں اور برادر عزیز وہ روشنی دیکھنے گئے تھے جو جذب ہو چکی تھی اور پھر سے ے رہی تھی..."

"برادر عزیز؟"

"یہیں کہیں تھا —" کالیا جھکا۔ آس پاس دیکھنے کی کوشش کی۔ کُتورا چولستان ب یہیں کہیں تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا "اور تم کہاں تھے؟"

"یہیں —"

"جھاڑیوں میں اور نرم ریت پر —" وہ برگیتا کا بہت احترام کرتا تھا اور اسی لئے ی آواز میں کوئی معنی خیزی یا رمزیت نہ تھی۔

"ہاں —" یکدم برگیتا ہنسی "زبردست — جیسے ریت تمہارے بدن کے نیچے کتی ہے — زبردست —"

"سائیں بات کروں؟" اللہ دوایا پھر حاضر ہو کر دوہرا ہو چکا تھا... اس کی آواز میں ت جنریٹر کو بند کرا دینے کی ناپسندیدگی تھی "کراچی والے مہمان سٹیشن پر اُتر چکے ہیں ھ گھنٹے میں ادھر آ جائیں گے... جیپ بہاولپور سٹیشن کے باہر انتظار کرتی ہے سائیں ادھر جو ڈاکٹر صاحب مہمان آ رہے ہیں دوسری طرف سے تو اُن کی گاڑی لیٹ ابعد میں پہنچیں گے۔"

"ٹھیک ہے — یہ ڈاکٹر بڈھا شیر ہمیشہ دیر کر دیتا ہے — شادی بھی دیر سے ے اور... پتہ نہیں اُس نے ابھی تک کوئی کام دکھایا ہے یا نہیں — اُس کے اندر مطلب ہے اُس کی بیوی کے اندر کچھ ٹھہرا ہے کہ نہیں —"

برگیتا نے سُنا اور چپ رہی —

صحرا کی رات میں یہی آسانیاں تھیں کہ آپ سنتے ہیں اور چپ رہتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ آپ کا ردِ عمل کیا ہے.... برگیتا کو بھی دن رات یہی طعنے سننے کو ملتے تھے باجیوں سے خاص طور پر..... ہائے ہائے..... چوہدری اللہ داد کا بیٹا مشاہد — اور ہائے ہائے بے اولاد — کچھ دیر بعد کالیا جان گیا کہ اس نے ایک بلنڈر کیا ہے یہ کہہ کر کہ پتہ نہیں اُس کی بیوی کے اندر کچھ ٹھہرا ہے کہ نہیں — لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی برگیتا کے علاوہ مشاہد ہی بھی تو..... بات دونوں طرف جا سکتی تھی — کٹس بوتھ ویز —

"سائیں کھانا سب لوگ مل جل کر کھائیں گے یا یہیں آپ کے سامنے لگا دیں۔ ویسے ادھر چلیں تو سبحان اللہ یزمان سے ڈیننگ ٹیبل منگائی ہے اور دو چولستانی بکرے بھون لئے ہیں سارے کے سارے"

"بھن یا تمہیں کھانے کی پڑی ہے — "کالیا بے حد خفا ہوا "ذرا ان کی تو سنو یہ کیا کہہ رہے ہیں —"

نمبردار بھی بے حد خفا ہوا اور پیچھے ہو کر کڑھنے لگا کہ یہ کیسے مہمان آ گئے ہیں۔

"یہ — میوزیشنز کیا کہہ رہے ہیں زاہد — "برگیتا نے ہچکی بھر کر پوچھا "پلیز — میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا —"

"میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا بھرجائی — "کالیا خوشدلی سے ہنسا "لیکن اب غور کرتا ہوں ایک اور سِپ کے بعد غور کرتا ہوں" اُس نے ہپ فلاسک کو منہ لگا کر اُس کا پیندا اُونچا کیا، وہ خالی ہو چکی تھی "بھن یا یہ بھی صحرا ہو گئی ہے — "اُس نے فلاسک کو گھما کر ادھر پھینکا اور چند پرندے اُڑے

جدھر سے ابھی ابھی مشاہد اور برگیتا آئے تھے۔

چاندنی کا طلسم مکمل ہونے میں ابھی تین راتیں باقی تھیں اور اس کے باوجود ہر شے، ہر شے اگر خواہش شدید ہو تو الگ الگ دکھائی دے سکتی تھی — ریت پر بیٹھے ہوئے — یا شاید وہ اُس میں سے اُگے ہوئے تھے اور سدا سے وہیں تھے، انہی حالتوں میں اور وہ اپنی ریت سے جُدا ہونے پر قادر ہی نہیں تھے، اپنے آپ میں الگ الگ مگن — گاتے تھے۔

وِچ روہی دے رہندیاں نازک ناز دیاں جٹیاں

راتیں کرن شکار دِلاں دے ڈینھاں دلوڑن مُیاں
گھبرڑے تیر چلاون کاری سے سے ہٹیاں
کر کر درد منداں کُوں زخمی ہے ہے بدھن نہ پٹیاں

"واہ جی واہ — "کالیا بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا اور یوں داد دینے لگا جیسے اُس کے نے سیکٹر 10 والی تینوں رقاصائیں ناچتی ہوئی اُس کے قریب اتنے قریب آ گئی ہیں کہ وہ کے بدن کی رضامند باس سونگھ سکتا ہے "نازک ناز دیاں جٹیاں — چوہدری مشاہد یہ رے قبیلے کا تذکرہ ہے... قربان — "اس نے جیب میں سے چند نوٹ نکال کر گویّوں پر ور کر دیئے۔

ذیراور کے افق پر کچھ روشنی ہوئی جو شاہی قبرستان کے نیلے گنبدوں پر رُکتی ایک ری کو منور کرنے لگی — روشنی کے آگے ہلکی چاندنی مزید پھیکی پڑتے ہوئے پسپا ہو

جیپ میں سے ایک تھکی ہوئی پژمردہ شوبھا اُتری اور جب اُتری تو اپنے پاؤں ریت دھنستے ہوئے ذرا حیران ہوئی "ہیلو چاچا مشاہد — آپ یہیں کہیں ہو؟" اُس نے فون پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر تاریکی میں آباد اس بستی کے مکینوں میں سے مشاہد کو پہچاننے سعی کی۔ اُس نے مشاہد کی موجودگی کو تب جانا جب اس کے رخساروں پر اُس کے ٹ اسے پیار کرتے تھے — اور فوراً ہی اب موٹے ہونٹوں کی بجائے ایسے ہونٹ اس چہرے پر آئے جن کو وہ محبت سے پہچانتی تھی "ہاؤ آر یُو شوبھا؟" برگیتا نے پوچھا۔

"ایک آرڈر آف دے ڈے پہنچا چاچی برگیتا... فون پر... فوراً بہاولپور پہنچو — اور مردان جیسے تیار بیٹھے تھے — میں آغا خان سے واپس آئی تو بیرک کے برآمدے میں ے تھے — شوبھا تم صحرا دیکھو گی؟" — صحرا کہاں ہے چاچی؟" اس نے اندھیرے سے ے دیکھنے کی کوشش کی۔

"ادھر ہی ہے — تم اسے دیکھ لو گی — ابھی تمہاری آنکھیں عادی ہوں گی اور اسے دیکھ لو گی —"

"کیا میں بھی اپنا تعارف کروا سکتا ہوں؟" مردان میں بھی اتنی ہی تھکاوٹ تھی۔ چراب اُس کا پاؤں گھسٹتا نہیں تھا۔ دسمبر گذر چکا تھا — اس کے باوجود اس میں ارت تھی۔

مشاہد نے اسے بازوؤں میں لیا اور اُس کا ماتھا چوما اور ریت کے کچھ ذرے اِس ہونٹوں میں آ گئے تھے "بس یہی بہانے ہوتے ہیں ملنے کے... تھینک یُو فار کمنگ ہ — تم کیسی ہو شوبھا؟"

"نو شوٹنگ — نو سٹرے بلٹس — نو بومب بلاسٹس اور نو ایم کیو ایم اور نو پ پختون اتحاد... میں کس دنیا میں آ گئی ہوں چاچا مشاہد —"

"آپ سب جس دنیا میں بھی ہیں — یہ چولستانی موسیقار حضرت انتظار کر رہ ہیں کہ کب تم اپنے بڑے بڑے مُنہ بند کرو اور یہ — کچھ سنائیں — اجازت ہے؟" ک کہیں دور سے بولا اور اِس دخل اندازی پر بہت ناراض ہوا۔

"شوبھا اور مردان آئے ہیں —" مشاہد نے پکارا۔

"ہیں؟" کالیا بھاگا آیا "اوئے ہوئے شوبھا بیٹی کے ساتھ تو پہلی بار ملاقات ہو رہ ہے... واہ واہ... بھئی دراصل..." اُس نے جلدی جلدی جیبوں کو ٹٹولا "اوئے ہوئے م اپنی بیٹی کو پہلی بار ملنے کی خوشی میں — کچھ دینا چاہتا تھا لیکن — سارے بہن یا نوٹ سوری جی — سارے نوٹ میں نے ان گویّوں پر نچھاور کر دیئے ہیں —" کالیا یقیناً ایک اور ہِپ فلاسک ڈیک چکا تھا "تو پھر شوبھا بیٹی ادھار رہا — ٹھیک ہے؟"

"دیٹ اِز اے ڈیل انکل زاہد —" شوبھا نے ہاتھ آگے کیا اور کالیا جھجک گیا پھر ہاتھ ملا کر کہنے لگا "بالکل ڈیل ہے بھئی —"

"ادھر میں ہوں" مردان بولا۔

"آہو —" کالیا پھر شرمندہ ہوا اور پھر خوب زور زور سے گلے ملا... "اب اجازت ہے؟"

"ہاں ہاں —" سب نے اجازت دے دی۔

"یہ کیا گا رہے ہیں؟" شوبھا کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"غور سے سنو شوبھا — مردان نے اُس کا ہاتھ تھام لیا "اس کلام میں بھی ٹیگور اور نذرل کی مٹھاس ہے — سنو"

وِچ روہی دے رہندیاں نازک ناز دیاں جٹیاں

ستار نقوی کا چہرہ ایک منجمد سبزی کی طرح تھا۔ بہت مدت سے فریزر میں جما ہوا اور سبز اور جیسے اُس پر کائی اُگنے کو ہو۔

حرا کی رات میں کچھ اور وقت سایوں کی طرح گذرا اور پھر ڈیرا اور کی جانب سے ہیڈ لائٹ کچے کھنڈروں پر سفر کرتی ہوئی ان کی آنکھوں میں چھید کرنے لگی۔

اور اس جیپ میں سے ایک بیزار اور نڈھال ڈاکٹر ارشد احمد اُترا جو آج صبح معمول اپنی سختی سے پردے کی پابند بیگم کے ساتھ ایک قانونی عمل کے بعد ہسپتال تو وہاں ایک ٹیلی فونک پیغام تھا کہ — زاہد کالیے اور مشاہد علی کی یہ خواہش ہے کہ فوری طور پر... آج ہی...

اُسے قطعی طور بہاولپور دیکھنے کی — یا چولستان میں رات بسر کرنے کی خواہش نہ بلکہ اس کے نزدیک یہ وقت کا ضیاع تھا۔ ایک ہی مقام تھا جہاں وقت کی قیمت تھی... چار چیزوں میں سے ایک — دریائے سوات کے کنارے سلیٹی منظر ہیں، وے ہوٹل کے قریب۔

"بسم اللہ —" کالیا استقبال کے لیے اٹھا اور بمشکل اٹھا اس لیے کہ ہِپ فلاسک ایک تو نہ تھی متعدد تھیں جو اس کے بریف کیس میں بُرے وقتوں سے نبرد آزما نے کے لیے موجود تھیں۔ "اوئے بڈھے شیر بھرجائی کہاں ہے؟"

"وہ نہیں — آئی"

"کیوں؟"

"تم سب نامحرم ہو —"

"بہرحال کورم پورا ہو گیا ہے — ہاں جی شروع کریں اب کوئی نہیں کوئی نہیں گا — بسم اللہ"... اُس نے جھکے... جیسے اُن کی ریڑھ کی ہڈی ہمیشہ کے لیے قوس ہو گئی — جھکے ہوئے موسیقاروں کو کہا — وہ بالکل خاموش تو نہیں ہوئے تھے آہستہ اور لے میں منتظر تھے کہ نئے مہمان کی آؤ بھگت مکمل ہو تو وہ پھر سے اپنا آہنگ بلند تا۔

وِچ روہی دے رہندیاں...

عین قدموں کے قریب سے — قدم جو ریت میں دھنستے تھے ایک آواز بلند ہوئی ..."

"اوئے —" کالیا اندھیرے میں جھکا "اوئے برادر عزیز تو کدھر چلا گیا تھا۔"

"وُف —" برادر عزیز نے خوشی کا اظہار کیا۔ وہ جہاں کہیں بھی چلا گیا تھا واپس

آجانے پر بہت خوش تھا۔

نہ وہ دکھائی دیتے تھے جو بجاتے تھے، نہ ان کی گود میں ایک بچے کی طرح پوشیدہ ساز نظر آتے تھے جن پر وہ جھکے ہوئے تھے — چاند کی جو لَو تھی اس میں وہ ایسے مجسّ تھے جو ابھی ابھی مکمل ہوئے تھے اور شائبہ یہی ہوتا تھا کہ وہ حرکت کرنے لگیں گے۔ ا میں سے کسی ایک کا اِکتارہ خاموشی کو توڑتا تھا۔ اُس کی دُکھی تاؤں تاؤں — لگتا تھا کہ یہ کی چیل ہے۔ ڈار سے بچھڑی کونج ہے جو کُرلاتی ہے۔

"ارشد —" مشاہد نے بہت آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور ایسے بولا کہ اُس کی آواز صرف اُس تک پہنچتی اور دم توڑ جاتی تھی "تھینک یُو فار کمنگ —"

"ہاں —" برگیتا نے اپنا ہاتھ مشاہد کے کندھے پر رکھا اور اُس کی گرمی ارشد تک بھی پہنچی اُس ہاتھ کے راستے جو مشاہد کا تھا اور اب اس کے بازو پر آرام کرتا تھا "لیکن تمہیں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لانا چاہیے تھا۔"

"وہ ایک شٹل کاک برقعے میں مدفون یہاں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی کیا لگتی — برگیتا وہ تو میرے سامنے، عین سامنے بیٹھنے سے بھی گریز کرتی ہے اور کئی بار — اور یہ زیبِ داستان نہیں ہے — میں کئی بار اسے اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہوں کہ یہ کون ہے —"

"یُو ڈونٹ مین اِٹ —"

"اس اندھیرے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ انسان اپنی بے بسی اور بے یقینی پر کڑواہٹ سے مسکرائے تو بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا —"

"آئی ایم سوری ارشد —"

آ چنوں رَل یار   پیلوں پکیاں نی وے

صحرا کی ٹھنڈک اُترنے لگی تھی اور ان کے بدن ایک پُر لطف مزاج کی ٹھنڈک سے آشنا ہوتے تھے۔

شوبھا ابھی تک کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہر اس شے کو گھورتی جو ذرا حرکت کرتی — "بابا — آپ کہاں ہیں؟"

مردان اٹھا اور اس کے برابر میں آ بیٹھا "ادھر — شوبھا.... میں ادھر ہوں"

"آپ میرا ہاتھ تھام لیں — مجھے ڈر لگتا ہے —"

"فکر نہ کرو میری جان — میں تمہارے ساتھ ہوں — تمہارا بابا —" مردان مضبوطی سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کبھی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی — کبھی بھی.... نہ کرفیوز سے۔ نہ لوٹ مار نہ لی سے اور خون جو فٹ پاتھوں بس شاپوں اور مسجدوں میں بہتا تھا اور جمتا تھا نہ اُس — وہ کبھی نہیں خوفزدہ ہوئی تھی لیکن ایک ہی دن میں ذر اُس کے وجود میں آئیوی کی طرح جڑیں پکڑ گیا تھا۔ جو دیواریں ایک ایک اینٹ کر کے اندر اپنے دفاع کے لیے تعمیر جاتی ہیں اگر اُن ... کا پلستر نہ کیا جائے تو ذر کی آئیوی کے لیے پنجے گاڑنا مشکل ہوتا — وہ تو ... بھی نہیں گئی تھی۔ لیکن بابا کہتے تھے آنٹی بابر کا وزن بہت زیادہ ر بہت دنوں تک اُن کے کندھے دُکھتے رہے تھے... آپا نازنین اور عارفین تدفین کے قُل کے دن، دسویں کے روز بھی نہایت اہتمام سے اپنے آپ کو چادروں میں پ کر سر جُھکائے بابا مردان کی ہر بات پر — بالکل جی — جی جی — شور شور اور انٹ — کہتی تھیں — افسوس کے لیے کس نے آنا تھا۔ محلے کی چند خواتین آ صرف اُس ناریل والے گھر کی ایک اندرونی جھلک دیکھنے کے لیے اور اُن کے افسوس کے کلمات پر اُن دونوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جواب میں کیا کہیں — وہ — ہاں — بالکل جی — تھینک یُو ایور سو مچ — ہی کہتی رہیں... بہت بعد میں انہوں نے للہ چالیسویں کے بعد جانا کہ کیا کہا جاتا ہے — بس اللہ کی مرضی — اور ایک ٹھنڈی ں کے ساتھ کہ بس جی سب نے جانا ہے — وہ ممی کی موت کی تفصیل بیان کرنے بھی قاصر تھیں۔ افسوس کے لیے آنے والی خواتین کا دوسرا فقرہ یہی ہوتا تھا کہ پھر — بیمار تھیں؟ — وہ عجیب ایک دن تھا۔ اُسے مُردوں نے کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔ میڈیکل سٹوڈنٹ عام طور پر اگر مُردوں کو دیکھنے چیرنے پھاڑنے سے اپ سیٹ نہ ہو تو جاتا تھا کہ اُسے مُردے تنگ نہیں کرتے — لیکن اُس دن وہ عجیب ایک دن تھا۔

ستار نقوی کیسے مُردہ ہو گیا۔ بیوقوفوں کی طرح منہ کھول کر سٹریچر پر لیٹ گیا اور یہ کرنے لگا کہ ہم سب اُسے مُردہ مان لیں۔

اور اُسی روز آنٹی بابر نے بھی اپنی ویٹنگ ہُرک دکھادی —

دسویں کی رسم کے فوراً بعد شوبھا اور مردان آنٹی بابر کے گھر سے نکلے —

زیب النسا سٹریٹ کے کونے سے آلو بخاروں کے سائز کے جامن کھائے اور پھر

شوبھا کی فوکسی چل بھئی چل..... وہ ملیر پہنچے، اپنی بیرک تک پہنچے تو بیٹ مین بشیر باہر برآمدے میں کھڑا پسینہ پونچھ رہا تھا "آپ کے مہمان آئے ہیں کپتان صاحب —"

اندر کین فرنیچر میں سر جھکائے عارفین اور نازنین —

"ہم ممی کے بغیر اُس گھر میں نہیں رہ سکتیں — ہمیں ڈر لگتا ہے"

وہ کبھی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی لیکن اب — ایک ہی دن میں — عجیب ایک دن تھا۔

کئی دُھپ وِچ وی چَندیاں رہندیاں
کئی چھنویرے پہندیاں
پیلو پکیاں نی وے

ریت کے ٹیلوں پر جو شفاف اور کٹیلی ہوا ہوتی ہے — جب رات ہوتی ہے اور ٹھنڈک کے گالے بدن کو چھونے لگتے ہیں اور صحرا کے چوہے اور خرگوش اور گلہریاں اور تمام رینگنے والے جانور اپنی موج میں ادھر سے ادھر جاتے ہیں تب اُس کھنکتی ریتلی ہوا میں سانس لیں تو وہ کیسے اُس ہوا سے الگ بہت جدا ہوتی ہے جو کراچی کی ایم اے جناح روڈ کے اوپر اور لاہور کی مال روڈ کے اوپر معلق دھوئیں اور آنکھوں میں مرچوں کی طرح چبھنے والی ہوا سے جُدا ہوتی ہے — مردان جانتا تھا کہ وہ ادھر آتا رہتا تھا — اِس جنگل بیابان میں حیران پریشان وہ آتا رہتا تھا۔

وہ اُس خشک پیالہ نما جگہ سے بھی واقف تھا جس کے بارے میں چولستانی خانہ بدوشوں کا عقیدہ تھا کہ وہاں ہزاروں برس پیشتر ایک جھیل تھی اور اُس جھیل پر پرندے مرنے کے لیے آ جاتے تھے۔

لیکن ابھی جب کہ اُس کے سامنے ہلکی چاندنی میں چند پگڑیاں اپنے دلوں اور سینوں پر جھکی ہوئی ایسے کہ جیسے کچھ پڑھ کر اپنے دلوں اور سینوں پر پھونکیں مار رہے ہیں، خواجہ فرید کی پیلوں پکا رہے تھے وہ — مردان علی حسد کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو رہا تھا — وہ ڈری ہوئی شوبھا کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا لیکن خود بھی ڈرا ہوا تھا — ایسا بہت کم ہوا تھا — کبھی نہیں ہوا تھا تو پھر آج کیوں ہو رہا ہے — مشاہد بھائی جان کو کیا ہو گیا ہے — اُن کی توجہ مجھ سے کیوں ہٹ گئی ہے — کیوں؟"

اس — کیوں" — کو مشاہد نے اپنے اندر سنا — اُس نے اندھیرے میں اوپر

[دیکھا سامنے] مردان تھا اور اُس نے آہستہ سے آواز دی — مردان!

[اُس] لمحے کہا گیا جب وہ اس سوچ میں جلتا تھا کہ بھائی جان کو کیا ہو گیا ہے —

[اُسی] لمحے —

"جی بھائی جان —" وہ شوبھا کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"ادھر آؤ —"

وہ اندھیرے میں اطمینان سے اپنا راستہ جانتے ہوئے چلتا گیا اور مشاہد نے اٹھ کر [اُسے] ٹھنڈک میں بھیگتی ریتلی رات کی ہوا میں اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا جب کہ ابھی [پیلوں] پک رہی تھیں...

پُر وحشت سُنجڑی روہی
اے دل دیوانی موہی

وہ کچھ دیر اس کے سینے پر سر رکھے اپنے باپ چوہدری اللہ داد خان کی مہک تلاش [کرتا رہا] اور وہ کبھی کبھی — ایک گمشدہ خیال کی طرح — ایک فراموش شدہ محبت کی [طرح] آتی تھی اور گم ہو جاتی تھی۔ مشاہد بہت آہستہ آہستہ شفقت سے اُس کی پشت پر [ہاتھ پھیر]تا رہتا تھا جیسے ایک شیر خوار بچہ ہو جس نے دودھ پینے کے بعد ڈکار نہ لیا ہو اور مردان [اپنے] باپ کی مہک کی آرزو میں اس کے سینے سے لگا ٹھنڈک میں بھیگتی رات میں تھا جب [مشاہد] نے سرگوشی کی "میں تم سے ایک بہت ہی راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔"

مردان نے سر اٹھایا "جی بھائی جان —" وہ جانے کیا کہنے والے تھے۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں —"

پہلے ایک سنجیدہ مہاندرہ کہ کیا پتہ اس میں کوئی رمز ہو اور پھر وہ جان گیا کہ بھائی [جان] اسے دیکھ کر کچھ ابنارمل ہو گئے ہیں "واقعی بھائی جان؟"

"ہاں بالکل — بلکہ مرغابیاں اگر پانچ بھی ہوتیں تب بھی ان کا خوشی سے کوئی [تعلق] نہ ہوتا —" ایک ہنسی — پہلے مشاہد کی — اور اُسی میں شامل ایک بے اختیار [ہنسی] مردان کی جو یک جا ہو کر ریتلی رات میں تیرتی گئی دور دور تک۔ یقیناً ڈیراور کی دبیز [اور] لمبی فصیل تک جو اس لمحے چاند کی گیارہویں میں بھیگی ہوئی تھی۔ اپنی خوبصورتی سے [اور] لاعلاج، اٹل اور ناگزیر حقیقت کو شرمندہ کرتی ہوئی — اور جامع مسجد کے فردوس [جیسے] زمیں جھروکے تک اور پھر اس بازار میں چلتی ہوئی — جس میں ریت تھی اور

ڈھیتی ہوئی محرابیں تھیں۔

برگیتا چپ، نیم اندھیرے میں بظاہر لاتعلق، بڑھتی ہوئی ٹھنڈک کو برداشت کرتی ہوئی۔ موسیقاروں کی ناآشنا... تانوں کو سنتی — لاتعلق لیکن بہت ہی گہرے حسد میں مبتلا — وہ صرف اس ہنسی سے نفرت کرتی تھی۔ مشاہد اور مردان کی یک جا ہنسی — بے اختیار — جو سات کمروں والی کوٹھی میں بھی اسے بیزار کرتی تھی۔ ان دونوں کا رشتہ صرف بھائیوں کا نہیں ہے — یہ ہم سے — مجھ سے اور شوبھا سے ہمارے حصے کی محبتیں لے جاتے ہیں۔

سب جو اپنے آپ میں لاتعلق ہو کر اندھیرے میں تھے ان سب نے سر اٹھا کر ایک دوسرے کے چہرے دیکھے جو پھڑپھڑاتی لو پر جھکے چہرے کی طرح۔ نیم تاریکی میں آتے جاتے ظاہر اور پوشیدہ ہوتے تھے۔ نمبردار اللہ ڈوایا صاحب لوگوں کے لیے صحرا میں کیمپ قائم کرنے کا مقامی ایکسپرٹ تھا اور آج تو عباسی صاحب کا آرڈر آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رات جب آگے ہوتی جاتی ہے تو کونسے لمحوں میں ٹھنڈک بے آرام اور بے چین کرنے لگتی ہے اور وہ عین اُن لمحوں میں خشک لکڑیوں کے ڈھیر کو اپنے لائٹر سے سلگاتا ہے اور وہ پکڑ دھکڑ کرتی جلتی یکدم ایک بڑے الاؤ کی صورت میں روشن اور ظاہر ہو جاتی ہیں اور اس روشنی میں وہ سب ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ اُن کے حلیے وہ نہ تھے جن کے وہ عادی تھے۔ خاصے بدحال... کراچی اور بٹ خیلہ سے یہاں تک کے سفر کی تھکن، پھر بہاولپور سے یہاں تک ڈیرا اور تک کی ریت اور جیپ کے جھٹکے انہیں بدحال کرتے تھے... البتہ اُن کی مسکراہٹیں اُن کی شناخت کرتی تھیں... نشستوں میں ردوبدل ہوا، شوبھا نے برگیتا کی طرف دیکھا اور وہاں جو چوڑی خوش آمدیدی مسکراہٹ تھی اُس کی ڈوری سے بندھی ہوئی اُس کے برابر میں جا بیٹھی —

"میں تم سے ناراض ہوں — بہت زیادہ"

"کیوں چاچی؟"

"تم مردان کے ہمراہ لاہور کیوں نہیں آئی تھیں کرسمس پر؟"

"آپ یہ سوال صرف اس لیے پوچھ رہی ہیں کہ آپ کبھی میڈیکل سٹوڈنٹ نہیں رہیں... یقین کریں برگیتا چاچی... میڈیکل والے slaves ہوتے ہیں، یقین کریں..."

"اب تم میرے ساتھ لاہور جاؤ گی —"

شوبھا صرف دانت نمایاں کر کے مسکرائی "چاچی ادھر کتنی سردی ہے۔ اُدھر کراچی میں چل رہے ہیں" وہ اپنے آپ میں سردی کو محسوس کرتے ہوئے ابھی سمٹی نہ تھی مردان اُٹھ کر اُس کے پاس آ گیا "Slightly nippy eh?" اور اُس کے کندھوں پر اپرک پھیلا دی — شوبھا نے جتنی دیر میں اوپر دیکھا وہ جا چکا تھا۔

اگرچہ الاؤ کی روشنی موسیقاروں تک پہنچتے پہنچتے تاریکی میں گھل جاتی تھی لیکن وہ انہیں نظر آنے لگے تھے۔ اب بھی یہ جاننا ممکن نہ تھا کہ اُن کی عمریں کیا ہیں، وہ خوش یا ناخوش.. ریت میں اُگے ہوئے بوٹے ہیں؟ صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ اُن میں سے ایک گیارہ برس کا لڑکا ہے جس کی پگڑی اُس کی آنکھوں کو ڈھکتی تھی اور وہ ایک ڈفلی نما ہتھیلی سے تھاپ دے رہا تھا۔ بقیہ لوگ الاؤ کی روشنی سے اُس کی تمازت سے متاثر بغیر اپنے سازوں اور دِلوں پر جھکے ہوئے تھے اور اُن کے اندر سے کافی کے بول صحرا ات میں جھاڑیوں سے بلند ہو کر تھوڑی دور جا بیٹھنے والے نامعلوم پرندوں کی طرح رہے تھے....

پُر وحشت مُنجڑی روہی

اپنے جاگرز اتار کر اور ایک طویل سفر کی تھکاوٹ کے بعد پاؤں کو کتنا آرام ملتا ہے نے پہلی بار اپنے ننگے پاؤں کو ریت سے آشنا کیا۔ سرد اور کھسکتی ہوئی ریت پاؤں کا ٹا جاتی تھی... مردان اُسے دیکھ رہا تھا جب سے آگ جلی تھی مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اور یک تجزیہ نگار کی پُرتفکر نگاہ سے موسیقاروں کو دیکھ رہی تھی اور اس کے سیاہ بالوں پر کی ایک تہہ تھی جس پر سفیدی کا دھوکہ ہوتا تھا... تو شوبھا جب ذرا بزرگ ہو گی تو لکی لگے گی — مردان کے دل پر گہرا بوجھ تھا — ایک اُلجھن تھی جو اُسے بار بار سے واپس ملیر کینٹ کے بیرک نمبر تین میں لے جاتی تھی جہاں یقیناً اس وقت تک اور نازنین سو چکی تھیں اور بیٹ مین بشیر دن کا آخری سگرٹ اپنے پھیپھڑوں میں تھا۔ ایک ہی گھر میں تین جوان جہان لڑکیوں کی ذمہ داری سنبھلنے والی ذمہ داری ہوتی۔ اگرچہ عارفین اور نازنین کے بالوں میں سفیدی بہت تھی لیکن وہ غیر شادی شدہ ہیں اور ابھی لڑکیاں ہی تھیں۔ شوبھا اپنی ذات میں ایک پُراعتماد شخصیت تھی، اُسے حفاظت یا بچاؤ کی فصیل کی ضرورت نہ تھی۔ محبت اور رشتوں کی کشش ایک الگ لیکن وہ اپنے طور پر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی تھی.. اور وہ دونوں — بہت ایک

اور تنہا غیر محفوظ اور سہارے تلاش کرتی ہوئی تھیں..

وہ کیا کر سکتا تھا —

دسویں سے واپسی پر جب وہ اور شوبھا زیب النسا سٹریٹ سے جامن کھا کر آ۔ تھے تو بیٹ مین بشیر نے اُن کی موجودگی کی اطلاع دی تو — وہ کیا کر سکتا تھا۔

وہ کیا کہہ سکتا تھا —

عارفین اور نازنین کو آپ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ خاص دباؤ اور درجہ حرارت میں ہی زندہ رہنے والے سمندر کے نیچے ہزاروں میٹر کی گہرائی میں پائے جانے والے بے رنگ آبی پھولوں کی طرح تھیں — جو سطح آب پر آتے ہی مسمار ہو کر پانی ہو جاتے ہیں — اب اُن کو کتنا عرصہ اُس گہرائی اور درجہ حرارت میں رکھا جا سکتا تھا — اُنہیں اوپر — سطح آب پر آنا تھا — تو یہ نہ سنبھلنے والی ذمہ داری تھی۔

اُن پر ترس بھی آتا تھا — وہ اپنے آپ کو کارآمد ثابت کرنے کے لیے ہمہ وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھیں اور جو کچھ بھی کرتی تھیں اگر نہ کرتیں تو بہت بہتر تھا لیکن مردان انہیں منع نہیں کرتا تھا.. ڈیفنس کے ناریل والے گھر کے پردے گرے ہوئے تھے اور وہ مقفل تھا... وہ سب کچھ تو بیگم بابر کے زمانے میں ہی پیکڈ اور مقفل تھا جو اُن کی رخصتی پر اُن کے ساتھ جانا تھا — صرف کاریں دھونے اور پالش کرنے والے کی روٹین میں فرق نہیں آیا تھا۔ نازنین اس معاملے میں بے حد حساس تھی —

"ممی... بہت خوش ہوں گی — وہ — جہاں بھی ہیں — یہ دیکھ کر کہ اُن کی کاریں روزانہ دُھلتی اور پالش ہوتی ہیں — ممی بہت خوش ہوں گی —" ایک گہرا سانس بھر کر وہ ایک ٹشو ناک پر رکھتے ہوئے ایک تہذیب یافتہ شوں کرتی۔

وہ کیا کر سکتا تھا۔

آنٹی بابر کے غسل خانے میں مسز حسین کی نمکینیت سے اُس کی ملاقات آخری نہ تھی — اسے اب اس خیال سے بھی شرمندگی ہوتی تھی کہ لیکن ایسا ہوا تھا — ہم ذرا عمر رسیدی تک پہنچتے ہیں تو پھر شرمندہ ہونے لگتے ہیں حالانکہ اُنہی حالات میں اور عمر کے اُسی حصے میں اگر دوبارہ پہنچ جائیں تو وہی کچھ ہو گا — جو ہوا تھا۔

اگلی شام اکیڈمی کا ڈرائیور ایک بُوکے لے کر آیا تھا اور میس کے تمام افسران نے رشک سے دیکھا کہ مسز حسین کی جانب سے اس بار — بُوکے مردان کے لیے آیا؟

کوئی خفیہ نہیں — کھلا راز تھیں۔ وہ انتخاب کی قدرت رکھتی تھیں۔ عہدہ، اور تجربہ ایک ایسا لیتھل کمبی نیشن تھا جس کے سامنے ایک سادہ اپنے آپ کو سمجھتا نوجوان کپتان کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا — اور چند روز کی نشہ آور رفاقت کے اکیڈمی کے وسیع گھاس کے میدانوں میں گھڑسواری کے بعد — بڑی بڑی سیال ن میں اُس نمی کے بعد جو اُن کی دُکھی اور ناخوش زندگی کی وجہ سے بھر بھر آتی تھی رُمجت کی ایک خاص مہک کے بعد جو اُن کے نمکین وجود سے اُٹھتی تھی وہ کپتان ہو جاتا پختگی سے یقین کر لیتا تھا کہ مسز حسین کے ماضی کے بارے میں جتنی داستانیں سراسر جھوٹ ہیں اور صرف وہی اور اُن کا نمکین بدن ہی سچ ہیں.. اور کیا خوبصورت پارٹیوں میں، باہر جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کے باوجود پارٹیوں میں اُن کے بیٹوں کا الیکٹرک گٹاروں پر ایلوس پریسلے اور بیٹلز کی دُھنیں بجاتا اور اُن پر مسز حسین جیسے رتیں کوئی اور نہیں کر سکتا تھا اور اس دوران اُن کی لیکوئڈ آنکھیں صرف مردان پر

اُن کے خاوند جو ظاہر ہے مسٹر حسین تھے انتہائی بردبار، ملنسار، شریف الطبع اور قلب شخص تھے۔ موجودہ پوزیشن تک وہ مسز حسین کے بدن کی کومل سیڑھی سے تھے اسی لیے وسیع القلب تھے.. یوں بھی یہ افواہ عام تھی اور شائد اس کا منبع مسز نا تھیں کہ وہ نیچے سے ساڑھے چھ تھے اور یہ کلاک بہت عرصے سے یہیں سوئیوں پوزیشن پر رُکا پڑا تھا... بے چاری مسز حسین اور اُن کی نم ناک آنکھیں تو ایک کپتان کہاں تک یہ سب کچھ سہہ سکتا تھا —

اکیڈمی ایک برڈ سینکچری کی مانند تھی —

اُس کے وسیع پھیلاؤ میں اور پھر پرنسپل کے شاندار گھر کے اندر طرح طرح کے اُڑانیں کرتے تھے اور اُنہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا تھا — فوجی افسر، سول ہماری دوست، بنگالی محب الوطن سب یہاں بے خطر جمع ہوتے تھے۔ اس برڈ کے باہر صرف جنگل تھا جس میں صرف جنگ تھی۔

چند روز کے لیے مسز حسین مغربی پاکستان بھی گئی تھیں..

وہ جانتی تھیں کہ مردان کی سب سے بڑی کمزوری اُس کا بھائی ہے جو لاہور میں چنانچہ وہ خاص طور پر اس سے ملنے بھی گئی تھیں...

لیکن وہ ملنے تو کسی اور کو گئی تھیں۔

اُن کی واپسی پر ایک اور پارٹی ہوئی —

کیا خبریں ہیں؟ — اسلام آباد کا کیا موڈ ہے؟

مسز حسین ایک تمامتر سیاسی اور سماجی حقیقتیں جاننے والی شخصیت کی طرح اپنی سیال آنکھوں سے مسکراتی رہیں — "آغا صاحب بہت سویٹ تھے — Loveable تھے"

سب نے ایک دوسرے کی جانب جواب کے لیے دیکھا اور پھر مسز حسین کی طرف، یہاں تک کہ مسٹر حسین نے بھی جو بوجوہ اپنی بیگم کے ساتھ مغربی پاکستان نہیں گئے تھے.. البتہ اُن کے بیٹے چپ رہے، وہ اُن کے ہمراہ گئے تھے۔

"اِن دونوں نے — " وہ بہت فخر سے ماںتا کے پُرتقدس فخر سے اپنے بیٹوں کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگیں "وہاں پرفارم بھی کیا — اور آغا صاحب loved it — اِن سے پوچھ لیں۔"

دونوں بیٹے بولے کچھ نہیں لیکن وہ بھی ذرا پُرفخر تھے۔ آفٹر آل صدر پاکستان آغا جنرل یحییٰ خان کے لیے اُن کے صدارتی محل میں پرفارم کرنا — جب کہ اُن کی والدہ محترمہ اُن کے ہمراہ ایک سرخوشی میں رقص کرتی تھیں اور آغا صاحب کی گھنی پلکیں اور خوبصورت آنکھیں سُرخ ہوتی ہوئی اُن پر جھکتی تھیں ایک قابل فخریات تھی —

"تو پھر — جنرل صاحب کیا کہتے تھے؟" ایک فوجی افسر کے لیے، کپتان اور میجر کے لیے ایک فل جنرل اور وہ بھی ملک کی صدارت پر فائز جنرل تو ایک خدا سے کم نہیں ہوتا — شائد کچھ زیادہ ہی — اور اُن کے چہروں پر ایک عجیب نورانی کیفیت تھی جب وہ یہ پوچھتے تھے کہ تو پھر — جنرل صاحب کیا کہتے ہیں —

"میں سب کچھ تو نہیں بتا سکتی — " مسز حسین نے بظاہر ٹالتے ہوئے کہا "لیکن... وہ اتنا مرد ہے کہ جنگ — جنگلوں میں اور صحراؤں میں جاری رہے گی.. جنگ... میں سب کچھ تو نہیں بتا سکتی — "

شائد یہی وہ لمحہ تھا جب چوہدری اللہ داد خان کا بیٹا کیپٹن مردان خان — بدلا — اس کے اندر بہت کچھ آگے پیچھے ہوا... اس کی کلف لگی وردی بوسیدہ ہونے لگی.. بو دینے لگی.. اس کے اندر انجیکٹ کیا گیا تھا اُس کی لایعنیت زائل ہونے لگی.. محب الوطنی کیا ہے؟ حکم ڈسپلن کیا ہے سچ ہے یا جھوٹ ہے اور حکم ماننا دانش مندی ہے یا یہ سوال کرنا کہ کون

رہا ہے اور اُس کی اہلیت کیا ہے دانش مندی ہے — یا آنکھیں بند کر لینا سب سے دانش مندی ہے — اس تبدیلی کو مردان نے اُس لمحے نہیں بہت بعد میں جانا... اُس وہ بھی مسز حسین کے جلال کی روشنی میں آنکھیں چندھیائے اُن کی جانب دیکھتا تھا اس کے ساتھ کہ میں اس عورت کے بدن کے سارے حروف تہجی جانتا ہوں اور اُن کے زیر زبر پیش سے آگاہ ہوں اور یہی عورت ہمارے باس سے مل کر آئی ہے اور باس کی پلکیں اس پر جھکی تھیں — اور اب بھی وہ صرف مجھے دیکھتی ہے اس کے باوجود کہ ایک خدا سے مل کر — نہیں صرف مل کر نہیں — بہرحال آئی ہے —

"انہوں نے اور کیا کہا تھا ڈارلنگ — " یہ مسٹر حسین کی پُراشتیاق آواز تھی "کیا کہا؟"

"وہ — He is loveable — جیسے ایک کڈلی بیئر ہوتا ہے — " مسز حسین آپ میں گم وہیں تھیں جہاں کڈلی بیئر بہت loveable تھا۔ اور وہیں کسی صدارتی محل کے نزدیک زیب بھی تھا — منتظر — تھینک گاڈ پاکستان ہیز بین سیوڈ —

"لیکن ڈارلنگ — " مسٹر حسین نے پبلک میں پہلی بار اپنی بیگم کا ہاتھ پکڑنے کی جرأت کی اور بے حد معزز محسوس کیا "انہوں نے اور کیا ارشاد کیا؟"

مسز حسین جواب دینے سے پیشتر باقاعدہ بَلش کر گئیں — "ہی اِز سو سویٹ۔ مجھے نام سے تو نہیں پکارتے تھے — بلیک بیوٹی کہتے تھے..." وہ بَلش کرتی چلی گئیں۔

باہر ہیلی کاپٹر تھے اور جنگ کی مشین پوری قوت اور اخلاقیات سے عاری کہ کوئی جنگ آج تک جنیوا کنونشن کی پابند نہیں ہوئی — جاری تھی۔

رقاصاؤں پر گرتے نوٹ جو ہیلی کاپٹروں کی طرح نیچے آتے تھے۔

کھلنا بیرکس اور اُلٹے لٹکتے شیر دلیر جوان... اپنے اعضا کے بغیر برہنہ.. جنرل صاحب کا آرڈر — ان کی نسل بدل دو... بنگالی نہیں زمین....

اور اندر — He is loveable... مجھے بلیک بیوٹی کہتے تھے۔

یہیں پر مردان کا نصیب مختلف ہوا...

اُس نے مشاہد کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر الاؤ کی آگ ایک پرانے پروجیکٹر والی بلیک اینڈ وہائٹ فلم کی طرح جھجکتی اور بجھتی دکھائی دے رہی تھی۔ مشاہد بھائی

جان اُسے سوئٹزر لینڈ میں ملے تھے... بلیک بیوٹی کو — فال کے بعد — جب ڈھاکہ ڈوب چکا تھا تب — کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن کالیا اپنی چوتھی ہِپ فلاسک صحرا کی جانب اُچھال چکا تھا۔ اگرچہ یہ فلاسکس بہت مہنگی تھیں لیکن کالیا انہیں ڈسپوزایبل کو ہی گردانتا تھا — اُس نے بہت دیر سے چُپ ڈاکٹر ارشد کی جانب نگاہ کی جو ایک لکڑی کے چہرے کے ساتھ لاتعلق — جیسے اُس کی ڈیوٹی لگا دی گئی ہو — لطف اندوزی سے دُور ایک بیکار تسلسل کے ساتھ موسیقاروں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا اور اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا گا رہے ہیں اور اُسے پرواہ بھی نہیں تھی... اُس کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔

"اوئے ڈاکٹر بڈھے شیر — یہ بتا کہ تم نے کچھ کام بھی دکھایا ہے کہ نہیں —"

کالیا اب قطعی طور پر لاپرواہ ہو چکا تھا کہ اُسے کون سنتا ہے "یار یہ صحرا اپنی جگہ پر لیکن بٹ خیلہ کے باہر دریائے سوات والا وے سائڈ ہوٹل وہ کیا ہے یار — مجھے خدشہ ہے کہ وہ وہاں نہیں ہے اور صرف ہم تینوں جب وہاں جاتے ہیں تو وہ ظاہر ہو جاتا ہے — کیوں کیسی معرفت کی بات کی ہے میں نے... میں نے کنگ آف گندھارا نے؟"

ڈاکٹر ارشد نے اُس کی جانب دیکھا۔ الاؤ سے اُس کی آنکھوں میں سرخ دیئے جلتے تھے "صرف اس لیے کہ وہاں آلوچے کے شگوفے تمہاری نظروں کے سامنے پھوٹتے ہیں اور کھلتے ہیں؟"

"آہو —" کالیے کا منہ کھل گیا۔

"وہ وہیں ہے — اور وہ ہے یا نہیں ہمیں اس سے غرض نہیں کیونکہ — وہ ہم ہیں — شگوفے یا وے سائڈ ہوٹل نہیں ہے — ہم ہیں۔"

"کیا ہم اتنے اہم ہیں یار ڈاکٹر — کہ — ہم ہوں — میں نے سنا ہے کہ جب سے حضرت آدم آئے ہیں انسانوں کی چھ سو نسلیں گذر چکی ہیں — تو اُن میں سے ایک نسل یہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ ہم ہیں — میرا گمان ہے کہ ہم نہیں ہیں — اگر ہم ہیں تو ایک شگوفہ یہاں بھی گر سکتا ہے چولستان کے صحرا میں ڈیراور کی تاریک ریتلی رات میں — یہاں صحرا میں جہاں ابھی میں اپنے آپ کو دسویں بار ہلکا کرنے گیا تھا تو پتہ نہیں کیا کیا مخلوق اِدھر اُدھر ہوتی تھی — ہاں شگوفہ یہاں بھی تو گر سکتا ہے — اگر ہم ہیں تو۔"

کالیے نے اپنی تمام تر مخموریت کے باوجود اور ڈاکٹر ارشد پر پڑتی الاؤ کی جھلملی تاریک ہوتی روشنی کے باوجود یہ محسوس کر لیا کہ وہ کہیں اور ہے۔ یہاں موجود نہیں

وہ آ تو گیا ہے لیکن ابھی وہیں ہے۔

"ڈاکٹر کہاں ہو یار — یہ ذرا ایک ڈیک لگاؤ بلیک لیبل وسکی کی — تو تم واپس آ گے۔"

کالیے نے اپنی ہِپ فلاسک جان سے بھی پیاری فلاسک اس کے ہاتھوں میں نے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر ارشد نے اُسے بڑے آرام سے واپس دھکیلا — "نہیں تم جانتے ہو کہ میں نہیں پیتا۔"

"ایک تو یہ مرزائی بہت بنیاد پرست ہوتے ہیں —"

"مرزائی نہیں —" ارشد نے فوراً ٹوک دیا۔

"ٹھیک ہے مرزائی نہیں قادیانی —"

"نہیں احمدی —"

"اوکے احمدی — اگر اس سے کوئی فرق پڑتا ہے تو — تو تم لوگ اتنے Rigid ہو یار — ہمارے ہاں جو شخص نمازیں زیادہ پڑھتا ہو اس کے بارے میں شبہ کیا جاتا ہے وہ مرزائی — میرا مطلب ہے احمدی ہے۔ جو خاتون پردے کی پابند ہو اُس پر بھی کیا جاتا ہے کہ... ویسے تم میرے یار ہو لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر پنجابی بولتا یار پنجابی پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ تو حیا کرو —؟"

"قادیان میں پیغمبر کیوں نہیں آ سکتا۔ صرف اس لیے کہ وہ پنجاب میں ہے —"

مشاہد نے ارشد کی اِس آؤٹ برسٹ کو سنا اور چپ رہا۔ وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا اگر اس کورم میں واحد شخص تھا جو مذہب کے بارے میں بنیاد پرست تھا۔ اور وہ بھی ی مذہبی بحث میں ملوث نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ دونوں — کالیا اور وہ ایک عرصے تک کی مذہبی وابستگی سے لاعلم رہے۔ وہ اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کرتا تھا اور پھر نگار سے واپسی پر بٹ خیلہ واپسی پر — جب وہ کالیے سے ہاتھ ملا رہا تھا تو اُس کا ہاتھ تھا جیسے اُس میں سے جان نکل رہی ہو اور وہ بے قابو لرزش میں تھا "کیا بات ہے جان من کیا بات ہے —" کالیے نے پوچھا تھا —

"کچھ نہیں —" ارشد نے سر جھٹکا تھا "کچھ بھی نہیں —"

اُس — کچھ بھی نہیں — کے پس منظر میں شب قدر تھا۔

"کچھ تو ہے —"

"نہیں —" اُس کے ہاتھ میں مسلسل لرزش تھی۔ کالیا خود بھی سہم گیا۔ ڈا ارشد ایک مضبوط اعصاب کا کم گو اور دھیما شخص تھا۔ ایک بار قادر آباد بند پر اُن کی جی ایک موڑ کاٹتے ہوئے اُلٹ گئی تھی اور سوائے ڈاکٹر کے سب کی چیخیں نکل گئی تھیں... اطمینان سے کپڑے جھاڑتا ہوا باہر نکل آیا تھا اور سگرٹ سلگا کر جوکالیاں کے بیلے سرسبز اور گھرے جنگل کے منظر میں محو ہو گیا تھا۔ اور اب اُس کا ہاتھ مسلسل لرزش تھا۔

پس منظر میں شب قدر تھا...

اُس کے گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اُس کے ساتھ یہ کچھ ہو گا۔ اگر ہوتا تو وہ پشاو کورٹس میں پینڈنگ اپنے درجنوں مقدمے چھوڑ کر اس ہم عقیدہ شخص کی ضمانت کرا کے لیے شب قدر جیسی جگہ کیوں آتا —

پارسائی کے پُر تکبر منہ سے جھاگ نکلتی تھی —

شک تھا کہ وہ اپنے دین سے انحراف کر کے مرزائی ہو گیا ہے اس لیے — پولیس کی حراست میں تھا اور وہ شخص — جو پشاور سے خاص طور پر آیا ہے اپنے پینڈنگ مقدمے چھوڑ کر اس شخص کی ضمانت کرانے کے لیے شب قدر آ گیا ہے۔

ہجوم کو دیکھ کر وہ ہراساں نہیں ہوا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ کسی سیاسی شخصیت کی عدالت میں پیشی ہے اور اُس کے حواری نعرے لگاتے ہوئے بے خود اور بے اختیار ہو رہے ہیں۔ اس نے — اُس وکیل نے — اُن کے نعرے غور سے کان لگا کر نہیں سنے تھے جب تک کہ پہلا نوکیلا کنکر اُ کے سیاہ کوٹ کی آستین پر ایسے لگا جیسے کسی تیز چونچ والے پرندے نے اُسے ٹھونگا مارا ہو — پھر نعروں کی نوعیت واضح ہونے لگی — لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔

پتھر زیادہ فاصلے سے پھینکے جائیں تو نشانے تک پہنچتے پہنچتے اُن کی قوت میں کمی آ جاتی ہے اس لیے وہ قریب ہو گئے۔

سنگسار شدہ جسم بہت دیر تک ہلتا رہتا ہے اور جان نہیں نکلتی — خاص طور پر جب اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے کچے بیروں کی طرح نوچ لیے گئے ہوں، خون بھرے گڑھوں میں سے گوشت کے ریشے لٹکتے ہوں — جان نہیں نکلتی —

اسی لیے اُسے شب قدر کی گلیوں میں گھسیٹا جاتا ہے —

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ راہ گذار تھا

ڈاکٹر ارشد کے پس منظر میں شب قدر تھا۔

پُر وحشت مُنجڑی روہی

الاؤ کی سیاہی اور روشنی کے سیال سائے کالیے کی عینک پر شوخ ہوتے تھے اور پھر پڑ جاتے تھے۔ وہ اپنے اس یار کے بارے میں فکر مند تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کی تشویش کو لیا اور اُس کا ہاتھ تھام کر بولا "تم اتنے دنوں کی قید کے بعد چند روز اپنے گھر والوں کے کیوں نہیں ٹھہرے؟"

"بہن یا گدھ ہیں سارے کے سارے... میں نے چوکھٹ کے اندر پاؤں رکھا تو ب کے سب بلند آوازوں میں بین کرنے لگے اور رو رو کے حشر کر لیا — میں نے اوئے میں پھاہے لگ گیا ہوں جو بین کرتے ہو بہن یا چپ کرو۔ وہ چپ کیے تو پھر لے اور بولے تو ہر ایک کے پلے میں اپنی اپنی داستانِ غم تھی جس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا تھا بھائی زاہد تمہاری غیر موجودگی میں ہم بھوکے مر گئے تھے۔ کچھ لاکھ دو لاکھ ادھار دو ..... گدھ بہن یا —"

"گھر والوں کا حق بنتا ہے —"

"بال بچوں کا حق بنتا ہے ناں ڈاکٹر — میرے تائے اچھّو کا تو نہیں بنتا جو ستّر سال عمر میں بھی رنڈی بازی سے باز نہیں آتا یا میری ماسی کا تو نہیں بنتا جسے میں اب تک لا روپے دے چکا ہوں اور پھر کہتی ہے کہ میری کنسائن منٹ پکڑی گئی ہے کالیے پتر۔ لُٹ گئی۔"

کالیے کا اندازِ گفتگو کسی بھی تاریک صورت حال کی گمبھیرتا کو روشن کرنے میں معاون ثابت ہوتا تھا۔ ڈاکٹر مسکرایا "تمہاری ماسی بھی یہی کام کرتی ہے؟"

"آہو — میں نے کسٹم والوں سے ماسی سلامت بی بی کی صاحب سلامت کرا پشاور، دیر اور مردان میں کونکشن ملا دیا اور پھر ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ماسی تو میری ماں کے ہے اب تو اپنا شکار کر مجھ سے رقم نہ مانگنا — تو جیل سے آ کر گھر میں قدم رکھا ہے تو

ماسی سر پر بازو رکھ کر دُہائی دینے لگی ہے کہ ہائے پُتر میرا مال پکڑا گیا ہے — مال پکڑا گیا ہے تو یہ بمن یا کالیے کا قصور ہے جو اس دوران جیل میں تھا — " کالیے نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر ارشد اپنی یاسیت سے باہر آ رہا ہے تو اس نے اپنے آپ کو ذرا اور سوشل کر لیا

"میرے بھائی بھی تو بمن یا گدھ ہیں — چٹے ان پڑھ سارے کے سارے اور شوق لارڈ ماؤنٹ بیٹن والے — چھوٹا اکی نہیں ہے پہلی کنسائن منٹ تھرو ہوئی ہے تو پانچ گھوڑے خرید لیے — ایک دو نہیں اکٹھے پانچ — بھلا تم نے اتنے گھوڑوں کے بمن یا تکے کباب بنانے ہیں — دوسرے دِن انٹیلی جنس والے گھر آ گئے — اور اندر — تین مہینے رہ کر آیا ہے —"

ڈاکٹر ارشد ہنسنے لگا "ایں ہمہ خانہ —"

"آہو — " کالیے نے سر ہلایا "اتنی فارسی میں بھی سمجھ لیتا ہوں۔ ایں ہمہ خانہ آفتاب است — بالکل — اور کیا کیا آفتاب ہیں بمن یا ہماری فیملی مین —"

"تم ہمیشہ اپنے علم سے حیران تو کرتے ہو زاہد۔ لیکن یہ فارسی کہاں سے آ گئی؟"

"افغان کونیکشن — " وہ ہنسا اور فلاسک سے ایک بہت ہی طویل اور اُسے تہہ تک خالی کر دینے والا گھونٹ بھرا "افغان جہاد کم از کم میرے لیے تو بہت مبارک ثابت ہوا ہے.. بمن یا کیا کیا پیس آیا ہے وہاں سے — ڈاکٹر، جلال آباد میوزیم میں قسم سے وہ کچھ تھا جو پیرس کے لوور اور جاپان کے کوبے میں نہیں تھا — اصل گندھارا تو ادھر تھا — چونے کا ایسا ایسا مجسمہ تھا کہ وینس ڈی میلو اُس کے سامنے چوڑی لگتی تھی — میرے ہاتھوں سے گیا ہے سارا مال — گدھوں پر لاد کر لاتے تھے مجاہدین — بابر کے مقبرے کی جالیاں... محمود غزنوی کے بیٹوں کی قبروں کے کتبے بہت دن میرے لان میں پڑے رہے اور لوگ اُن پر بیٹھ کر وہسکی پیتے رہے — کابل میوزیم بھی ادھر سے ہو کر اِدھر اُدھر ہوا ہے۔"

ڈاکٹر ارشد کے لیے کالیے کی گفتگو خواجہ فرید کی کافی سے زیادہ پُرکشش تھی۔

"خالص سونے کا بنا ہوا ایک باختری پنجہ — حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے کا بنا ہوا — میرے پاس آیا تھا۔ دوستم کا ایک دوست لایا تھا — تو ڈاکٹر یار میں اُسے سامنے رکھ کر سر جھکائے ساری رات بیٹھا رہا — اُس میں سے نُور نکلتا تھا ڈاکٹر نُور — میں اپنے بچوں کو بیچ دیتا پر اُسے نہ بیچتا — لیکن مجبوری تھی — " کالیا یکدم خاموش ہو گیا۔

ڈاکٹر نے اپنی توجہ ہٹائی نہیں — "کیا مجبوری تھی؟"

"ایک بارہویں صدی کا منقش گل دان ہے لنڈن والے کرسٹیز کے پاس — انی آیات کو موزیک سے لکھا گیا ہے۔ اُسے خریدنے کے لیے رقم درکار تھی۔"

"اس گل دان کو کہاں سمگل کرو گے؟"

"ناں — " کالیے نے سر ہلایا "ڈاکٹر — میں اسلام نہیں بیچتا — توبہ توبہ۔ پنے لیے خریدا ہے۔"

"کیا کرو گے؟"

"کچھ تو کروں گا — " بہت مدھم آواز میں کالیے نے کہا "ہماری تہذیب ٹھیکریاں گئی ہے۔ نہ کوئی اسے جوڑ کر دیکھتا ہے کہ یہ کیا ہے، کونسا برتن ہے جو ٹوٹ گیا ہے اور ئی رکھوالی کرتا ہے — میں کچھ تو کروں گا —"

"اِدھر بھی کچھ ہے؟"

"اِدھر اُچ شریف میں بخاریوں اور گیلانیوں کے گھروں میں بہت کچھ ہے.. کچھ ہے۔ کھرا ہے — باقی اللہ اللہ — بی بی فاطمہ کی چادر اتنی مہنگی، اتنی باریک اور اتنی نکور حالت میں کیسے ہو سکتی ہے۔ بہرحال عقیدت اِن نوادرات کو آتھنٹیکیٹ کر دیتی — پر یہ بھی ٹھیکریاں ہو جائیں گے —"

"مذہب کو بھی؟"

کالیے نے سر اُٹھایا "کیا؟"

"عقیدت آتھنٹیکیٹ کر دیتی ہے — تم عقیدے کو چیلنج نہیں کر سکتے — نہ علم یا تاریخ کے زور پر۔ اس عہد میں بالغ نظری اور روشن خیالی کے اس عہد میں لان سفید فام دیگوں میں سے زہر پیالے بھر بھر کے خود بھی پیتے ہیں اور اپنے بال بچوں بھی پلاتے ہیں اور پھر اُن کی لاشیں جینز اور جیکٹس اور بلاؤزز میں سے اکڑتی جنگل میں ی ہیں کہ وہ سب اپنے پرافٹ کی پیش گوئی پر یقین رکھتے تھے کہ یہاں سے سیدھے — اور پرافٹ کی لاش بھی اُن میں شامل ہوتی ہے — لوگ صندوقوں میں بند ہو ندر میں اُتر جاتے ہیں —"

"میں جانتا ہوں تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو —"

"نہیں۔ یہ میری عادت نہیں۔ یہ صرف تمہارے — کیوں؟ — کا جواب ہے"

"اور کیا بھن یا جواب ہے —" کالیے نے بار بار سر ہلایا "بہت دیر سے برادرِ عزیز کی وَف سنائی نہیں دی — کہاں گیا" اس نے تشویش بھری ایک نگاہ چاروں اور دوڑائی "میں دیکھتا ہوں" وہ برادر عزیز کو دیکھنے کے بہانے الاؤ کی پہنچ سے دور جھاڑیوں میں گیا اور اپنے آپ کو ہلکا کر کے واپس آ گیا۔ مشاہد نے اُسے پاس سے گذرتے دیکھا "کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ آپ ہم سے بھی کسی وقت ہم کلام ہوں گے؟"

"ہم نہیں ہوں گے آپ سے ہم کلام — آپ نے ہمیں رنجیت سنگھ کی پوتی کی قبر دکھائی ہے — ؟"

"لاہور واپسی پر پہلا کام یہی کریں گے — وعدہ"

مہمانوں کے علاوہ ریت پر بیٹھے اپنے آپ پر جھکے پگڑیوں والوں کو بھی چائے سرو کی گئی اور وہ کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ اُن میں جو لڑکا تھا وہ البتہ کبھی کبھار شکایت آمیز اور ناراض نظروں سے اُن کی جانب دیکھتا تھا جو کسی اور قوم اور نسل اور مذہب کے تھے۔ اُس جیسے نہ تھے۔

نمبردار اللہ ڈوایا انتظامات کی بھاگ دوڑ میں ادھر آیا اور اُنہیں خاموش بیٹھا دیکھ کر اُن پر برس پڑا — پھر بھی اُنہوں نے یکلخت اپنے ساز نہیں چھیڑے، فوراً منہ کھول کر تانیں لگانے سے اجتناب کیا اور بہت سوچ سمجھ کر آہستگی سے سلوموشن میں اپنا کام شروع کیا — اِکتارہ ریت میں سے پھوٹتا ہوا بہت دھیمی سُر میں اُن تک آتا گیا اور پھر بلند اور ذرا اور بلند اور تب اُن سب کی ماتمی سی آوازیں اُس میں شامل ہو گئیں...

روہی... روہی... روہی

شوبھا اُکتا چکی تھی۔

برگیتا ٹھوڑی پر ہتھیلی جمائے — جیسے وہ یوٹے برگ کے کسی کانسرٹ ہال میں پاپا راڈنی کے ہمراہ مکمل توجہ اور خاموشی سے وائلن کنشیٹو سنتی تھی ایسے لگن سے چپ سنتی تھی۔

بیرک نمبر تین میں اگرچہ صرف تین عورتیں تھیں لیکن — ذرا پرے گرینڈ فادر کلاکس اور سنگی تعویزوں میں بھی دو اور تھیں جو ابھی تک وہیں تھیں۔ وہ جب بھی انہیں جانے کے لیے کہتا وہ لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر عجیب بین کرنے کے انداز میں رونے

لگتیں اور جو کچھ کہتیں بنگالی میں کہتیں اور جب اٹھ کر جانے لگتیں تو وہ انہیں روک لیتا دو چار روز اور سہی لیکن اس کے بعد تمہیں اپنا بندوبست کرنا ہو گا۔ اُن کے بین فوراً بند نہ ہوتے آہستہ آہستہ دھیمے پڑتے جاتے — دو چار روز اچھی خوراک، ڈھنگ کے کپڑے تو وہ بھی بلیک بیوٹی سے کم نہ ہوتیں...

بلیک بیوٹی — پاکستان کی سفیر — سوئٹزر لینڈ میں۔

اور اُن کے خاوند مسٹر حسین — پاکستان کے سفیر آسٹریا میں۔

آغا صاحب غیر ممالک میں پاکستان کے امیج کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ Loveable کتنے considerate کہ میاں بیوی کو ساتھ ساتھ ملکوں میں اپائنٹ کیا حالانکہ وہ بنگالی اور بنگال میں تو جنگ — جاری رہے گی۔

شوبھا نے مردان کے جھکے ہوئے چہرے کو تشویش سے دیکھا جس پر تھکاوٹ بہت عیاں ہو رہی تھی...

"بابا۔ آپ کے پاؤں زیادہ بہتر محسوس کریں گے اگر آپ بھی جاگرز اُتار دیں"

"بہت اچھا مشورہ ہے اس جنگل بیابان میں —" وہ جھکا اور اُلجھے ہوئے تسموں کے سرے تلاش کرنے لگا — جوگرز اُتار کر اُس نے پاؤں ریت پر رکھے تو ایک سنسناتی تازگی اُس کے سر تک پہنچی۔ متعدد بار پاؤں کی اُنگلیاں سمیٹنے اور سیدھی کرنے سے سکون بھی ملا اور یہ اِحساس بھی ہوا کہ ریت کم ہے اور اُس کے نیچے زمین قدرے اور سخت ہے۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور ذرا آگے ہو کر موسیقاروں کے قریب جا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ سفر نے... طویل سفر نے بدن کو اکڑا دیا تھا اور ایک بے آرام اور بے چین کیفیت اس میں رینگتی چلی جاتی تھی — میں اتنا جوان نہیں رہا۔ ہاں — بدن کی لچک کم ہو رہی ہے۔ گویّوں نے ممنونیت سے اُسے دیکھا کہ وہ اُنہیں سننے کے لئے اُن کے قریب آ بیٹھا تھا۔

پیلوں پکیاں او یار... آ رل مل

"اوے بھائی نمبردار —" کالیے نے بلند آواز میں پکارا تو وہ شائد قریب ترین جھگّا میں کان لگائے کھڑا تھا اِس بلاوے پر فوراً آ گیا "یار اِدھر تو اتنی دیر سے صرف پیلوں پک رہی ہیں کھانا پتہ نہیں کب پکے گا —"

"تیار سائیں آپ حکم کریں تو ابھی ڈیننگ ٹیبل پر لگا دیں —"

کالیے نے ذرا توقف کیا۔ اِس کا خیال تھا کہ کھانے کی تائید میں دو چار آوازیں ضرور بلند ہوں گی لیکن ایسا نہ ہوا "کھانا بعد میں لگا دینا ابھی پیلوں پکنے دو"

نمبردار اُسی قریب ترین تاریکی میں پھر روپوش ہو گیا۔

زمین کی ٹھنڈک کی سطح مردان کے بدن میں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی... جیسے وہ ایک بُوٹا ہو جو دھیرے دھیرے نمی چُوس رہا ہے۔ اِس کی دونوں ہتھیلیاں بھی زمین تھیں اور وہ لے پر کان لگائے اپنی اُنگلیوں سے ہولے ہولے اُسے کریدتا تھا اور اُس کی نم اُسے حیران کرتی تھی — نرم ریت کی بجائے زمین کی کرختگی اور اِس میں گیٹے اور پتھ اور کنکر — کبھی ایک گھونگا بھی — وہ اِنہیں اُٹھا کر الاؤ کی بجھتی لَو کی زد میں لا کر دیکھتا او پھر پھینک دیتا۔

دو کارندے سوکھے ہوئے درخت کا ایک تنا اُٹھائے چلے آ رہے تھے۔ اُنہوں نے تنے کو کندھے جھکا کر الاؤ میں اُلٹایا اور چلے گئے...

تنا چنگاریاں چھوڑتا ہوا آگ پکڑنے لگا.... اور الاؤ کی روشنی تیز ہو گئی۔

ایک ٹھیکری مردان کی اُنگلیوں میں آئی۔ اس نے اسے بھی چہرے کے قریب لا کر آگ کی روشنی میں دیکھا... اُس پر کچھ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے... سیاہ رنگ میں کچھ پتے کچھ شکستہ دائرے — اُن پر آگ کی روشنی اور سیاہی آگے ہو کر ہنتی تھی — کیا سوہنے اور عجب بیل بوٹے ہیں جو کسی نے بنائے — اس نے ٹھیکری کو آنکھوں کے نزدیک کیا تو باقی آوازیں مدھم ہو کر سناٹے میں بدلنے لگیں — کس کا ہاتھ تھا جس نے اِسے بنایا — اور کب بنایا — کہتے ہیں اِدھر بستیاں تھیں....

کالیا جو کافیوں اور پیلوں پکنے سے ازحد بیزار ہو چکا تھا اور اُس کی مخموریت کا گراف نیچے جا رہا تھا اپنی کرسی سے اُٹھا اور مردان کے ہاتھ میں پکڑی ٹھیکری پر جھک گیا... ایسی ٹوٹی پھوٹی پرانی چیزوں میں ایک خود کار نظام ایسا تھا جو فوری طور پر کالیے کو سگنل بھیجنے شروع کر دیتا تھا کہ آؤ ہمیں دیکھو، ہم ٹھہرا ہوا وقت ہیں — اور کالیا جب اِس ٹھہرے ہوئے وقت پر جھکا تو اُس کے چہرے جو تحیر آیا وہ الاؤ کی بھڑک کر دھیمی ہونے والی لَو کی وجہ سے نہیں تھا — "مردان یہ کیا ہے؟"

"یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں —" مردان نے کہا۔

"تو میں بھی کسی وقت کہوں گا کہ — اور یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں —"

"کسی برتن کی ایک ٹھیکری ہے — یہیں اِسی ریت اور مٹی میں دبی پڑی تھی اِس کے بیل بوٹے دیکھو"

"وہی دیکھ رہا ہوں — بھن یا کیا سوہنے اور عجب بیل بوٹے ہیں —"

"ہوں —" مردان چونک گیا اور خوفزدہ ہو کر کالیے کو دیکھا جو ٹھہرے ہوئے ت کو دیکھتے ہوئے ٹھہرا ہوا تھا... کوئی ربط ہے کہیں نہ کہیں۔ کوئی میل ہے، کوئی ابنکشن ہے۔ چند لمحے پیشتر وہ یہی لفظ... ہو بہو اِنہی لفظوں میں بڑبڑایا تھا —

پاروشنی پوچھتی تھی کہ پگلی یہ بیل بوٹے تم کیسے اُلیکتی ہو —

وہ رُکھوں میں سے میرے لئے پتلی شاخیں لایا کرتی تھی اور پوچھتی تھی اور میں تی تھی کہ یہ بیل بوٹے میرے سر میں تو نہیں، یہ تو اِن ٹہنیوں اور شاخوں میں ہوتے یا جنہیں رنگ میں ڈبو کر جھجھروں۔ ڈولوں۔ صحنکوں پر پھیرتی ہوں اور یہ آپ ہی پ بنتے چلے جاتے ہیں۔

پانی سوکھے گا۔ اور پھر صرف کنارے رہ جائیں گے۔

ریت بھی آئے گی اور ہوا بھی اور میرے گھڑے گریں گے ٹوٹ کر۔ اور اُس بت میں دب جائیں گے — آج سے کئی رُتوں بعد — وہ اِن بیل بوٹوں کو دیکھیں گے رکھیں گے کہ کیا سوہنے اور عجب بیل بوٹے ہیں جو کسی نے بنائے — اور وہ کس کا ہاتھ اس نے اِنہیں بنایا اور کب بنایا... جب کہتے ہیں کہ اِدھر بستیاں تھیں اور دریا تھا اور ہاں میں مور بولتا تھا۔

"وَف وَف —" جھاڑیوں میں کُتورا بولا جو بہت دیر سے گمشدہ تھا۔

"واہ —" کالیے نے ٹھیکری کو چُوما عقیدت سے جیسے وہ حجرِ اسود کا ٹکڑا ہو، کیا نے اور عجب بیل بوٹے ہیں —"

نمبردار اللہ ڈوایا اپنی تاریک سلطنت میں سے پھر باہر آ گیا اور دوہرا ہو کر بولا سا جدھر ہم بیٹھے ہیں اِدھر دریائے گھاگھرا کی گزر گاہ تھی — ... دن کے وقت دیکھو اِن کے اُونچے خشک کنارے دکھائی دیتے ہیں اور اِدھر ذرا کریدو تو گھونگے اور ٹھیکریاں لتا — اِدھر بستیاں تھیں سائیں..."

آس پاس ریت ہی ریت ہو گی بے اَنت اور کوئی نہ جانے گا کہ ہم یہاں تھے —

میں تھا — پاروشنی تھی۔

وہ ایک ایسی جگہ کھڑا ہے جس کے دونوں طرف اُونچے خشک کنارے ہیں جو تک جاتے ہیں۔ پاؤں کے نیچے سوکھی سیپیاں ہیں۔ کنکر ہیں اور ٹھیکریاں ہیں اور ہر طرف ریت ہے اور جھاڑیاں ہیں — سب اجاڑ ہے۔ اُس کے کانوں میں عجیب بولیاں ہیں او کسی اور سمے میں ہے جو اُس کا نہیں —

"ہیں —" کالیا اِس ٹھہرے ہوئے وقت میں سہجے سے بولا "یہاں سرسوتی تھا۔"

سرسوتی جو بڑے پانیوں کی ماں ہے
اور ساتویں ندی ہے
اِس کے پانی آتے ہیں
شاندار اور بلند آواز میں چنگھاڑتے ہوئے —

ورچن سرسراتی ریت میں ننگی ہوتی اینٹوں اور ٹوٹے ہوئے برتنوں پر نظر جما دیکھتا ہے کہ کیسے بندے کے بغیر ہر شے میں سے حیاتی ختم ہو جاتی ہے — یہاں لوگ کدھر گئے — یہاں کے ورچن۔ پاروشنیاں۔ سمرو اور پکلیاں کدھر گئے —

"بہن یا ہم بے ادبی کر رہے ہیں —" کالیا جھکا ہوا اُٹھا "ہم مُردوں پر بیٹھے پیلا پکیاں سُن رہے ہیں —"

"یہ —" مردان نے ہاتھ بڑھایا "مجھے دے دو"

"واہ — قربان —" کالیے نے ٹھیکری کو ایک مرتبہ پھر بوسہ دیا اور مردان۔ حوالے کر دی...

شوبھا کے چہرے پر رقم تھا کہ وہ بور ہو رہی ہے۔

برگیتا بھی اب اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے بیٹھی بظاہر مگن سُن رہی تھی۔

ڈاکٹر ارشد جیسے ایک ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔

مشاہد تھک چکا تھا اور سونا چاہتا تھا —

مردان کی جبین کی جیب میں ٹھہرا ہوا وقت تھا اور وہ اُس زمین کو تکے جا رہا تھا جس میں سے وہ وقت برآمد ہوا تھا۔

نمبردار ہاتھ باندھے سر ہلا رہا تھا اور گویتے جیسے وجد میں آ رہے تھے اور اُن کی

اُنگلیاں ہل رہی تھیں اور اُن کے سر سینوں سے اُٹھ کر اُوپر آسمانوں کو دیکھتے تھے جہاں سے ٹھنڈک اُترتی تھی...

اور دیکھتے دیکھتے وہاں سے آسمانوں سے ٹھنڈک کی بجائے روئی کے گالے اُترنے لگے۔

سفید سفید نرم آہٹ کے ساتھ وہ اُترنے لگے اور تین موسیقاروں کے سامنے گرنے لگے اور کالیا حواس باختہ ہو کر منہ کھولے اُنہیں بغور دیکھ رہا تھا اور وہ گالے نہیں آڑو کے سفید شگوفے تھے جو ٹپ ٹپ گھاگھرا کی خشک گزرگاہ پر جو اُن سب کے سامنے موسیقاروں کے سامنے تھی وہاں گرتے تھے اور رات کی سیاہی کو سپیدی میں بدلتے —

موسیقاروں نے اپنے ساز چھوڑے اور پہلی بار الاؤ کی روشنی کی زد میں آئے تو اُن کے چہرے نظر آئے جو اَن دیکھے تھے — شائد وہ ٹھیکریوں کی بستی سے آج کی رات کے لیے آئے تھے.. ٹھہرے ہوئے وقت تھے — ورچن۔ سمرو۔ ذورگا۔ پکلی اور پاروشنی تھے۔ جن میں سے ہر ایک کے اندر ایک مور بولتا تھا اور اُن میں جنگل میں ڈکارتے بھینسے کے ملاپ میل کرنے کی آس تھی... اُن کے پیراہنوں پر ریت تھی جسے وہ جھاڑتے ہوئے اُٹھے ... دور کے سفر سے آئے تھے — عجب چہرے تھے.. وہ تیز آندھی کے بعد جامن کی جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے اور آس پاس گرے سیاہ جامن چننے کا چاؤ رکھنے والے بچوں کی طرح پُر اشتیاق ہو کر اپنے سامنے گھاگھرا کی خشک گزرگاہ پر ٹپ ٹپ گرنے والے شگوفوں کو چننے لگے۔

"اوئے نمبردار —" کالیا گرجا۔

"جی سائیں —" وہ شتابی سے حاضر ہو کر دوہرا ہو گیا۔

"اوئے یہ پاگل خانے کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ سائیں — پیلوں پک گئی ہیں سائیں — اور یہ پیلوں چُن رہے ہیں —"

"پیلوں چُن رہے ہیں —" کالیا زیرِ لب بڑبڑایا اور اُس نے ڈاکٹر ارشد اور مشاہد کی طرف دیکھا جو اُس کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ بھی وُہی دیکھ رہے تھے جو وہ دیکھ رہا تھا — یہ وہ تھا جس کی اُن تینوں کو خبر تھی — لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مردان کو تجربہ ہے —

اور تب ایک شگوفہ اُس کے قدموں میں بھی آگرا —

یہ ہم ہیں —

ولیز جیپ ملتان روڈ پر تھی اور پھر چونگی امرسدھو تک پہنچی جہاں سے وہ نہر ے رواں ہو گئی۔ موسم میں گرمی کی شدت ظاہر ہو رہی تھی اور برگیتا بار بار اپنے گلے میں رومال ڈال کر پسینہ پونچھتی تھی۔

"شیل — مجھے ایک پرابلم میں سے باہر نکالو پلیز — میں سمجھ نہیں پا رہی" مشاہد ر سامنے دیکھتا رہا کیونکہ لاہور کی نہر کنارے سکون کی چھاؤں کے جزیرے تیز دھوپوں بدل چکے تھے.. اور اب ٹریفک بہت گھنی اور تیز رفتار تھی" پچھلی رات — صحرا میں ان گوئیوں کو نہیں سمجھ سکی۔ وہ پہلے تو جھکے ہوئے اور بے بسی سے بیٹھے ساز بجاتے رہے، پھر اُٹھے اور صحرا میں سے کچھ اُٹھانے لگے — وہ بہت بے اختیار کر دینے والی ی کی حالت میں تھے — وہ کیا اُٹھاتے تھے؟"

"سفید شگوفے —"

"وہائٹ بڈز —" برگیتا نے تھوک نگلتے ہوئے ایک بے یقین ہچکی لی "ایک صحرا یُو ڈونٹ مین اِٹ —"

مشاہد خاموشی سے جیپ ڈرائیو کرتا رہا —

"میں تم سے بات کر رہی ہوں —" وہ ذرا غصّے میں آ گئی "یہ کیسے ممکن ہو سکتا نصف شب میں..."

"اگر تم نہیں سمجھ سکتیں تو چپ رہو —"

مشاہد اتنا کٹیلا کم بولتا تھا لیکن اب وہ بہت تیز اور کٹیلے لہجے میں بولا تھا —

"نہیں یہ میرے لئے ممکن نہیں مشاہد — اور پلیز اتنا روکھا اور تیز جواب مت م مجھ سے الگ ہوتے جا رہے ہو — میں شکایت نہیں کرتی کیونکہ تم ہمیشہ سے ایک لگے ہو — اور میں یہ بھی نہیں کہتی کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے — وہ تم ہو لیکن میری اہمیت سکیم آف تھنگز میں گھٹتی جا رہی ہے — فار ہیونز سیک مجھے

یہ بتا دو کہ وہ کیا چُنتے تھے —"

مشاہد کی ویلیز جیپ نے نہر کو چھوڑا اور فیروز پور روڈ کی جانب اُترنے لگی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر پسینے سے بھیگے ہوئے ماس اور بڑے مساموں کی چھاتیوں والی محنت کش عورتیں سٹرابیریز سجائے قریب سے گزرتے ڈرائیورز کو رُکنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

"وہ — بہن یا کیا چنتے تھے مشاہد —"

مشاہد نے یکدم ہڑبڑا کر اُس کی جانب دیکھا اور ایک لمحے کے لئے جیپ توازن میں نہ رہی" یہ لفظ تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟"

"کونسا؟"

"یہ... بہن کے بارے میں —"

"زاہد سے — وہ اسے بہت خوبصورتی سے استعمال کرتا ہے —"

"یہ کوئی اتنا معزز لفظ نہیں ہے —"

"میں خود اتنی معزز نہیں ہوں —" برگیتا نے کندھے سکیڑے اور اتنی ہی روکھی اور تیز ہوئی جتنا کہ ابھی کچھ دیر پہلے نہر کے کنارے رواں دواں جیپ میں مشاہد ہوا تھا۔

کلمہ چوک میں داخل ہوتے ہی برگیتا پھر اُسی روکھے انداز میں بولی" میں ابھی گھر نہیں جاؤں گی —"

"کیوں —"

"مجھے سینڈوچز کے لئے کچھ ٹیونا اور مایونیز ساس درکار ہے.. مجھے ٹولنٹن مارکٹ تک لے چلو"

"یہ چیزیں تو ماڈل ٹاؤن مارکٹ سے بھی مل سکتی ہیں —"

"ہاں مل سکتی ہیں۔ لیکن میں — ٹولنٹن مارکٹ جانا چاہتی ہوں اِف یو ڈونٹ مائنڈ" اِس بار اُس کی ہچکی بھی غصیلی تھی۔

مال روڈ پر حسب معمول ٹریفک ٹھہری ہوئی تھی اور اُس پر کثافت کی سیاہی معلق تھی — مشاہد نے اُس کا ارادہ بدلنے کی قطعی کوشش نہ کی کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اُس میں سویڈش سرکشی جڑیں پکڑ چکی ہے...

"بہت بہت شکریہ —" وہ ٹولنٹن مارکٹ کے برآمدے کی جانب بڑھنے سے پیشتر بہت نارمل انداز میں بولی..

"میں انتظار کرتا ہوں —"

"نہیں — تم وہ اپنے فلکنگ وہائٹ بڈز اپنے پاس رکھو میں ٹیکسی میں واپس ں گی اور لنچ پر بھی میرا انتظار نہ کرنا —"

وہ یوں اُس سے جُدا ہوئی جیسے راستہ پوچھنے والا شخص یکدم چلا جاتا ہے۔

بند ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ربط کی رسّی میں تناؤ کم ہو رہا تھا — یہ سب کچھ بے اور بے سبب ہو رہا تھا۔ اولاد کا نہ ہونا کوئی جواز نہ تھا۔ کچھ اور تھا جو مُحبت کے ربط کو رکر رہا تھا...

شائد مُحبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جس کے پار جاتے ہی اس کی گرفت کم ہو ہے.... اور یہ حد کہاں سے شروع ہوتی ہے — پہلی داڑھ کے سفید بیسن میں گرنے آنکھوں کے گرد پہلی جھریوں سے یا بدن سے مکمل آشنائی کے بعد اُس کی یکسانیت

سات کمروں والی کوٹھی کے ڈھیلی چُولوں والے پھاٹک کے سائے میں وہ بہت دیر اُنگھ رہا تھا جب اُس کے پوتے نے اسے جھنجھوڑ کر کہا "دادا اُٹھ، صاحب آ گیا ہے۔"

"تم یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو — اندر کیوں نہیں گئے —" مشاہد جیپ سے اور برکت مسیح کے کندھے پر تھپکی دے کر پیار سے بولا "تمہاری بیٹی کا گھر ہے —"

"بس جی — وہ مالی صاحب نے تو بہت کہا تھا کہ اندر آ کر ٹاہلی کے نیچے لیٹ رہو مر بھی بے آرامی نہیں تھی۔ بہت سکھ میں بیٹھے ہوئے تھے میں اور میرا پوترا — یہ مسیح ہے ناں، میرے بڑے کا بڑا پتر..."

اقبال مسیح ایک ایسا لڑکا تھا... کم از کم وہ لڑکا دکھائی دیتا تھا — جو صاف ستھرے ے پہننے کے باوجود اپنی محرومی اپنی شکل پر سے ہٹا نہیں سکتا تھا — اُس نے آگے بڑھ برابری کی سطح پر مشاہد سے ہاتھ ملایا" میں بھی پھپھی برگیتا سے ملنے دادے کے ساتھ آیا ہے —"

ڈھیلی چُولوں والے پھاٹک نے کھولے جانے پر بہت واویلا کیا اور شور کیا۔ وہ اندر آ گئے "تمہاری پھوپی تو ذرا ٹھہر کے آئے گی —"

"یہیں بیٹھو —" مشاہد نے اُس کا کندھا تھام لیا" تم کیا کرتے ہو اقبال؟"

"یہ —" دادے نے فوراً اپنی سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرا "یہ میرا پوترا لیڈر ہے — ہاں جی — اب تو یسوع مسیح کا بڑا کرم ہے پر پہلے تو صاحب جی بڑی تنگی تھی تو اُن دنوں میرے بڑے نے... مجبوری تھی جی — اسے قالینوں والوں کے ہاتھ بیچ دیا — ایڈوانس پکڑ لیا دس سال کا — تو یہ ادھر کام کرنے لگا- پھر قانون آ گیا کہ زبردستی کی مجبوری جائز نہیں تو یہ آزاد ہو گیا — اب سکول پڑھتا ہے اور لیڈری کرتا ہے خیر سے۔"

"آپ اگر اجازت دیں تو میں کچھ کہوں پُوچھا —" وہ عمر میں بڑا تھا لیکن اس کا قد چھوٹا رہ گیا تھا — اُس نے ایک سکول بوائے کی طرح ہاتھ کھڑا کر کے اجازت چاہی۔

"بانڈڈ لیبر کے خلاف جب قانون آ گیا تو کارپٹ فیکٹری کے مالکان کو مجھے آزاد کرنا پڑا — میں وہاں صبح آٹھ بجے سے رات کے دس بجے تک ناٹس باندھتا تھا اور وہ مجھے کھانے میں صرف دال روٹی دیتے تھے.. چاچے نے ایڈوانس جو پکڑ لیا تھا- تو جب میں فیکٹری سے باہر آیا تو ایک غیر سرکاری ادارے نے مجھے پناہ دی — سکول میں داخل کیا اور مجھے تقریریں سکھائیں — تو اب میں بانڈڈ لیبر کے خلاف تقریریں کرتا ہوں... اور لیڈر ہوں جی — امریکہ بھی گیا ہوں — بوسٹن میں.. ہاں جی —"

"واقعی —" مشاہد شدید حیرت میں مبتلا ہوا کہ کامونکی کا ایک عیسائی لڑکا اور... لیکن.. جس طرح اُسے مشائلہ کے مستقبل میں جھانکنے کے لئے کوئی کرسٹل بال نہیں ملا تھا اور پھر چند برس بعد اُسی صوفے پر اُس کا سرنج زدہ بدن اور بدن کے بھوکے لوگ تھے اُسی طرح وہ کیسے یہ جان سکتا تھا کہ چند ماہ بعد اقبال مسیح قتل ہو گا اور غیر سرکاری ادارے کا سربراہ اس کی موت کو جواز بنا کر بے شمار غیر ملکی امداد حاصل کرے گا اور ملک کی کارپٹ انڈسٹری کو ٹھپ کروا دے گا — کیسے جان سکتا تھا۔

برکت مسیح نے پھر اپنی سفید مونچھوں کو مروڑنے کی کوشش کی "صاحب جی ہم باہر جا کر انتظار کر لیتے ہیں میم صاحب کا —"

مشاہد نے پھر اُسے کندھے سے پکڑ کر روک لیا" آپ یہیں بیٹھیں- میں چائے بھجواتا ہوں —"

اُدھر جہاں شیشم اور جامن کے گھنے درخت تھے جن کے نیچے وہ بوسیدہ کمرہ تھا جس کی چھت پر گھاس اُگی ہوئی تھی اور جو مردان کا پسندیدہ تھا اُدھر سے مالی شریف جھکا ہوا ہاتھ میں کھرپی پکڑے اور ایک اُنگلی پر پٹی لپیٹے ہوئے کہ گوڈی کرتے ... اس نے اپنی

پی سے اپنے آپ کو زخمی کر لیا تھا نظر جو کمزور ہو رہی تھی تو مالی شریف جھکا ہوا — م ہے نہیں، عمر سے جھکا ہوا آگے آتا گیا اور مشاہد چند قدم چلا اور اُس کے پاس پہنچ گیا — گھر کی چابیاں اُس کے پاس تھیں- مشاہد نے ہاتھ آگے کیا تو اُس نے اسے بہت ناگاہوں سے گھورا اور کچھ کہے بغیر — اُسے چابیاں تھمانے کی بجائے آگے آگے چلنے لگا — مستطیل بیڈ روم کے قریب پہنچ کر اُس نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا — آپ کے مہمان آئے ہوئے ہیں- کل رات کے"

"مہمان —"

باہر کی دھوپ میں جو چُندھیا دینے والی شدت تھی وہ برآمدے میں آ کر نرم پڑ گئی تھی اور جب کمروں کے اندر تک جانے کی کوشش کرتی تھی تو ناکام ہو جاتی تھی اسی لئے اندر ایک نیم سیاہ ٹھنڈک تھی- اُس صوفے پر جس کی پوشش پر بڑے بڑے زرد اور ... پھول تھے اُس پر وہ سرجھکائے بیٹھی تھی-

وہ کون ہو سکتی تھی —

تقریباً تمام کے تمام سفید بال، بہت صاف ستھرے باب کٹ سٹائل میں کٹے ہوئے گردن کو نمایاں کرتے تھے اور جن پر وِگ کا گمان ہوتا تھا- سیاہ سکرٹ اور سفید بلاؤز ایشیائی مہاندرہ.. اور وہ سرجھکائے بیٹھی تھی لیکن دروازہ کھلنے پر اس نے اطمینان سے اٹھا کر بالکل اپنے سامنے دیکھا...

"جی —" مشاہد نے صرف اتنا کہا-

"آپ کون ہیں؟"

"مشاہد —"

"میں فاطمہ ہوں —"

"جی —" مشاہد یکدم فیصلہ نہ کر پایا کہ کون فاطمہ —

"میں بابو کی بیوی ہوں — فاطمہ —" گود میں رکھا اُس کا ہاتھ آہستگی سے اُٹھا اُس کی اُنگلیاں کھل گئیں-

پرندوں کے پَر ہوا کو کھٹ کھٹ کاٹتے تھے اور ہوا مشاہد کے چہرے پر آتی تھی اور زور سے لگتی تھی کہ اُسے اذیت دیتی تھی-

شی اِز ناٹ مائی سسٹر —

شفق کی سُرخی میں رنگی ہوئی سُرخ بادبانوں والی کشتیاں —

اور یہ ہم ہیں بابو —

یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں — جوائے از اے تھنگ آف جوائے فار ایور — غلافی آنکھوں والا بابو اور یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں —

ٹرینٹ کے کنارے۔ سفید آہنی بنچ پر — آف وہائٹ بلاؤز۔ سفید کارڈیگن اور پلیٹ والے سیاہ سکرٹ اور ہائی ہلیز میں۔ نیم گھنگھریالے سیاہ بالوں اور کوئلہ سیاہ آنکھوں والی سرپرائز — دے گرل آئی وانٹ ٹو میری مشیل —

تم فاطمہ کو جانتے ہو ناں —

فاطمہ کو اس شہر میں کون نہیں جانتا تھا — اور کیا کیا کچھ نہیں جانتا تھا۔

چھوٹی چھوٹی کھلونا نما بادبانی کشتیاں ٹرینٹ کے گدلے پانیوں پر — کچھ یہاں — کچھ وہاں تیرنے لگیں اور اگر کوئی دیکھ سکتا تو چیری کا ایک شگوفہ بھی جو سائز میں اِن کشتیوں سے کئی گنا بڑا تھا اور وہ ایک سفید مہک والے بادبان کی طرح تھا اُن کے ساتھ تیرتا چلا جا رہا تھا۔

اور ایک شگوفہ بابو کے قدموں میں جہاں لمبا سیاہ سکارف اُلجھتا تھا، گرا —

فاطمہ اپنے سنڈے بیسٹ میں — سفید بنچ پر — ٹرینٹ کے کنارے اُنہیں اپنی جانب آتے دیکھتی ہوئی...

تم فاطمہ کو جانتے ہو ناں —

مشاہد نے فاطمہ کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھامنے کے لئے بہت زمانے طے کئے — بہت برس اُن میں سے گزرا اور واپس آیا اور واپس آیا تو سامنے سات کمروں والی کوٹھی میں بڑے بڑے زرد گلابوں والی پوشش کے صوفے پر — فاطمہ — اس کی جانب سر اُٹھا کر نہیں اپنے سامنے دیکھتی تھی۔ "لونگ ٹائم نو سی... بہت عرصہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں بہت عرصہ —." مشاہد نے کہا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کوئلہ سیاہ تھیں اگرچہ اُن کے گرد مہ و سال کے سیاہ حلقے تھے۔

"تم مشاہد ہی ہو ناں؟ — مشیل؟"

"ہاں —" اُسے کچھ شک سا ہوا —

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں دیکھ نہیں سکتی — اگر تمہیں ناگوار نہ گزرے تو ہاتھ تھامے رہو — میں بہتر محسوس کروں گی — میں بلائنڈ ہوں —"

سرخ بادبانوں والی کشتیاں — ایک اندھیرے میں —

"آئی ایم سوری —"

"میں اس فقرے کے گزر جانے کا انتظار کرتی ہوں — تاکہ گفتگو شروع کی جا... مجھے نابینا ہوئے پندرہ برس گزر چکے ہیں اس لئے یہ میری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں جب میں دیکھ سکتی تھی — تم میری جانب آ رہے ہو۔ تم ...ن — اور ایک جیسے لباس میں ہو۔ شائد بڑی دھاریوں والی تھری پیس سوٹس میں اور — مجھے یاد آیا — مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ لمبے لمبے سکارف قدموں میں اُلجھتے ہیں —" وہ ہنسنے لگی اور اُس کے دانت اب بھی بے حد سفید تھے۔ سفید باب کٹ ...میں اُس کے دانت بہت میچ کرتے تھے "ہاں جب میں دیکھ سکتی تھی تو مشاہد یہ آخری ...ہے جو میرے ذہن میں زندگی کے قریب لے جانے والا ہے —"

بابو راؤ پٹیل ایک ٹکسیڈو میں، پورے دانتوں کی مسکراہٹ کے ساتھ کیمرے کے ...ں دیکھتا ہوا اور اُس کا بازو تھامے دُلہنوں کے روایتی سفید لباس میں فاطمہ — اور وہ کیمرے کے لینز کے اندر بہت اندر اپنے سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں سے دیکھتی اور ...ئی ہوئی — لیکن وہ اُس لمحے صرف مشاہد کو دیکھ کر کہہ رہی تھی — میں اب اُوشا ...فاطمہ نہیں — اب تم کیا کہتے ہو۔

"تم اُوشا نہیں ہو؟"

"نہیں — اب میں پھر فاطمہ ہوں — اور کیا اس خبر پر تمہیں خوشی نہیں ؟"

اُس شادی کی تصویر کے بعد بابو اور فاطمہ یا اُوشا اس کے لئے وہ بلیک بک ہرن ...و بلند قلانچیں بھرتے سلو موشن میں ایک سیاہ جنگل میں سے آتے تھے اور پھر اُس میں ...جاتے تھے۔

"ہاؤ از بابو —؟"

"ہی از ڈیڈ"

بلیک بک ہرن قلانچ بھرتے ہوئے جیسے یکدم ریت پر گر گیا — اور ریت ہو گیا۔ شائد اُس کے پاؤں میں لمبا سکارف اُلجھ گیا تھا اس لئے وہ گر گیا۔ غلافی آنکھوں والا بلیک بک۔

اُس نے فاطمہ کے ہاتھ کو ایسے تھاما جیسے وہ خود گرنے کو ہو اور وہ گر جاتا اگر اُس نے اُس کا ہاتھ نہ تھام رکھا ہوتا — "کب؟"

"پانچ برس ہو گئے —"

"آئی ایم سوری —"

"ہاں — ہر آفت کے لئے بس یہی طریقۂ اظہار — آئی ایم سوری — آفت بڑی ہو یا چھوٹی بس یہی الفاظ — اور مشیل —" اُس نے اُس کا ہاتھ کو احتیاط سے ذرا دبایا "کیا تم سن رہے ہو؟"

"ہاں —"

"میں دریافت کرنا چاہتی تھی کہ کیا میں تمہارے گھر میں آج کی شب قیام کر سکتی ہوں — میں آئی تو تم نہیں تھے۔ تمہاری اجازت کے بغیر ایک رات ٹھہر گئی صرف اس لئے کہ.. اُس منظر کے لئے جب تم دونوں میری جانب چلتے آ رہے تھے — کل میری روانگی ہے"

"ہاں — ضرور — مجھے بہت خوشی ہو گی۔ میں بابو کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔"

"اور میرے بارے میں؟ —"

"اور تمہارے بارے میں —"

"تمہاری مخالفت کے باوجود ہماری شادی ہو گئی — تمہارے یہ کہنے کے باوجود کہ میں بہت تجربہ کار اور ہر مرد کے ساتھ سو جانے والی لڑکی ہوں — یہاں تک کہ.."

"پلیز —" مشاہد نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"آئی ایم سوری مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اتنے عرصے بعد نہیں — پلیز میرا ہاتھ تھام لو میں بالکل اندھیرے میں ہوں —" اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا اُس کے ہاتھ کی تلاش میں اور پھر چھونے پر اُسے تھام لیا "شکریہ — کیا تم واقعی یہ داستان سننے میں دلچسپی رکھتے ہو —"

"ہاں — بابو مجھے بہت عزیز تھا —"

"مجھے بھی —" اس کی کوئلہ سیاہ آنکھوں سے سیال سیاہی بہنے لگی "مجھے بھی" کچھ اور خاموشی جس میں پرندے اپنے پروں سے ہوا کو کھٹ کھٹ کاٹتے رہے اُن کی کترنیں ہوا میں اُن پرندوں کی طرح ہی تیرتی رہیں — اور وہ سنتے رہے۔

"تمہاری پہلی اولاد سیتا تھی — انگلینڈ میں — اُس کے بعد کچھ ہوا — ڈائیگنوز نہ ہو سکا کہ کیا ہوا — ایک ہفتے کے اندر اندر میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو گئی۔ بابو نے میرے لیے اتنی بھاگ دوڑ کی کہ مجھے اُس پر ترس آنے لگا — کیا ہوا جو میں بلائنڈ ہو گئی ہوں یہ دنیا کا خاتمہ تو نہیں ہے۔ مشیل میں اُس بیوقوف سے مُحبت کرتی تھی تم تو یقین نہ کرو گے لیکن مجھے قسم ہے اپنے قرآن اور اپنے دادا کے خیموں کی میں بہت شدت سے اُس کی مُحبت میں مبتلا تھی — کیا تم یقین کر سکتے ہو؟"

"ہاں — میں اُس وقت مُحبت سے ناواقف تھا —"

"شکریہ — تم جانتے ہو کہ پہلے وہ کبھی کبھار پیتا تھا — لیکن اُسے بہت غم ہوا اور وہ بہت زیادہ پینے لگا — وہ سارا سارا دن میرا ہاتھ تھام کر بیٹھا رہتا اور جو کچھ بھی آس پاس ہوتا اُس کی مکمل تفصیل بتاتا رہتا تاکہ مجھے اپنے اندھے پن کا احساس نہ ہو یہاں تک کہ وہ مجھے ایک روز دریائے ٹرینٹ کے کنارے لے گیا اور اُس سفید بنچ پر بٹھا کر کہنے لگا تم اب بالکل سامنے دیکھو اور تم دیکھو گی کہ میں اور مشیل دھاری دار سُوئٹروں میں چائے پیتے ہوئے لمبے سکارفوں میں اُلجھتے تمہاری جانب چلے آ رہے ہیں۔ اور مشیل یقین کرو میں نے تم دونوں کو دیکھا — وہ تم سے بے پناہ مُحبت میں تھا تم جانتے ہو —"

"ہاں —"

"تو وہ میرے دکھ میں تھوڑا سا الکوہلک ہو گیا۔ اس دوران مجھے لنکنز اِن میں داخلہ مل گیا — ہاں میں پہلی نابینا ایشیائی لڑکی تھی جسے وہاں داخلہ ملا تھا۔ ہاں — جس کے ماتھے پر میرے پیغمبر کا نام لکھا ہے وہاں — میں نے قانون کی تعلیم مکمل کی اور پھر پہلی ایشیائی بیرسٹر کے طور پر پریکٹس شروع کر دی۔ میں ظاہر ہے اکیلی تو کچھ نہیں کر سکتی تھی، بابو میرا ہاتھ تھا، میری آنکھیں اور میری وہیل چیئر تھا لیکن اُس کی شراب نوشی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ وہ ایسٹ افریقہ کے لئے زبردست ہوم سِک ہو گیا۔ میں نے اپنا پروفیشن اُس کے لئے چھوڑ دیا اور اُس کے ساتھ یوگنڈا چلی گئی۔ میرا بچہ وہیں پیدا

ہوا لیکن اب یہ وہ یوگنڈا نہ تھا جو بابو کے خیالوں اور جذبات میں گندھا ہوا تھا۔ انڈین لوگوں کے لئے اب وہاں جگہ کم تھی... وہ پیدا ہی افریقہ میں ہوا تھا لیکن حالات بدل چکے تھے اور اُس کے لئے بھی وہاں گنجائش کم ہو گئی تھی چنانچہ ہم ہندوستان شفٹ ہو گئے، بمبئی میں — سُنی کی پیدائش ہندوستان کی ہے۔ وہاں مجھے کچھ ذہنی دشواریاں پیش آئیں۔ ہندوستانی ایک غیر ملکی عورت کو ذہنی طور پر بیرسٹر کی حیثیت سے قبول نہیں کرپاتے تھے اور ایک اندھی بیرسٹر اُن کے لئے تضحیک آمیز رویّے اور مسکراہٹوں کے سوا کچھ نہ تھی۔ پھر مالی دشواریوں کا بھی آغاز ہو گیا — ایک مرتبہ پھر ہم نے انگلینڈ واپس چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں بھی نئے سرے سے پریکٹس شروع کرنا اور اپنے آپ کو مستحکم کرنا بہت مشکل ثابت ہوا۔ بابو کچھ بھی کرنے کے لائق نہیں رہا تھا وہ صرف بوتل سے دلچسپی رکھتا تھا اور یہی اُس کی واحد محبّت تھی... ہمیں روزانہ اخراجات کے لئے سوشل ویل فیئر پر انحصار کرنا پڑا.. یہ ایک قسم کی بھیک تھی اور میری عزت نفس بہت مجروح ہوئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر واپس ہندوستان — ذرا میرا ہاتھ چھوڑو میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں —"

اُس نے اپنا بیگ ٹٹول کر کھولا اور اُس میں سے ایک پلاسٹک کوٹڈ تصویر نکال کر مشاہد کی آنکھوں کے عین سامنے کی — تاج محل کے سامنے فاطمہ اور بابو — اور بابو ایک گنجا اور بدوضع شخص اگلے دانت ٹوٹے ہوئے، ڈھیلی پتلون اور چیک بش شرٹ میں لاتعلقی سے کیمرے کو دیکھ رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں جو غلافی تھیں اب بڑی ہو کر اُبلتی ہوئی لگتی تھیں۔ اُن دونوں کے ساتھ جینز میں ملبوس لمبے بالوں والے تین جوان ہوتے بچے تھے جو ماں باپ کی موجودگی سے کچھ بیزار سے لگتے تھے —" اُن دنوں جب یہ تصویر اُتری تھی بابو نے کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تمہیں اکثر یاد کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ایک دن میں لاہور جاؤں گا مشیل سے ملنے اور اُسی دھاری دار سوٹ اور لمبے سکارف میں جاؤں گا جو میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے — بس یہی کہانی ہے — تم کیا کرتے رہے؟"

مشاہد کو بہت دیر تک خاموش رہنا پڑا۔ اس کی زندگی کے اہم ترین کرداروں میں سے ایک ابھی ابھی موت سے ہمکنار ہوا تھا تو اُس کی موت کے احترام میں اُسے کچھ دیر تو خاموش رہنا تھا۔

"میں... ایک ہوزری فیکٹری ہے میری — لیکن میں وہاں کم جاتا ہوں۔ اور — اس سات کمروں والی کوٹھی میں اپنی بیوی برگیتا کے ساتھ رہتا ہوں — اور بس"

"بچے —"

"نہیں ہیں —"

"آئی ایم سوری —"

"پھر وہی فقرہ —" مشاہد پہلی بار ہنسا "اور کیا تم واقعی فاطمہ ہو —"

اُس کا جُھکا ہوا چہرہ بلند ہوا اور رنگین شیشوں میں سے جو مدھم دھوپ اندر آتی اُس کے نین نقش یوں واضح کرنے لگی جیسے تصویر کھینچ گئی ہو۔ وہ اِس مڈل ایج میں اُس کی نسبت کہیں زیادہ پُرکشش اور قابل تعظیم لگ رہی تھی —" ہاں مشیل — تم میری طرف کبھی نہیں دیکھتے تھے اس کے باوجود میں واقعی فاطمہ ہوں — اندھی سفید بالوں والی فاطمہ — اور میں جانتی تھی کہ تم ہماری شادی کے مخالف کیوں تھے۔ تمہارا نکتہ نظر سمجھتی تھی۔ لیکن میں مجبور تھی — کیا واقعی تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا میں ایک رات کے لئے تمہارے گھر میں ٹھہر جاؤں — میں تمہاری بیوی سے ملنا چاہوں گی —"

"وہ ابھی آ جائے گی اور فاطمہ تم —" اُس نے اُس کا ہاتھ تھام کر ہولے سے جیسے کسی عزیز سے بات کرتے ہیں اور کسی بچھڑے ہوئے دوست سے آبدیدہ ہو کر بات کرتے ہیں۔ اور دل کے کنوئیں کی تہہ میں جو ریت ہوتی ہے اُس کے قریب اس کی ٹھنڈک کو اُنگلیوں کی پوروں پر محسوس کرتے ہوئے اُس ریت کو کریدتے بات کرتے ہیں" فاطمہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ میں تم میں بابو کو دیکھتا ہوں —"

ایک بہت بڑا دھچکا تھا جس کے شاک میں سے وہ گزرا تھا۔ اس کمرے میں داخل ہو کر وہاں بڑے زرد پھولوں والے صوفے پر اسے منتظر پانا اور یہ جاننا کہ وہ ٹرینٹ کے سفید بنچ پر بیٹھی ہوئی فاطمہ ہے۔ ایک بہت بڑا دھچکا تھا جس کے بعد کے اثرات سے وہ ابھی تک گزر رہا تھا اور نارمل نہیں ہو پایا تھا۔

"تم نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ میں تم تک کیسے پہنچی —"

"یہ کافی ہے کہ تم پہنچ گئیں فاطمہ —"

مشاہد اُٹھا اور سوئچ بورڈ پر گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا اور دیر تک رکھا یہاں تک مالی اپنی طبعی بیزاری اور بدتمیزی کے ساتھ کمرے کے اندر آ گیا" کیا قیامت آ گئی اُس نے ناگواری کو چھپایا نہیں" میں پورچولاکا کی پنیری لگا رہا ہوں۔ اگر پانی پیچ کر نہ

دیا جائے تو مرجائے گی کھڑی کھلوتی — کیا کہتے ہو؟"

"بیگم صاحبہ کے لئے چائے لے آؤ —"

"پہلے اُن چُوڑوں کو چائے پلائی ہے جو پھاٹک کے ساتھ بیٹھے بی بی جی کا انتظار کر رہے ہیں.. پھر اُن کے جُوٹھے برتن کلمہ پڑھ کر پاک کئے ہیں اور اب..."

"یہ بیگم صاحبہ مسلمان ہیں —"

"اب ہوں —" فاطمہ نے ہولے سے کہا۔

شریف نے فاطمہ کے بلاؤز اور سکرٹ کو قدرے تشکیک سے دیکھا اور سرہلا کر جانے کو تھا کہ فاطمہ نے پھر ہولے سے کہا "مشل — میں چائے نہیں پینا چاہتی — تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں — پلیز"

"تم جاؤ —" — شریف نے فوراً اس مشورے پر عمل کیا اور چلا گیا۔

"تمہارے بچے کیا کر رہے ہیں؟"

"بیٹی کی شادی تو بابو کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی — وہ خوش ہے — شائد بنگلور میں ہے... یا اندور میں... مجھے پتہ نہیں —"

"وہ تم سے ملنے نہیں آتی؟"

"نہیں — وہ تینوں میرے بارے میں بہت مجرم محسوس کرتے ہیں — میں حالات کی مجبوری کے تحت اُن کی ماں تھی۔ خاص طور بیٹوں کے لئے میں بہت شرمندگی کا باعث تھی... وہ دونوں بی۔ اے کرنے کے بعد سنّی اور سنجے سٹریٹ پالیٹکس میں اِنوالو ہو گئے تھے — اور شو سینا کے بہت ڈائی ہارڈ ممبر تھے۔ کسی نے شکایت کر دی کہ اِن کی ماں ایک زمانے میں مسلمان تھی — اور یہ اُن دونوں کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ میں نے پارٹی کے دفتر میں جا کر اپنا شناختی کارڈ اور لاء کی ڈگری دکھائی اور حلفیہ بیان دیا کہ میں فاطمہ بن نصر اپنی رضا سے فلاں تاریخ کو بابو سے شادی کرنے کے لئے انگلستان میں — ساؤتھ ہال میں... شو مندر میں ہندو ہو چکی ہوں اور اب ہمیشہ کے لئے اُوشا ہوں... لیکن — وہ شک میں مبتلا رہے... انہیں ہمیشہ طعنہ دیا جاتا رہا کہ اُن کی ماں... مسلمان تھی اور وہ سراسر اور مکمل خون والے ہندو نہیں ہیں... اور یہی سچ اُن کو چُبھتا تھا اور اُنہیں بے آرام اور مجھ سے لاتعلق کرتا تھا — میرا امتحان مشل.. ہاں ہر شخص کی زندگی میں ایسے امتحان آتے ہیں جب وہ اپنے بنیادی عقائد اور اخلاقیات سے مکمل طور پر روگردانی کرتا ہے.. سمجھ لو

اپنی رُوح کو فروخت کر دیتا ہے، اپنے خون کے رشتوں کے لئے — تو میرا ایک امتحان اُس وقت ہوا جب وہ دونوں ماتھے پر تلک لگائے ایک جتھے میں شامل ہو کر بابری مسجد کو ڈھانے کے لئے چلے گئے.. اور... میں نے اُنہیں آشیرواد دی — رام مندر کی تعمیر کے آشیرواد دی — اس کے باوجود.." وہ روانی سے بولتی بولتی یکدم خاموش ہو گئی۔

وہاں جو پرندے منتظر تھے —

اپنے پَر سمیٹے ہوئے — انتظار کرتے تھے کہ کب یہ دونوں چُپ ہوں، خاموش ہوں اور ہم اُڑان کریں اور اس ہوا کو کھٹا کھٹ اپنے پروں سے کاٹیں اور وقت کی کُترنیں ہیں — ایک برس کی ایک کترن جس پر اُس برس کی زندگی تحریر ہو — ایک سیاہ کوئلہ آنکھوں والی لڑکی ٹرینٹ کے کنارے اور ایک غلافی آنکھوں والا بلیک بک — ایک کُترن تھی جس پر سُرخ بادبانوں والی ایک کشتی تیرتی تھی اور ایک کُترن پر ایک شگوفہ تھا...

"پھر بمبئی میں فساد ہوئے — تم آگاہ ہو گے — تب میں اکیلی ایک کھولی میں تھی۔ بیٹے کہیں اور رہتے تھے وہ میرے پاس آئے — اُنہوں نے لفظ "ماں" بہت ذلّت اور مصیبت سے ادا کیا اور کہا — تم یہاں سے چلی جاؤ — ہم بمبئی کو ایک ہندو شہر بنانا چاہتے ہیں — تم چلی جاؤ —

میں نے انہیں بھی بتایا کہ میں فاطمہ بن نصر... اپنی رضا سے — فلاں تاریخ کو... ہندو ہو چکی ہوں۔ میرا نام اُوشا ہے اور — میں کہاں چلی جاؤں۔

اُنہوں نے کہا، نہیں — ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ مشل، تمہارے بیٹے نہیں ہیں اور تم نہیں جانتے کہ بیٹے کس طرح ماں باپ کی جان ہوتے ہیں وہ میری جان ہیں مشل — کبھی کبھار وہ میرے پاس آتے تھے اور جب آتے تھے تو اُنہیں دیکھ کر میں اپنے اندر بہت ساری زندگی جمع کر لیتی تھی اور پھر جیتی تھی لیکن وہ ماتھے پر تلک لگائے سُرخ آنکھوں اور صدیوں کی نفرت سے مجھے دیکھتے تھے اور کہتے تھے... ماں ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے — اگر بیٹے ذمہ دار نہیں ہو سکتے تو کون ہو سکتا ہے مشل — مجھے بتاؤ کہ میں تو محبت کے لئے اپنے دادا کے خیمے کی پاکیزگی ترک کر کے... اپنا دین تیاگ کر بابو کے پاس آ گئی تھی اور وہ — میرے بیٹے، میری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے تھے..."

اُس کی کوئلہ آنکھیں اور اُن میں سے بہتی سیال سیاہی — وہ بدستور اپنے

سامنے، اپنے عین سامنے دیکھ رہی تھی اور اُس کی بے نُور آنکھوں میں سے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے... کوئی ایک لفظ مشاہد کے ذہن میں نہ آیا جو وہ کہے اور اُس کی کچھ تشفی ہو..... کہیں بھی کوئی ایک لفظ نہ تھا۔

"انسان ایک قید میں ہے یہ میں نے تب جانا — اپنے مذہب اور وطن اور اخلاق میں قید ہے اور بے بس ہے، وہ کچھ بھی کر لے، کہیں بھی چلا جائے اِن سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکتا — میں نے بیس برس بابو کے ساتھ گزارے، کوئی غیر اخلاقی رشتہ نہیں تھا، میاں بیوی کا رشتہ تھا اور اس کے باوجود میرا اصل تبدیل نہ ہو سکا۔ میں وہی رہی جو کہ میں تھی اور بابو وہی رہا جو کہ وہ تھا اور — مُحبّت کچھ بھی تبدیل نہ کر سکی۔"

دوپہر ڈھلنے لگی تھی اور جو شیشم۔ جامن اور شرنیہ کے درخت تھے اُس بوسیدہ اور گھاس بھری چھت پر جھکے ہوئے جو مردان کا پسندیدہ ٹھکانہ تھا اُن میں ایک پرندہ پہل کرتا ہوا اپنی بولی میں بولا — تو مشاہد نے پلٹ کر اُس رنگین شیشوں والی کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے وہ بولی اندر آئی تھی۔

برگیتا اندر آئی تو اس کی آنکھوں کو یکدم کچھ دکھائی نہ دیا.. کچھ سُجھائی نہ دیا — وہ سیدھی مشاہد کی طرف آئی اور پھر ٹھٹک گئی کیونکہ اُس نے کمرے میں ایک اور موجودگی محسوس کی تھی۔ تب اُس کی نگاہ سفر کرتی ہوئی، بوسیدہ قالینوں، پرانے فانوس اور بلند روشندانوں پر سے سفر کرتی زرد پھولوں کی پوشش والے صوفے تک پہنچی، سفید بلاؤز اور پلیٹ والے سکرٹ میں ملبوس ایک سفید بالوں والی اُدھیڑ عمر خاتون پر گئی — وقت کی ایک کُترن پر — اور وہ ٹھٹک گئی۔

"یہ فاطمہ ہے — میرے دوست بابو راؤ پٹیل — کی بیوی"

کون ہے — ٹھہرا ہوا وقت ہے۔

"ہاں —" ذرا توقف سے اُس نے سر ہلایا "ہاں۔ تم اِن کے بارے میں اکثر بات کرتے تھے — آپ کیسی ہیں؟" اُس نے ہاتھ آگے کیا۔

فاطمہ برس ہا برس کے تجربے سے جانتی تھی کہ کونسے لمحے اور کس لفظ کے اختتام پر ہاتھ یُوں آگے بڑھاتے ہیں کہ مخاطب جان نہیں پاتا کہ آپ اُسے نہیں دیکھ سکتے — اور اُس نے اُسی لمحے ہاتھ آگے بڑھا دیا.. گاڈ، شی از بیوٹی فل — برگیتا کے اندر حسد کی ایک لہر سی اُٹھی...

"فاطمہ — از بلائنڈ —" مشاہد نے فوراً کہا۔

"کیا؟" برگیتا سمجھ نہ سکی —

"فاطمہ — دیکھ نہیں سکتی — شی از بلائنڈ —"

"آئی ایم سوری —" وہی فقرہ فوراً آ گیا۔

"کیا تم سینڈوچز کے لئے ٹیونا اور مایونیز خرید لائی ہو —" مشاہد نے اُس کے ے کو دیکھا جس پر دوپہر کا کٹیلا پن کم ہو چکا تھا۔

"ہاں —" اس کی آنکھیں ابھی تک اُس خاتون پر تھیں جو اُس کے زرد پھولوں لے صوفے پر ایک پُر وقار اور پُر اطمینان انداز میں بیٹھی خلاء میں دیکھ رہی تھی۔ "اور ڈیڈی سے بھی مل آئی ہوں — میں نے بہت کہا لیکن وہ اندر آنے سے انکاری ہے۔"

"کوئی خاص کام تھا؟"

"ہاں — اُن کا ایک پوتا — جو میرا کیا لگتا ہے؟ — شائد بھائی کا بیٹا — وہ ں جو اُن کے ساتھ آیا تھا... ایک اور — وہ اُس کیس میں پکڑا گیا ہے جس کا اخباروں ہت ذکر ہے — بلاس فیمی کیس —"

"اسے مت چھوؤ —" مشاہد فوراً بولا "یہ بہت حساس مسئلہ ہے"

"میں تو نہیں چھونا چاہتی —"

"تو مت چھوؤ —"

"لیکن مشیل — ڈیڈی کہتے ہیں کہ اُن کا پوتا — یا میرا بھتیجا بالکل ان پڑھ ہے لہ کسی دیوار پر کچھ بھی نہیں لکھ سکتا — وہ کہتے ہیں کہ اس کیس میں کامونکی کا ایک داری ذی حسین ملوث ہے۔ یہ وہی حسین ہے جس کی قسمت کے ستارے تب روشن ئے جب 47ء میں کامونکی سٹیشن پر قتل کی گئی ٹرین میں سے ایک بڑھیا کے گٹھڑ سے اسے اُس نے بہت سارے کرنسی نوٹ حاصل کئے تھے اور ڈیڈی کہتے ہیں میں نے بھی لا کی مدد کی تھی۔ پتہ نہیں کیسے — اور اب وہی حسین بہت متحرک ہے اور کہتے ہیں پھانسی لگنی چاہیے —"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا —"

"اور انصاف کا کیا ہو گا؟"

"اس ملک میں؟ — کچھ بھی نہیں"

ایک فراموش وقت کی کُترن پر فاطمہ کا بڑھا ہوا ہاتھ ساکت ہو چکا تھا اور برگیتا اُ سے جتنی وقت کی کترن تھی اتنی دیر کے لئے غافل ہو گئی اور اُس نے مشاہد کے قریب کر اُس کی آنکھوں کی سطح پر جھک کر کہا" لیکن کیوں؟"

"اس لئے کہ بیٹے ماتھوں پر تلک لگا کر اپنی ماؤں کے سامنے کھڑے ہو گئے ہ — اس ملک میں بھی" وقت کی کُترن پر ساکت ہاتھ میں حرکت ہوئی تو برگیتا نے اُ دیکھا اور اس سے پیشتر کہ وہ پھر ساکت ہو جاتا اُسے تھام لیا "میں اپنے مسائل میں اُلجھ گ تھی اور.... مجھے معاف کر دیجیے —"

"اور بیٹے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اب ماؤں کے ذمہ دار نہیں ہیں... محبت کچھ بھ بدل نہیں سکی۔ خوشی کے لئے آپ جو کچھ بھی کر لو وہ تمہیں حاصل نہیں ہو گی۔ یہ ایک ہاری ہوئی دوڑ ہے — یاد ہے تم اور بابو پوائنٹ ٹو پوائنٹ ریسز کھیلنے جاتے تھے؟"

"ہاں —" مشاہد مسکرایا" مجھے ہارنے والے اپنے ہر گھوڑے کے سُم میں سے اُڑنے والے کیچڑ کی شکل تک یاد ہے"

"فاطمہ — آپ ضرور بہت ہی زیادہ حیران ہوں گی لیکن مشیل — نے بابو ہمیشہ یاد کیا ہے... میرے سامنے اور میری غیر موجودگی میں بھی —"

"اور مجھے —"

برگیتا نے اُس کے ہاتھ کو ایک قیمتی خزانے کی طرح تھپکا "میں آپ کو بھی جانت تھی —"

"برگیتا... اگر میں تمہیں تمہارے پہلے نام سے بلا سکتی ہوں تو... میں صرف اپ آپ کو یہاں ایک دو روز کے مجتمع کرنا چاہتی ہوں... مجھے فیصلہ کرنا ہے کہ اب مجھے — انگلستان جانا ہے یا کویت لوٹنا ہے۔ مشیل جانتا ہے کہ اب میں پھر سے تنہا ہوں.... اپ اندھیرے اور اپنی زندگی میں — تو کیا میں تمہارے گھر میں ایک دو روز قیام کر سکتی ہوں؟"

"آپ ہماری عزت نہیں کر رہیں فاطمہ —" برگیتا نے اُس کا ہاتھ نرمی سے دبایا" یہ تمہارا اپنا گھر ہے"

"اپنے آپ کو مجتمع کرنے کے لئے، کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے مجھے وہاں جانا تھا

دریائے ٹرینٹ کا ایک کنارا اب تک موجود ہے — مشیل — اور اُس کنارے پر وہ بنچ اب بھی ہے — جہاں کوئی — میری ماضی کی کترن پر ساکت تصویر سے آشنا

"تم دونوں ماضی کی بہت ساری کُترنیں اپنی اپنی یاد کی جیبوں میں سے نکالو اور اپنی یادوں کے جگ سا پزل کو اس طرح ترتیب دو کہ تصویر مکمل ہو جائے اور میں شام کے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ ہمیں فاطمہ کی آمد کو سیلی بریٹ کرنا چاہیے — کوئی خاص کھانا تم کھانا پسند کرو فاطمہ؟"

"ساؤتھ اینڈ میں جب پہلی بار میں بابو کے کمرے میں گئی تھی تو وہاں ایک عجیب اور بعد میں خوشگوار بُو تھی — اس میں لہسن اور اَدرک کی مہک تھی — بابو نے میرے لئے اَدرک گوشت کی کری خود بنائی تھی —"

"جنجر مٹن کمنگ اَپ —" برگیتا نے اُس کے ہاتھ کو پھر تھپکا اور اُسے اُس کے بازو پر ایسے رکھا جیسے ایک پیارے اور خوش رنگ پرندے کو احتیاط سے بٹھاتے ہیں اور پھر مشاہد کو دیکھتے ہوئے باہر چلی گئی۔ وہ نارمل ہو چکی تھی۔

"تمہاری بیوی تم سے کچھ برس جونیئر ہے؟"

"بہت سے برس —"

"مشیل —" فاطمہ صوفے کے بازوؤں پر ہتھیلیاں جما کر اُٹھی اور کھڑی ہو گئی — اُس کا بدن تین بچوں کو سوا دو برس تک اپنے اندر رکھنے اور سہنے کے بعد ڈھیلا اور پھیلا ہوا بدن تھا لیکن اُس کے سفید بالوں میں بریکٹ شدہ چہرہ ابھی تک دل کو تھامیں رکھتا تھا "میری جانب دیکھو —"

وقت کی کُترن پر جو تصویر تھی وہ اُسے اپنی جانب دیکھنے کو کہہ رہی تھی حالانکہ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔

"میں دیکھ رہا ہوں —"

وہ اُس کی آواز کی ڈور کو اپنی اُنگلیوں میں تھام کر چلتی ہوئی آگے آئی اور یوں آئی کہ اُس کا سر اُس کے — مشاہد کے سینے کے ساتھ لگ گیا۔ مشاہد نے اپنے بازوؤں سے اُسے اپنے قریب کر لیا اور اُس کے سفید بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے" میں اور کہاں تھا —"

"تم فکر نہ کرو فاطمہ — تم اب محفوظ ہو... میں.. اگر تمہارے بیٹے نہیں — تو میں ذمہ دار ہوں —" مشاہد کی سفید سلک شرٹ پر فاطمہ کی پلکیں جب بھی بند ہوتی تھیں تو اُن میں سے ایک سرمہ سیاہ سیال بہتا تھا اور اُس کی سفیدی پر سیاہ لکیریں نمودار کرتا تھا۔ اور اُس کی نمی مشاہد کے سینے پر گیلی ہو کر اُسے یہ پتہ دیتی تھی کہ وقت کی کترن پر جو تصویر تھی وہ زندہ ہو رہی ہے۔

سات کمروں والی کوٹھی کی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں میں سے جو مدھم روشنی اندر آتی تھی کہ دوپہر ڈھل چکی تھی اُس میں مشاہد اور فاطمہ کسی یونانی تھیٹر کے کھنڈروں میں ایستادہ ڈھلتی دھوپ میں کھڑے دو کورنتھئن بوسیدہ ستونوں کی طرح تھے جو اِک دوجے کے ساتھ لگ کر اس لئے کھڑے تھے کہ وہ گرنے والے تھے — وقت نے اُن کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا تھا اور وہ سہارے کے لئے ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے۔

لال سوہانڑا پارک میں جب بلیک بکس کو سیاہ ہرنوں کو اُن کا رکھوالا "ہوئے ہوئے" کہہ کر بلاتا ہے اور کنالیوں میں اُن کے کھانے کے لئے مکّی کے دانے، ڈالتا ہے تو وہ آس پاس کی جھاڑیوں اور صحرائی لینڈ سکیپ میں سے چوکڑیاں بھرتے آتے ہیں، اُچھلتے ہوئے آتے ہیں اور جیسے فضا میں آہستہ اور معلق ہو جاتے ہیں ایک لمحے کے لئے اور پھر ریت پر گرتے ہیں اور پھر چوکڑی بھرتے ہیں — ایسے بابو تھا، فاطمہ تھی، ماضی کی کترن پر چوکڑیاں بھرتے بلیک بک جو کچھ دیر کے لئے وہاں سلوموشن میں ہوتے معلق ہوتے ساکت ہو کر — پھر گر گئے۔

سرخ بادبانوں والی کشتیاں صحرا میں چل رہی تھیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن اُس کی کرنیں ابھی صحرا کی ریت میں جذب ہو کر منتظر تھیں کہ کب وہاں سے کوئی کشتی گزرے تو وہ اُس کے بادبانوں کو سرخ کریں، کب ایک بلیک بک قلانچ بھرے اپنے آپ کو زمین سے، صحرا سے آزاد کر کے فضا میں بلند کرے تو وہ اُس کے پھرتیلے معجزہ بدن کو روشن کر دیں — ریڈ سیلز اِن دے سَن سیٹ...

"میں گھر پہنچ گئی ہوں —" اُسے وہ مہک آئی جو دادا کے خیمے میں عافیت اور ابدی خاموشی اور صحرائی سکون کی مہک تھی۔

تم دونوں میری جانب چلنا شروع کر دو کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے —
مجھے سفید بنچ کا آہنی وجود چبھ رہا ہے کیونکہ میں بہت دیر سے انتظار میں تھی۔

تم دونوں کے لمبے سکارف قدموں میں اُلجھ اُلجھ کر ایسے آزاد ہوتے ہیں جیسے وہ اِن میں سے خوفزدہ ہو کر اُڑان کرنے والے پرندے ہوں۔

پانی پر نظریں جمائے رکھو تو وہ تمہیں بہا کر لے جاتا ہے — دور تک۔

اُن پانیوں پر جو کشتیاں تیرتی تھیں وہ صحراؤں کی ریت میں سے نکل کر آئی اُس کے دادا کے خیموں سے چھو کر آئی تھیں اور اُن کے بادبان سُرخ تھے۔ اور کے پہلو میں اُن کے حجم کے بڑے بڑے سفید شگوفے دریائے ٹرینٹ کی سطح پر تیرتے آتے تھے۔

"میرے بیٹے میرے سامنے تلک لگا کر کھڑے ہو گئے — محبّت کچھ بھی بدل نہ سکی"

اندر کوئی ہے؟

ہاں —

کون؟

ٹھہرا ہوا وقت — ایک کترن۔

برن کی قدامت میں بھی نہیں۔ پتھریلی گلیوں میں بھی نہیں اور ریچھوں کے مجسموں میں تو بالکل نہیں۔ کہیں بھی کوئی نہ تھا جو اس کے دُکھ اور غصّے میں شریک ہو سکتا۔

اُسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میں تمہاری مونچھوں سے اپنے بُوٹوں کے تسمے بناؤں گا — کیا ضرورت تھی۔ کسی کی انا کو اس حد تک کچوکے دینے کی کیا ضرورت تھی — لیکن وہ ایسا ہی تھا... اس نے جتنے دوست بنائے ایسے بنائے کہ وہ اس کے لئے جل مرے اور جتنے دشمن بنائے زندگی کے دشمن بنائے اور ان میں سے بیشتر کی انا مجروح کر کے بنائے۔

پچھلی شب ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں اس نے ہیڈ لائن سنی۔ وہ اپنا کلیئر ویجی ٹیبل سُوپ چھوڑ کر کمرے میں آگیا اور وہاں جتنی چینلز تھیں سب پر ایک ہی خبر تھی۔

پھر ایک لفٹ نیچے آئی۔ مشاہد اور مردان کے عین سامنے۔ اس کے پٹ سرکتے ہوئے ہٹ گئے۔ اور ایک لمحے کے لئے وہ جھجکا۔ کھلے عوامی سوٹ میں آستینیں اوپر ہوئیں۔ اس کی آنکھیں شائد بے خوابی کے باعث سُرخ تھیں اور وہ کچھ چبا رہا تھا۔

وقت ایک منت سماجت کرتی شٹل کاک برقعے میں لپٹی کسی ادھیڑ عمر عورت کا نہ — ڈیسٹنی کا تھا۔

اور اسے ڈیسٹنی کہاں لے گئی تھی — وہاں جہاں گھاس نہیں اُگتی۔

— I will make shoe laces out of your Moustaches — کہنے کی ضرورت تھی۔

ایک سیاسی جینیئس کا ایک تکبّر ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ ضرورت تھی؟

مشاہد سوئٹزر لینڈ میں تھا — ہوزری کی چند مشینیں خریدنے کے لئے لیکن — یں وہ خبر ملی جو ممکن نہیں لگتی تھی — ضیاء کی فی الحال کوئی حیثیت نہ تھی اور بھٹو کی ی اور اس کے باوجود اس نے اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کا اہتمام کر لیا۔ لفظ اہتمام" قابل غور ہے — آپ اگر پاور میں ہیں تو کچھ بھی "اہتمام" کر سکتے ہیں۔ ف جوق در جوق آئیں گے اور حلف اٹھائیں گے ... شہد کی مکھیاں تو بہت بعد میں پ کی لاش پر حملہ آور ہوں گی لیکن ابھی یقین دلایا جائے گا کہ ملزم ایک اچھا مسلمان ں ہے۔ چاہے یہ نکتہ متعلق ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ اہتمام کر لیا گیا۔

خیال تھا کہ ہمالیہ روئے گا لیکن ہمالیہ کو شائد اس سے بہتر اور بھی کام تھے۔

ہمالیہ کیوں نہ رویا؟ — جبر، کوڑے — وحشت — لیکن ان کے علاوہ وہ کوئی ا بھی رچرڈ آف دی ارتھ ہو — اپنی مونچھوں کو تسمے بنانے کی دھمکی کو اس لمحے ایک اہٹ کے ساتھ قبول تو کر لے گا لیکن موقع کے انتظار میں رہے گا — اور وہ رہا۔

ڈاکٹر ظفر نیازی نے اسے ایک ایسی غلیظ کوٹھڑی میں دیکھا جس میں ٹائلٹ والا کموڈ آتا تھا۔ اس نے — قیدی نے پروٹسٹ کیا "میری کچھ انا ہے۔ مجھے کچھ پرائیویسی ہے۔ میں سب کے سامنے اس کموڈ پر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"تمہیں بیٹھنا ہو گا۔"

اور اسے بیٹھنا پڑا —

اسے بہت یقین تھا کہ ہمالیہ روئے گا۔

لیکن ہمالیہ کیوں روئے — اس کے عزیزوں اور دوستوں نے ان کے ساتھ ت کر لی جنہوں نے اہتمام کیا تھا تو ہمالیہ کیوں روئے۔

بہرحال برن میں — کوئی بھی نہ تھا — جو اس کے دکھ اور غصے میں شریک ہو

وہ اسے ایک مدت سے جانتا تھا۔

جب کوکی سے کراچی کی میکلوڈ روڈ پر اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی اور اس کا سنہری والا شوفر مرسڈیز کا دروازہ وا کر رہا تھا تب سے جانتا تھا۔

ایک شب کوکی اسے ولیکاز کی ایک کاک ٹیل پارٹی پر لے گیا۔ وہاں بیچ لگژری کے ل ایک محل نما گھر تھا اور وہاں — ایک نوجوان بلند قامت وزیر صنعت آیا تھا اپنی

بلند قامت خوش شکل ساڑھی میں ملبوس ایرانی بیگم کے ساتھ — نوجوان وزیر ایک بے حساب اعتماد اور پوشیدہ رعونت کے ساتھ سب کے سروں سے اوپر کہیں دیکھتا تھا جیسے وہ اپنا مستقبل دیکھتا ہو — صرف چند برس بعد اسے وہاں جانا تھا جہاں پاکستان کا کوئی معمولی سے معمولی وزیر یا اعلیٰ افسر بھی نہیں گیا تھا۔ وہاں جہاں گھاس نہیں اُگتی۔

ہیلی کاپٹر گڑھی خدابخش کی جانب گیا تھا اور دونوں خواتین زیر حراست تھیں۔

تمام چینلز پر ایک ہی خبر تھی۔

مختلف بلیک اینڈ وہائٹ اور کلر تصویریں سکرین پر کھٹ کھٹ بدلتی جا رہی تھیں اور نیوز کاسٹر اپنی بے لاگ اور لاتعلق آواز میں تفصیلات بتاتے جا رہے تھے۔

برن عجیب شہر تھا۔ دن کے وقت یورپ کی جدیدیت کا خالص ترین نمونہ اور رات ڈھلتے ہی وہ پیچھے ہٹتا چلا جاتا اور مڈل ایجز میں پہنچ جاتا۔ مشاہد نے پردے ہٹا کر کھڑکی کو دھکیلا تو جیسے مڈل ایجز کی آہستہ خرام ہوا اندر آنے لگی جس میں ان گھوڑے پتھروں پر پڑتے سُموں میں سے نکلنے والی چنگاریوں، گھوڑوں کی لید اور آس پاس کے پہاڑوں پر گرتی ہوئی تازہ برف کی مہک تھی اور بُو تھی۔

ہاں اپریل تمام مہینوں میں سے ظالم ترین مہینہ تھا۔

سوس بستر دلدل کی طرح نرم اور موتیے کی طرح سفید جس میں انسان گر کر سنبھل نہیں سکتا... اسے اپنے آرام پر اختیار نہیں رہتا۔

پَر کٹے سیاہ پرندوں کی طرح بہی کھاتوں اور کتابوں کے جلے ہوئے ورق اگست کی گرمی کے دوش پر اٹھتے ہوئے — شاہ عالمی کا آسمان اور آگ کی گڑگڑاہٹ — ڈسٹ ان ٹو ڈسٹ اینڈ ایشز ان ٹو ایشز — تو اس کا نیٹ رزلٹ کیا ہوا۔ شائبہ شائبہ راکھ چہرے پر بیٹھتی ہوئی۔

بوسیدہ اور گلتی ہوئی گھاس قادر آباد کی جھیلوں کی سرد صبحوں میں بُو دیتی ہوئی صدیوں سے کناروں کے ساتھ لپٹی — کبھی ہوا کے زور سے پیچھے ہٹتی — لیکن یہ ابھی رہے گی۔ اس نے پہلی مرغابی پر ہاتھ رکھا تو اس کی پرواز کی حدت اس کے پروں میں سے ابھی خارج ہو رہی تھی اور ابھی اس کا گوشت گرم تھا — ہمیشہ ایسا ہوتا تھا۔ زندگی یکدم خارج نہیں ہو جاتی آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی نکلتی ہے اور یہ تو جاننا ممکن نہیں کہ اُن لمحوں میں دماغ بھی اُسی طرح سرکتا ہوا سرد ہوتا ہے یا اُس کی رفتار بدن کے ٹھنڈے ہونے کی

ذرا کم ہوتی ہے اگر کم ہوتی ہے تو وہ کیا سوچتا ہے؟... کیا ہمالیہ روئے گا — اُس لمحے آ جائے گا۔

کاسینو پلاٹز میں سوئس ایئر کے دفتر میں اسے اپنی اگلی صبح کی نشست معطل کروانے تو چنداں دشواری پیش نہ آئی۔ ایک میکانکی مسکراہٹ کے ساتھ "اینی تھنگ ایلس؟" لیکن جب اس نے ایک ہفتے کے بعد کسی بھی فلائٹ میں بُکنگ کی درخواست کی تو میکانکی مسکراہٹ ڈیپ فرِیزنگ کی برف کی طرح منجمد ہوئی اور یہ حیرت انگیز تبدیلی تھی کہ نوجوان ریسپشنسٹ خاتون کے ماتھے پر یکدم بوڑھی عورتوں ایسی عمر کی لکیریں ابھرنے لگیں اور وہ بالکل فریجڈ ہو گئی "سوری سر۔ وی آر فُلی بُکڈ" — مشاہد نے کاؤنٹر سے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر آ گیا۔

باہر دِن کا برن تھا۔ یورپ کی جدیدیت کا خالص ترین نمونہ۔

وہ ابھی — ان حالات میں پاکستان واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں کون تھا جو اس کا منتظر تھا — سوائے مردان کے جو فوج سے فارغ ہو کر ایک پرائمری سکول میں بچوں کا پڑھاتا تھا... اور کوئی نہ تھا۔ وہ بہت دیر بے دھیانی میں چلتا رہا۔ بغیر کسی مقصد کے، کسی چیز کو دیکھے بغیر — اس نے ایک پبلک بوتھ سے راڈنی ایزبرگ کو یوٹے برگ فون کیا — تم کہاں ہو مشیل؟ — اچھا — سویڈن کے اتنے قریب... بہرحال کافی قریب کم از کم یورپ میں تو ہو نا — آ جاؤ ایک دو روز کے لئے — تمہیں پتہ ہے برگیتا اب ہائی سکول میں جانے والی ہے... ہاں ہاں وہی بچی — تم اس رات میرے ساتھ تھے — ہاں — شائلہ از فائن۔ تم اگر آ سکو تو ہم تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔

وہ بُوتھ سے باہر آ کر بہت دیر تک سویڈن کو سوچتا رہا — لیکن نہیں — وہ کہیں بھی جانا نہیں چاہتا تھا... وہ کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بُوتھ سے ٹیک لگائے فٹ پاتھ پر کھڑے اور رواں ہجوم کو دیکھتا رہا — کبھی ان کے لباس کو کبھی چہروں کو اور کبھی صرف قدموں کو — اور پھر اس کے اندر ایک زمانے نے کروٹ لی اور اس پر وہ وقت آ گیا جب کوئی شخص اُس ایک کروٹ کی وجہ سے لمحۂ موجود میں یکدم بے وطن ہو جاتا ہے — اسے کسی مٹی، کسی موسم اور کسی رشتے کی خواہش یا تانگ نہیں رہتی۔ اس کے لئے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے صرف اس لئے کہ ہر شے بے معنی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قدم اٹھا لیتا ہے تو کدھر جاتا ہے؟ — کسی اور جہان میں — کسی اور کائنات میں

— اور اگر جاتا ہے تو کیا وہ جہان اور وہ کائنات مداوا ہو سکتی ہیں۔ لمحۂ موجود کی نسبت وہاں بہتری اور آسودگی ہو سکتی ہے — اس کے سامنے ٹرام سٹاپ پر ایک خاص وقفے کے بعد سوِس صفائی اور ستھرائی سے لشکائی ہوئی ٹرام رکتی تھی اور بہت بیزار اور نیوٹرل اور صرف اپنی ذات میں گم چہرے — لاتعلق ہر شے سے — اس ہوا میں جو اپریل کی تھی اور اس سرد ہوا سے جو برن کے نواحی پہاڑوں سے اتر کر کاسینو پلاٹز میں پھیلتی تھی — لاتعلق، ہر شے سے جُدا ایک میکانکی تنظیم سے جو سوِس قوم کا طُرّہ امتیاز ہے مُردہ اور تنہا لوگ ستھرائی لشکائی ٹرام میں داخل ہو جاتے تھے۔ لیکن فٹ پاتھ زیادہ دیر کے لئے خالی نہیں ہوتا تھا ان کی جگہ کچھ اور گونگے مجسمے۔ ڈمیز آ جاتی تھیں اور انتظار کرنے لگتی تھیں۔

اُن میں سے ایک ڈمّی کا رنگ گندمی تھا، بال سیاہ تھے... اور ایک پاؤں میں آتے سیاہ سکرٹ اور پھولدار بلاؤز میں اور چہرے پر وہی لاتعلق اور مُردہ کیفیت جو ٹرام کے منتظر بقیہ مسافروں کی تھی۔

اس پر وہ وقت آیا ہوا تھا جب کوئی شخص بے وطن ہو جاتا ہے لیکن اُس لاتعلق گندمی چہرے کو دیکھ کر اس کا تعلق ہوا اور وہ ایک نیم مخمور شخص کی طرح ہونٹوں کے کونوں میں سے پھیلتی مسکراہٹ کی بے بسی میں سڑک پار کر کے — اور سڑک پار کرتے ہوئے متعدد کاروں اور ٹیکسیوں کے ہارن سنتے ہوئے بھی لاپرواہ ہو کر وہ اس ایک شکل کی طرف کھنچتا گیا جس میں گندم کے رنگ تھے۔

"معاف کیجئے گا کیا آپ مسز حسین ہیں؟"

اس لاتعلق شکل نے کاسینو پلاٹز کی جدیدیت کے خالص ترین پس منظر کے ساتھ صرف ایک بار اپنی سیال آنکھوں سے اسے دیکھا — اور جواب میں کوئی جھجک نہ تھی "نو — آئی ایم ناٹ —"

"آئی ایم سوری — مشاہد کی شرمندگی نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا۔ یقیناً وہ جنوبی امریکہ کی کوئی سیاح خاتون تھی جس میں اسے اپنی گندم کے رنگ اور مہک کے دھوکے ہوئے تھے اور وہ سوچتی ہو گی کہ یہ شخص ایک عام فلرٹ ہے" آئی ایم ٹیری بلی سوری۔"

اس کے چہرے سے منہ موڑ کر وہ فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ پھر واپس سڑک کے پار چلا جائے یا وہیں کھڑا رہے کیونکہ سڑک کے پار بھی تو وہ کچھ نہیں کر رہا تھا صرف بُوتھ سے ٹیک لگائے ایک علیحدگی اور بے خبری میں سامنے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا —" کسی گندم کے کھیت میں جیسے اندر ہی اندر اس کی سنہری بالیوں کے اندر جب تیتر اور چڑیاں سونے کے ڈنٹھلوں میں سے اڑتے ہیں تو ان کے ہوئی گندم کے بوٹوں کے ساتھ کھینے سے جو سرسراہٹ جنم لیتی ہے ویسی آواز میں کسی ہا "معاف کیجئے گا — اگر میں مسز حسین ہوں تو کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

وہ مڑا — "ہاں"

"کیا آپ مشاہد ہیں؟"

"ہاں —"

"کیپٹن مردان خان کے بڑے بھائی؟"

"جی —"

"آئی ایم سوری —" "گندم کی بالیاں اب لاتعلق نہیں تھیں ان میں چڑیوں تیتروں کی اڑان کی سرسراہٹ تھی۔ اور ان کا تعلق تھا" مجھے ذرا احتیاط کرنا پڑتی ہے ٹس اے بگ سرپرائز ٹو سی یُو ہیئر اِن برن — مجھے تو یقین نہیں آ رہا —"

"مجھے بھی نہیں آ رہا —"

"یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا تو مناسب نہیں — کیا ہم کسی ریستوران میں جا ہیں؟"

کاسینو پلاٹز ذرا بلندی پر ہے اور نیچے اگر آپ سیڑھیاں اُتر کر برن کیتھڈرل کے ین سے دریا تک جاتی سیڑھیوں سے اتر کے نیچے جائیں گے تو وہاں گھنے اور بڑے گھیر ے سایہ دار درختوں میں اوپن ایئر ریستوران ہیں جہاں اپریل میں بہت کم لوگ بیٹھتے یونکہ دریا کے پانیوں کی برف سردی کی قربت جسم کو بے چین اور ریح کرتی ہے —

"ہاؤ اِز مردان؟"

"ہی از فائن — کراچی کے ایک پرائمری سکول میں بلامعاوضہ پڑھاتا ہے —"

"اُس نے آرمی چھوڑ دی ہے؟"

"ہاں —"

"کیوں؟"

"یہ صرف وہی بتا سکتا ہے.... لیکن.... ہی از فائن"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے قدرے بدتمیزی کے ساتھ آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا لیکن آپ میری پوزیشن کو جانتے ہیں۔ مجھے نہ جیتنے والے قبول کرتے ہیں اور نہ ہارنے والے — مجھے احتیاط کرنی پڑتی ہے — میں اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی تاکہ اپنے والد کو ڈینٹسٹ کے پاس لے جا سکوں... ان کے دانت بہت کمزور ہو گئے ہیں — جب میں نے آپ کو دیکھا — ہاں میں نے آپ کو سپاٹ کر لیا تھا آپ فون بُوتھ سے ٹیک لگائے بہت دیر سے وہاں کھڑے تھے اور آپ مسکرا رہے تھے — کس وجہ سے؟"

"کوئی وجہ نہ تھی۔"

"اور میں نے آپ کو پہچان لیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا — اینڈ ہاؤ از مردان؟"

"ہی از فائن —" مشاہد پھر مسکرانے لگا۔

"آئی ایم سوری —" مسز حسین کے مڈل ایجڈ چہرے پر نوجوان لڑکیوں ایسی شرماہٹ آئی۔" میں یہ سوال پہلے بھی پُوچھ چکی ہوں — لیکن مردان مجھے بہت عزیز تھا — بہت شاندار شخص — وہاں جتنے بھی آفیسرز تھے ان سب میں سے حسّاس اور — بہت ہینڈسم.... اور لاتعلق بھی —"

"لیکن وہ زیادہ دیر لاتعلق نہیں رہا تھا —"

مسز حسین کی سیال آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں کہ تم جانتے ہو — "مجھے وہ دن یاد ہے جب میں لاہور آئی تھی اور آپ — آپ مجھے اپنے موٹر سائیکل پر بٹھا کر چاروں کونوں میں لے گئے تھے۔ مجھے گلبرگ کا فوارہ اور شنگھائی ریستوران بھی یاد ہے جہاں ہم کھانے کے لئے گئے تھے۔"

"اینڈ وہاٹ اباؤٹ ایسٹ پاکستان؟"

"وہاٹ اباؤٹ اِٹ؟" مسز حسین کی بہتی ہوئی آنکھوں میں ایک ناپسندیدگی تھی جو نفرت کے کناروں کو چھوتی تھی" ایسٹ پاکستان از نو مور — تمہاری تاریخ تو اس کا حوالہ بھی نہیں دیتی۔"

"ہاں —" مشاہد میں وہی بے وطنی کی کیفیت پھر در آئی" ہاں — ہم نے اسے نصاب سے خارج کر دیا ہے جیسے کبھی کچھ بھی نہ تھا لیکن — مجھ ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کی تن بدن پر یہ حوالہ کھدا ہوا ہے... میرے اور خاص طور پر مردان جیسے بے شمار

— ایک ایک لفظ اور ایک ایک حقیقت کھدی ہوئی ہے۔"

"آپ کی اپنی حقیقت — مغربی پاکستان کی حقیقت —"

"نہیں میں اس مشترکہ جرم کا حصّے دار نہیں ہوں — لیکن آپ تو خود حوالہ

"

مسز حسین کے ماتھے پر کرونیں آئیں لیکن فوراً ہی ان کی جگہ ایک سب کچھ جان نے والی مسکراہٹ آ گئی" مجھے ایک بہت ہی طاقتور کافی کا کپ درکار ہے — جس میں آمیزش بھی ہو"

"آئرش کافی؟"

"ہاں — اور وہ بھی بہت زیادہ آئرش —"

آئرش کافی میں کافی کم تھی اور نپولین برانڈی کی شدت اور گرم گہرائی زیادہ۔

"تم کیسے اس — بقول تمہارے مشترکہ جرم کے حصے دار نہیں ہو — کیا تم مغربی پاکستانی نہیں ہو — تم سب تو بری الذمہ ہو گئے — اپنے اپنے کردار ادا کر الگ ہو گئے اور مجھے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔ میں بنگالی ہوں لیکن میں نے تمہارا ساتھ — تمہیں پتہ ہے کہ ٹائیگر نیازی ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت آموں کی پیٹیاں کر میرے گھر آ گیا تھا — تمہیں پتہ ہے؟"

یہ وقت نہیں تھا پوچھنے کا کہ وہ صرف آپ کے ہاں آموں کی پیٹیاں لے کر ہی آتا تھا —

"وہ ٹکا خان سے بہت بہتر جنرل تھا۔ کم از کم وہ بچر نہیں تھا کیونکہ بچر ہونے کے خاص قسم کے گٹس کی ضرورت ہوتی ہے — اور وہ اُس میں نہیں تھے — اگر ہوتے وہ اتنے اطمینان سے پلٹن میدان میں اپنی بیلٹ اور ریوالور نہ اُتار دیتا — ٹکا کبھی ایسا نہ تا — وہ اب کہاں ہے؟"

"کون؟"

"ٹائیگر —"

"آخری بار جب میں نے اُس کا نام سنا تھا تو وہ ایک سیاسی جماعت میں تھا اور جب ہر آتا تھا تو عوام شیرِ اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے —"

"میں جانتی ہوں وہ کس چیز کا شیر تھا —"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ اُن کے درمیان حائل ہوا۔

"لیکن ہم ڈنر کے لئے مل سکتے ہیں..." اُس نے کلائی پر بندھی گھڑ بے اطمینانی سے دیکھا" مجھے ابھی والد کو لے کر "ڈینٹسٹ کے ہاں جانا ہے —"

"اگر آپ چاہتی ہیں تو —"

"ہاں — اور ڈنر از آن می"

برن کا مہنگا ترین ریستوران بھی کاسینو پلاٹز میں تھا۔

ایک وسیع اور تھیٹر نما ہال جس میں ایک بہت بڑا گنبد تھا اور اس کے درج فانوسوں تلے سینکڑوں قطعی طور پر بیزار اور کسی بھی خوشگوار اور خوشی کے تاثر کو چہروں قریب بھی نہ لانے والے لوگ خوراک پر ایک فرض کی ادائیگی کے لئے گویا جھکے ہو تھے۔

"مجھے پاکستان سے نفرت ہے —" یہ پہلا فقرہ تھا جو مسز حسین نے کرسی پر بیٹھ ہوئے کہا اور اُس کے مختصر گندمی جسم کے ایک ایک پور میں وہ نفرت نہ صرف دکھائی د تھی بلکہ ناپسندیدگی کی ایک شدید مہک چھوڑتی تھی... "تم پہلے پاکستانی ہو جس کے ساتھ م نے — بنگلہ دیش بننے کے بعد بات کی ہے —"

"مجھے واقعی اس بات پر فخر کرنا چاہیے —" مشاہد کے گلے میں بہت کڑوا ذائقہ آیا.. یہ کیا کہہ رہی ہے.. میرا حق ہے پاکستان پر — میں اپنے وطن کو کچھ بھی کہہ سک ہوں — لیکن — لیکن — مسز حسین — اسے کیا حق ہے —

"مجھے اور میرے خاوند کو ایکسپلائٹ کیا گیا تھا — تم جانتے ہو کہ ہماری اپائنٹمنٹ ہو گئی تھی ایمبسڈرز کے طور پر — میں اِدھر اور مسٹر حسین اُدھر آسٹریا میں —"

"میں جانتا ہوں —"

"اور بھٹو نے ہماری تقرریاں کینسل کروا دیں — وہ فوآرے کے پاس ہوتا تھا"

"اُسے آج ہینگ کر دیا گیا ہے —"

"اور میں بہت خوش ہوں —"

"یہ پوچھنا مناسب ہو گا کہ کیوں؟ — آپ کیوں خوش ہیں —" اسے کیا ت ہے —

"اُس نے مجھے بے گھر کیا — مشاہد میں اپنے گھر نہیں جا سکتی کبھی بھی — میں ایمبسڈر کے طور پر آئی تھی اور اب اس ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے وئی جانتا ہے کہ میں کبھی ہرایکسی لینسی تھی۔ میں اب یہاں مقامی عدالتوں میں سوِس ت حاصل کرنے کے لئے منت سماجت کرتی ہوں کیونکہ میں کہیں بھی نہیں جا سکتی — لہ دیش نہ پاکستان۔"

بلیک بیوٹی سکڑ رہی تھی۔ شرنک ہو رہی تھی۔ عمر اُس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ کی گندمی رنگت میں سنہری ذرّے کم ہو چکے تھے اور سیال آنکھیں جامد ہونے کو

ویٹرس بل لائی تو مسز حسین نے اُس پر ہاتھ رکھ دیا "نہیں — تم میرے مہمان اور بل پر رکھے ہاتھ پر رگیں اور جھرّیاں ابھر رہی تھیں۔

وہ باہر آئے تو کاسینو پلاٹز ویرانی کے باعث بہت وسیع اور سرد دکھائی دے رہا تھا۔ کی ہوا دکھ اور سردی دیتی تھی۔

"پاکستان واپسی پر — کیا تم مردان کو ملو گے؟"

"وہ میرا بھائی ہے —"

"میں کم از کم تمہیں نہیں بتا سکتی کہ مردان میرے لئے کیا تھا —" مسز حسین کی یں اُوپر اُسے، مشاہد کو بلندی پر دیکھ رہی تھیں کہ وہ چھوٹے قد کی بہت مختصر مگر جامع ی خاتون تھی "اُسے آپ ایک مرتبہ پھر یہ کہہ دیجیے گا کہ کسی ایک رات جنگل میں... ھ دکھائی دیتا ہے، وہ شائبہ بھی ہو سکتا ہے وہ واہمہ بھی ہو سکتا ہے — اور اگر وہ ت تھی تو بھی یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ شائبہ تھا —"

جنگل میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے —

کسی ایک رات —

گمان بھی ہو سکتا ہے —

واہمہ بھی —

کاسینو پلاٹز میں چلتی ہوئی مسز حسین چلتی گئی کہ اُسے واپس نہیں آنا تھا — نہ یش میں — نہ پاکستان میں — وہ اب گمان تھی۔

April is The Cruelest Month of Them all.

ستار نقوی کی موت نے بچرز کو ایک عرصے تک بے آرام اور دکھی کیا۔ اُنہ نے اُس کے کھلے مُنہ اور اکڑے ہوئے بدن کو قبول نہیں کیا تھا ---

ایک عرصے کی بے آرامی اور دُکھ کے بعد ملیر کی نیم صحرائی کیفیت میں جب بچر کی کاریں مشورہ کرنے کی غرض سے رُکیں تو بہت دُھول اُٹھی اور جب یہ دُھول لاپرو کی آہستگی سے بیٹھ گئی تو پہلی شکل رحمان گل کی دکھائی دی بلکہ پہلی ناک کہنا چاہیے کیونکہ کہیں بھی اگر دھول اُٹھے اور اُس میں رحمان گل ملفوف ہو جائے تو اُس کے بیٹھنے اُس کی ستواں ناک پہلی شے ہو گی جو ظاہر ہو گی۔ "یارا آئی بیک آؤٹ۔ میں بزدل گیا ہوں"

"اوئے کیا بات کرتے ہو ہمارے ڈیئر پٹھان بچہ ---" صباحت نے اپنا زبانی پٹا چلایا اور لَے میں آ کر سُر میں ہو کر بولی "آپ کیسے بزدل ہو سکتے ہو؟"

"میں ہو گیا ہوں یارا ---"

"ہی ہی ہی ---" داؤد صرف ہنسا اور اُس نے اپنے چہرے پر سے دُھول پونچھ کے لئے دعا کے بعد کی طرح دونوں ہاتھ ماتھے سے لے کر ٹھوڑی تک پھیرے۔

"اگر رحمان گل بیک آؤٹ کرتا ہے تو میں اپنی سروسز آفر کرتا ہوں..." دانش ک گہری آواز ملیر کی گرمی میں اور صحرائی کیفیت میں جیسے آسمانوں سے اُتر کر اُن تک آئ "آفٹر آل ہم اب تو بیک آؤٹ نہیں کر سکتے۔ دو چار ہاتھ لبِ بام وغیرہ"

کمند علی خان ابھی تک اپنی کار سے باہر نہیں آیا تھا لیکن اب وہ باہر آیا اور چلّا ہوا آیا "واہ ہم نازک اندامو ں کو کراچی کی اس رطوبت بھری گرمی میں یہاں تک لائے اور اب کہتے ہیں کہ ہم بیک آؤٹ کرتے ہیں۔ نہ ہم نہیں کرنے دیں گے گل پٹھان --- قسم سے ہم اتنی بڑھیا ذات کے تلیر ہیں کہ آپ ہریان ہو جائیں ---"

نورالہدیٰ بھی ہمراہ تھی --- وہ ہنستی رہی پھر بیزار ہو کر بولی "واپس چلتے ہیں ---"

"گُڈ آئیڈیا ---" داؤد بے حد راضی ہوا "اُدھر جا کے اپنے انکل مردان سے عزتی جو خراب کروانی ہے تو ادھر ہی سے پسپا ہو جاتے ہیں --- گُڈ آئیڈیا"

"واپس چلیں اظہار؟" رحمان گل نے اب تک چپ ہر ایک کو "میں تمہیں کیا ہوں" خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے اظہار سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

"ہائیں ---" کمند علی خان بولے "تمہیں ہی تو اعتراض ہونا چاہیے اے مرد دانا فتح جھنگ ---"

"فتح جھنگ نہیں --- فتح جنگ" اظہار نے کمال بیزاری سے کہا اور اس بیزاری ئی دوسرا اُس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا" تم لوگوں کو اپنے جغرافیے کا بھی علم نہیں۔"

"واقعی تمہیں کوئی اعتراض نہیں اگر ہم سب بچرز انکل مردان سے وہ درخواست بغیر یہیں سے واپس چلے جائیں... اُن کی بیرک سے دو کلومیٹر ادھر سے ہی لوٹ جائیں رخواست کئے بغیر"

"ہاں ---"

"واقعی؟" رحمان گل انتہائی پُر مسرت ہو کر بولا۔

"ہاں ---" اظہار نے ناگواری سے اپنی داڑھی پر جمی گرد صاف کی "اگر میرے ت اتنے نامرد ہو گئے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

رحمان گل نے اپنے اولین ری ایکشن میں یہ فیصلہ کیا کہ اظہار کا گلا دبا دیا جائے یا پوائنٹ بلینک پانچ دس گولیوں سے ٹھنڈا کر دیا جائے کہ یہ شخص ایک پٹھان کو نامرد رہا ہے لیکن پھر اس نے اس کے بنجر اور انا کے پانیوں سے ہی زندہ رہنے والے منحنی و دیکھا اور یہ فیصلہ مؤخر کر دیا "ہم یارا جان مان قربان کر دیں گے اپنے یار پر --- ے زیادہ انکل مردان ہمیں پھانسی پر لٹکا دیں گے ناں --- تو لٹکا دیں --- آؤ۔"

اس "آؤ" کی کال پر تمام بچرز اُن تینوں کاروں میں شڑاپ شڑاپ گھُس گئے جن ے وہ ابھی ابھی نمودار ہوئے تھے اور پھر یہ تین کاریں تین بیرکوں کی جانب... گرمی کی کیفیت میں اور سر پر سے گذرتی فلائیٹ پی۔ کے نمبر 622 کو درگزر کرتیں، نہ چاہتے بھی دُھول اُڑانے لگیں۔

بیٹ مین بشیر برآمدے میں صاحب کے بوٹ پالش کر رہا تھا جب اُس نے دُھول

اُڑتی دیکھی اور جان گیا کہ اس کے اندر کی ایک نہیں ایک سے زائد کاریں ملفوف ہیں۔

"تم ذرا احتیاط کیا کرو بیٹے —" مردان اپنے گھنے اور سفید ہوتے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا، گرینڈ فادر کلاکس اور کتبوں میں قدم پھُونک پھُونک کر چلتا ہوا... کہہ رہا تھا اور اُس نے مڑ کر دیکھا کہ شوبھا وہاں ہے یا نہیں اور کیا وہ سُن رہی ہے یا نہیں اور شوبھا نے یکدم کہا "میں سُن رہی ہوں بابا —"

"تم اپنی فوکسی کو چیک پوسٹس پر تو روکتی ہو ناں؟"

"رُکنا پڑتا ہے بابا —"

"انہیں کیا کہتی ہو کہ تم کون ہو —"

"صرف کاغذات دکھا دیتی ہوں، کہتی کچھ بھی نہیں ہوں"

"ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔ بے شمار بنگلہ دیشی شہر میں مقیم ہیں، غیر قانونی طور پر، روٹی اور چار پیسے کمانے کی خواہش میں... پولیس انہیں گرفتار کر رہی ہے — ڈیپورٹ کر رہی ہے... مجھے ڈر لگتا ہے کہ کسی روز... اُن سے یہ نہ کہنا کہ تم بنگالی ہو"

"آج تک تو آپ یہی کہتے آئے ہیں کہ..."

"ہاں — لیکن اب نہیں — مجھے ڈر لگتا ہے" مردان نے ایک کتبے کی آرائش کو جھُک کر دیکھا اس پر کچھ دھوپ تھی جو بیرک کے سالخوردہ تختوں کی درزوں میں سے آ رہی تھی "اسے جھُک کر دیکھو —"

شوبھا جھُکی —

"ان سپاہیوں کو دیکھ رہی ہو — تلواریں اور شاندار لبادے، پتھر میں سے نکلتے ہوئے۔ سینکڑوں برس ملکی کی کسی قبر پر پہرہ دیتے رہے اور اب یہاں ہیں، بے کار اور بے مصرف، کسی بھی تاریخ کے بغیر — سپاہی کا اختتام اسی طرح ہوتا ہے —"

"آپ کو افسوس ہوتا ہے بابا؟"

"نہیں — میں نے اپنے آپ کو پتھر میں ساکت کر کے کسی قبر پر پہرہ دینے سے روک لیا ہے —"

کرنوں کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ پتھر کے سپاہیوں میں سے صرف ایک کے خدوخال روشن ہو رہے تھے... اُس کی شکل میں مردان کے مہاندرے کی شباہت تھی۔

"میں نے بھی ایک تلوار دیکھی تھی —" مردان جھُکا ہوا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس

ی کو "جیسور میس کے ڈائننگ ہال میں دیوار پر آویزاں ایک شاندار، بھاری اور زنگ تلوار جس کی ایک تاریخ تھی۔ اس کا بیکار لوہا سینکڑوں برس سے خون کا ذائقہ بوش کر چکا تھا — وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ انسان کے بدن کے اندر جاتا ہے اور دور پہلے وار کے زور پر جاتا ہے تو انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا، وہ چند لمحوں کے لئے بے خبر ہے اور پتہ تب چلتا ہے جب یہ لوہا اُس کے جسم سے کھینچا جاتا ہے — تب خون کی بوند نمودار ہوتی ہے۔"

"بابا" شوبھا نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اُن کے علم میں آ گیا وہ اب دور تک جائے گا اور ایسی باتیں کرے گا جو اُس کے علم میں نہیں ہیں... اُن میں جنگل تھا اور کچھ شائبے تھے، کسی ایک رات میں۔ گمان بھی ہو سکتا تھا اور واہمہ بھی بابا اکثر بھٹک جاتے تھے۔

وہ دونوں اُس کتبے پر جھُکے رہے جس میں کنول کے پھُولوں کے درمیان لمبے ں والے پہرے دار تلواریں سونت کر ساکت ہو چکے تھے۔

"تلوار چلانا بہت آسان ہے —" مردان نے پیچھے مڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا جس کا اُن کے کندھے پر رکھا اُسے سکون دے رہا تھا "لیکن تلوار سہنا کیسا ہے — یہ تو کوئی بتا سکتا —"

جنگل میں لالٹین کی مدھم اور گم ہوتی پھر سے تیرتی واپس آتی روشنی میں — عورت ناکافی ساڑھی میں لپٹی سر جھُکائے یوں بیٹھی تھی جیسے ڈرائنگ کے پیریڈ میں علموں کے سامنے ایک ماڈل بے حس و حرکت اپنے آپ کو بمشکل ساکت کئے بیٹھا ہے تاکہ پنسل کا کوئی سٹروک آگے پیچھے نہ ہو جائے —

سب ایک قطار میں بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے — جنگل میں۔

بیٹ مین بشیر بدستور بُوٹ پالش کر رہا تھا اور ابھی تک وہ کاریں جو ایک سے زیادہ اور بیرکوں کی طرف آتی دُھول اُڑا رہی تھیں — اُس دُھول میں پوشیدہ تھیں۔

مردان نے اپنے کندھے پر رکھے اس بہت ہی آرام دینے والے مرہم جیسے ہاتھ جو ڈھلکا تھا اس پر اپنا ہاتھ رکھا "بہرحال تم احتیاط کیا کرو —"

"بابا — وہاٹ اباؤٹ آپا عارفین؟"

وہ دونوں اب بھی یہیں تھیں۔ نازنین اور عارفین — عارفین ہفتے میں ایک بار

ڈیفنس کے ناریل والے گھر میں جاتی۔ کاروں کو دھونے اور پالش کرنے والا شخص ابھی تک لاعلم تھا کہ بیگم بابر فوت ہو چکی ہیں اور اب اس گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ وہ اپنے وقتِ مقرر پر آتا۔ صابن پالش اور ٹاکیوں سمیت اور پوری دل جمعی سے کاروں کو دھو۔ پالش کرتا اور چلا جاتا۔

عارفین صرف اپنے جہیز کا سامان دیکھنے جاتی۔ کارٹنز میں پیک شدہ ڈِنر سیٹ، کراکری، ڈیپ فریزر، ساڑھیاں، شاہ طوس کی شالیں — ایرانی قالین — دیکھتی اور پھر ملیر کی بے آرام اور گرم بیرکوں میں واپس آ جاتی۔

”وہاٹ اباؤٹ ہَر؟“

”آپ اُن سے شادی کریں گے؟“

اُس کے خوش شکل وقت سے متاثر ہونے والے چہرے نے مڑ کر دیکھا شوبھا کی طرف ”میں تو ابھی تمہاری شادی کی فکرمندی میں ہوں —“

اور ڈھول میں ملفوف کاریں ظاہر ہوئیں۔ بیرکوں کے سامنے اُن کی بریکیں لگیں اور اُن میں سے تمامتر بچر ز برآمد ہوئے، اُنہوں نے حیرت سے اُس ویرانے میں اُر رہائش گاہ کو دیکھا جس میں وہ پہلی بار قدم رنجہ فرما رہے تھے اور جہاں بچر ز میں سے ایک — شوبھا رہتی تھی۔

برسوں کا کھایا ہوا لکڑی کا دروازہ کھلا تو بہت ساری روشنی بیرک کے اندر گئی جس سے بہت سارے پتھر، کلاک اور گُل بوٹے روشن ہو گئے۔ انہوں نے کاروں کے رُکنے کی آواز تو سن لی تھی لیکن مردان نے بھی اور شوبھا نے بھی پہلے ناگواری سے کہ یہ کون مخل ہوا ہے اور پھر حیرت سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

اور پیچھے تمامتر بچر ز مجرم بنے کھڑے تھے۔

شوبھا کو یقین نہ آیا۔

”کیسے؟ — تم نے مجھے کیسے تلاش کر لیا؟“

بچر ز بہت ہی مجرم محسوس کرتے ہوئے بدستور گُنگ کھڑے رہے۔

”کیسے؟ — رحمان گل — نُور — صباحت یار کیسے؟“

”میں بولوں؟“ رحمان گُل نے گویا تمامتر بچر ز کی جانب سے اجازت چاہی اور اُن سب نے ایک رضامند خاموشی سے سر ہلائے۔

”سر —“ رحمان نے گلا صاف کر کے بیان شروع کیا ”انکل مردان سر — ہم یہاں حاضر ہوئے ہیں تو ایک بہت ہی نیک اور پاکیزہ مقصد کے لئے حاضر ہوئے ہیں — مگر یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ویسے تو اختیار اُس ذات کا ہے لیکن ہم بندے جو ہیں... تو بس اسی لئے حاضر ہوئے تھے —“

مردان نے انہیں جانچا — بیوقوف سے بچے، ابھی زندگی کے فریب کو نہیں جانتے تھے ”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پہلے سب لوگ کچھ کھا پی لو — چائے — کریم کیک یا... یہاں بیرکوں میں زیادہ چوائس نہیں ہے... اور پھر ہم زندگی اور موت کے بارے میں بات کریں —“

مردان کو — شوبھا کو — قطعی طور پر اندازہ نہ تھا کہ اگلا فقرہ رحمان گل کا کیا ہو اور اگلا فقرہ تھا ”اظہار اعوان شوبھا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور ہم — سفارش کرنے آئے ہیں...“

مردان نے اس ہجوم کو دیکھا جو سفارش کرنے آیا تھا۔

کوئی بھی باپ — کسی قسم کا بھی... بہت لاپرواہ، شرابی، جواری، بہت ساری بیٹیوں کا باپ کوئی بھی باپ جب پہلی بار یہ سنتا ہے کہ کوئی اور ہے جو اس کی بیٹی کو لے جانا چاہتا ہے تو وہ سناٹے میں آ جاتا ہے۔ اُسے یقین نہیں آتا کہ اس کی بیٹی کو ایک اور بیہودہ اور ناموزوں سا دکھائی دیتا شخص لے جانا چاہتا ہے، ہمیشہ کے لئے۔ چنانچہ مردان کا ردعمل بھی یہی تھا ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“

بچر ز سارے کے سارے جو لاشوں کے بیوپاری تھے جو انسانی بدن کو ادھیڑ کر اُسے ٹانکے لگا کر سیتے تھے، جو دل کی شریانوں کو بدل کر راستے بناتے تھے وہ سارے کے سارے لاہوری محاورے کے مطابق بکری ہو گئے، مکمل طور پر — گُنگ اور بے چارے اور خاموش ہو گئے۔ اور تب مردان نے صورت حال کو سمجھا اور قدرے نرمی سے ایک بار پھر کہا ”واقعی یہ تم... کیا بکواس کر رہے ہو“

ہر طرف خاموشی تھی۔

کوئی بھی بولنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

تب اظہار اعوان نے بغیر کسی تردد کے اپنے تمامتر بے پرواہ رویتے کے ساتھ آگے بڑھ کر کہا ”سفارش کی کوئی ضرورت نہیں سر۔ میں ایک معزز اور شریف خاندان

سے تعلق رکھتا ہوں جس کے پاس زمین کم ہے اور عزت نفس زیادہ — سر میں کوشش کروں گا کہ شوبھا کو خوش رکھ سکوں۔"

مردان نے فوراً ادھر دیکھا جدھر شوبھا تھی۔ کتبوں اور گرینڈ فادر کلاکس کے درمیان کہیں — کرنوں کی زد میں آنے والے کسی منقش پتھر کے پاس شوبھا تھی۔

"شوبھا —"

اور اُس نے چونک کر دیکھا جیسے سُندر بن کی پہنائیوں میں اُسے کسی درندے نے آلیا ہو۔

"جی —" اُس نے صرف اتنا کہا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" مردان اب بھی سخت غصے میں تھا اور مخالف تھا کسی بھی ایسے بندوبست کا جس کے نتیجے میں وہ اُس سے جدا ہو سکتا تھا۔

سارے بیچرز دم بخود کھڑے تھے۔

مقدمہ پیش ہو چکا تھا۔

اور اُن سب میں سے زیادہ سکون والا چہرہ اظہار کا تھا — اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔

"مجھے کچھ اندازہ نہ تھا —" بالآخر شوبھا بولی۔

"مجھے بھی نہ تھا —" اظہار نے تیوڑی چڑھا کر کہا۔

"تو پھر..." مردان نے اُن بیچرز کی موجودگی میں، کلاکس، سنگی تعویزوں اور بیرک میں سٹور شدہ دوسرے سامان کی موجودگی میں شوبھا کی طرف دیکھا۔ شوبھا نے اپنے بابا کو جھجکتے ہوئے دیکھا تو اُن کی آنکھوں کے کنارے بھیگتے تھے اور لگتا تھا کہ وہ سانس بھی آرام سے نہیں لے رہے۔ "مجھے پتہ نہ تھا کہ مجھ پر یہ وقت بھی آئے گا۔"

جن کتبوں پر گھیرے دار لباسوں والے تلوار باز سپاہی ساکت تھے اور بیرک کے تختوں میں سے بچ نکلنے والی زرد دھوپ میں اُن کے چہرے ڈرپوک ہوتے تھے کہ اُن کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور رُکے ہوئے وقت کے آس پاس — دم بخود بیچرز کے گرد اور شوبھا جسے کسی درندے نے آلیا تھا اور مردان جس کی آنکھوں میں پانی بہت تھے — وہاں رطوبت بھری بے چین گرمی میں ناریل کے تیل کی مہک تھی اور پام کے درخت جب تیز ہوا سے جھکتے چلے جاتے ہیں تو اُن کے چیرویں پتوں میں سے جو ہوا بلند سرسراہٹ کے ساتھ نکلتی ہے تو وہ شور اتنا تھا کہ پوری بیرک اس مہک دار سیلاب میں ڈوبنے لگی۔

اس کے بال اس کی پشت پر جھومر ڈالتے بلند ہو ہو کر گرتے تھے جب وہ چلتی دور ہوتی تھی اور مردان اسی طور — اس لمحۂ موجود کی طرح آنکھوں کے بھیگے ن میں سے اُسے جاتا دیکھا کرتا تھا۔

باہر ابھی تک بدامنی بہت تھی
لیکن مردان مسز حسین کی سینکچری سے نکل آیا تھا...

اُس شام جب مسز حسین اسلام آباد سے آغا جی کے چارم سے ہپنوٹائز ہو کر لوٹی اور اپنے بدن پر جو کچھ تھا اُسے بہا لے جانے والے پانی کی یاد میں ایسے مسکراتی تھیں خود بھی ہپنوٹائز ہو گیا تھا — اُس کی آنکھوں کے سامنے جتنے منظر تھے وہ یکسر بدل جنگ کی لینڈ سکیپ میں جتنے درخت، کھیت اور چہرے تھے اُن کے مفاہیم بدل گئے، خود اپنے آپ سے ہراساں اور خوفزدہ ہو گیا۔ صرف دو چار روز پیشتر وہ اس پ کو ایک مختلف نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ان لوگوں کے بدن ایک برسٹ کی آماجگاہ اور ہاں تک پسلیوں سے ٹکرائے بغیر اندر تک جاتی ہے — اور جنگ ایک مقدس شے ۔ تو مردان پر منظر بدل جانے والا لمحہ تب آیا جب مسز حسین — باہر کی ہولناکیوں ود... ایک پورے ملک میں بھوک اور خون کے باوجود کس لاتعلق اطمینان سے، ے آغا جی کی بھنوؤں میں جو سیکس اپیل تھی اُس کے بارے میں لجا لجا کر بات کرتی وہ اُس لمحے اُس شکنجے میں سے نکل آیا جس میں اُسے وطن کی محبت۔ ڈیوٹی اور لی زنجیروں سے جکڑا گیا تھا.... اب ایک اور لمحہ آنے کو تھا جب ایک زنگ آلود لڑکو اتنی سرخی دیتی ہے کہ وہ بقیہ عمر اُس سرخی کو بھول نہ پایا تھا — لیکن اُس لمحے وہ مسز حسین کا شکر گزار بھی تھا جنہوں نے اُسے ایک ٹریپ سے آزاد کر دیا۔

مولوی احتشام الدین آلتی پالتی مارے چپ چاپ اور بہت دیر تک ہارمونیم کو ر انگلیاں جمائے بیٹھا رہتا —

اُن کا اپنا گھر اس کے بس سے باہر ہو رہا تھا۔ ڈھاکہ میں۔ نواکھلی اور باریسال اور جیسور میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کیسے آنکھیں بند کر کے اُس سے لاتعلق ہو سکتا باغ کو جب آگ نے کھایا ہے اور اُس میں پولیس کے لوگ جلے ہیں تو اُن کی بُو

صرف ڈھاکہ میں تو نہیں پھیلی تھی — یہاں اس جھونپڑے میں بھی تو آئی تھی۔

مولوی احتشام الدین اب بھی اپنے پاکستانی مسلم عقیدے پر قائم تھا لیکن اُسے ہم وطنوں کے جلتے ہوئے جسموں کی بُو بہت پریشان کرتی تھی۔

گاؤں میں لوگ اعتراض کرتے تھے — پاکستانی فوجی — ادھر نہیں آنے کا احتشام الدین... بیچرز — ان کو صرف زمین چاہئے۔

مہرالنساء بھی بہت خاموش رہتی تھی — اس کے بالوں میں اُٹھنے والی ناریل کے تیل کی مہک اگرچہ اب بھی مردان کو کچھ عجیب سی لگتی تھی لیکن وہ منتظر اُسی مہک کا رہتا تھا۔

آپ کی جان کو ادھر خطرہ ہے کپتان صاحب — آپ ادھر نہ آیا کرو — تھوڑا دن ٹھہر جاؤ پھر اللہ کو منظور ہو گا تو پھر میل جول ہو گا۔

سبھی تو ٹائیگر نہیں ہوتے کہ مسکراتے ہوئے اطمینان سے اپنے رینک اُتار کر میز پر رکھ دیں، اپنا ریوالور دوسرے کے ہاتھ میں دے دیں۔ اُن میں سے بہت سارے ایسے بھی تھے جنھوں نے حکم عدولی کی... اپنے آپ کو دشمن کے سامنے بے لباس نہیں کیا اور ایک وحشت اور بے چارگی اور بے بسی کو اپنے اندر کچلتے ہوئے بیرکوں سے نکل کر نامانوس اور دلدلوں کی طرح منتظر جنگلوں کی گھنی موت کے اندر چلے گئے۔

مردان بھی اُن میں سے ایک تھا۔

وہ ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔

وہ بھی ان جنگلوں کے نیم تاریک گنجلک اور موت منتظر سناٹوں کے اندر کئی دن تک ایک نیم وحشی جانور کی وحشت سے چلا — دانت نکوسے — غراتا ہوا اور کانٹے دار جھاڑیاں اور سوکھی ٹہنیاں اُس کی وردی کی دھجیاں اُتار اُتار کر اپنی زیبائش کرتی رہیں اور ننگے بدن پر خون کی لکیریں کھینچتی چلی جاتی تھیں — بھوک اور پیاس سے نڈھال لیکن ایک جانور کی طرح وحشت میں گم گرتا پڑتا اور خون آلود ہوتا — کبھی ایک سسکی نکو... ہوئے دانتوں میں سے جب کوئی زخم مزید گہرا ہو جاتا — داڑھی کے بال تیز نوکیلے بانس کی کونپلوں کی طرح بڑھتے چلے جاتے تھے اور اُن پر پسینے کے قطرے زیادہ دیر ٹھہرتے نہیں تھے، نوکِ خار پر لرزاں شبنم کی طرح... بہ نوکِ خارے رقصم — اُس کے بُوٹوں کا چمڑا گیلا اور بوسیدہ ہو کر اُس کے پاؤں کی جلد سے جڑ جاتا اور پھر اُسے ادھیڑ کر جنگل میں نکل...

...جاتا۔

وہاں کوئی راستہ نہ تھا۔

کدھر جانا ہے اس کا بھی کوئی تعین نہ تھا —

جہاں جہاں جن ڈالیوں اور پتوں پر اُس کے خون کے دھبے لگتے جاتے تھے اگر اُن ...روشنی ہوتی تو یہ جنگل ازل سے ابد تک لو دینے لگتا۔

ایک نیم تاریک خلا تھا جس میں وہ ایسے چلتا اور بھاگتا جا رہا تھا جیسے ماضی میں واپس ...ہو، اُس کا قد مختصر ہو رہا ہو — درختوں کی چوٹیاں لحظہ بہ لحظہ بلند اور بہت اُوپر ہوتی جا ...تھیں۔ زبان مُردہ بُو دیتے بدن کی طرح پھول رہی تھی اور وہ اُسے بہت دِقت اور ...ے منہ کے اندر دبائے چلتا تھا دانت نکوستا ہوا... اس پر اس عالم میں بہت ساری ...تیں وارد ہوئیں۔

گھاس، پھول بُوٹے، جھاڑیاں، درخت جن کی کوئی شکل کوئی ہیئت نہ تھی سوائے ...ے اور پتوں کے اور ان کی ایک سُرنگ تھی جس میں وہ تیرتا چلا جاتا تھا — سمت کے ...کے بغیر۔ دن یا رات کے حساب سے الگ۔ موسموں سے ماورا — تیرتا چلا جاتا تھا ...ن کی ہتھیلیوں کے ساتھ کانٹے دار بُوٹے اٹکتے تھے اور بدن پر بھی جھالروں والی ...مور چھل کی طرح جھلی جاتی تھیں اور یہ بھی ہوتا تھا کہ اُس کے پاؤں کوئی پانی کا ...جکڑ لیتا تھا اور پھر فوراً گرفت ڈھیلی کر دیتا تھا اس زور کی وجہ سے جو مردان کے بدن ...ور کرتا تھا جہاں جہاں اسے ٹانکے لگے ہوئے تھے اُن ٹانکوں کو ادھیڑتا تھا۔

جب ہریاول کی سُرنگ اختتام کو پہنچتی تو وہ خلاء میں بے آواز اور آہستگی سے ...لگتا۔ صرف اس خلاء کے رنگ سبز اور گہرے سیال تھے — وہ اس میں ناک اُونچی ...کے تیرنے کی کوشش کرتا کہ کہیں وہ اس میں غرق نہ ہو جائے۔ اور کبھی وہ نیچے بھی ...اور خلاء کا سیال سبزہ اس کے بدن کے اندر داخل ہو جاتا اور اُسے غوطہ آ جاتا اور وہ ...تا ہوا زور لگاتا اور پھر سے سطح پر آ کر تیرنے لگتا۔

دن اور رات کا کوئی حساب نہ تھا۔

انسان کا بدن جو کچھ — اور کیا کیا کچھ سہار سکتا ہے اس کا بھی کوئی حساب نہ تھا۔

چوہدری اللہ داد کے باکس کیمرے میں سے تصویریں نمودار ہوئی تھیں، تیز ہوا ...ٹھہرے ہوتے درخت اور... اور وہ اُس کے اُوپر دوہرے ہوتے تھے — ہو بہو وہی

تصویریں — یہیں — یہاں پر — ناریل کے جھومتے دوہرے ہوتے درخت تیز و تند سائیکلونی ہواؤں میں کیسے دوہرے ہوتے ہیں اور اُن سے ٹپ ٹپ ناریل گرتے ہیں، نیچے ریت ہو تو دھنستے ہیں پانی ہو تو ڈوب جاتے ہیں۔ اِن فلک بلندیوں تک جاتے درختوں، ہواؤں میں سنسناتی جھاڑیوں اور اُن کے اندر دن یا رات کے حساب سے الگ پناہ لیتے والے درندوں کے آس پاس سے اگر کوئی حیوان نما انسان دانت نکوستا بڑھی ہوئی پسینہ آلود داڑھی اور بدن پر تیز خراشیں خون کی لئے بھاگتا ہے ایسے کہ اُس کے پاؤں کے ساتھ پانی کے سانپ لپٹتے ہیں تو وہ درندے بھی ڈر سے دبک جاتے ہیں اور حملہ نہیں کرتے ایسا ہوا اور متعدد بار ہوا کہ مردان نے ان کی آنکھیں شعلہ بار — جلتی ہوئی دیکھیں — اُسے دیکھتی ہوئیں اور اُن میں ڈر تو تھا اور تعظیم بھی تھی۔

وہ درندے بھی جانتے تھے کہ وہ اپنی انا کے لئے بھاگ رہا ہے — اور ٹائیگر نہیں جانتا تھا۔

ہاں اُن کی جلتی ہوئی آنکھیں اس کے بدن کو داغتی تھیں جیسے کسی گھوڑے کو سرخ دہکتے لوہے سے داغتے ہیں۔

چنانچہ سفر کے اختتام پر — اگرچہ ابھی اُس کے گمان میں اختتام نہ تھا لیکن اس کے اختتام پر وہ شمار کر سکتا تھا — اپنے داغ گن کر حساب لگا سکتا تھا کہ کتنی آنکھوں نے اسے دیکھا اور داغا ہے۔

نہ اسے ہوش تھا۔ نہ پرواہ کہ اس فرار کا کونسا دن ہے یا رات ہے — جو بھی زمانہ تھا اس میں کب اُس کے بدن سے اس کی وردی کا آخری چیتھڑا الگ ہو کر گرا — اور وہ آزاد ہو گیا۔

بھاگتا ہوا آزاد، مردان، ہانپتا ہوا، دانت نکوستا، ناریل کے جھکے ہوئے درختوں کے اندر ایک تقریباً کبڑا ہو چکا انسان بھاگتا تھا صرف اس لئے کہ اسے کسی سرینڈر کی میز پر نہ بیٹھنا پڑے۔

اس کے بعد جھاڑیوں میں پوشیدہ جلتی آنکھوں والوں نے اسے دیکھا تو اپنا جانا — وہ اُن جیسا ہی ہو چکا تھا سوائے ایک فرق کے — کہ وہ پوشیدہ ہونے کی چاہت کو فراموش کر چکا تھا اور صرف دور ہونا چاہتا تھا۔ صرف چند کلومیٹر ادھر — بارڈر کی قربت میں — جہاں جنگل چھدرا ہوتا ہے اور جہاں اگر اُوپر سے دیکھا جائے تو ایک کبڑا ہو کر

بدن دریدہ حیوان صاف نظر آ جاتا ہے، پوشیدہ نہیں رہ سکتا وہاں — وہاں انہوں نے گھیرے میں لے لیا —

وہ اُس جنگ کا پہلا ہارا ہوا سپاہی تھا جس کی وحشت اور درندگی کو ایک جال ڈال قابو میں کیا گیا۔

ایک جانور کی طرح پکڑا گیا۔ وہ قابو میں نہ آتا تھا —

پہلے وہ قابو میں نہ آتا تھا۔ اب آیا تو بے بسی سے ایک کونے میں سمٹ گیا۔

اُس آہستہ رو ٹرین کے ایک ڈبے میں جو اُسے بقیہ جنگی قیدیوں کے ہمراہ ہندوستان کے اندر کسی نامعلوم کیمپ میں لے جا رہی تھی وہ اُس کے ایک کونے میں بھی بے بسی سے سمٹ گیا۔

کیمپ میں بھی وہ سب سے جُدا رہا۔

کچھ وہاں ایسے تھے جو اُس جیسے تھے۔

لیکن کچھ ایسے تھے جو نامناسب سہولتوں کے حوالے سے احتجاج کرتے رہتے تھے۔ خوراک میں کیڑے نکالتے تھے — رکتوں کا سائز اتنا چھوٹا کیوں ہے — گوشت کی کوالٹی اچھی نہیں ہے۔ کچھ ابھی تک نہیں جانتے تھے کہ وہ کس پوزیشن میں آ چکے ہیں اُن کا مذاق اُڑاتے تھے — کچھ نے واپسی پر کتابیں لکھنی تھیں۔

جن کے نام جنگی مجرموں کی فہرست میں آ گئے وہ دماغی توازن کی کمی بلکہ شدید کمی کا شکار ہو گئے لیکن وہ — ایک کونے میں سمٹا بیٹھا رہا۔

وہاں سے بھاگنا فرار ہونا بہت آسان تھا — پیچیدہ نہ تھا۔

ایک نیم حیوان کے لئے کچھ پیچیدہ نہ تھا۔

لیکن وہ وہاں سے نکلا تو ویسا نہ تھا جیسا تاڑ اور ناریل کے جھکے ہوئے درختوں، جھاڑیوں اور سلگتی آنکھوں اور پاؤں سے اُلجھتے پانی کے سانپوں میں تھا کہ سمت کا حساب تھا نہ دن رات کا کوئی پیمانہ نہیں —

لیکن اب وہ جانتا تھا کہ وہ کدھر کو جا رہا ہے — اُسے اپنی سمت کا پتہ تھا۔

گھڑی دو گھڑی میں یہ کیا ماجرا ہو گیا —

ماجرا بس یہی ہوا گھڑی دو گھڑی میں کہ جب وہ گیا تھا تو اپنے وطن سے گیا تھا اب یہ ملک کوئی اور تھا۔ اپنی تمامتر فراخ دلی کے باوجود وہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اب

بنگلہ دیش ہے۔

بنگلہ دیش میں پہلے بدامنی بہت تھی اور اب اس کے ساتھ بربادی بھی بہت تھی۔ یہاں جو سالا پونزابی کے لئے گہری جان لیوا نفرت کی شدت تھی اور اب اس کے کچھ جواز اُن کے پاس تھے اور کچھ مہیا کر دیئے گئے تھے اور وہ اپنی جان کو اس خدشے میں ڈال کر اِدھر آیا تھا — اُدھر نہیں گیا تھا۔ **پاکستان کی طرف**

نصف سے زیادہ مولوی احتشام الدین کا گاؤں بھی سوختہ تھا۔ ناریل کے پیڑ جُھلسے ہوئے تھے۔ تالاب میں صرف کیچڑ تھا —

سارے کا سارا الزام ہارے ہوئے کو جاتا ہے لیکن — ہندوستان کے لئے یہ ایک فیلڈ ڈے تھا۔ وہ ایک قوم کی تاریخ سے روگردانی اور لاعلمی اور آغا جی ایسے سینکڑوں دماغوں کی وجہ سے چیمپئن بن چکا تھا۔ اُن کا وزیر دفاع جگ جیون رام خود کہتا ہے کہ ہم نے ایک لاکھ تیس ہزار بنگالیوں کو پاکستانی فوج کے خلاف لڑنے کی ٹریننگ دی ہے۔ ڈاکٹر ترگونہ سین نے اگرتلا کے باغیوں کو باقاعدہ ایک ریڈیو ٹرانسمٹر تحفے میں دیا — سوادھن بنگلہ بیار کیندرا کا آغاز ہوتا ہے — انڈیا ہیڈ اے فیلڈ ڈے، تھینک یو آغا اینڈ ریسٹ آف دی ٹائیگرز —

تو اُس سوختہ گاؤں میں اور ناریل کے جُھلسے ہوئے پیڑوں میں بہت احتیاط برتتا مردان دبے پاؤں اُس جھونپڑے کی طرف جاتا تھا جہاں سے اُسے ناریل کے تیل کی ناگوار مہک آتی تھی لیکن وہ اُس کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا —

جب اس نے جھونپڑے کا دروازہ دھکیل کر اندر جھانکا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائے۔ مہرالنساء بھی اور مردان بھی...

مہرالنساء جو ایک چٹائی پر لیٹی تھی اس نے کروٹ بدل کر اُس کی جانب دیکھا اور اُس کی وحشت اور بے ترتیب داڑھی میں سے اسے الگ نہ کر سکی — تو اُس کا مہرالنساء کا پیٹ سندر بن کے چیتے کا ہموار پیٹ نہیں تھا — اس کے اندر شوبھا تھی۔ کس کی تھی؟ کسی کی بھی — ایک وار بے بی کا تعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔

مولوی احتشام الدین کسی الشمس البدر یا کسی باہنی کے تقدس یا وطن پرستی کے کام آ چکا تھا۔ اور مہرالنساء اُس جھونپڑے میں ایک چٹائی پر لیٹی اس جنگی بچے کے باہر آنے کا

ھر تھی... جو کسی کا بھی ہو سکتا تھا —

مہرالنساء صرف دو چار روز بعد بے حد آسائش سے شوبھا کو پیدا کر کے بے حد آسودگی سے مرگئی۔ مردان کو یہ نام پسند تھا، شوبھا!

ان دنوں کون پوچھتا تھا کہ صاحب آپ ایک نومولود بچے کو اُٹھائے کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ اسی لئے مردان سے بھی کسی نہ پوچھا — نہ ہندوستان میں دوبارہ داخل ہوتے اور نہ بہاولپور کی طرف سے پاکستان میں اندر آتے — کسی نے نہ پوچھا۔

سات کمروں والی کوٹھی دسمبر کے یخ اور گھنے اندھیرے میں تھی اور صرف ایک کھڑکی کمرے کے اندر روشن بلب کی وجہ سے اس اندھیرے سے الگ ہوتی تھی۔ وہ شوبھا کو سینے سے لگائے جنگی کھتّی کی بلند باڑ کو ایک جانور کی طرح ہی پھلانگ گیا۔ اُسے انسان کا روپ ترک کئے ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں... وہ اِس کھڑکی کے قریب ہوا یہاں تک کہ اندر کے بلب کی روشنی جو شیشوں سے گزر کر پھیکی ہو جاتی تھی اس کے چہرے پر آئی — اور کوئی دیکھتا جیسے ایسے جب وہ دانت نکوسے بھاگتا تھا جھاڑیوں میں پوشیدہ اندھیروں میں تو درندوں کی جلتی آنکھوں نے دیکھا تھا — ایسے اس کی بانس کی کھردری کونپلوں والی داڑھی میں سے اُس کی آنکھیں دہک رہی تھیں — کمرے کے اندر مشاہد نے شکاری بیگ میں کافی فلاسک کو ایک طرف کر کے کارتوسوں کا ڈبہ رکھا اور بیگ کی زِپ بند کر دی — زِپ کے چلنے کی مختصر سرسراہٹ کے بعد کمرے میں خاموشی ہو گئی لیکن اُس یکلخت خاموشی میں کچھ تھا جس نے مشاہد کو چوکنا کر دیا۔ اُس کا ہاتھ پڑی بندوق پر گیا لیکن اُس نے اسے اُٹھانے سے گریز کیا اور صرف کھڑکی کی طرف نگاہ کی — Missing Beleived Killed کی سرکاری اطلاع پر کون اعتبار کرتا ہے۔ جب تک ایک اُجڑا ہوا بدن اور کھلا منہ نہ دیکھ لے کون اعتبار کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ چوکنا ہوا تو ایک شکاری کی طرح نہیں جو گھات میں ہو بلکہ ایک جانور کی طرح جس کی جانب شکاری بڑھ رہا ہو — وہ دم سادھے پڑی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا — کیا یہ ممکن ہے کہ ہیر کو تو ایسا کوئی نہ ملا جو گئے ہوؤں کو موڑ لے آتا ہو لیکن وہ خود آ گئے ہوں۔ رانجھا جوگی بن آیا ہو۔ اور وہ Missing Beleived Killed نہ ہو — اگر چوکھٹ پر جوگی ہے تو صدا کیوں نہیں دیتا۔ ایک دوہائی کی کُوک مشاہد کے سینے میں سے اُٹھی، پلٹی اور اُس کے اندر ہی

اندر گنبد کی صدا ہونے لگی لیکن باہر خاموشی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ رانجھا جوگی بن آیا ہو۔

باہر لاہور کے دسمبر کی یخ بستہ رات کا راج تھا اور بلب کی روشنی جو شیشوں کی رکاوٹ سے مدھم ہوتی تھی کھڑکی کے پٹ کھلنے سے باہر آئی تو وہاں جوگی کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں الاؤ جلتے تھے۔

"بھائی جان —"

Missing Beleived Killed پر کون اعتبار کرے۔

"بھائی جان میں تو حیران پریشان — جنگل بیابان"

"مردان —"

"جی بھائی جان —"

"کھڑکی کے راستے تو تم اندر نہیں آ سکتے — دروازہ تو ادھر ہے"

"میں آ سکتا ہوں بھائی جان —" اس نے اپنے ایک ہاتھ سے کوئی پارسل نما چیز تھامی اور کُود کر اندر آ گیا۔

مشاہد دم روکے کھڑا رہا — وہ کیا کرے۔ مردان کو گلے لگائے، اس کی کھُردری داڑھی میں پوشیدہ رخساروں کو چومے۔ اُس کے سر پر پیار دے کیا کرے — اور اُس نے کچھ نہ کیا۔ دم روکے کھڑا اُس کی شکل کو اپنے اندر اُتارتا رہا کہ بہت دنوں سے، نہیں برسوں سے اس کی شکل اس کی دید کا حصہ نہیں بنی تھی۔

"یہ شوبھا ہے بھائی جان —" اس نے احتیاط سے پارسل کو کھولا اور اسے کھولتے ہوئے اس کی آنکھوں کے الاؤ ٹھنڈے ہوئے اور اُن میں سرد چشمے بہنے لگے۔

وہ ایک قدم آگے آیا — آگے ہو کر بھی نیچے مردان کی گود میں نہیں دیکھا کہ اُس کی نظریں اپنے بھائی کی شکل سے ہٹتی نہ تھیں۔

"یہ میری بیٹی ہے بھائی جان —"

رُکے ہوئے وقت کے آس پاس جہاں بیرک کے تختوں میں سے بچ نکلنے والی دُھوپ میں مُکلی کے مزاروں پر گھیرے دار لباسوں والے سپاہی تلواریں سونتے ساکت کھڑے تھے وہاں گرینڈ فادر کلاک کی رُکی ہوئی سوئیوں کے آس پاس بچر ز بھی اُسی طور

اور دم بخود کھڑے تھے جیسے اُن میں بھی سانس نہ ہو، وہ مجسمے ہوں.... شوبھا کا سراپا دھوپ جہاں کہیں بھی اس کے بدن کو روشن اور واضح کرتی تھی، زرد تھا اور مردان اس ناپسندیدہ شخص کو دیکھا جو دعویدار تھا اور وہ ایک ناراض نگاہوں والا بارلیش شخص

"شوبھا —"

اور وہ یکدم ٹھٹکی — جیسے ایک مرتبہ پھر اُسے جنگل میں ایک اور درندے نے آ

"جی بابا —"

"تم کیا کہتی ہو؟"

اظہار منتظر تھا اور ایک لاپرواہ اور بغیر دکھ والے رویّے کے ساتھ سب کو دیکھتا

"کچھ نہیں بابا —"

"تم کیا کہتے ہو؟" — کیا نام ہے تمہارا انتظار —"

"اظہار —" اس نے ازحد ناگواری ظاہر کی "اور میں نے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ

"

رُکا ہوا وقت اور ساکت سپاہ اور بچرز اور دھوپ کی باقی ماندہ زرد کرنیں اُسے مردان کو دیکھتے تھے کہ وہ کیا کہتا ہے اور اُس نے کہا" اگر میں یہ کہوں کہ مجھے سوچنے لئے کچھ مہلت دی جائے تو آپ کا کیا ردعمل ہو گا؟"

ایک گہرا اور اذیت سے آزاد سانس رحمان گل نے بھرا اور بقیہ بچرز جو ایک عرصے سے ساکت اور جامد ہو چکے تھے، پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے اور اُن میں ت پیدا ہونے لگی۔

"بالکل سر — ہم بالکل انتظار کر سکتے ہیں کیوں اظہار —" داؤد نے آگے بڑھ ہمت کرتے ہوئے لیکن ذرا ڈرتے ڈرتے مردان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ویسے سَر نے ہماری رُوحیں فنا کر دی تھیں... بالکل سَر آپ سوچ لیجئے معاملہ ہی ایسا ہے —"

سب سے گہرا اور تسلی والا سانس دانش کا تھا جس کی باقاعدہ آواز تھی۔ وہ کچھ بولا صرف اُس کے چہرے پر غیر متوقع صورت حال کے خوف کی جو سلوٹیں اُبھری تھیں

وہ خود بخود ہموار ہو گئیں۔ صباحت نے نارمل ہو کر زبان سے بناخہ چلا کر اپنا کتھارسس کیا اور کمند علی خاں ذرا ہچکے۔ نُورالہدیٰ خاموش رہی اور اظہار اعوان کی شکل مزید بیزار ہو گئی۔

"تو ہم چلتے ہیں سر۔ شہر میں کوئی یوم سیاہ وغیرہ ہے سر تو کچھ ایکشن وغیرہ ہو گا۔ ٹائر جلیں گے... اور بچہ لوگ روف ٹاپ سے فائرنگ کریں گے تو ہم چلتے ہیں" رحمان گل نے مئودب ہو کر اجازت چاہی۔

"ٹھیک ہے —" مردان بے دھیانی میں سرہلا کر کہنے لگا "آپ جائیں —"

بچرز سب کے سب مارچ آوٹ کرنے کو تھے کہ اظہار نے نہائت دشمن نظروں سے مردان کو دیکھا اور کہنے لگا "مردان صاحب آپ مائنڈ نہ کریں تو عرض کروں کہ ہمارے فتح جنگ میں اگر آپ کسی بہت ہی غربت زدہ گھر میں بھی چلے جائیں مہمان کے طور پر تو وہاں چوپا اور کھڈی حلوہ ضرور پیش کیا جاتا ہے۔ ہم آپ کے پاس آئے ہیں اور معزز لوگ ہیں اور آپ نے چائے تک کا نہیں پوچھا" اس بیان کے اختتام پر مردان نے اور اظہار نے ایک دوسرے کو دیرینہ دشمنوں کی طرح دیر تک گھورا اور اس دوران بچرز دم بخود رہے اور پھر مردان کے چہرے پر پہلی مرتبہ نرمی آئی اور وہ آرام سے بولا "اور ہاں آپ لوگ کچھ کھائے پئے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟"

"بالکل نہیں جا سکتے" سب سے پہلے داؤد پلٹ کر آیا "لیکن سر ہمیں اب ماضی کے مزاروں میں سے تو نکالئے۔ کتبوں کی رفاقت میں کچھ وحشت سی ہوتی ہے"

نورالہدیٰ کی نگاہیں جب سے وہ اس بیرک میں آئی تھی مرکوز تھیں کلہوڑہ اور ترکھان خاندان کے نقش والے پتھروں پر اور وہ رنجیدگی سے سب کو دیکھتی تھی "تمہیں داؤد، سندھ کے ماضی سے وحشت ہوتی ہے —"

"اللہ —" کمند علی خان نے تان لگائی "پھر وہی ایتھنک پرابلم —"

"میں نے تو کچھ نہیں کہا" داؤد باقاعدہ سراسیمہ ہو گیا "صرف کتبوں کی کمپنی سے نکلنے کی درخواست کی ہے اس میں نور تم نے ایتھنک پرابلم کہاں سے برآمد کر لی —"

"اور ہمارا جو سچ مچ کا ایتھنک پرابلم ہے تلیر حضرات کا اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتا" صباحت سر ہلانے لگی جیسے قوالی سن رہی ہو "کیا ہم ایک مرتبہ پھر اَپ رُوٹ ہوں گے؟"

مردان حیران پریشان بلکہ جنگل بیابان کے یہ بچے جو ابھی ابھی اتنے متحیّر اور ساکت دم بخود کھڑے تھے اب اُس کے وجود سے بے خبر لا علم کسی اور عہد میں چلے گئے تھے۔

"آپ لوگ بیرک نمبر ایک میں تشریف لانا پسند فرمائیں گے؟" مردان ذرا جُھکا اس جھکنے میں اپنی کمر کی سالخوردگی سے پھر آگاہ ہوا۔

"ضرور —" رحمان گل سب سے اوّل بولا "آئیے۔ بچرز آئیے"

اور جب وہ چائے اور نمکین بسکٹوں کے منتظر تھے اور خاموش بیٹھے تھے تب اظہار پاس سے گذرتی شوبھا کو اپنی مکمل بیزاری سے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا "فتح جنگ میں کراچی والی سہولتیں نہیں مل سکیں گی —"

"نہ ملیں —" شوبھا نے کہا اور گزر گئی۔

وقت کی ایک کُترن میں سے اظہار کو ناریل کے تیل کی عجیب سی خوشبو آئی اور وہ ہانپتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

مشاہد نے اخبار پر جھکا ہوا سر اُٹھایا "برگیتا میری نظر کی عینک کہاں ہے؟"

"تمہیں اخبار پڑھنے کے لئے اس کی ضرورت تو نہیں" وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

"مجھے ضرورت ہے ـــ" وہ بے حد تُرشی سے بولا۔

برگیتا اُٹھی اور قدرے مشاہد سے خوفزدہ ہو کر اُٹھی کہ وہ اتنی درشتگی سے کم بولتا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے ٹاپ ڈرائر سے عینک نکال کر اُسے تھما دی "کوئی خاص خبر ہے؟"

"ہاں" عینک لگا کر وہ پھر اخبار پر جُھک گیا "ارشد کو ـــ ڈاکٹر ارشد کو گرفتار کر لیا گیا ہے ـــ"

"کیا ـــ" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اخبار پر جُھک گئی۔

"ہاں ـــ"

"لیکن کیوں؟"

"دو کالمی خبر ہے ـــ اور ـــ اور چارج یہ ہے کہ ـــ میں نے تو وہ ویڈنگ کارڈ دیکھا بھی نہیں تھا ـــ"

"پلیز مشیل ـــ کیا ہوا ہے؟" وہ اس کا متغیر ہوتا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"اُس کے شادی کے کارڈ پر ـــ پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم درج تھا ـــ"

"تو کیا ہوا؟"

"تو بہت کچھ ہوا برگیتا ڈارلنگ ـــ" اس کی آواز میں تھراہٹ نمایاں ہو رہی تھی۔

"میں سمجھ نہیں سکی ـــ بالکل سمجھ نہیں سکی"

"اس ملک کے کتنے ردعمل ہیں جو تم سمجھ سکی ہو۔ تم نے کتنی ذہنی حالتوں کو ایک مثبت شعور کے ساتھ سمجھا ہے ـــ قانون ہے"

"یہ کس قسم کا قانون ہے مشیل ـــ"

"تم ذہنی طور پر اب بھی سویڈش ہو۔ تم نہیں سمجھ پاؤ گی ـــ"

"میں کوشش کر سکتی ہوں ـــ"

"یہ مُلکی قانون ہے جس کا تقدس برقرار رکھنا ہمارا فرض ہے ـــ ارشد قادیانی ہے" وہ چپ ہو گیا اور اخبار تہہ کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"Is it serious"

"ہاں ـــ بہت ـــ شاید چھ برس"

"جیل میں؟" اس نے مکمل بے یقینی سے پوچھا۔

مشاہد کوشش کر کے بستر سے اُٹھا اور اُس کھڑکی کو کھولا جسے پھلانگ کر کئی برس ...ان اسی کمرے میں داخل ہوا تھا اور وہ جب بھی اس کھڑکی کی جانب بڑھتا تھا تو اُسے ...م سا شک ہوتا تھا کہ مردان اب بھی باہر کھڑا ہے ـــ جلتی آنکھوں اور ایک ...تے پارسل کے ساتھ۔

"نہیں ـــ جیل میں نہیں ـــ" وہ پلٹ کر بستر کے گدّوں میں دھنستی سیاہ بدن ...ی جانب آیا جو سفید نائٹی میں جگہ جگہ سیاہ دکھتی تھی "نہیں جیل میں تو نہیں ـــ ...ڑے ریسارٹ میں وہ اسے بھیجیں گے ریلیکس کرنے کے لئے شائد سپین کے کوسٹا ...سول میں ـــ یا پھر فرنچ رویرا میں... چھ برس کے لئے۔

"How very humane of

برگیتا نے اپنے خاوند کو ایسے دیکھا کہ اُس میں تشویش بہت تھی۔ اور وہ دیکھتی تھی ...ں کی نظروں کے سامنے ایک دوست کی فکرمندی کے درد میں جھکتا چلا جاتا ہے ...اُس کے چند بال مزید سفید ہو گئے ـــ اسی لئے اُسے دیکھنے میں تشویش بہت ...اُٹھی اور بمشکل اُٹھی کہ گدّے میں دھنس کر اُٹھنا بمشکل اُٹھنا ہوتا ہے اور مشاہد ...ب ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اُس کے رخساروں پر رکھ دیئے۔ اُس کی بڑھی ہوئی شیو ...ھی نیم خوابیدہ ہتھیلیوں میں ہولے ہولے چُبھی "تم اس کے لئے کیا کر سکتے ہو؟" "انتظار ـــ" اس نے برگیتا کی ہتھیلیوں کو آرام سے پرے کیا اور دوبارہ کھڑکی سے لگا۔

برگیتا اُسے دیکھتی رہی ـــ وہ اُسے دسمبر کی سویر کی یخ سے خبردار کرنا چاہتی تھی ...ر موسم اب آسانی سے اثر انداز ہو جاتا تھا لیکن وہ چُپ رہی، اُس کی پُشت پر

نظریں جمائے اسے دیکھتی رہی۔ یہاں اس شہر میں، سات کمروں والی کوٹھی کے اس کمرے میں جب کہ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا صبح کی یخ سے لاتعلق تھا، برگیتا اُسے دیکھتی رہی۔ ایسے جیسے زندگی میں پہلی بار وہ اُس کے اختیار سے باہر ہو گیا ہو، اس کے سیاہ وجود کا پہلے ایک حصہ تھا اب الگ ہو گیا ہو، وہ بستر میں بھی جہاں وہ ایک پسینہ بھرا وجود ہوتے تھے وہاں بھی ملنے کے باوجود الگ ہوتا تھا۔ مشاہد اپنی پُشت پر برگیتا کی نظروں کو نہ صرف محسوس کرتا تھا بلکہ جانتا تھا کہ وہ اُس لمحے کیا سوچ رہی ہے اور اُسے وہ سوال بالآخر پوچھنا ہے جو بہت دنوں سے اُس کے ذہن میں زور مارتا ہے، اُسے اُس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ یہ سوال پوچھ لیا جائے۔

"مشاہد — کیا فاطمہ اب یہیں رہے گی؟"

"میں ارشد کے بارے میں فکر مند ہوں —"

"میں فاطمہ کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں —" وہ آگے ہوئی اور اپنا ہاتھ اُس کی چوڑی پُشت پر رکھ دیا۔ "میں بھی فکر مند ہوں۔"

فاطمہ نے بستر پر لیٹے لیٹے دیوار کو ٹٹولا، کچھ گرا شاید پُرانا چُونا دیوار سے الگ ہوا اور اگر وہ دیکھ سکتی تو اپنی ہتھیلی پر اُس کے سفید ذرّے دیکھتی — سات کمروں والی کوٹھی سے پرے جہاں شیشم، جامن اور املتاس کے درخت اندھیرا کرتے تھے وہاں جو فراموش شدہ کمرہ تھا جس کی چھت پر سے گھاس لٹکتی تھی وہیں فاطمہ اپنی من مرضی سے رہتی تھی، الگ تھلگ — جہاں مروان بھی بسیرا کرتا تھا — وہاں اُس نے لیٹے لیٹے دیوار کو ٹٹولا —

مشاہد کے اندر فاطمہ کے لئے جتنا بغض جتنا حسد تھا وہ — بابو کی موت کی خبر سنتے ہی بہہ گیا تھا۔

"تم دو چار روز اور ٹھہر جاؤ — کم از کم لاہور تو دیکھ کر جاؤ —"

"کون دکھائے گا؟"

"میں —" مشاہد نے ہنس کر کہا تھا "کیوں برگیتا؟"

"بالکل —"

وہ اُس کا ہاتھ تھامے لئے پھرتا — شالیمار باغ دیکھ رہی ہو؟ ہاں دیکھ رہی ہوں — کیا دیکھ رہی ہو؟ میں اسے تمہارے ہاتھ کے لمس سے دیکھ رہی ہوں

Pale hands beside shali وہ اُسے لال حویلی بھی لے کر گیا اور وہاں پیچ دار اور نگ سیڑھیوں میں اُس کا ہاتھ تھامے تھا جب وہ اُوپر جا رہا تھا تو وہاں اُس نے محسوس کیا طمہ صرف سہارے کے لئے اُس کا ہاتھ نہیں تھامتی — اور وہ اپنی خالی اور بڑی بڑی ن سیاہ آنکھوں اور سفید بالوں کے ساتھ ایک بہت پُرکشش عورت ہے — اور ب اُس سیاہ اور سفید کترن نے اُس کا ہاتھ دبایا اور کہا "مشاہد میں زیادہ دیر لاہور میں ٹھہر سکتی —"

"کیوں؟"

"کیا ایک مرتبہ اندھا ہونا — بیوہ ہونا اور بے اولاد ہو جانا کافی نہیں ہے —"

اُسے جامن اور شیشم کے گھنے اندھیرے میں گم پوشیدہ اُس بوسیدہ نم اور اُگ رہا ردو دیوار پر سبزہ کمرے کی بُو باس پسند تھی اور وہ اپنی من مرضی سے وہاں رہتی تھی لگ تھلگ اور خاموش... لیکن وہ یہاں کتنے روز اور ٹھہر سکتی تھی... اس کے باوجود وہ کے خیال سے جھجکتی تھی۔ وہاں دیوار کا پلستر کریدتے ہوئے اس کے ذہن میں جو یں متحرک تھیں اُن میں سے ایک تصویر نے کہا "اس وقت مشاہد کھڑکی سے باہر ہے اور تمہارے بارے میں سوچتا ہے اور برگیتا کے لہجے میں ناپسندیدگی ہے" — یہ اُس نے دھکیل کر پرے کر دی۔

اُن پُرپیچ اور نیم تاریک سیڑھیوں میں اگر وہ ماچس کی ایک تیلی جلاتا تو فاطمہ نابینا ے باوجود اُس کی طرف دیکھتی — اور وہ دکھائی دے جاتا —

مشاہد نے اپنی پُشت پر رکھے ہاتھ اور اُس ہاتھ میں فرق محسوس کیا جسے وہ تھامتا تھا ڑا تو برگیتا کا ہاتھ وہیں ہوا میں رہا جسے اُس نے تھام لیا "تم میری بیوی ہو"

"قانونی حیثیت محبت کی پاسبانی نہیں کر سکتی —"

"میں اُسے جانے کے لئے کہہ دیتا ہوں —"

"میں یہ نہیں چاہتی —" برگیتا اُس کے سینے کے ساتھ لگ کر بے جان سی ہونے ں میں یہ بھی نہیں چاہتی۔ اس کے جانے سے شاید تم بالکل ہی واپس نہ آؤ"

"تو پھر —"

"تو پھر Status Quo — کے سرا سرا — جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا اور مستقبل

ہمارے لئے دیکھنے کی چیز نہیں اس لئے — کے سراسرا"

مشاہد مسکرایا "ڈورس ڈے کیا ابھی تک زندہ ہے؟"

"اس گیت میں یقیناً —" برگیتا بھی یکدم سب کچھ بھول گئی اور پھر سے مشاہد کی اُس کشش میں مبتلا ہو گئی جس سے چھٹکارا حاصل کرنا اُس کے لئے اِس زندگی میں تو ناممکن تھا "اور ہاں مشیل — اب جب کہ اس قسم کے موضوعات زیرِ بحث ہیں — اس نے ایڑھیاں اُٹھا کر اُس کے رخسار پر ہلکا سا بوسہ دیا اور پھر وارڈ روب کی طرف گئی، اُسے کھول کر اپنے کپڑے اور جوتے اتھل پتھل کرتی کچھ تلاش کر کے واپس آ گئی — اُس نے دونوں ہاتھ اوپر کئے، ایک ہاتھ میں ایک پرندہ تھا — کاغذ کا پرندہ۔

"یہ تمہارے لئے ہے —"

"کہاں سے آیا ہے؟"

"Guess —"

ایک جامد ٹریفک والے مشرقی شہر کی گھنی آبادیوں اور نامانوس زبانوں اور بُری نظروں میں داخل ہو کر اپنی ڈائری پر درج ماما کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایڈریس کو تلاش کر ایک جہنم ہے لیکن وہ دسمبر کی یخ میں بھی پسینے میں بھیگتی ایک پیوند زدہ نیلی جین اور ہاف شرٹ میں کچھ بے چین اور گندی محسوس کرتی ہوئی کہ میکلوڈ روڈ پر واقع اُس غلیظ ذرا ہوٹل میں مردوں اور پیشاب کی بُو تو بہت تھی لیکن صاف غسل خانے نہ تھے، وہ اب بدن کو کھجلاتی ایک شاندار مگر بوسیدگی کے عالم میں مبتلا رہائش گاہ کے سامنے کھڑی تھی جس کے گرد گھنی باڑھ تھی اور ایک ٹوٹا ہوا گیٹ ہوا سے جھولتا تھا اور کہیں بھی کال بیل کا کوئی نشان نہ تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر ڈائری کھول کر پتہ دیکھا اور ماما کو کوسا کہ صرف ایک کاغذی پرندہ ڈلیور کرنے کی غرض سے اسے اتنی مصیبت اُٹھانی پڑی تھی۔

پرے جہاں درختوں کا ایک جھنڈ تھا وہاں ایک سفید بالوں والی عورت ایک کرسی بیٹھی اپنے آپ میں مگن تھی۔ اُدھر سے ایک مشرقی پگڑی باندھے ایک بوڑھا آدمی ہاتھ میں فلاور پاٹ لئے چلا آ رہا تھا۔

"ہیلو —" اُس نے بے تابی سے ہاتھ ہلا کر اُسے متوجہ کیا۔

اُس آدمی نے اُسے بالکل توجہ کے لائق نہ سمجھا اور دائیں جانب رہائش گاہ

ت کی طرف مڑنے لگا۔

"ہیلو ہیلو —" وہ باقاعدہ چیخی "موشائد — آئی وانٹ مسٹر موشائد —"

مشرقی پگڑی والا نام سن کر ٹھٹکا اُس کی جانب غور سے دیکھا اور پھر فلاور پاٹ زمین کر زرد رنگ کی ایک راہدری میں چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ فام ش عورت اپنی لمبی ٹانگوں کی خوبصورتی اور توازن سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گیٹ قریب آ گئی۔

"ڈو یو سپیک اِنگلش —"

"یَس —"

"ویری گڈ — آئی ایم کرسٹین — فرام ڈنمارک — میں اِدھر اپنے کچھ توں کے ساتھ انڈیا جانے کے لئے آئی تھی... کیا نام ہے اس شہر کا — یاد نہیں رہتا ہاں لاہور... تو — مسٹر مشاہد ادھر رہتے ہیں؟"

"ہاں —" برگیتا نے گیٹ کھول دیا "آپ انہیں جانتی ہیں؟"

"نہیں —" وہ گہرا سانس بھر کر ایک ہچکی کے ساتھ بولی "نہیں —"

"وہ آپ کو جانتے ہیں؟"

"نہیں —" وہ ہنسی۔ ایک جوان تئیس سالہ ہنسی اور بہت بے باک اور لاپرواہ "میری ماں اُنہیں کبھی ملی تھی ڈنمارک میں — اور اُس نے کہا تھا کہ — میری ماں تھا کہ اگر میں شہر لاہور میں سے گزروں تو — اُس نے کندھے سے رُک سیک اُتار ا میں سے کچھ نکالا جو بہت چُڑمُڑ اور پچکا ہوا تھا "یہ — اُنہیں دے دینا"

ایک چُڑمُڑ پچکا ہوا کاغذ کا پرندہ —

"اندر آ جاؤ —"

"نہیں میں بہت مصیبت والی جلدی میں ہوں۔ میرے دوست ریلوے سٹیشن پر ظار کر رہے ہیں۔ میں نے بہت وقت ضائع کر کے یہ گھر تلاش کیا ہے صرف اپنی ماما ب نہ سمجھ میں آنے والی خواہش کو پورا کرنے کے لئے — پلیز یہ انہیں پہنچا دیجئے"

وہ بلند قامت تھی، برگیتا نے دیکھا۔ اور اُس کے سارے بدن میں یورپ کی مکمل نہ تھی کہیں کہیں سیاہی کی ملاوٹ تھی جو بھلی لگتی تھی۔ اُس کی آنکھیں

بالکل ڈینش نہیں تھیں بہت گہری اور سیاہ باتیں کرنے والی تھیں اور جب وہ ہنستی تو برگیتا کا دل رکتا تھا... وہ اس ہنسی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی تھی۔

"اور آپ کون ہیں؟"

"میں مسز مشاہد ہوں — وہ شہر جا چکے ہیں۔"

"تو میں واپسی پر اپنی ماں کو بتا دوں کہ تمہارا پرندہ جو میں نے اتنے طویل سفر کے دوران اپنے رُک سیک میں سنبھالے رکھا اس کی بیوی کے حوالے کر آئی ہوں — ٹھیک ہے"؟

"تھاکس میکے —" برگیتا نے کاغذ کی اُس شکل کو وصول کیا جو اتنی دور سے بھیجی گئی تھی اور جس کا بھید وہ نہیں جانتی تھی۔

"آپ سویڈش جانتی ہیں؟" حیرت اُس لڑکی کے چہرے پر پسینے کے ساتھ ساتھ پھوٹی۔

"میں خود سویڈش ہوں"

"واقعی؟"

"ہاں — ایک سیاہ فام سویڈ —"

"میں بہت جلدی میں ہوں —" اس نے ہاتھ آگے کر دیا "آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی اور پلیز یہ جو برڈ ہے — تو"

برگیتا نے اُس کا ہاتھ تھوڑی دیر کے لئے تھامے رکھا "کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تم اندر نہیں آنا چاہتیں؟ — شاید تم کافی پسند کرو — میں فوری طور پر تمہارے لئے کچّی مچھلی کے سکنڈے نیوین سینڈوچ بنا سکتی ہوں شائد تم وہ پسند کرو —"

"اگر وقت ہوتا تو — میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم آج ہی انڈیا جا رہے ہیں... اور مسٹر مشاہد کو میری جانب سے بہت اچھی خواہشات — خدا حافظ" اُس نے رُک سیک اُٹھایا اور ماڈل ٹاؤن مارکیٹ کی طرف چلنے لگی جہاں متعدد پیلی ٹیکسیاں ایک پرانے پیپل کے قریب کھڑی تھیں۔

تہہ خانے کے روشندان کے آگے جھولتا ہوا کاغذی پرندہ

ردی کی ٹوکری میں پسینے سے بھیگے ہوئے چُرمُر پرندے — جو دب چکے تھے۔

"وہ کیسی تھی؟" مشاہد نے پوچھا۔

"تم جیسی تھی —" برگیتا نے کہا۔

بے ڈر بے جھجک شوبھا کی فوکسی تھی جو ایک کچھوے کی متانت سے بے آباد شاہراہ پر چلی جا رہی تھی۔ اردگرد جو آبادیاں تھیں اُن میں کہیں کہیں کسی کھڑکی یا بالکونی میں کوئی دیکھ کر فوراً پرے ہو جاتا تھا۔

دنیا بھر میں لوگ ٹریفک جیمز سے عاجز آئے ہوئے تھے، رُکتے، کھانستے، بریکوں پر پاؤں مارتے اپنی قسمت کو کوستے وہ دھچکوں سے رُکتے اور رواں ہوتے تھے اور یہاں میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ گلیاں ہو جان سونیاں وِچ مرزا یار پھرے — مرزا یار بھی یہی کچھ محسوس کرتا ہو گا جو میری فوکسی اِن سُونی گلیوں میں چلتی ہوئی محسوس کر رہی ہے۔ اور یہ جو اکادُکا سنائپر شاٹ سنائی دیتے تھے تو یہ پارٹ آف دے گیم ہیں — اگرچہ وہ اس گیم کی ایک کھلاڑی نہ تھی محض تماشائی تھی لیکن یہ گیم سب کھیل رہے تھے۔ بازی لگی ہوئی تھی۔ بادشاہ، پیادے، سپہ سالار — ملکہ... اور راج کرے گی خلقِ خدا۔

فضا میں یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی سٹرے بلٹ اِدھر سے اُدھر جاتا تھا۔

فلیٹوں کی بلند عمارتوں کی چھتوں پر سے وہ نیچے دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس اکیلی اور بیوقوف فوکسی پر نشانہ بازی کی جائے یا نہ کی جائے — چلی جا رہی ہے خدا کے سہارے۔

اس کا خیال تھا کہ اب اظہار کے رویّے میں کچھ نرمی آئے گی اور وہ کبھی کبھار چاہے بوسیدہ اور سڑی ہوئی سہی ایک آدھ مسکراہٹ سے اُسے نواز دیا کرے گا — آخر بابا کسی حد تک تو مان چکے تھے۔ لیکن نہیں جی اظہار صاحب پہلے سے بھی زیادہ درشت اور لاپرواہ — جو مسکراہٹ شوبھا کے ہونٹوں پر آئی اس میں اختیار کا دخل بہت کم تھا کہ وہ اظہار کے لئے ایک گہرے ربط اور میلان کی مظہر تھی۔

آپا عارفین میں البتہ ایک تبدیلی آ رہی تھی۔

وہ اب زرق برق بھڑکیلے گوٹے کناری والے ملبوسات سے گریز کرنے لگی تھی۔

ہے اپنے آپ میں واپس آ رہی ہوں۔ فراموش وقت کی چھوٹی چھوٹی کُترنیں جمع کر کے اُنہیں ایک کُل کی شکل میں دیکھنا چاہ رہی ہوں — بابا متوجہ نہیں ہوتے تھے، اُنہیں توجہ کرنا تھا — اب وہ پھر مسکرائی اپنے بابا کے لئے، آواز بٹھا دینے والے اور آنکھوں میں نمی لانے والے جذبے کے ساتھ...

ڈز —

کہیں ایک فائر ہوا۔

گولی کی آواز کتنی مختصر اور دل کو دھچکا دینے والی ہوتی ہے۔

جب سے بُچڑ برادری اُس کا پروپوزل لے کر آئی تھی، بابا کم بولتے تھے — وہ سکول سے بھی ناغہ کر لیتے اور جب اُس کی فوکسی سڑک سے پرے کچے راستے میں اڑتی اور دھول اُٹھتی تو وہ اُس دھول کے اندر آتی ہوئی بابا کی نگاہیں محسوس کر لیتی جو رک کے برآمدے میں بیٹھے جوگیوں ایسے مکمل دھیان کے ساتھ اُس جانب دیکھ رہے تے تھے... اور وہ ہمیشہ کہتے، تم نے بہت دیر کر دی شوبھا — وہ کچھ بے اعتبارے ہو گئے تھے۔

یہ نہیں کہ شاہراہ پر صرف اُسی کی فوکسی تھی... کبھی کبھار کوئی کار، وین یا ٹرک بھی ئی تیز رفتاری سے اُسے اوور ٹیک کرتے ہوئے فوراً دُور ہو جاتا۔

ماں کے بارے میں بابا کبھی تفصیل میں نہیں گئے تھے۔ کبھی یہ نہیں بتایا کہ اُن کا یسے ہوا تھا... اُن کے پاس ماں کی تصویر بھی نہیں تھی۔

”بابا — آئی لو یو“ اس نے کار کا ہارن متعدد بار بجا کر بچوں کی طرح خوشی سے سَر ا... ہارن کی آواز ویرانی میں وہاں تک گئی جہاں بہت سارے مکان خاموشی کے ایک ثے میں بہت دیر سے چُپ تھے۔

چند ٹرک، دو جیپیں، وائرلیس کی گہما گہمی، پولیس اور رینجرز کی وردیاں اور ہلمٹوں نیچے ہونٹ چباتے جوان۔

اُس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ ایک اور چیک پوسٹ۔

اُس کے کاغذات چیک ہوئے، ایک پولیس انسپکٹر نے فوکسی کے گرد ایک تفتیشی نظرِ غور مکمل کیا اور کاغذات واپس کر دیئے ”شکریہ —“

شوبھا نے کار سٹارٹ کر دی اور یقیناً یہ پاکستان کی واحد فوکسی تھی جو پہلی بار چابی

گھمانے سے سٹارٹ ہوئی تھی۔

"شوبھا مردان —" انسپکٹر نے جُھک کر کہا "میں نے پہلی بار ایسا نام سنا ہے۔"

"کیونکہ میں آدھی بنگلہ دیشی ہوں —" شوبھا نے ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ایکسلریٹر پر دباؤ ڈالنے کو تھی کہ انسپکٹر نے سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ دیا "آپ ذرا باہر آئیں۔"

"کیوں؟"

"باہر آؤ —"

بہت بہادر اور نڈر ہونے کے باوجود اس کی رنگت میں زردی ظاہر ہونے لگی اور اُس کے ہاتھ لرزنے لگے "لیکن کیوں؟"

اس دوران چند مستعد اہل کار فوکسی کے آگے تعینات ہو چکے تھے۔

وہ باہر آ گئی۔

"کار کی تلاشی لو —"

"ڈیش بورڈ، نشستیں، اُن کے نیچے کی جگہ، بونٹ، انجن — ہر شے میں جھانکا گیا۔

"تم بنگلہ دیشی ہو —" انسپکٹر ایک نرم چہرے اور ہلکی مونچھوں والا نوجوان تھا جس کی شباہت میں ابھی پولیس کی سختی نہیں آئی تھی اور بارعب ہونے کی کوشش میں ذرا بیوقوف لگنے لگتا تھا۔

"نہیں۔ میں پاکستانی ہوں لیکن میری ماں بنگالی تھی —"

"یو آر انڈر اریسٹ —" انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کی جانب دیکھا اور وہ جیسے اُسی کے دیکھنے کے منتظر تھے وہ آگے آ گئے "کار کو تھانے لے چلو اور اسے بھی —"

شوبھا کا بدن کپکپانے لگا "مجھے بابا کو فون کرنا ہے —"

"بنگال جا کر کرنا —" ایک سپاہی جو پہلے کسی سنائپر کی دہشت میں تھا ایک بے سہارا لڑکی کے آسرے نڈر ہو گیا۔

صاحب کمال نے اُسے تب دیکھا جب وہ فوکسی سے باہر آ رہی تھی۔

اُس نے اس لڑکی کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ اِس بکٹی پرانی کار کو بھی اور اس فریجائل قسم کی لڑکی کو بھی — کہاں دیکھا تھا۔

اُس کی جیپ میں وائرلیس سسٹم کا بہت شور تھا — اور وہ کار کے قریب کھڑا

ی کے لرزتے بدن کو بھی دیکھ سکتا تھا — وہ جیپ سے باہر آ گیا۔ "انسپکٹر —" ہلکی نچھوں والا انسپکٹر فوراً اٹن شن ہو گیا "یہ لڑکی کون ہے؟"

"سَر اس نے خود admit کیا ہے کہ یہ بنگلہ دیشی ہے سَر — اور سَر آپ جانتے ں کہ کراچی میں اس ٹیم بہت زیادہ غیر قانونی بنگلہ دیشی ہیں سَر تو حکومت انہیں پکڑ کر پس بھیج رہی ہے۔ یہ بھی واپس جائے گی سَر —"

شوبھا نے صورت حال میں ایک غیر متوقع تبدیلی محسوس کی کہ ایک افسر جیپ میں ے اُترتا ہے اور اس کی جانب آ کر پوچھتا ہے کہ لڑکی کون ہے تو شائد — "سَر انہیں ئی غلط فہمی ہوئی ہے سَر... میں آغا خان میڈیکل کالج کی فائنل ایئر کی سٹوڈنٹ ہوں سَر اور میں پاکستانی ہوں۔"

"تم بنگلہ دیشی نہیں ہو؟"

"نو سَر — یس سَر — صرف ہاف سَر —" وہ سرد ہواؤں میں زرد پتے کی کپکپاہٹ تھی۔

اوہ یس — صاحب کمال جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔

یہی فوکسی تھی جو دور ہوتی جا رہی تھی جب اس کے اندر ایک تلاطم برپا ہوا تھا۔ ہوا چلی تھی۔ اب وہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔ ادھ کھلے ہونٹ زرد پتے کی کپکپاہٹ — اور اُس کی جانب ایک مسیحا کی طرح دیکھ رہی تھی "پلیز سَر، میرے بابا میرا انتظار کر رہے یں۔"

اوہ یس۔ صاحب کمال اسے جانتا تھا کہ وہ کون ہے — جس نے اس کے اندر ک کا بیج بویا تھا۔ شباہت کے دھوکے دیئے تھے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک ہو — تئیس برس پہلے کے جو جنگل تھے اُن میں سے کوئی ایک چہرہ ادھر کراچی میں ایک فوکسی میں ہو —

ایک سنائپر فائر ہوا، سب لوگ ایک لمحے کے لیے غیر ارادی طور پر جُھک گئے۔

بیرک کے برآمدے میں منتظر مردان کے آگے جو میز تھی اُس پر بیٹ مین بشیر کی رکھی ہوئی چائے کی پیالی کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی کیونکہ چائے پینے کے لیے پیالی اُٹھانا ضروری ہے اور پیالی اُٹھانے کے لیے نظر جُھکا کر اسے دیکھنا ضروری ہے اور مردان افق پر ں جمائے شوبھا کی کار کی دُھول کا منتظر تھا۔

"پلیز سَر- میں محب الوطن پاکستانی ہوں اور — میرے بابا میرا انتظار کر رہے ہیں-"

"تمہارے بابا کیا کرتے ہیں؟" صاحب کمال نے پہلی بار اسے مخاطب کیا-

"سکول ٹیچر ہیں سَر — لیکن ہی واز این آفیسران پاکستان آرمی سَر —"

صاحب کمال کا بدن "این آفیسران پاکستان آرمی —" سنتے ہی سیدھا ہو گیا

"نام؟"

"کیپٹن مردان علی —"

"یُونٹ —؟"

"آئی ڈونٹ نو سَر — لیکن اُنھوں نے بنگلہ دیش میں — آئی مین ایسٹ پاکستان میں سَرو کیا تھا سَر — تو — میری ماں بنگالی تھی-"

"کہاں — کون — لیکن ڈیم اِٹ ڈیوٹی اِز ڈیوٹی-

"Let her go"

"لیکن جنابِ عالی یہ..." انسپکٹر نے ہلکا سا احتجاج کرنا مناسب جانا-

"اِسے جانے دو — اور اس کے لیے کار کا دروازہ کھولو-"

انسپکٹر فوراً بدل گیا اور مئودب ہو کر جھکتے ہوئے فوکسی کا دروازہ کھول دیا "آئیے جنابِ عالی —"

شوبھا بے یقینی میں وہیں ساکت کھڑی کانپتی رہی اور پھر اُس شخص کی جانب دیکھا جو بلند قامت اور وجیہہ تھا اور اُس کی جانب مسلسل دیکھ رہا تھا "تھینک یُو سَر —"

"اِدھر آؤ —"

"جی سَر —" شوبھا جیسے حکم کی تعمیل میں مکانکی گڑیا کی طرح سر ہلاتی اُس کے پاس آ گئی- صاحب کمال نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا جو شائد بلاوجہ ہی لرزش میں تھا...

"ینگ لیڈی، ہم بُرے وقتوں میں رہتے ہیں- باہر نکلتے ہوئے احتیاط کرو-"

"یس سَر —"

شوبھا نے وردی پوش شخص کی طرف دیکھا اور اس کی شباہت اُسے دیکھی ہوئی لگی...

صاحب کمال نے ویران شاہراہ پر دور ہوتی فوکسی پر سے نظریں نہیں ہٹائیں،

دیکھتا رہا.. اُس نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر اپنی ہتھیلی کو ناک سے لگایا اور اُس میں کچّے کی مہک تھی اور پھر اُسی ہتھیلی سے آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو صاف کیا-

جب کچی سڑک پر دُھول اُٹھی تو مردان نے اطمینان کا سانس لیا اور گھڑی پر وقت

شوبھا دس منٹ دیر سے آ رہی تھی-

وے سائڈ ہوٹل کے پچھواڑے میں آلوچے کے درخت کی خالی ٹہنیاں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں کیونکہ تاریکی بہت تھی اور دریائے سوات کا شور اُس اندھیرے میں دُور تک اُترتا چلا جا رہا تھا۔

کُتورا — برادرِ عزیز ایک عرصہ ہوا بڑا ہو کر کُتّے کا سٹیٹس حاصل کر چکا تھا اور موجودہ لمحے میں دریا کنارے بیٹھے زاہد کالیے کے قدموں میں دُم ہلائے چلا جا رہا تھا۔

"یار ارشد یہ حرکت کرنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"کونسی حرکت؟"

ڈاکٹر ارشد بٹ خیلہ تھانے کی ایک تاریک کوٹھڑی میں نسوار کی تھوکوں سے بھرے فرش پر صابر شاکر لیٹا سلاخوں سے منہ لگائے زاہد کالیے کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر دوست کے لیے فکر اور دردمندی تھی۔

"یہی — شادی کارڈ پر بسم اللہ لکھنے کی —"

"میں نے پشاور اگر چھوڑا تھا تو زاہد صرف اس لیے کہ یہاں مالاکنڈ ایجنسی میں، بٹ خیلہ میں ایک عام سی زندگی بسر کر سکوں... یہ کیا زندگی ہے — ہر شے کے لیے تم واحد سکیپ گوٹ ہوتے ہو.. جیسے یورپ میں یہودی ہوا کرتے تھے —"

کالیا آج صبح اسلام آباد سے چلا تھا اور متعدد ہِپ فلاسکس خالی کرنے کے باوجود پژمردہ اور تھکا ہوا تھا اور اپنے سوال کا جواب چاہتا تھا "میں شادی کارڈ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"پہلے سے چھپا ہوا تھا۔ ریڈی میڈ کارڈز پر پہلے سے چھپا ہوتا ہے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"یار اب میں تمہیں حوالات میں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا —"

"کوئی اور چارہ نہیں۔ ویسے بھی یہ ہماری آخری ملاقات ہو سکتی ہے —"

"بہن یا کیا بکواس کرتے ہو —"

ڈاکٹر ارشد فرش سے جس پر بہت کچھ غلیظ چپکا ہوا تھا اُٹھ کر سلاخوں کے قریب آ

زا تو ہو گی اور قید کے دوران کوئی نیک شخص مجھے جہنم واصل بھی کر سکتا ہے۔"

بہت دیر سے، اتنی دیر سے کہ پچھلا پہر شام میں ڈھلا اور پھر چک درہ پُل کی یاں جل اُٹھیں اور دریائے سوات کا بہاؤ نظر سے تاریک ہوا اور صرف شور باقی رہا اور عزیز کی دُم مسلسل حرکت میں رہی۔

وہ ٹکٹکی باندھے نظریں جمائے آلوچے کے درخت کو دیکھتا رہا جو وے سائڈ ہوٹل ک کوٹھڑی میں جلتے بلب کی روشنی میں کچھ کچھ دکھائی پڑتا تھا۔

آج پانیوں کا شور کم تھا۔

اِن مہینوں میں اِن موسموں میں اُس کے کان آشنا تھے کہ شور اتنا کم نہیں ہوتا... ں میں کوئی پرابلم ہو گئی ہے — یا پھر دریا میں پانی کم ہو گئے ہیں جو شور گھٹ گیا ہے۔ پانی اس سے پیشتر پتھروں سے ٹکرا کر آگے جاتا تھا اُس میں کمی ہو گئی ہے — پر یہ نہ تھا — اُس نے سر جھٹکا اور جھک کر برادرِ عزیز کی پشت پر ایک تھپکی دی جس کے ب میں ایک شکر گزار "وَف" کی آواز آئی۔

کوئی شگوفہ نہ کھلا اور اُس کی سفیدی سے رات کی تاریکی کم نہ ہوئی۔

آلوچے کی شاخیں خالی رہیں۔

چار چیزیں ہیں اور اُن میں سے ایک...

"می آؤں- می آؤں" رُکھوں کے اندر سے کہیں مور بولا۔

اور رُکھوں کے اندر ہی اندر اُن کے گہرے اندھیرے اور سبز ٹھنڈک کے بیچ ہی بیچ وہ دونوں چلے جاتے تھے پر الگ الگ اپنے اپنے راستوں پر — ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے، نظر میں رکھتے متوازی راستوں پر چلے جا رہے تھے۔ برگیتا اور مشاہد کے درمیان میں، انہیں الگ کرتے ہوئے، صرف پانچ چھ درخت تھے اور وہ کم نہ ہوتے تھے۔ وہ خوف میں تھی کہ یہ فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ درخت ایک جنگل ہو جائیں گے اور مشاہد جو اب اُسے دکھائی دے رہا ہے، ساتھ ساتھ چلتا ہوا اوجھل ہو جائے گا اور وہ چونکتی، گہرے سانس لیتی اور کبھی ہچکی بھرتی چلی جا رہی تھی اور انہی رُکھوں میں کہیں مور بولتا تھا۔

"می آؤں- می آؤں —"

مشاہد نے سوتے میں کروٹ بدلی۔

رُکھوں کے اندر ہی اندر وہ بھی سفر میں تھا۔ اُسے دائیں ہاتھ پر چند درختوں سے پرے برگیتا دکھائی پڑتی تھی جو چلتی جا رہی تھی اور چلتے چلتے اُس پر نظر رکھتی تھی۔ پہلے ندر ہی اندر گھنا سکوت اور چپ خاموشی تھی اور پھر یکلخت تمام درخت اور اُن کی ٹہنیاں پرندوں سے بھر گئیں، پرندے جو بے پناہ شور مچا رہے تھے اور پھر اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور وہ برگیتا کو دیکھ نہ سکتا تھا کیونکہ رنگ برنگے پکھیرو اُن کے درمیان اُڑان کرتے تھے اور جہاں سے اُڑان کر کے گذرتے تھے وہاں ہوا میں اُن کے رنگ باقی رہ جاتے تھے اور ان رنگوں کی لکیروں میں سے برگیتا کہیں کہیں دکھائی دے جاتی تھی۔ وہ اُس کے چہرے اور بدن سے ٹکراتے اور پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑان کر جاتے۔ پہلے وہ برگیتا کو نظر میں رکھتا تھا رنگوں کی لکیروں کے پار اور اب وہ قدم دھیان سے اُٹھاتا تھا کہ پرندے اتنے زیادہ تھے کہ جنگل کے فرش پر اُن کے ڈھیر لگتے جاتے تھے اور وہ روندے جاتے تھے۔ شور بے پناہ تھا لیکن جب مشاہد بولتا تو وہ سارے کے سارے چپ ہو جاتے۔ یہیں کہیں مور

مشاہد اوندھا پڑا سو رہا تھا اور کھنچے ہوئے پردوں میں سے دِن کی لَو کمرے کی تاریکی نے کی کوشش میں تھی۔ برگیتا کا سیاہ ہاتھ اُس کی ننگی پُشت پر آرام کرتا تھا۔

"می آؤں- می آؤں —"

برگیتا نے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کی یخ بلند چھت والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ر وہ ابھی تک گہرے سانس لے رہی تھی۔ تعلق واسطے میں، محبت کے رشتے میں ہلی باریک سی دراڑ آتی ہے تو انسان انجان بن جاتا ہے، یہ واہمہ ہے — یہ آج ر کل صبح جب میں اس کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیروں گا تو وہاں کہیں بھی کوئی اٹک ہو گی، بال برابر بھی نہیں ہو گی — یہ واہمہ ہے۔ لیکن یہ دراڑ اُس کے اندر نقش ہو ہے اور بڑی ہونے لگتی ہے، چاہے وہ واہمہ ہو، وہ حقیقت کا رُوپ دھار لیتی ہے — کمروں والی کوٹھی سے پرے شیشم اور جامن کے درختوں کے نیچے بوسیدگی کے میں وہ دراڑ ہے — جو دیکھ نہیں سکتی اور بڑی ہوتی جا رہی ہے۔

"می آؤں- می آؤں-"

اس کی پُشت پر ایک بوجھ تھا — وہ برگیتا کے سارے بدن اور ہاتھ پاؤں سے آگاہ لیے وہ اس بوجھ کو محسوس کرتے ہوئے جانتا تھا۔

اُس ہاتھ کے راستے جیسے وہ اُس کے بدن میں سفر کرتا ہوا وہاں تک پہنچ رہا تھا وہ اس سوچ میں تھی کہ شیشم اور جامن کے درختوں کے نیچے بوسیدگی کے کمرے دراڑ ہے — اگر انسانی ردعمل طے شدہ ہو تو کبھی دھوکے اور دُکھ کا وجود نہ ہو تو نہیں جانتا تھا کہ فاطمہ اُس پر کس طور اثر کرے گی۔

"می آؤں- می آؤں-"

مشاہد نے بھی آنکھیں کھول دیں — اُس نے غنودگی میں نہیں، عالم خواب میں ہے میں بالکل نہیں سات کمروں والی کوٹھی کے اندر سے آتی ہوئی سچ مچ ایک مور سُنی تھی۔

"برگیتا —" وہ کروٹ بدل کر اُس کے قریب ہو گیا اور اُس کا ہاتھ اِس کی کمر کے گیا "یہ آواز کیسی ہے؟"

میں غلطی پر نہیں ہوں تو... میرا خیال ہے — اِٹس اے پیکاک —" وہ

اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنا لباس درست کرنے لگی "میں دیکھتی ہوں ––"

کمرے میں جمع شدہ ٹھنڈک سے اُس کا بدن ٹھٹھرا اور وہ شانوں پر ہاتھ رکھے باہ آ گئی –– دھوپ ابھی نیچے نہیں آئی تھی اور نیچے لان میں اور بے ترتیب باڑھ میں او لکڑی کے بوسیدہ پھاٹک میں کہیں کہیں دُھند کے جزیرے تیر رہے تھے۔ پرے اُس جھنڈ کے نیچے –– شیشم اور جامن کے درختوں تلے ایک مور کھڑا تھا۔

فاطمہ کو وہاں اس بوسیدگی کے کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے –– اُس سویر کی یخ میں بیٹھے ہوئے اس کے کانوں نے خبر کی کہ اُدھر سات کمروں والی کوٹھی کے بڑے کمرے میں سے کوئی باہر آیا ہے کہ چٹخنی کھلنے کی آواز یہاں پہنچی تھی اور جو باہر آیا ہے وہ ایک عورت کے اطمینان سے باہر آیا ہے۔

فاطمہ کی کرسی سے ذرا پرے وہ مور کھڑا تھا –– "می آؤں ––" وہ اپنی موجودگ کو ثابت کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر بولا۔

"یا خدایا –– یہ تو سچ مچ ایک مور ہے ––" برگیتا کے شانے پر سے مشاہد ک آواز ایک ناقابل یقین حیرت میں گم آئی –– "لیکن یہ آ کہاں سے گیا؟"

بابا نذیر احمد کے دل میں مکالمے چلتے رہتے تھے۔

اپنے آپ سے مخاطب، وقت جو گزر چکے تھے اُن سے... کبھی اُس ریت سے جو تلے تھی، ابھی تک صبح کی یخ بستگی سے۔ اُس دُھند سے جو راوی کے پانیوں پر بہت معلق تھی اور اب اُس میں سے کامران کی بارہ دری دھندلاتی نظر آنے لگی تھی اور کبھی بہاؤ سے جو سُست اور ٹھہرا ہوا سا لگتا تھا –– اور بعض اوقات سرد ہوا سے وہ مخاطب ہوتا تھا اور اُس کے مکالمے چلتے تھے اور کبھی وہ مسکراتا تھا اور کبھی سنجیدہ ہو ہونٹ بھینچ لیتا تھا اور اپنے سامنے ایزل پر آرام کرتے کینوس پر نظر کرتا تھا اور پھر اِس کے اوپر سے اپنی اُس کمپوزیشن کو دیکھتا تھا جو کئی روز سے دھیرے دھیرے تصویر منتقل ہو رہی تھی۔ کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی –– صبح ے... سردیوں کی سرد سویر میں –– کہیں دُھند، کہیں سورج کی بجھی ہوئی کرنیں –– اگلے دس پندرہ منٹ میں اسے سویر کی بجھی بجھی روشنی کے شیڈ اپنے بُرش میں لانے اور اُس کی سٹروکس سے کینوس پر منتقل کرنے تھے اسی لیے وہ جلدی جلدی اور تیزی سٹروکس لگا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سورج بلند ہو جائے گا اور روشنی قابو میں نہیں ہے گی۔

راوی بابا نذیر کی فکسیشن تھا۔

ہم عصر مصور کہتے تھے کہ بابا نذیر کا فن راوی پر آ کر ٹھہر گیا ہے... وہ اس سے باہر نکل سکتا۔ اور بابا نذیر اول تو ایسی تنقید کے جواب میں صرف مسکراتا تھا اور اگر کچھ تھا تو صرف یہی کہتا تھا کہ پانی تو ایک سے نہیں رہتے، بہتے رہتے ہیں تو اُن کی کوئی ر صرف اُس ایک لمحے کے پانیوں کو قید کر سکتی ہے جو اُس وقت بہتے ہیں اور چلے جاتے تو میں ٹھہر نہیں گیا –– ہاں اگر یہ رُکے ہوئے ہوتے، کوئی تالاب یا جھیل کی طرح تو لا جا سکتا تھا کہ چند تصویروں کے بعد اُس سپاٹ میں کوئی سوال نہیں رہا، ممکنات کا

خاتمہ ہو گیا ہے۔

وہ پچھلے بیس برس سے صرف راوی، کامران کی بارہ دری، کشتیاں، پل، کنارے، واقع اونچے بند اور اُن پر جھکے آسمان کو پینٹ کر رہا تھا۔

سپاٹ پر پینٹ کرنا ایک انتہائی مشقت طلب کام ہے۔ صبح سویرے منہ اندھیرے گرمی ہو یا سردی اُسی سپاٹ پر پہنچنا یہ دعا کرتے ہوئے اُس میں کوئی تبدیلی نہ آ گئی ہو۔ فلاں کشتی اگر ریت پر اوندھی پڑی تھی تو کسی نے اسے سیدھا نہ کر دیا ہو۔ پانی کی سطح وہ ہو جو کل تھی اور سب سے اہم بات کہ روشنی وہی ملے — اُسی زاویے پر اور اُسی تیزی سے جیسے کل ملی تھی۔

اور پھر وہ لوگ جو پکنک کے لیے آ جاتے تھے۔ سیر سپاٹے کے لیے۔ اُن کے گروہ کے گروہ آپ کے کندھوں پر سے جھانک رہے ہیں۔ یہ کیا بنا رہے ہیں؟ یہ درخت ایسا نہیں ہے — یہ پانی تو گدلا بنا دیا ہے — اور ایسے بے شمار احمقانہ سوال۔ اس کے علاوہ کوئی تانگے والا آپ کو آفر کر سکتا ہے کہ آپ میرے تانگے پر شیر اور تاج محل بنا دیں؛ کوئی نودولتیا اس پیشکش کے ساتھ کہ کیا آپ میرے ڈرائنگ رُوم کی دیوار پر ایک عقاب بنا سکتے ہیں جس کے نیچے تو شاہیں ہے بسیرا کر — لکھا جا سکے۔ لیکن ابھی صبح تھی۔ ابھی خدا کا شکر ہے کہ رونق میلہ شروع نہیں ہوا تھا اور وہ اکیلا تھا اور اُس کے پاس چند لمحے تھے صبح کی اِس پھیکی دُھند آلود روشنی کو قید کرنے کے لیے۔

اس نے بارہ دری کے حفاظتی پشتے کے ساتھ لگ کر بہنے والے پانی کو کینوس پر اُتارنے کے لیے برش اُٹھایا۔

یہ پینٹنگ بہت دنوں سے نامکمل تھی۔ آج اسے بہرطور مکمل کرنا تھا۔

وہ سٹروک لگانے لگا تو رُک گیا۔ اس نے برش کو ایک پیمانے کے طور پر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا، بارہ دری، دریا کے پانی اور پشتے کو ماپا اور پھر کینوس پر ایک نظر ڈالی اور رُک گیا۔

بارہ دری کی قدیم سرخ اینٹوں کے ساتھ لگ کر دریا بہتا تھا اور وہاں اپنے نشان چھوڑتا تھا۔ جب اُدھر پہاڑوں میں برف پگھل کر نیچے آتی تھی تو پانی کی سطح بلند ہو کر محرابوں تک جاتی تھی اور سردیوں میں نیچے، پشتے سے نیچے تک پانی گر جاتا تھا۔ دریا میں جگہ جگہ جزیرے اُبھرتے تھے، اُن پر کچھوے رینگتے تھے — بابا نذیر جانتا تھا کہ سردیوں میں

راوی میں پانی بہت کم ہوتا ہے تو بارہ دری کی حفاظتی دیوار کی اینٹوں پر کہاں تک ہوتا

وہ سٹروک لگاتے لگاتے رُک گیا تھا —

پانی کی سطح بہت نیچے آ چکی تھی۔ وہ اُن پرانی اینٹوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو آج تک نے نہیں دیکھی تھیں کیونکہ وہ مسلسل زیرِ آب رہی تھیں۔ ایسا کیوں دکھائی دیتا یہ تو ممکن نہ تھا کہ راوی میں پانی کم ہو گیا ہو۔ ہزاروں برسوں سے رواں قدیم یا روشنی آج کا راوی — اس میں پانی کم ہو رہا ہو۔

بابا نذیر نے سٹروک ادھوری چھوڑ دی، ایزل فولڈ کیا اور کینوس پیک کر کے ایک بے چین اور لاعلمی کی کیفیت میں موٹرسائیکل کے کیریئر پر باندھ کر وہ اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا — اُس کے اندر اب کوئی مکالمے نہ چلتے تھے، اندر خوف کی خاموشی تھی۔

اُس کے سٹوڈیو میں، دیوار کے ساتھ پچھلے دس برس میں پینٹ کیے ہوئے راوی کینوس تھے — اور اُن کے برابر میں وہ ادھوری تصویر بھی تھی جو آج ایزل پر تھی۔

بارہ دری کے ساتھ لگ کر بہتے پانی کی سطح ہر برس... نیچے ہو رہی تھی۔

تصویروں میں فرق نظر آ رہا تھا۔ اور اُس نے اس فرق کو پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

راوی خشک ہو رہا تھا۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا...

ایک ہی سپاٹ سے، ایک ہی مقام سے بنائی ہوئی تصویروں میں پانی کی سطح مختلف

وہ درجہ بہ درجہ نیچے ہو رہی تھی۔

اور آج سویرے — اس نے بارہ دری کی اُن اینٹوں کو بھی دیکھ لیا تھا جو ہمیشہ زیرِ آب تھیں اور اب ظاہر ہو رہی تھیں۔

پانی کم ہو رہے تھے۔

چار چیزیں ہیں... اُن میں سے ایک کامران کی بارہ دری...

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں... اُن میں سے ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس —

سرکنڈوں سے ادھر تاریکی میں کم گہرائی والے پانی کے اوپر کہر کی ایک پتلی چادر بچھی ہوئی تھی اور کشتی کی روانی اس باریک شیشے کی کرچیاں کرتی چلی جا رہی تھی... دُھند بہت گہری تھی اور اُس کے پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اندھیرے میں لَو دیتے ڈائل کو وہ آنکھوں کے قریب لایا اور ہندسے پھیل گئے، وہ یکجا نہ ہوئے تھے... اُنہیں پڑھنے کے لیے اسے قریب کی عینک درکار تھی جو وہ بھول آیا تھا... لیکن اُس کے بدن میں سفر کرتی ٹھنڈک بتاتی تھی کہ سورج نکلنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے۔

کشتی کی رفتار دھیمی ہوئی اور وہ سرکنڈوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ سرکنڈے ابھی سیدھے کھڑے ہیں اور ابھی کشتی کے آگے غلاموں کی طرح بچھے چلے جا رہے ہیں...

ملاح نے چپّو اُٹھا لیے "جناب یہاں ٹھیک ہے؟"

"ہاں —"

"بالکل ٹھیک ہے جی؟" ملاح صرف "ہاں" کے جواب سے مطمئن نہ ہوا۔

"ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔"

گہری دُھند میں سرکنڈوں کے اندر ایک تنہائی اُتر رہی تھی اور اُس نے مشاہد کے آس پاس اپنے آپ کو تعینات کر لیا یہاں تک کہ ہر سرکنڈہ الگ الگ تنہا ہو گیا اور وہ دُھند جو دھیرے سے پانیوں پر سے اُٹھتی تھی ٹھہر گئی اور اس دُھند کو بھی احساس ہوا کہ وہ بھی الگ ہے اُس بڑی دُھند سے جو قادر آباد کی جھیلوں پر چھائی ہوئی ہے...

کشتی کے گیلے پیندے پر تینوں شکاری تھیلے... برگیتا کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے

پنچ اور کافی، وِیڈرز والا تھیلا اور تیسرا تھیلا جس میں کارتوس ٹھنسے ہوئے تھے، روسی بیکال ہاتھ میں لیے، جیسے پچھلے برس کے دسمبر کا ایکشن ری پلے ہو رہا تھا۔

اُس کے اندر شکار کے احساس میں، اس کی طلب اور دیوانگی میں، وحشت میں نہ کمی ہو چکی تھی بلکہ اس بار وہ صرف زاہد کا لیے کے بے پناہ اصرار کی وجہ سے آ گیا صرف ایک دوست کا دل رکھنے کی خاطر — ورنہ اسے پرواہ نہ تھی۔

آسمان پر سپیدۂ سحر تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا لیکن دُھند بدستور نابینا اور سفید تھی تنہائی کی تہہ گہری ہوتی جا رہی تھی — تنہائی اور اداسی کی تہہ... وہ، مشاہد اور سرکنڈے اُس کے بوجھ تلے دبے چلے جا رہے تھے — ہر سرکنڈہ الگ — اور دُھند بھی لیکن اس کے باوجود لکشمی مینشن وہاں آ گیا... اُس کے فلیٹوں کی منزلیں ایک ایک کے اُتریں اور ایک دوسرے کے اُوپر براجمان ہوتی گئیں یہاں تک کہ اُن کی چھتیں نظر آنے لگیں جن میں ایک مستطیل چھت پر فلیٹ نمبر 17 کی چھت پر مشاہد لیٹا ہوا تھا اور اُس کی کھلی آنکھوں پر جو آسمان تھا اس کی نیم تاریکی میں صرف ریگل چوک کے پار "...نیڈرز" کے اوپن ایئر ریستوران میں سجاوٹ کے قمقموں کی ہلکی روشنی تھی... اور ...ں میں اینجلا ناچ رہی تھی...

عشقے دا اِک پلنگ نواڑی وے اساں چانیاں وِچ ڈاہیا...

آپا جی تو بس آپا جی رہیں اور جس روز اس نے انہیں "ہائے موم" کہہ کر پکارا تھا ...وں لگے چمٹے سے اُس کی مرمت ہوئی تھی... کتنے برسوں بعد اس نے قادر آباد کی دسمبر کی صبح میں سرکنڈوں میں ساکت کشتی میں آپا جی کو یاد کیا تھا... اُن کی ہڈیاں، نیچے قبر میں ...وں کے نیچے... شائد سفید لٹھے کا کوئی ایک ٹکڑا سلامت ہو اور آپا جی کے سفید بال... ...ے بہت دن، کئی برس یہ بے اختیار خواہش رہی کہ وہ کچی قبر کو اپنے ہاتھوں سے کریدے اور پھر دیکھے کہ وہ کیسی ہیں... اب کیسی ہیں... یقیناً کرم خوردہ... اور... بال تو ہوں گے... ...ت عرصے بعد اس نے ماں کو یاد کیا تھا۔

صفیہ یہ مشاہد ہے۔ یہ اچھا بچہ ہے — منٹو صاحب نے کہا تھا۔

آسمان صاف کیسے ہو سکتا ہے... اس کے چہرے پر راکھ کیوں نہیں ہے۔

دن کے وقت شاہ عالمی جلتا ہوا سنائی دیتا اور رات کو دکھائی دیتا...

فلیٹ کی باون سیڑھیوں کے عین درمیان میں جا کر سمیعہ نے اُس کا ہاتھ دبوچ کر کہا

تھا "اوئے مجھ سے ڈرتے ہو —"

اوپر نیچے اور درمیان...

لاشی مینشن اس سرکنڈوں والی دُھند بھری تنہائی میں اس لیے فلیٹ در فلیٹ اُتر تھا کہ پچھلی شب اُس نے سمیعہ کو دیکھا تھا... اور ایک بروتھل ہاؤس میں... ایک ڈھلتی عمر خاوند اور مسلسل مخمور رہنے والا خاوند اُس کا مقدر تھا... پہلے ٹیلی فون آپریٹر۔ پھر گرلز ہوسٹل کی وارڈن... خاوند کی رحلت اور تین بیٹیاں... اور غربت... بیٹیاں چٹی گوری بھری بھری.. اور گندے کچے مکانوں سے تنگ آئی ہوئیں... چنانچہ ایک آئیڈیل سیٹ اَپ...

"مشاہدی... تم کمرے میں آئے ہو تو میں نے تمہیں پہچان لیا۔ باجیوں کا کیا حال ہے —" اس پر گوشت بہت تھا اور اُس کی آنکھیں اس گوشت میں روپوش ہو رہی تھیں "پر یار تم کہاں آ گئے ہو؟"

مشاہد نے کمال کی طرف دیکھا جو ایک گنجا مڈل ایجڈ... شوگر سے سکڑتا ہوا بیزار شخص تھا اور امریکہ میں دو شادیوں کی ناکامی کے بعد چند روز کے لیے پاکستان واپس آیا تھا... اور ایک پاکستانی لڑکی چاہتا تھا... فار اولڈ ٹائمز... مشاہد قطعی طور پر ایسے رابطوں اور ملاپ کا شائق نہ تھا لیکن کمال اسے کھینچ لایا تھا... تم بے شک باہر انتظار کرنا... میں گیا اور میں آیا... اور وہاں سمیعہ تھی..

"یہ میری بیٹیاں ہیں...."

کمال بھی سنّاٹے میں آ گیا۔ "چلو مشاہد..."

"اب بھی مجھ سے ڈرتے ہو مشاہدی —"

لاشی مینشن دُھند میں تحلیل ہونے لگا...

سردی بہت تھی.. ایک اُونی مفلر کانوں کو لپیٹتا اس کے منہ کے آگے گیلا ہو رہا تھا۔

سپیدۂ سحر سرکنڈوں کے اندر سرائت کرتا ہوا انہیں الگ الگ کر رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ —" آج ڈیڑھ بجے صبح... برگیتا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں..." وہ کروٹ بدل کر دوسری جانب کھڑکی کو دیکھنے لگا "یہ میری عمر ہے..."

"نہیں مشیل..." برگیتا نے اس کی ننگی کمر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے جگہ جگہ چھوا

نہیں..."

"امپوٹنسی کے لیے کوئی وقت تو مقرر نہیں... پلیز مجھے مت چھوؤ..."

برگیتا خوفزدہ ہو کر پرے ہو گئی تھی... دراڑ بڑھتی جا رہی تھی..

اوپر بلند چھت کے عین نیچے جو روشندان تھا اس نے پہلی بار اُس کی جانب دیکھا اور وہاں وہ پرندہ تھا... کاغذ کا، ایک دھاگے سے لٹکا ہوا — "برگیتا —"

"یس ڈارلنگ..." وہ اُس کے غصیلے پن سے مزید خوفزدہ ہو گئی۔

"یہ... کاغذی پرندہ... تم نے لٹکایا ہے؟"

"ہاں —"

"کیوں؟"

"تم نے اِسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا اور مجھے خیال آیا کہ روشندان کے آگے لٹکتا ہوا اور ہوا کے زور سے جھولتا ہوا بہت زبردست لگے گا.. میں نے بہت مشکل سے ایک بلند سیڑھی منگوا کر اسے لٹکایا ہے — تمہیں پسند نہیں؟"

کیا وہ جانتی ہے اور صرف مجھے چڑانے کی خاطر اُس نے اتنی سردردی کی ہے...

اُس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ لڑکی مجھ جیسی ہے —

اُس نے اُسے دیکھا نہ تھا لیکن یہاں قادر آباد کی جھیلوں میں.. سرکنڈوں میں روپوش کشتی میں.. مرغابیوں کے انتظار میں اپنے اونی مفلر میں سرد سانس لیتے ہوئے — وہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ کرسٹین جیسی ہی ہو گی... لمبی تڑنگی اور بے باک اور — اُس میں کچھ آمیزش ہو گی.. وہ اُسے دیکھ سکتا تھا... ابھی ابھی.. ایک وحشت بھری خواہش نے اُسے جکڑ لیا ایسے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے اس کشتی سے نکل کر قادر آباد ریسٹ ہاؤس تک پانی میں چلتا ہوا جا سکتا تھا اور پھر وہاں پارک کی ہوئی وِلیز جیپ پر اس نیم تاریکی میں علی پور، گوجرانوالہ اور سادھوکے سے فراٹے بھرتا ہوا لاہور پہنچ سکتا تھا اگر اُسے کوئی یہ یقین دلا دیتا کہ وہ اس سات کمروں والی کوٹھی کے باہر پھاٹک کے ساتھ کھڑی ہو گی اور وہ اُسے دیکھ سکتا تھا.... اپنی آمیزش کو ایک نظر دیکھ سکتا تھا۔

لیکن یہ واہمہ بھی ہو سکتا تھا۔ برگیتا فاطمہ کی وجہ سے شک میں مبتلا بھی تو ہو سکتی

ایک پرندہ جو سات کمروں والی کوٹھی کے بڑے کمرے کے روشندان میں لٹک رہا

تھا — ایک اور پرندہ جس کے بارے میں تمام تر مقامی تحقیق کے باوجود یہ نہیں جانا جا سکا تھا کہ وہ کیسے اور کہاں سے آیا تھا.. جو لان میں گھومتا تھا.. اور کچھ نہیں کھاتا تھا۔ پچھلے تین روز سے بھوکا تھا اور صرف "می آؤں می آؤں" کر کے اپنی موجودگی کی اطلاع جانے کس کو دیتا تھا... اور تیسرا پرندہ جس کے پروں کی سائیں سائیں کے اُس کے کان منتظر تھے... وہ چار پرندے جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

پالے کی ماری ہوئی خشک اور بد رنگ گھاس والے لان میں کین کی کرسی پر فاطمہ دسمبر کی دھوپ میں مگن اپنے آپ میں مگن سامنے دیکھتی تھی اور سامنے برگیتا اُسے بہت دیر سے دیکھتی تھی اور اُسے بتاتی نہیں تھی کہ فاطمہ میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ وہ تھوڑی سی مجرم محسوس کر رہی تھی۔ وہ اُس کی معذوری کا فائدہ اُٹھا رہی تھی لیکن... وہ اُسے دیکھنا چاہ رہی تھی... اِس عورت میں کیا تھا جس نے مشاہد کو اُس سے بیگانہ کر دیا تھا، کونسی ایسی قوت تھی جو اُن کے رشتے کے گلیشیر میں ایک گہری اور اندھی پھلانگ نہ سکنے والی دراڑ تخلیق کر سکتی تھی... اُس میں کچھ بھی نہ تھا... وہ دسمبر کی دھوپ میں مگن ایک بوڑھی ہوتی ہوئی اندھی عورت تھی... اُس میں کچھ بھی نہ تھا...

"فاطمہ —" وہ پہلی بار بولی۔

"جی —"

"میں بہت دیر سے آپ کو دیکھ رہی ہوں... آپ کو بتائے بغیر۔"

"میں جانتی ہوں —"

طویل خاموشی اور دسمبر کی دُھوپ اور جامن، پیپل، املتاس اور شیشم کے درختوں تلے کھڑے مور کی ایک "می آؤں" کے بعد برگیتا بولی "آپ کیا جانتی ہیں؟"

"سب کچھ —" وہ کہنے لگی۔ اُسے دیکھتے ہوئے جیسے اُس کی سیاہ آنکھیں واقعی اُسے دیکھتی ہوں.. اور برگیتا میں ایک خوف آیا کہ فاطمہ ہمہ وقت ایک کھیل میں تھی... جس میں وہ نابینا ہونے کی اداکاری کر رہی تھی اور وہ نہیں تھی اور اُسے دیکھ سکتی تھی

"صرف یہ جان لو کہ بابو راؤ پٹیل میری زندگی میں وہ واحد شخص تھا جس پر میں فدا ہوئی.. بہت بُری طرح... اتنی بُری طرح کہ اس کے لیے میں نے اپنا مذہب چھوڑ دیا... اس کے بعد آج تک... تمہیں فکرمندی کی ضرورت نہیں —"

برگیتا چپ رہی۔ اسے غور سے دیکھتی رہی لیکن کہیں بھی فاطمہ کے چہرے پر کوئی ایسی شکن نہ اُبھری جو پوشیدہ رکھنے والوں کے چہروں پر خود بخود اُبھرتی ہے۔

"اس نرم دھوپ کے موسم میں جب ہوا سرد ہے... میں ان دونوں کو اپنی جانب سفید بنچ کی جانب آتے ہوئے دیکھتی ہوں اور اُن کے لمبے سکارف اُن کے قدموں میں اُلجھتے آتے ہیں۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں ایک خاص بلندی پر پائپ ہیں جو بجھے ہوئے ہیں... دھاری دار نیلے سوٹوں میں تم خیال نہیں کر سکتیں کہ وہ کیسے لگتے تھے..."

"ہاں.. میں خیال نہیں کر سکتی کیونکہ میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔" برگیتا نے ہنس کر ایک خاص خوش مزاجی سے کہا۔

"تو میری جانب بڑھتی ہوئی تصویر میں سے — بابو غائب ہو گیا اور مشاہد باقی رہ گیا۔ اسی لیے میں یہاں آئی تھی... بس اتنی سی بات ہے۔ تمہیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں —"

"نہیں میں فکرمند نہیں ہوں —"

"تم ہو —"

"ہاں میں ہوں —" یکدم برگیتا نے بے اختیار اور بہت ہی مغلوب ہو کر کہا "فاطمہ ہمارے درمیان ایک دراڑ آ گئی ہے۔"

وہ اپنے سامنے دیکھتی رہی — اور کچھ نہ بولی۔

"اس کاروبار میں شراکت بہت زیادہ ہو چکی ہے... پہلے مردان تھا... میں اُسے بہت پسند کرتی ہوں بلکہ آپ کے سامنے اگر میں اقرار کر لوں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بعض اوقات میں مردان اور مشاہد میں فرق نہیں کر پاتی۔ دونوں مجھے ایک سے عزیز ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک پلڑا جھُک جاتا ہے اور کبھی دوسرا... لیکن فاطمہ، مردان میرا حصہ بھی لے جاتا ہے — اب آپ ہیں اور..."

"میں کبھی اس کاروبار میں تمہارے حصّے کی خواہش نہیں کروں گی —"

کناروں سے لٹکتی گھاس جو پانی کے اندر تھی گلتی اور سڑتی تھی اور بُو دیتی تھی... ایک گیلی بُو اور پھر سرکنڈوں کی گیلاہٹ تھی جو دُھند میں لپٹی اس کی ناک تک آتی تھی۔ اور یہ بُو ہمیشہ رہے گی جب کہ میں سیمنٹ کی سلوں کے نیچے کعبے کی جانب منہ، سفید لٹھے

میں لپٹا — لیکن ابھی بند کھلیں گے، پہلے پاؤں کے اور وہ الگ الگ ہوں گے اور پھر منہ کے.. منہ ول کعبے شریف — اور اُس پر مٹی... دھک مکوڑے اور ڈسٹ اِن ٹو ڈسٹ...

اے ہوسٹ آف ڈیفوڈلز....

چار چیزیں ہیں....

گوشت پوست اور پروں کی پوٹلی یہ نہیں جانتی کہ وہ جو اُڑان میں ہے اور اُس اُڑان کی اِس بلندی پر آسمان کی چھت کی قربت میں اور زمین جہاں سے ایسے نظر آتی ہے جیسے خمیر شدہ آٹا تو وہاں نیچے بہت نیچے جھیلوں کا ایک سلسلہ ہے جس پر ابھی دُھند اُٹھ رہی ہے اور وہیں کہیں سرکنڈوں کا ایک جھنڈ ہے جس میں گھاس گلتی سڑتی ہے وہاں پوشیدہ ایک کشتی ہے جس میں بیکال کو کندھے سے لگائے مشاہد علی مثیل ہے.... گوشت پوست اور پروں کی پوٹلی نہیں جانتی۔

مشاہد کے کانوں میں وہ سرسراہٹ اُتری جو ایک زمانے میں اُس کے لیے ڈیبوسی کی سمفنی "آئی بیریا" کا کلائمکس تھی اور جو اُس کے جذبات کو ایسے اُبھارتی تھی جیسے بہت دن ہوئے برگیتا کا سیاہ وجود اس کے ساتھ کپکپاتا اور گیلا ہوتا تھا۔

وہاں آسمان پر جہاں مکمل اندھیرے کی بجائے سفیدی آگے آ رہی تھی وہاں مرغابیوں کا ایک بے پناہ ہجوم تھا اور اُن کے پَروں پر اُس بلندی پر سورج کی پوری کرنیں پڑتی تھیں اور اُن کے پَروں کو یُوں سنہری کرتی تھیں جیسے وہ سب ایک ہی پرندہ ہوں۔ پورے آسمان پر محیط ایک داستانوی پرندہ... ایک دیوزاد پکھیرو جس کے سنہری پَر آہستگی سے حرکت کرتے ہوئے نصف دنیا پر سایہ کر رہے تھے۔

مشاہد نے اپنی رَف اینڈ ٹف بیکال کو اونچا کیا اور اُس کی مکھی میں سے آسمان کو سیاہ کرتے شُوکتے پرندوں کو دیکھا اور یہ جانا کہ اگر وہ نشانہ لیے بغیر ہی فائر کر دیتا ہے تو بھی قادر آباد کی نصف جھیل پھڑپھڑاتی مرغابیوں سے اٹ جائے گی....

اس نے بیکال کو اونچا کیا اور پھر نیچے کر لیا۔ طلب، دیوانگی اور شکار کی وحشت نے مکمل طور پر اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس میں خواہش باقی نہ رہی تھی۔

جو کالیاں کے قریب ساہن پال سے گذر کر جب وہ سیلابی بند کے اوپر رُکے تو اس رُکے کہ انہیں بیلے کے اندر سے بھینسے کے ڈکرانے کی آواز آئی تھی... صرف ایک — اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"بمن یا تم نے فائر کیوں نہیں کیا —" زاہد کالیا ناراض ہونے لگا "میں نے پوری گی میں اتنی مرغابیاں نہیں دیکھیں۔ آسمان سیاہ ہو رہا تھا بمن یا —"

"اس لیے کہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں اور میں زیادہ سے زیادہ مرغابیاں مار گراتا، ایک نیل سر اور دو...."

زاہد کالیے نے خاموشی اختیار کر لی۔

اُن دونوں میں ایک اداسی تھی جو بٹ خیلہ کے باہر وے سائڈ ریستوران کے اڈے میں دریائے سوات کے کنارے رکھی تین کرسیوں تک جاتی تھی جہاں وہ تینوں ے تھے — نہ صرف وہاں بلکہ یہاں قادر آباد کے دسمبر میں بھی یہ پہلی بار تھی جب رشد اُن کے ہمراہ نہ تھا۔

یہ اداسی بھی تھی اور بے بسی بھی —

کالیے کی نسان پٹرول میں درجنوں مرغابیاں بے حس اور آخری پرواز کی تھکاوٹ ے بے دم اور مُردہ پڑی تھیں اگرچہ اُن میں سے چند ایک کا گوشت ابھی تک حدت میں ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

"مشاہدی یار تم اُس قید سے نکلو۔ بمن یا اُس سات کمروں والی کوٹھی کی تنہائی اور بالی کے بدن کی قید سے — میرے پاس آؤ — بلکہ آ جاؤ — میں تمہارے لیے اور مجرا کراؤں گا.... قسم سے ایسی گشتیاں لے کر آؤں گا کہ تم ٹن ٹن کر اُٹھو گے۔"

"نہیں —"

"مشاہدی ان کے ساتھ دو بول پڑھوا لیں تو یہ پھیکی پڑ جاتی ہیں، اِن میں چس نہیں ا.... قانونی شے میں وہ چس نہیں ہوتا جو غیر قانونی میں ہوتا ہے... یہ مجھ سے پوچھو... آؤ ؟"

"میں نے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے —"

"نہ جاؤ — "کالیا بجھ گیا "نہ جاؤ۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

اونچے سیلابی بند کے برابر میں سورج کی زرد اور سردی میں بجھتی کرنوں میں جنگلی بیروں کی جھاڑیوں اور گھاس پھونس میں ابھرتی قبروں کے قریب ایک نسان پٹرول اور ایک ولیز جیپ کھڑی تھیں اور ان میں سے ایک میں وہ شخص تھا جس کے جینز ان ابھرتی قبروں میں سے کسی ایک میں دفن ایک ان پڑھ لیکن، دانش کی گہری حس رکھنے والے کسان کے بدن میں سے آئے تھے اور وہ لاعلم تھا کہ اس کی قبر کونسی ہے.....

کلّر زدہ — کسی حد تک بنجر زمینوں میں سے ایک چھوٹی سی تارکول کی سڑک ابھر کر اوپر ہوتی تھی اور اپنا دامن نیچے گرنے سے بچاتی تھی جس پر مشاہد کی ولیز سفر کرتی تھی۔ علی پور کے نواح میں رنجیت سنگھ کی بارہ دری کے آثار نظر آئے اور گذر گئے۔

اور پھر کسے پرواہ تھی کہ وہاں ہوسٹ آف لوٹسز کھلتے ہیں سڑک اور ریلوے لائن کے درمیان جوہڑوں میں — کسے پرواہ تھی۔

وہ رُکے بغیر لاہور کی جانب ڈرائیو کرتا رہا اور اُس کی جیپ کے پچھواڑے میں ایک بھی مرغابی نہ تھی — صرف اَن چلے کارتوس اور بندوق کی سرد نالی تھی۔

تین چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں... اور اُن میں سے ایک قادر آباد کی جھیلوں کے آس پاس شکار — نہیں تھا۔

"ہو اِز دیئر؟"

مردان کے پاؤں اندھیرے میں منجمد ہوئے اور وہ ٹھٹک گیا — وہاں کون ہو سکتا ا — کئی مرتبہ اندھیرے میں تربیت کے دوران کاکول کے نواح میں یا پھر جنگ میں، ٹ اور کھلنا کے آس پاس یہی سوال سکوت کو توڑتا تھا — "ہالٹ۔ ہو اِز دیئر؟" اور ں کے جواب میں مردان اپنے آپ پر جبر کر کے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے خاموش ہتا تھا ورنہ ہمیشہ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ چیخ کر کہے، آئی ایم مردان علی سن آف چوہدری ردادخان اینڈ یو کین گو ٹو ہیل —

لیکن یہاں جس آواز نے وہاں کون ہے کا سوال کیا تھا وہ کرخت اور فوجی نہ تھی... م، ڈری ہوئی نسوانی آواز تھی۔

سات کمروں والی کوٹھی میں پچھلے ایک برس میں بہت ساری تبدیلیاں آ چکی تھیں اُس کی فہم سے باہر تھیں۔ بھائی جان کس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پھاٹک کو اس نے حسب عادت ایک لونگ جمپر کی طرح زقند بھر کر عبور کیا تھا رچہ لینڈنگ پر اُسے یہ وارننگ ہڈیوں کی جانب سے مل گئی تھی کہ مردان تم ہمیں آخری آزمائش میں ڈال چکے... آئندہ کے لیے اپنی عمر اور ہماری خستگی یاد رکھنا۔ بہت دیر بعد چلنے کے قابل ہوا۔ کوٹھی کے اندر بہت گہرا اندھیرا تھا جو شیشم کے قد آور درختوں پر ے اُترتا ہوا سیاہ دُھند کی مانند ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتا پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھی رات ں جہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اس نے اپنے سامنے کھڑے پرندے کو دیکھ لیا۔ یہ وہ اُسے تب نظر آیا جب وہ زقند بھر کر پھاٹک کو پھلانگتا ہوا لان میں لینڈ کر رہا تھا اور اُس ہڈیوں نے اُسے آخری آزمائش کی وارننگ دی تھی...

وہ بہت دھیمی آواز میں بولا تھا "نی آؤں —"

بھائی جان یہ کس قسم کی زندگی گزار رہے ہیں۔

مور جیسے راستہ روکے کھڑا رہا — اسے مہین آنکھوں سے تکتا رہا۔ یہ آنکھیں تاریکی میں صاف اور الگ الگ دِکھتی تھیں، اسے گھورتی ہوئی۔

فاصلوں کی کمند سے آزاد، میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے — اور شہر میونخ میں ابھی کرسمس میں چند روز باقی تھے کہ وہ پہنچ گیا۔ پچھلے برس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے — اور سات کمروں والی کوٹھی کے لان میں ایک مور اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس نے مستطیل کمرے کی جانب اس کی کسی کھڑکی میں روشنی کی رمق باہر آنے کی آس میں ادھر دیکھا اور ادھر بھی سیاہی جیسے ابد سے تھی —

مور کی گردن بہت لمبی تھی۔

وہ بڑی آسانی سے اُسے دبوچ کر مروڑ سکتا تھا... لیکن یہ سُندر بن تو نہیں تھے جہاں کے جانور بھی اُس کی تاک میں تھے اور اُس کے پاؤں سے رسیّوں کی طرح لپٹتے تھے اور اُسے جھاڑیوں میں پوشیدہ جلتی آنکھوں سے دیکھتے تھے، آوازیں ایسی نکالتے تھے کہ دل دہل جائے اور انسان کے حواس سرد ہو جائیں.. ہم حالت جنگ میں نہیں ہیں مردان علی — تم نے صرف اتنا کرنا ہے کہ اس مور کے دائیں یا بائیں جانب ہو کر چپکے سے گذر جانا ہے — بس۔

اور وہ دائیں طرف سے گذرا تو مور نے گردن گھما کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون گذر گیا ہے۔ اس کی لمبی گردن فضا میں بلند رہی اور مہین آنکھیں پھاٹک کو دیکھتی رہیں جیسے وہ نابینا ہو۔

اور اب جب کہ وہ درختوں کے جھنڈ سے پرے شیشم کے رُکھوں تلے اپنے ٹھکانے کی طرف آیا تھا، راستہ ٹٹولتا، تلاش کرتا اور کوٹھری کے بوسیدہ کواڑ کھلے تھے جن میں سے اُس کے پاؤں آگے آئے تھے اور ٹھٹکے تھے یہ سن کر کہ کوئی نسوانی آواز ہے جو پوچھتی ہے..... کہ ہو اِز دیئر؟

دسمبر کی رات میں لاہور کے ریلوے سٹیشن میں سے جو کہ ایک دنیا تھا، آباد روشن اور پُر شور وہ پیدل چلتا ہوا حسب عادت — ماڈل ٹاؤن ایسے وقت میں پہنچا تھا جب ہر جانب نیند اور سناٹے تھے۔ پھاٹک پر سے جھانک کر اُس نے پورچ کی چھت تلے دیکھا اور وہاں مشاہد کی جیپ موجود نہ تھی۔ چار چیزوں میں سے ایک نے — قادر آباد کی چیلوں نے اسے بلا لیا تھا.. چونکہ دسمبر تھا۔ بھرجائی برگیتا کو رات گئے یونہی بے آرام کرنا

نے مناسب نہ جانا اور یہی مناسب جانا کہ اپنے گھاس بھری چھت والے کمرے میں ے اور کچے فرش پر سلیپنگ بیگ بچھا کر دو چار گھنٹوں میں سپیدہ سحر کرے اور پھر ائی کے کمرے کے باہر جا کر اپنی آمد کا اعلان کرے — بھابھی برگیتا — میری کرسمس اِن ایڈوانس۔

لیکن یہاں اُس کے قدم منجمد ہو گئے تھے اور وہ ٹھٹک گیا تھا — ہو اِز دیئر؟

"میں مردان ہوں — آپ کون ہیں؟"

ادھر سے جس نے جواب دینا تھا دوہرے اندھیرے میں تھی اس لیے اسے باہر ے ہوئے کچھ وقت لگا "مشیل کے بھائی؟ — چھوٹے بھائی؟"

"ہاں" مردان از حد حیران ہوا۔

دوہرے اندھیرے میں بولنے والی نے اندھیرے کی ایک تہہ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد اور پھر بولی "مشیل تمہارا بہت ذکر کرتا تھا — بلکہ صرف تمہارا ہی ذکر کرتا تھا۔ بابو کے بارے میں بات کرتا تھا تو ہمیشہ کہتا تھا، اُس کا چھوٹا بھائی مردان ہے — تُو تم ن ہو؟"

"جی —"

"تمہارے بدن میں وہی مہک ہے۔ تم دونوں کے پسینے کی بُو ایک سی ہے —"

"آئی ایم سوری" بہت پشیمان ہو کر اس نے کہا "میں ایک لمبے سفر سے آیا ہوں راچی سے اِس لیے... اپنے آپ کو... صاف ستھرا نہیں کر سکا —"

"اگر تم نہ بولتے تو میں تمہیں مشیل ہی جانتی — میں سو رہی تھی — تم نے مجھے ا۔"

"آئی ایم سوری —"

"کھڑے کیوں ہو — بیٹھ جاؤ — ادھرا میرا بستر ہے۔ تم پائنتی پر بیٹھ سکتے ہو۔ یں جاگ گئی ہوں —"

باہر تو تاریکی اور پوشیدہ خاموشی بدستور رہی لیکن گھاس بھری چھت والی بوسیدہ ری کے اندر جہاں حاملہ بلیاں بسیرا کرتی تھیں وہاں ہر شے الگ الگ ہو کر صاف صاف کے سامنے آنے لگی — سفید بالوں والی ایک خاتون، آنکھیں اور وہ بڑی اور دلکش ہت آہستگی سے سلوموشن میں جھپکاتی عین سامنے دیکھتی تھی، مردان کی جانب نہ

دیکھتی تھی۔

وہ پائنتی پر اس احتیاط سے بیٹھا جیسے اُسے یقین ہو کہ یہ بستر اور اس پر بیٹھی ہوئی عورت چینی کے کھلونے ہیں — باریک اور ریزہ ریزہ ہو جانے والے اور یہ — ٹوٹ جائیں گے... اس احتیاط سے بیٹھا "آپ کون ہیں؟"

"میں فاطمہ ہوں۔" اس نے گردن میں بل دے کر براہ راست مردان کی آنکھوں میں دیکھا... اور وہ کس تسلسل کے ساتھ اسے دیکھے چلی جا رہی تھی، ایسے تسلسل کے ساتھ جو بے آرام کرتا تھا کہ یہ کیوں میری جانب اس طرح دیکھے چلی جا رہی ہے۔

"فاطمہ؟"

"بابو کی بیوی — بابو مشیل کا بہترین دوست تھا انگلینڈ میں — بہت برس ہو گئے۔"

وہ اُٹھتے ہوئے کہنے لگا "میں باہر سو جاتا ہوں۔ آپ آرام کریں۔"

"نہیں —" وہ تیزی سے بولی "آپ اپنا ہاتھ مجھے دیں" فاطمہ کا ہاتھ اس کے سامنے آیا اور اس کی انگلیاں ہولے ہولے ہلنے لگیں۔

"جی؟"

"اپنا ہاتھ —"

مردان نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا اور صرف اُسی لمحے اُس نے سمجھا اور جانا کہ وہ اُسے دیکھ نہیں سکتی کہ اُس کا ہاتھ ہوا میں اُسے تلاش کرتا رہا جب تک آگے ہو کر اسے تھام نہ لیا "میں دیکھ نہیں سکتی مردان — آپ یہاں بھی سو سکتے ہیں — یوں بھی میں شائد آپ سے عمر میں بڑی ہوں۔"

فرش میں سے گھاس سر نکالتی تھی۔ کچھ بوٹے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے پھول لگے ہوئے تھے اور گیلاہٹ تھی اور اُس پر مردان نے اپنا سلیپنگ بیگ کھولا۔

"آپ فرش پر سوئیں گے؟"

"مجھے چارپائی پر سوئے ہوئے — بہت برس ہو گئے ہیں۔"

"کوئی پرانی چوٹ یا کمر کا درد وغیرہ —"

"ہاں — ایک پرانی چوٹ!"

"مشاہد تو نہیں ہے — شکار پر جانے والی جیپ کے انجن میں ایک الگ

چینی ہوتی ہے جو میرے کانوں نے سُنی تھی۔ اس نے جیپ سٹارٹ کی تو میں اس گاڑی میں..."

"جی —" بھائی جان کو دسمبر میں بہت سی چیزیں بلاتی ہیں... وہ صبح سویرے واپس آئیں گے... زیادہ دیر نہیں۔"

"ہم اتنی دیر باتیں کر سکتے ہیں.. میں اب سو نہیں سکتی —"

"ہاں —"

وہاں مستطیل کمرے میں — برگیتا نے ایک اور کروٹ لی۔ بے خوابی اور بےچینی کم نہ ہوتی تھی...

"می آؤں —" مور پھر بولا۔

آج مشاہد کو کیا ہوا تھا؟ کیا واقعی امپوٹنسی کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں یا وہ خود ذمہ دار تھی... وہ اب مشاہد کو اُبھار نہیں سکتی تھی — وہ دراڑ جو درختوں کے جھنڈ کے مسمار ہوتی کوٹھڑی میں خوابیدہ تھی — یا نہیں تھی — وہ دراڑ شائد ذمہ دار نہیں .. مشاہد علی مشیل کے ساتھ اُس کے دن پورے ہو چکے تھے — جو زندگی اُس کے نصیب میں تھی اس کے دن پورے ہو گئے تھے اور بڑھ نہیں سکتے تھے۔ جیسے ہر انسان کی متعین ہوتی ہے ایسے ہر رشتے اور جذباتی تعلق کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، وہ اختتام کو پہنچ جائے تو لاکھ منت سماجت اور بدن کی کشش اس میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں کر سکتی.. وہ قطعی طور پر ذمہ دار نہیں تھی۔

کروٹ لیتے ہوئے اس کے کانوں نے ٹھہری ہوئی تاریکی اور چپ میں جو کچھ بہت آہستے سے حرکت کرتا تھا اس کی سرسراہٹ سنی تھی — باہر کوئی تھا — مور کے سوا بھی کوئی تھا۔

مالی شریف نے آس پاس کے تمام گھروں سے یہ ظاہر کیے بغیر کہ اُن کے ہاں لان میں ایک مور کھڑا ہے، استفسار کیا تھا کہ کیا اُن کا کوئی پالتو پرندہ گم ہوا ہے اور جواب نفی میں تھا۔ صرف ایک گھر کے اندر جانے کی وہ جرات نہیں کر سکتا تھا جہاں بلند اور گھنی گھاس میں سانپ بسیرا کرتے تھے اور جس کے لان میں متعدد خونخوار کتے گھومتے تھے اور جہاں کوئی رانی رہتی تھی۔

برگیتا اُس کے لیے فکر مند تھی، وہ جب سے آیا تھا اُس نے کچھ نہیں کمایا تھا۔ وہ

گردن بلند کیے شکایت بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھتا رہتا اور اپنے آگے رکھی گئی خوراک کو قطعی طور پر رغبت کی بجائے رنجش کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

برگیتا نے اپنے پورے بدن پر ایک نابینا کی طرح محسوس کرتے ہوئے ہاتھ پھیرا، اپنے آپ کو جاننے کے لیے، جانچنے کے لیے اور وہ ہر ابھار پر ٹھہری اور ہر نشیب پر رُکی یہ جاننے کے لیے کہ وہ کیسے قصور وار تھی —— کہیں بھی کوئی نمی نہ تھی، گیلاہٹ نہ تھی جو مشیل کی اُس کے بدن میں موجودگی کا پتہ دیتی اور یہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اوپر، رات کے باوجود، بلند روشن دان کے آگے کاغذ کا پرندہ دکھائی دیتا تھا۔ ماضی کے اتھاہ جنگلوں میں سے نکل کر حال کے ریگزاروں میں پرواز کرتا ہوا... پرندے تیرا بھید کیا ہے؟ ایک اور کروٹ بدلنے کے بعد بھی جب اُس کی آنکھیں نیند سے آشنا ہونے کے قریب نہ ہوئیں تو وہ اُٹھ بیٹھی... اپنے آپ کو نائٹ گاؤن میں کیا اور پھر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ دسمبر کی یخ اور کٹیلی ہوا گاؤن کے اندر اس کے بدن میں چلنے لگی اور وہ ٹھٹھرتی ہوئی وہیں اندھیرے میں دم سادھے کھڑی اس پرندے کو دیکھنے لگی جس نے صرف ایک بار گردن گھما کر اسے دیکھا تھا اور پھر اپنی مہین آنکھیں پھاٹک پر رکھ دی تھیں یہ دیکھنے کے لیے کہ کون اندر آتا ہے ——

"اولاد کی محبت کو میں بھی جانتی ہوں ——" سفید بالوں والی عورت بول رہی تھی "جب وہ ماتھے پر تلک لگائے ایک مجبور اور نفرت بھری نگاہ تم پر ڈالتے ہیں تب بھی دل میں سے خون کا ایک فوارہ چھوٹتا ہے اُن کی اُلفت کے لیے —— میں اُن کی داسی بن کر رہ لیتی اگر وہ مجھے رکھ لیتے —— پر وہ بہت شرمندہ تھے اور میں اپنی آل اولاد کو کسی کے آگے شرمندہ اور بے وقعت ہوتا نہیں دیکھ سکتی اس لیے آ گئی —— شوبھا آپ کی بیٹی ہے؟"

"ہاں —— اس نے میرے اجتماعی احساس سے جنم لیا ہے ——"

ایک بُوٹا تھا جو سلیپنگ بیگ کے کناروں پر اُس کی ناک کی قربت میں آتا تھا اور اُس میں ایک چھوٹا سا زرد پھول تھا جو اُس کی ناک پر کھجلی سی کرتا تھا اور اُس میں جو مہک تھی وہ کچی اور بدذائقہ سی تھی —— اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو اس ناہنجار بوٹے سے الگ کیا "میں اُس کی شادی کر رہا ہوں۔ آپ کب تک یہاں ہیں؟"

فاطمہ بہت دیر تک کچھ نہیں بولی۔ پہلے تو وہ ہر سوال کے جواب میں فوراً کچھ نہ

کہہ دیتی لیکن اب اپنے سامنے دیکھتی رہی اور پھر بولی تو بہت دور سے اور اپنی زوری کے بوجھ تلے دبی ہوئی بولی "میں زیادہ دیر تک یہاں نہیں ہوں —— مجھے اس گھر کے ینوں میں اپنی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ تصویریں جن میں میں اپنے آپ کو دیکھتی ں اور مجھے ڈر ہے کہ جب میں اس گھر سے نکلوں گی تو باقی ماندہ زندگی میں میرے سامنے سادہ دیوار ہو گی جس پر کچھ بھی نہ ہو گا... اُسی دیوار کے ساتھ میں نے اپنی زندگی ارنی ہے تو کچھ دن اپنی شکلیں دیکھ لوں —— کتنے دن؟ بس کچھ دن ——"

"کراچی کی صورتِ حال کچھ ٹھیک نہیں ——" وہ بالکل الگ راستے پر سفر کرنے فاطمہ سے پرے ہو کر مردان ایک اور ٹریک پر چلا گیا "بیروت میں بھی بالآخر ایک میز پر نا پڑا... لیکن وہ تب بیٹھے جب ہر سو کھنڈر تھے۔ کم سے کم کھنڈروں میں مذاکرات کی میز یہی دانش مندی ہے —— ابھی تو قتل، قتل کو جنم دے رہا ہے..."

"مے آئی کم اِن؟"

دونوں اس آواز پر چونک گئے۔

"بھرجائی آپ ——" مردان اپنے سلیپنگ بیگ میں اُلجھتا اپنے آپ کو الگ کرتا بڑی دِقت سے اُٹھا اور برگیتا نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور ایسے لگا جیسے ت کا افسوس کرنے کے لیے گلے لگاتے ہیں۔ وہ مردان سے لپٹ کر ایسے کھڑی تھی جیسے ی دنیا ویران اور بے آباد ہے اور اس میں صرف ایک سہارا، ایک ستون ہے جو کہ ان ہے۔

برگیتا نے ایک ہچکی بھری اور اس میں ایک ناخوشی تھی جو اُس کے آنسوؤں میں ی ہوئی اُس کے رُخساروں پر بہنے لگی۔

"کیا ہوا بھرجائی —— کیا ہوا؟" مردان نے اس کی پُشت کو شفقت سے تھپکا۔

"کچھ نہیں ——"

"آپ ناخوش ہیں؟"

اندھیرے میں اُس کے بدن کے اندھیرے میں اس کے سفید دانت نظر آئے — اس لمحے، جامن چنار اور املتاس کے درختوں تلے اس گھاس کی چھت والی ٹیا میں، تمہارے سامنے —— میں بہت ناخوش ہوں مردان ——"

"لیکن پیاری بھابھی جان ——" اس نے برگیتا کے کپکپاتے بدن کو اپنے سے الگ

کیا اور اندھیرے میں بھی اُس کا مہاندرا ناخوش دکھائی دے رہا تھا "آپ اگرچہ خوش نہیں ہیں لیکن چار مرغابیوں کا تو خوشی سے کوئی تعلق نہیں — ایک شیولر اور تین نیل سر، کیا خیال ہے؟"

وہ اپنے سر پر سفید بالوں کا بوجھ محسوس کرتی کان لگائے سن رہی تھی اور اُس نے کبھی ایسی بے ربط گفتگو تو نہ سنی تھی لیکن وہ سنتی رہتی کہ مرغابیوں کا کیا جواب آتا ہے اور اُس نے سنا کہ برگیتا کی ہنسی ہے جو اُس کی بھیگتی آنکھوں میں سے ہو کر آئی ہے اور ناخوشی کا سندیسہ لاتی ہے اور پھر بھی مردان کی موجودگی اس میں سے ناخوشی کے عنصر کو کم کر کے اُسے زندگی کے قریب کرتی ہے۔

"تم درست کہتے ہو۔ کوئی تعلق نہیں... میں کئی بار تم میں اور مشاہد میں فرق نہیں کر پاتی اور اب بھی مجھ پر وہی کیفیت ہے۔"

ان کے پسینے کی بو ایک جیسی ہے تو فرق کیسے کر پائے —

"مردان — یہ فاطمہ ہیں —"

"واقعی؟" مردان بھی ہنسا "میں تو حیران پریشان اور جنگل بیابان بھرجائی جی —"

اور برگیتا جان گئی کہ مستطیل کمرے میں اُسے جو احساس ہوا تھا کہ وہاں لان میں مور کے سوا بھی کوئی ہے تو یہ کوئی فاطمہ سے اچھی طرح متعارف ہو چکا ہے۔

"اور تم شوبھا کو کیوں نہیں لائے؟"

"فائنل امتحان سر پر... پریکٹیکلز اور جگر سوز پڑھائیاں بھرجائی جی — وہ نہیں آ سکتی تھی لیکن آپ کا پسندیدہ اور اکلوتا دیور آپ کو میری کرسمس کہنے کے لیے آ گیا ہے۔"

"اتنی جلدی —"

"تو واپس چلا جاتا ہوں —"

"نہیں نہیں —" برگیتا یکدم مکمل طور پر بحال ہو گئی اور خوشی اس کے اندر صرف مردان کی موجودگی کی وجہ سے رچنے لگی "مجھے بھی ایک ایسے ویٹر کا انتظار تھا جو ان درختوں کو میرے لیے رنگین کرسمس لائٹس سے سجا دے اور پھر ڈنر سرو کرے — مجھے انتظار تھا۔"

جیپ کا ہارن ہوا تو سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئے۔

برگیتا نے مردان کی جانب دیکھا اور وہ کوٹھڑی سے باہر آیا اور اندھیرے میں دیکھنے والی شریف اپنے کوارٹر میں سے نکل کر بھاگتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے پھاٹک کھولا اور ہو گیا۔ جیپ اندر آئی اور اُس کی لائٹس بجھ گئیں۔ تاریکی پھر سے نیچے آ گئی۔ مردان احتیاط سے قدم اُٹھاتا جیپ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس نے پھر محسوس کیا کہ قدم اُٹھاتے ے اس کی ٹانگوں کے پٹھے اسے تکلیف دیتے ہیں اور اُس کا پاؤں قدرے گھسٹتا ہے دسمبر کے مہینے میں ڈھکی چھپی چوٹیں سطح پر آ جاتی ہیں اور اذیت دیتی ہیں — وہ بہت یاط سے قدم اُٹھاتا جیپ کی طرف جا رہا تھا۔

چار چیزیں ہیں — لیکن اب تو صرف تین چیزیں ہیں جن میں سے ایک کامران کی دری سے لگ کر بہنے والا دریائے راوی ہے۔

"صاحب جی آپ دریا میں کشتی چلاؤ گے — بہت مضبوط کشتی ہے جناب... نرائی ین —"

"نہیں —"

"مناسب کرایہ لیں گے صاحب جی —"

"نہیں —"

مشاہد قادر آباد کی جھیلوں کی تھکاوٹ میں تھا اور اُس کا بدن جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر ب جگ ساپزل کی طرح دوبارہ جڑتا تھا۔

"بھائی جان آپ بے شک چلیں شرق پور راوی میں اشنان کے لئے، بھابھی کے اتھ... ہم تو یہیں ٹھہریں گے اور بابا نذیر کو تلاش کریں گے — وہ یہیں کہیں ہونا ہے۔"

فاطمہ اُن سے الگ تھلگ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ میں اور اندھیرے میں راسر تنہا تھی۔ اُس کی نابینا تنہائی کا کوئی حصہ دار نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے چہرے راوی کے پانیوں کی تازگی بہتی ہوئی محسوس کر رہی تھی اور یہ جانتی تھی کہ سامنے کوئی دیم عمارت ہے جسے سے لگ کر یہ دریا بہتا ہے اور یہ لوگ اس کے بہاؤ کے بارے میں کرمند ہیں۔ وہ چپ چاپ ان کی گفتگو سنتی اپنے آپ میں نابینا اور مگن رہی۔

"بابا نذیر ہمیشہ اس سے یہاں ہوتا ہے، آج کیوں نہیں ہے —" مردان اور

تشویش راوی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"تم بہت زیادہ تھک تو نہیں گئے مشاہد؟" برگیتا نے اس کا بازو تھپکا" میں آج بہت فکر مند تھی۔ شکار کیسا رہا ——"

مشاہد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کیا کہتا کہ اس کے کارتوس ان چلے رہے اور بندوق سرد رہی لیکن اُسے کچھ تو کہنا تھا اس لئے —— صرف اس لئے اس نے کہا "ٹھیک رہا۔"

پاؤں تلے کی ریت بہت سرد تھی۔

جو مدھم لَو تھی... جیسے ایک تاریک چھت پر صرف ایک دیئے کی لو ہوتی ہے ایسے مدھم لَو میں کامران کی بارہ دری کے ساتھ لگ کر بہتا ہوا دریا دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی بھربھری اینٹوں پر چھپاک چھپاک اوپر نیچے ہوتا دکھائی دیتا تھا۔

راوی کا بہاؤ مدھم لگتا تھا۔

نظروں کا کوئی ایسا پیمانہ نہیں کہ بہاؤ کے ساتھ بہہ کر جان جائے کہ آج یہ نارمل ہے اور آج مدھم بہتا ہے صرف ایک احساس ہے رونئیں میں کہ آج یہ مدھم ہے۔

اُس نے اپنے بڑے بھائی کی جانب دیکھا جو اپنی بیوی سے الگ ہو کر کھڑا تھا اور ایک ایسے ستون کی طرح کھڑا تھا جس کے آس پاس یونانی تھیٹر کے تمام ستون مسمار ہو چکے ہیں اور وہ ایک سحر شدہ شخص کی طرح سامنے دیکھ رہا تھا —— صبح کی ٹھنڈک سے الگ، راوی کی سرد ریت سے جدا، وہ اپنے چہرے پر اثر کرتی ہوا سے لاتعلق سامنے دیکھ رہا تھا۔

صرف اس لئے کہ اُس نے بھی وہی کچھ دیکھا تھا جو مردان دیکھ رہا تھا لیکن اُسے یقین نہیں آ رہا تھا —— بارہ دری کی اینٹوں پر دریا کے بہاؤ کے نشان تھے اور انہوں نے آج تک وہ اینٹیں نہیں دیکھی تھیں جو کامران کے عہد سے پانیوں میں غرق تھیں اب وہ اینٹیں ننگی ہو رہی تھیں۔

پانی کم ہو رہے تھے۔

راوی کے پانی بھی کم ہو رہے تھے —— یہ ممکن تو نہ تھا لیکن راوی... ایک وسیع لق ودق صحرا... جھاڑیاں اور کرلے... اور کھنڈر... ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی طرح —— کھنڈر شہر لاہور کے... یہ ممکن تو نہ تھا...

گوالمنڈی والے مکان کی چھت پر سفید بستروں پر لیٹے مشاہد اور مردان آنکھیں کھلی رکھتے تھے اور دیکھتے تھے کہ دائیں جانب آسمان پر ایک متحرک اور گرم روشنی ہے

ہٹ والی —— باتیں کرتی ہوئی۔ اس کی الاؤ زبانیں کچھ کہتی ہوئیں —— اڑتے سیاہ ں، پر کٹے پرندے جو سفید کھیسوں اور اُن کے چہروں پر اُترتے تھے۔

کھلنا بیر کس کے شہتیروں سے جھولتے ناک کٹے، کان کٹے اور نفس کٹے لوگ مزے سے جھولتے ہوئے... مشاہد نے اپنی جین کی ہپ پاکٹ پر ہاتھ رکھا... وہ کنگن گولائی کے ساتھ وہاں آج بھی موجود تھا... یہ کس کی کلائی کی آرائش تھا —— بہت ہو گئی تھی اُسے سنبھالے ہوئے ——

جب بھی لاہور کا آسمان شفق رنگ ہوتا... اک دن رہیں بسنت میں —— بسنت لاہور کی چھتیں۔ ممٹیاں اور برج ایک پرشور شدت کے ساتھ روشن تھیں۔ شہر کے چفیرے سرکلر روڈ پر گھومتے ہوئے کوٹھوں اور مکانوں پر نظر رکھتے ہوئے جب آپ کرتے تھے تو اُن پر ہزاروں سفید پتنگیں اور گڈے بے بسی سے شانے ہلاتے نظر آتے ... پرانی حویلیوں پر —— اُن کی چوڑی اور کچی چھتوں پر اداکار، سیاست دان، سفارت کار ڈھول اور روائتی کھانے اور بو کاٹا —— بے پرواہ —— لاپرواہ —— بو کاٹا —— شاہ ں، نیرو کا روم اور بسنت رات... دیکھو شفق کی سرخی کیا رنگ لا رہی ہے —— کیا رنگ ئے گی۔

مرادن بہت احتیاط سے قدم اُٹھاتا جیپ کی طرف جا رہا تھا۔

جیپ میں سے اُترتے ہوئے مشاہد کی اعضاء میں تھکاوٹ اتنی تھی کہ زمین پر قدم کھتے ہوئے اُسے اُسے اپنا آپ سنبھالنا پڑا —— جیسے حالت خمار میں کوئی سنبھلتا ہے اس جیپ کی باڈی کا سہارا لیا۔ وہاں قادر آباد کی جھیلوں پر روشنی پھیل چکی تھی لیکن یہاں اس کا رچاؤ نہیں ہوا تھا... اُس نے جیپ کا سہارا لیتے ہوئے درختوں کے ذخیرے کی رف دیکھا اور اُن میں سے جو شخص نکل رہا تھا اُس کی شکل نے اور چال نے... اور وہ اپنا ں گھسیٹ کر چلتا تھا مشاہد کو تروتازہ ایسے کیا جیسے وہ کسی یخ جھیل میں بہت دیر زیر آب س روکے ہوئے تھا اور جب سطح پر آیا تو وہاں تروتازہ ہوا تھی —— زندگی تھی۔

"بھائی جان ——" وہ اُس کی جانب آ رہا تھا لکشمی مینشن کی گرم دوپہر میں نکر اور بہت پریشان اور وہ مشاہد کی اس انگلی کو دیکھ رہا تھا جسے تھام کر وہ اس کے ہمراہ مال پر سیر کو جائے گا۔

"مردان —" وہ جیپ کے سہارے سے الگ ہو کر اُس کی طرف بڑھا کیونکہ اُس نے پاؤں گھسٹنے کی اذیت اس کے چہرے پر دیکھی جو اُسے دیکھنے کی سرخوشی میں کچھ کچھ دیتی ہوئی شامل ہو رہی تھی۔ اندر اُس گھاس اُگے کمرے میں برگیتا کو باہر آ کر یہ دیکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ دونوں بھائی اس لمحے گلے مل رہے ہیں اور اُن میں جو محبت ہے اس میں کسی اور کا حصہ نہیں ہے — فاطمہ نے اس کے حسد کو محسوس کیا اور اس کے وجود میں اس کے لئے صرف ہمدردی تھی — مشاہد شروع سے ہی ایسا تھا — اس نے بھی ایک زمانے میں اس سے بہت حسد کیا تھا۔ اُن دونوں کو مشاہد اور بابو کو ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر وہ بہت سلگتی تھی اور اس کی آنکھوں میں کوئلے دہکنے لگتے تھے — اب تو وہ راکھ ہو چکی تھیں لیکن کبھی وہ دہکتی تھیں۔

"بھائی جان میں تو حیران پریشان —" مردان ہنس رہا تھا اور بھائی کے کندھوں کو تھام کر ہنس رہا تھا۔

برگیتا منتظر تھی اور پھر وہ ہنسی مشاہد کی گہری محبت والی جو اس کی قسمت میں کبھی نہ تھی اس تک پہنچی اور وہ بے صبری اور ناپسندیدگی سے اپنے آپ میں سمٹی اور تھوک نگل کر پھر اپنے کان کھلے دروازے کی طرف کئے جدھر سے وہ ہنسی آ رہی تھی۔

"شوبھا اس بار بھی نہیں آ سکی بھائی جان —" مردان فوراً بولا کہ وہ جان گیا تھا کہ اب شوبھا کا پوچھا جائے گا "فائنل ایئر اور... آپ جانتے ہیں کہ آنٹی بابر کی بیٹیاں بھی فی الحال ہمارے ہاں ہیں تو... ذرا مشکل تھا۔"

"اچھا —" مشاہد نے اس کی بڑھی ہوئی سفید ہوتی داڑھی کو ایسے سہلایا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ تھا، آئس کریم کھا کر آیا تھا اور تھوڑی سی آئس کریم اس کے گالوں پر لگی تھی... "عارفین بھی..."

"نہیں بھائی جان —" مردان اپنے بھائی کی رمزیں سمجھتا تھا "نہیں — اب نہیں — بہت دیر ہو گئی ہے — بہت تلواریں چل چکی ہیں اور آوارہ گولیاں آوارگی کر چکی ہیں اور ہم وہ نہیں جو تھے آنٹی بابر کے گھر کی عافیت میں تھے، بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"یہ بُرا خیال نہیں ہے عارفین والا —"

"واہ —" مردان بہت ہی خوش ہوا۔

"کیا واہ —"

"بس یہی کہ اتنی دیر ہو چکی ہے کہ ہم تو... اپنی بیٹی کی شادی کر رہے ہیں... اس واہ —"

"شوبھا کی —"

"اور کیا — اُس کا سدّا دینے بھی آیا ہوں... پیار دیجیے اسے اور رخصت کیجئے"

"مردان یکدم ایک فالج زدہ شخص کی طرح اٹکنے لگا" وہ مسکراتا رہا کہ میری زبان کو کیا ہے لیکن اٹکتا رہا "اُسے شوبھا کو... اس کے لئے... مجھے... مجھے ہمت چاہئے بھائی جان" نے مشاہد کے بازو کو جس مضبوطی سے سہارے کے لئے جکڑا اس کے لئے مشاہد تیار نہیں ابھی سوچ بھی نہیں سکتا اس سے جدائی کا... مجھے بہت ساری ہمت چاہئے —"

"تم فکر نہ کرو مردان — تم فکر نہ کرو" آنکھوں کی نمی پر مشاہد نے بھی مشکل سے قابو پایا۔ "اباجی کہتے تھے کہ بیٹیاں دھڑکنیں ہوتی ہیں، پتہ ہی نہیں چلتا اور قد نکال کر ہو جاتی ہیں اور — یہ چڑیاں ہوتی ہیں اور انہیں اُڑ جانا ہوتا ہے — تم فکر نہ کرو"

"می آؤں —"

مردان چونک گیا۔ راستہ روکنے والا موڑ ابھی تک یہیں تھا لیکن ذرا فاصلے پر جیسے دونوں کی گفتگو میں مخل نہ ہونا چاہتا ہو۔

مخل ہونے کے لئے برگیتا کمرے سے نکلی ایک مسکراہٹ کو تادیر اپنی ہونٹوں پر تھام رکھے وہ ان دونوں کی جانب آ رہی تھی "کیا میں مخل ہو سکتی ہوں؟"

"ہاں —" مشاہد نے کہا۔

"سات کمروں والی کوٹھی میں کم از کم سات کمرے ہیں جن میں سے کسی ایک میں ہم تینوں ہیٹر جلا کر آرامدہ ہو کر بیٹھ سکتے ہیں — یہاں اس بیچ میں کھڑا رہنا ضروری تو نہیں؟"

"نہیں —" مشاہد نے پھر کہا

اور برگیتا نے دیکھا کہ وہ اب بھی اُن کے لیے موجود نہ تھی۔ وہ صرف "ہاں" یا "نہیں" کے ساتھ رخصت کر دی گئی تھی۔

کسی ایک کمرے میں ہیٹر کے سامنے بیٹھنے کے بعد بھی وہ اُن کے لئے موجود نہ

وہ صرف ایک سرسری مسکراہٹ یا ایک خالی الذہن "ہاں" یا "نہیں" کے لئے

تھی۔

ایسے موقعوں پر وہ ایک طویل ہچکی بھرتی اور بہت باتونی اور قدرے ابنارمل ہو جاتی...

"مشاہد تمہیں پتہ ہے کہ ہماری خوشگوار شادی شدہ زندگی کا سب سے بڑا راز کیا ہے؟"

"کیا؟"

"مردان —" وہ ہنسنے لگی" ہاں مردان — پاکستان میں میری ایک بھی کرسمس ایسی نہیں جب مردان نے مجھے بھرجائی میری کرسمس نہ کہا ہو — اور درختوں کے جھنڈ میں سے کسی ایک درخت کو کرسمس ٹری کی طرح سجا کر مجھے حیران پریشان بلکہ جنگل بیابان نہ کیا ہو! — اور ابھی کرسمس میں کچھ دن باقی ہیں اور یہ... میرا پسندیدہ دیور — صرف میرے لئے لاہور آ گیا ہے — کیا یہ خوبصورت بات نہیں؟"

"ہاں —" مشاہد نے کہا۔

"مشاہد — مشیل میرا خیال ہے تم میری بات دھیان سے نہیں سن رہے —"

"نہیں — ایسا نہیں"

"مشیل — آل دے وے فرام کراچی — مردان مجھے میری کرسمس کہنے آیا ہے اور — تمہیں ملنے کے لئے نہیں آیا —" وہ ایک بے اختیار ہنسی میں مبتلا ہوئی۔

"مردان ہمیں مدعو کرنے آیا ہے — شوبھا کی شادی ہو رہی ہے"

"واقعی؟ —" برگیتا اس خبر کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھی اس لئے اس کی سوچی سمجھی باتوں کا تسلسل یکدم ٹوٹ گیا اور وہ کچھ دیر کے لئے چپ ہو گئی۔

"کب؟" اس نے بالآخر اپنے آپ کو مجتمع کر کے دریافت کیا۔

"فائنل کے بعد بھابھی — آپ نے ضرور آنا ہے — مجھے کچھ پتہ نہیں کہ بیٹیوں کو کیسے رخصت کیا جاتا ہے —"

"پتہ تو مجھے بھی نہیں" برگیتا اپنی اہمیت پر خوش ہو گئی "لیکن میں کوشش کروں گی"

بھائی جان نے عارفین کے بارے میں کچھ کہا تھا —

شوبھا نے بھی کہا تھا —

شوبھا کے بعد — ابھی تو میں برداشت نہیں کر سکتا کہ شوبھا کے بعد بھی زندگی ہو سکتی ہے۔ لیکن — اُس کے بعد وہ دونوں کیسے بیرک میں رہیں گی۔ یہ ایک عجیب اور معاشرے کے لئے انگلیاں اُٹھانے والا بندوبست ہو گا — یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا ابھی، اسی لمحے اسے خیال آیا تھا۔ وہ انہیں، شوبھا کی رخصتی کے بعد برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے انہیں یہ تو نہیں پوچھ سکتا تھا کہ — آپ کب جا رہی ہیں؟ — اس الجھن کو کیسے سلجھایا جا سکتا تھا؟ وہ حل تو نہیں ہو سکتا تھا جو بھائی جان نے پیش کیا تھا — کبھی نہیں — عارفین، وہ اس کی جانب اب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا... اُس دیکھنے کے بعد اب نہیں دیکھ سکتا تھا — اور آنٹی بابر جانتی تھیں کہ کیوں... اپنی تمامتر غنودگی اور خراٹوں کے باوجود جانتی تھیں کہ وہ نظرنیچی کر کے کیوں اس سے بات کرتا ہے —

"شوبھا کے بعد ہمیں ایک اور ویڈنگ کے لئے تیار ہونا ہو گا —" مشاہد نے بہت آہستہ سے کہا۔ صرف مردان نے سنا اور چُپ رہا۔

برگیتا جو اپنی اہمیت پر خوش ہوئی تھی، پھر بولنے لگی "میں ضرور کوشش کروں گی اگرچہ مجھے بھی کچھ پتہ نہیں کہ بیٹیوں کو کیسے رخصت کرتے ہیں" اس نے ایک طویل سویڈش ہچکی بھری اور پھر چپ ہو گئی۔ وہ خواہ مخواہ باتونی ہو رہی تھی اُسے یکدم احساس ہوا اور وہ چُپ ہو گئی۔

اس کمرے میں بہت دنوں سے ٹھنڈک اور یخ کا بسیرا تھا۔ اس کے کونوں کھدروں میں اور روشندانوں کی رسیوں میں بہت یخ تھی جو ٹھہری ہوئی تھی اور اب آہستہ آہستہ وہ کم ہو رہی تھی اور کمرہ کوزی ہو رہا تھا۔

مشاہد اور مردان گیس ہیٹر پر نظریں جمائے بہت دیر سے اُسے ایک سحر شدہ حالت میں تکے جا رہے تھے اور برگیتا اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

برگیتا بہت دیر کا سکوت برداشت نہ کر سکی "ہم شرق پور کے قریب گگو گاؤں کے سامنے برگد کے اُس تناور درخت کے دوسری جانب راوی کے پانیوں میں کب اُتریں گے مشاہد — ایک برس ہو گیا ہے"

"آج ہی —" مشاہد نے کہا

"آج ہی؟" برگیتا کو اس جواب کی توقع بالکل نہ تھی اور ذرا حیران ہوئی "آج ہی کیوں"

"اور آج کیوں نہیں؟"

"تم ابھی شکار سے لوٹے ہو۔ مردان ابھی آیا ہے اور..."

"آج ہی — اور ابھی"

وہ چاروں سرد ریت میں اپنے بوٹوں میں سے گزرتی سردی کو پورے بدن میں سرائت کرتے تھے اور بارہ دری کی اُن اینٹوں کو ظاہر دیکھتے تھے جنہیں آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

مجھے ان کے ہمراہ نہیں آنا چاہئے تھا' یہ ان کی بالکل ذاتی ملاقات خاندانی اجتماع تھا... اگرچہ وہ فاطمہ.... پانیوں کی تازگی اپنے چہرے پر رواں محسوس کرتی تھی — پھر بھی یہ ان کی ذاتی ملاقات تھی۔

ویلیز جیپ کی پچھلی نشست پر... ایک پکنک باسکٹ تھی اور اس میں کافی اور سینڈوچز کے علاوہ ایک سوئمنگ کاسٹیوم بھی تھا — پہلی بار... مشاہد میں سختی آتی جا رہی تھی... نہیں تم کچھ پہنے بغیر نہیں نہاؤ گی... اگرچہ وہاں تمہیں دیکھنے والا کوئی بھی نہ ہو تب بھی... اور وہ بھی دن بہ دن ہتھیار ڈالتی چلی جا رہی تھی... وہ اب اُس یقین سے جو پہلے اُس میں ایمان کی طرح مضبوط تھا یہ بحث نہیں کرتی تھی کہ ان خطوں کے لوگ دریاؤں اور ندیوں سے کیوں جھجکتے ہیں۔ کیوں اُن میں بے لباس نہیں اُترتے اور اُن کی روانی کو اپنے بدن کے ہر حصے میں براہ راست اثر انداز کیوں نہیں ہونے دیتے... اس میں کیا قباحت ہے — یہ بحث اب وہ نہیں کرتی تھی... اگر ارادہ بھی کرتی تھی تو مشاہد پر ایک نظر ڈالنے سے ہی تبدیل کر دیتی تھی اور اسی لئے جیپ کی پچھلی نشست پر جو پکنک باسکٹ تھی اُس میں پہلی بار... ایک سوئمنگ کاسٹیوم بھی تھا۔

وہ مینارِ پاکستان کی جانب دیکھے بغیر آیا تھا' تاریخ کے کراس روڈ سے گزر کر آ گیا تھا اور منہ پرے کر کے اس سے پردہ پوش ہو کر گزر آیا تھا — تاریخ نے اسے سُندر بن کے اختتام پر برما کے بارڈر کے قریب ایک کھلی جگہ میں جال ڈال کر ایک وحشی درندے کی طرح قابو کر لیا تھا' تاریخ کے بہاؤ پر اُس کا بس نہ تھا ورنہ وہ کہاں قابو آتا تھا — اسے نہ صرف اس کی تاریخ نے بلکہ سیاست نے قابو کیا تھا ورنہ قابو کہاں آتا تھا — بابا نذیر کہاں ہے؟ وہ راوی کا بائیو گرافر ہے' اُسے یہاں ہونا چاہئے۔

"بھائی جان — " وہ مشاہد کے پاس چلا گیا جس کی نظریں بارہ دری کی ظاہر اینٹوں

ے ہٹتی نہ تھیں۔" اور وہ بار بار اپنی جین کی ہپ پاکٹ کو ٹٹولتا تھا" آپ ہو آئیں — یں فاطمہ بی بی کو لے کر واپس گھر جاتا ہوں۔ آپ ہو آئیں"

مشاہد نے برگیتا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس نے یونہی کہہ دیا تھا۔ باتونی پن میں اپنے آپ کو اہم اور نمایاں کرنے کے لئے اس نے یونہی کہہ دیا تھا کہ ہم گنگا گاؤں کی پرانی فصیل کے سامنے راوی میں کب اُتریں گے — اس کی ناک میں ابھی تک اُس شٹ کی بُو بہتے آور ہوتی تھی جو شرق پور کے پرے راوی کے پانیوں میں تیرتی تھی... اور ابھی تک... وہ سرسراتی ہوئی شے اس کے پیروں میں لپٹ رہی تھی۔ اس کے ابھاروں پر ٹھہرا ہوا پانی دریا میں شپ شپ گرا تھا جب وہ نوکدار کانوں والے سیاہ بلے کی طرح ٹھٹکی اور اس کے ننگے وجود پر خوف سے کانٹے ابھرے اور وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک بدبودار پلاسٹک بیگ اس کے پیروں سے لپٹا ہوا تھا... وہ اُس شٹ کے لئے' اُس بدبودار شاپر بیگ کے لئے پانی میں کیسے اُتر سکتی تھی۔

اس نے یونہی کہہ دیا تھا۔

ایک اور ہچکی کے ساتھ منت کے انداز میں اس نے مشاہد سے کہا "کسی اور دن شیل — ہم کسی اور دن چلیں گے۔ پلیز مجھے مجبور نہ کرنا' میرا جی ٹھیک نہیں ہے — میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا"

"ٹھیک ہے — " حیرت انگیز طور پر مشاہد معترض نہ ہوا" ہم واپس چلتے ہیں..."

جانیں دھئے راوی — نہ کوئی آوی تے نہ کوئی جاوی

دھی راوی پار جانے سے انکاری ہو گئی تھی۔

چنانچہ وہیں سے' کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتے پانیوں پر ایک پر تشویش وقت بسر کر کے وہ واپس ہو گئے۔

ویلیز جیپ میں جتنے بھی لوگ تھے' اپنے آپ میں گمشدہ تھے۔

فاطمہ کے چہرے پر جو ہوا لگتی تھی وہ اس سے اندازہ لگاتی تھی کہ وہ کہاں ہے — شاید یہ اس کے گمان میں بھی تھا کہ ایک سفید بنچ پر بیٹھے ہوئے اس کے سامنے سے جو دو نوجوان لڑکے' اُن کے سکارف پاؤں میں اُلجھتے' پائپ فضا میں معلق' دھاری دار سوئٹوں میں اس کی جانب آتے تھے ان میں سے ایک کی ہڈیاں گنگا میں بہائی جا چکی ہیں اور دوسرا اس کے پہلو میں خاموش ماضی گزیدہ ڈرائیو کرتا ہے اور شہر لاہور میں کرتا ہے۔ کیا اُس

کے گمان میں تھا... اس کے گمان میں، اس کی منصوبوں میں یہ بھی تو نہیں تھا کہ وہ نابینا ہو جائے گی۔ اس کے بیٹے تلک لگا کر اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ گمان ایک فریب ہے یہ ایک ایسا دھوکا ہے جو انسان کو بے بس کر دیتا ہے۔

سنگِ میل پبلی کیشنز کا شو روم، ٹاؤن ہال، عجائب گھر، بھنگیوں کی توپ اور... ٹولنٹن مارکٹ اور یاد ہے کہ اس کے دائیں جانب کسی بھی چھٹی کے دن مڑنے سے فٹ پاتھوں اور تھڑوں پر پرانی کتابوں کی ایک دنیا آباد ملتی ہے... برگیتا نے ادھر دیکھا اور جائس کی اُس "یولیسس" کو یاد کیا جو اس کے کسی سوٹ کیس کی تہہ میں زیرِ جامہ ملبوسات کے نیچے پڑی تھی...

O How the waters come down at lahore

جائس نے لاہور کو پتہ نہیں کن معنوں میں استعمال کیا تھا۔

اگرچہ وہ شلوار قمیض میں تھی لیکن اب بھی اس کا آبنوسی بدن دسمبر کی اس پیلی دھوپ میں کپڑوں سے الگ ہوتا تھا اور جب وہ ہنستی تھی تو ایک جانور کی طرح بے چین لگتا تھا — رسیاں تڑواتا اور زور لگاتا ہوا... پر اب اس میں زور کم تھا اور بے چینی زیادہ۔

مشاہد کے ہاتھوں میں ولیز کا سٹیئرنگ ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح حرکت کرتا تھا۔

کیا ہے جو ممکنات میں نہیں..... تھمے ہوئے وقت کے جزیروں میں تو ممکن ہے — جزیرہ لکشمی مینشن گزر رہا تھا — منٹو صاحب..... صفیہ آپا..... ابا جی..... آپا جی..... گروچو مارکس۔ رتّی پے ماسٹر... سمیعہ.....

یہ سمیعہ کون تھی؟

تھی — مشاہد نے کہا تھا۔

نہر کنارے حد نظر بید مجنوں جھکے ہوئے پانیوں میں ڈوبے ہوئے ویپنگ ولوز جھکے ہوئے اور ان پر دھند ٹھہری ہوئی...

سات کمروں والی کوٹھی کا پھاٹک ابھی تک کھلا تھا...

"میرا ہاتھ تھام لیجئے تاکہ... میں اُتر سکوں" پہلے مردانِ اچک کر نیچے آیا اور اپنا ہاتھ آگے کیا جسے فاطمہ نے فوراً تلاش کر لیا اور سہارا لے کر جیپ سے اُتر گئی لیکن وہ دیکھتی کہیں اور تھی "مور کہاں ہے؟"

"یہیں ہو گا —" مشاہد نے جیپ کا انجن آف کیا۔

"نہیں — وہ یہاں نہیں ہے"

"یہیں ہو گا —"

"نہیں۔ وہ مر چکا ہے"

سات کمروں والی کوٹھی کے اُس جھنڈ کے نیچے... شیشم اور پیپل اور جامن کے درختوں کی چھاؤں میں... اُس چھاؤں کے نیچے وہ مور تھا — اس کی پتلی گردن گھاس پر آرام کرتی تھی، پروں کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے، مہین آنکھیں کھلی تھیں اور چونچ کھلی تھی جیسے پیاسا ہو، بارہ دری کی اینٹوں کو دیکھ چکا تھا اور مر چکا تھا — می آؤں...

زندگی کے گھنے اور پیچیدہ تجربوں کے باوجود اُن میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ایک مور مر جائے تو اُس کے مُردہ جسم کو کیسے ڈسپوز آف کرتے ہیں۔

یہ تجربہ اُن کی زندگیوں میں موجود نہ تھا۔

مالی شریف نے اس کی نیلی گردن میں مونج کی رسی سے اتنی سخت گرہ باندھی کہ اس کی مہین آنکھیں ذرا بڑی ہو گئیں اور وہ سخت بیزاری کے عالم میں اسے گھسیٹتا ہوا بلاک میں واقع کوڑے کے بڑے ڈھیر پر پھینک آیا... جہاں چند آوارہ کتوں نے اس خوراک کی جانب چلنا تب تک ملتوی کیا جب تک کہ مالی شریف نظروں سے اوجھل نہ ہو لیا۔

"آج مجھے چلے جانا چاہئے —" فاطمہ نے مشاہد کی موجودگی محسوس کی... اگرچہ وہ بہت احتیاط سے کوٹھڑی کے اندر آیا تھا تاکہ اس کے چہرے کو کچھ دیر دیکھ سکے لیکن اُس نے فوراً ہی جان لیا تھا۔

"تم ابھی ٹھہرو... میری واپسی کا انتظار کرو..."

"مجھے بہر طور جانا ہے —"

"ہاں... لیکن... صرف دو چار روز... میں ارشد کو ملنے جا رہا ہوں"

"بہت قریبی دوست ہے؟"

"ہاں —"

"بابو کی طرح؟"

"ہاں آں... شاید"

"میں تمہاری واپسی تک ٹھہرتی ہوں لیکن پھر مجھے جانا ہو گا — نہیں تو مور پھر بولے گا... وہ پچھلی شب بولا تھا..."

"نہیں —"

"ہاں وہ پچھلی شب بولا تھا... شاید صرف میرے لئے"

کوڑے کے ڈھیر پر سے اس کے بے رنگ پر، نوچی ہوئی ہڈیاں اور بدصورت پاؤں چلے تھے اور سات کمروں والی کوٹھی میں آئے تھے...

ساتوں کمروں میں پنجوں کے نشان تھے۔

غور غشتو کی رات میں پہلے الگ الگ گیدڑ، سُؤر اور بھیڑیئے بولے اور پھر وہ ایک مسلسل پکار بن گئے۔

اُن کی آوازیں نیند کی بے چینی۔ چرس اور نسوار کی بُو اور بڑھاپے کی قربت کی تھکاوٹ کا ایک حصہ بن گئیں۔ حجرے کی کھڑکی میں سے غواڑ ندی کے پار اتنے جگنو تھے کہ اُن کی لَو خشک ندی کے پتھروں کو شکل دیتی تھی اور اُن سے پرے رانی کوٹ کی ویرانی تھی جہاں پہاڑ کے دامن میں اُترتی شام میں وہ گئے تھے اور اُن دو کنُووں میں جھانکا تھا جن کے اندر بدھ عہد کے مجسمے تھے اور اب نہیں تھے۔ شاید کالیے کے زیر انتظام کسی غیر ملکی عجائب گھر کے شوکیس میں سجے تھے۔

جگنوؤں والی پہاڑی میں سے کسی بھیڑیئے نے ایک لمبی تان لگائی ایک حواس باختہ کُتّے کی طرح، صرف اس کی آواز میں غراہٹ زیادہ تھی۔

"سو گئے ہو؟"

"نہیں —"

وہ دونوں ڈاکٹر ارشد سے ملاقات کرنے مینگورہ جیل گئے تھے لیکن ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا... کالیے کے کونیکشنز کے باوجود انہیں اگلے روز آنے کے لئے کہا گیا تھا۔

"ادھر صوابی کے قریب خدوخیل کے علاقے میں میرا ایک کونیکشن ہے، وہاں رات بسر کرتے ہیں، وہ بے حد ممنون ہو گا اور شاید کوئی پتھر وتھر بھی مل جائے، پٹرول کا خرچہ پورا ہو جائے گا" اور کونیکشن ایک پارسا باریش اور درویش صفت پٹھان بخت نصیب تھا جس کے حجرے میں ابھی ابھی جگنوؤں والی پہاڑی میں سے کسی بھیڑیئے نے ایک لمبی تان لگائی تھی۔

غور غشتو کے بازار میں امرجیت سنگھ، امریت سنگھ اور کرپا رام کی دوکانوں کا ہونا بخت نصیب کے لئے روزمرہ زندگی کا ایک حصہ تھا اور مشاہد کے لئے حیرت کا سبب۔

"1947ء میں یہ لوگ گئے نہیں؟"

"کدھر؟" بخت نصیب نے نسوار کو ایک خاص سٹائل سے تھوکا "یارا یہ اِدھر کا ہے تو اِدھر ہی رہے گا — کدھر جائے گا"

بازار سے ذرا پرے بلندی پر غواڑ کے کنارے جہاں اب خوانین کی رہائش گاہ تھی وہاں سید احمد شہید نے کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔

حجرہ عین سڑک پر واقع تھا اس لئے کبھی کبھار کوئی ویگن یا ٹرک ایک مخصوص رفتار سے گذر جاتا... چند لمحوں کے لئے اس کی روشنی حجرے میں بھٹکتی اور تیزی سے گل ہو جاتی۔

سپیدۂ سحر میں جگنو گم ہوئے اور جنگلی جانوروں کی آوازیں جیسے واپس جہاں سے جس جنگل سے آئی تھیں، واپس چلی گئیں۔

"شاباش — " کالیا ہنس رہا تھا اور بخت نصیب کی ہمت بندھا رہا تھا جو راہٹ کی گادھی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پورے زور سے دھکیل رہا تھا جیسے سیمسن کی طرح معبد کے ستونوں کو ڈھانے کو ہے اور پانی سے بھری ٹنڈیں ہولے ہولے شرابور ہوتی اُوپر آنے لگیں۔ مشاہد اپنے انڈرویئر میں اَولُو کے نیچے سر دیئے بیٹھا رہا اور پھر سرد اور بھاپ دیتے پانی کا پہلا ریلا اس پر گرا — ویسا ہی سرد جیسا ہلکی کا پانی ہوا کرتا تھا لیکن چند لمحوں میں ہی اس کی بھاپ زیادہ ہوئی اور وہ کوسا گرم ہو کر مشاہد کے بدن کو آرام دینے لگا۔

جب کنواں رواں ہو گیا تو گادھی کو دھکیلتا بخت نصیب باتیں کرنے لگا، اُس کا سانس اب ساتھ دے رہا تھا اور وہ رواں ہو چکا تھا.... "یار آپ لوگ خود انصاف کرو، ادھر زمین کم ہے، پتھر زیادہ ہے... ادھر گندم یا مکی بوئے گا تو سال کا روٹی نہیں ملتا۔ پاپی لگائے گا تو گذارہ ہو گا۔ اس بار بہت اچھا فصل ہے پوست کا۔ ادھر خدوخیل کا افیون سارے سرحد میں بہترین ہے اور پیداوار بھی زیادہ ہے اور طاقت ور افیون ہے یارا — "

"بہن یا ہمیں بھی ایک گولی کھلاؤ ناں بختو — " کالیا نہانے کے لئے کپڑے اتار رہا تھا۔

"حرام تو نہیں کھاؤ یارا — اللہ رسول کا نام لو — " بخت نصیب خفا ہو گیا "ادھر غور غشتو میں ہر گھر میں ڈھیر لگا ہوا ہے پر کھاتا کوئی نہیں — حرام ہے۔"

"اور ادھر کا افیون طاقت ور کیوں ہے بخت؟" مشاہد جھکا ہوا پانی سے باہر آ گیا۔

بخت نصیب سانس درست کرنے کے لئے رکا تو ٹنڈوں کی چُوں چُوں اور پانی کا شور بھی رک گیا اور خاموشی ہوئی تو اوپر سڑک پر سے گذرنے والی ٹریفک کے علاوہ چند پرندوں کی آوازیں بھی سنائی دیں "اس کی وجہ ہے کہ خدوخیل نیم پہاڑ اور نیم میدان ہے چنانچہ ادھر جب پوست کے ڈوڈے پر شبنم گرتا ہے تو اس کو نقصان نہیں پہنچاتا اس لئے ادھر کا افیون طاقت والا ہوتا ہے۔"

"بہن یا ہم ادھر ننگ دھڑنگ کھڑے ہیں ہمیں بھی نہلا دو — " کالیے نے اپنی مناسب توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے درخواست کی۔

بخت نصیب پھر کنواں گیڑنے لگا... اور چُوں چُوں ٹنڈیں اور نیم گرم بھاپ چھوڑتا پانی اور پھر تیتر بولنے لگے۔

"ہم تمہیں شام کو تیتر کھلائے گا — "

"شام کو ہم مینگورہ میں اپنے یار سے ملاقات کر کے سیدھا اسلام آباد جائے گا۔"

"لیکن پہلے نوگرام تو جائے گا۔ ادھر شاید کوئی گنتا مل جائے — "

"ہاں ادھر بھی چلا جائے گا — بہن یا سردی ہے "کالیا ٹھٹھرا" اس موسم میں تیتر کدھر سے آ گیا؟"

"شعر سنے گا سیٹھ؟"

"اگر ہم کہے گا کہ نہیں تب بھی تم سنائے گا بختو — " کالیے نے بخت نصیب کی پشت پر ایک دوستانہ دھپ لگاتے ہوئے کہا "اس لئے سنے گا"

"تو شاعر کا بچہ کہتا ہے — مقدر میں جو سختی تھا وہ مر کر بھی نہیں نکلا — قبر کھودی گئی میری تو پتھر کا زمین نکلا — تو ادھر دیکھو ہمارے مقدر میں پتھر ہی پتھر ہے۔"

"ہاں تمہارے مقدر میں پتھر ہی پتھر ہے لیکن پتھر کونسا؟ سنگ مرمر والا۔ بہن یا ادھر سنگ مرمر کی چٹانیں ہیں جنہیں بیچ بیچ کر تم لوگوں نے محل بنائے ہیں اور کیا چاہئے"

"یارا وہ تو خوانین کا ہے ہمارا کیا ہے۔ ہم تو سیٹھ کالیا کو گنتا فروخت کرتا ہے یا مرس کا من دو من بناتا ہے تو دو وقت کا سوکھی روٹی کھاتا ہے۔ ہمارے مقدر میں تو ہے"

ایک انتہائی زہریلی لائکہ چھپکلی اس کے پاؤں کو چھوتی ہوئی نزدیکی دراڑ میں گھس گئی۔

ہوا تیز اور کٹیلی تھی اور بلندی کی وجہ سے تھی اور دھوپ صاف اور روشن ہونے کے باوجود گرمی نہیں رکھتی تھی۔ نوگرام کے پہاڑ کی چوٹی پر سوائے ان تینوں کے اور کھنڈروں کے اور زہریلی لائکہ چھپکلیوں کے اور کوئی نہ تھا۔ اُن کے قدموں میں نیچے بہت نیچے ایک وسیع میدان تھا جس میں ترتیب شدہ باغات تھے، کھیت بھی باقاعدہ چوکور یا مستطیل تھے اور ان میں سنگِ مرمر کی چٹانیں کہیں کہیں ڈھیروں کی صورت میں تھیں۔

جنوب کی طرف اس سرسبز سنگِ مرمری میدان کے آخر میں دریائے سندھ کی پتلی سی لکیر کبھی دکھائی دیتی تھی اور کبھی دھندلکے میں گم ہو جاتی تھی۔ اس لکیر کے کنارے ہند تھا جہاں سے یونانی سکندر نے سندھ کو عبور کیا تھا لیکن اس سے پیشتر وہ یہاں بیٹھا تھا۔ یہیں جہاں پر بخت نصیب ایک سنگی کرسی پر براجمان تھا جو ہزاروں برس پہلے کسی بدھ راہب ان چیف یا بادشاہ کے لئے تراشی گئی تھی اُس پر براجمان تھا اور نسوار پچک پچک تھوکتا تھا تو یہیں سکندر بیٹھا تھا اور اُسی لکیر کو دیکھتا تھا جس کے پار ایک اور دریا کے پار پورس اُس کا منتظر تھا۔ سکندر نے اشوک کے زمانے سے مستحکم ریاست نوگرام کے بیشتر قلعوں رانی کوٹ، امان کوٹ اور غازی کوٹ کے بعد نوگرام کا رخ کیا تھا اور اسے زیر کرنے کے لئے اسے بہت تردد کرنا پڑا تھا... بالآخر وہ ایک یونانی چال چل کر اس قلعے اور محل میں داخل ہوا اور پھر اس سنگی سنگھاسن پر بیٹھ کر سامنے نظر آتے دریائے سندھ کو دیکھا اور ہند کو دیکھا ——

"بخت نصیب —— " کالیے کا آدھ گھنٹے کی زبردست چڑھائی کے بعد اب تک سانس پھولا ہوا تھا اور وہ نتائج چاہتا تھا "ہم نے بدھ عہد کا یہ قلعہ بھی دیکھ لیا ہے جسے بہن یا سکندر نے فتح کیا تھا یا نہیں کیا تھا اور ٹوٹے ہوئے وہ سٹوپے بھی دیکھ لئے ہیں جن سے تم لوگوں نے مجسمے اور سجاوٹیں اُتار کر اِدھر اُدھر سپلائی کر دی ہیں۔ ہم نے بڑا راہب خانہ، درس گاہیں اور قیام گاہیں بلکہ ان کے کھنڈر اور فرش بھی ملاحظہ کر لیے ہیں لیکن —— مال کہاں ہے؟؟"

"مال؟" بخت نصیب نے ایک اور پچکاری چلائی اور پھر یکدم نمودار ہوتے کھنڈروں میں متعین آثارِ قدیمہ کے چوکیدار سے، نہایت بدتمیز چوکیدار سے محوِ گفتگو ہو گیا۔

دراصل ایک سٹوپے کی اوٹ میں پچھلے آدھ گھنٹے سے ازار بند ڈھیلا کیے ہاتھ اندر الے اپنے آپ کو "خشک" اور پھر تر کیے جا رہا تھا۔ خشکی کے لیے وہ ایک ایسے ڈھیر سے رپسند کرتا جس میں مجسموں کی ٹوٹ پھوٹ اور بیل بوٹوں والے پتھر تھے.... کبھی کوئی ٹول ہاتھ آ جاتا اور کبھی کسی پجاری کا سر.... البتہ کچھ گیلاہٹ اُسے عطا کر کے وہ اُسے اپس ڈھیر پر پھینک دیتا تاکہ وہ آئندہ نسلوں کے کام آئیں۔

"اگر وہ مجسمہ سازی میں یکتا تھے تو ہم وتوانی سازی میں بے مثل ہیں —— بہن یا" لیے کی ناپسندیدگی ظاہر تھی۔

"یہ کہتا ہے اس کے پاس ایک ہیڈ ہے سونے کے پانی والا —— " بخت نصیب نے کیدار کے ساتھ مذاکرات مکمل کر کے اعلان کیا۔

"یار کدھر ہے؟" کالیا تقریباً ایک جنسی جوش میں آ گیا۔

"کہتا ہے نیچے گاؤں میں ہے —— "

"تو چلو ناں یہاں ہم آم چوس رہے ہیں۔ چلو نیچے گاؤں میں —— بختو یار واقعی نے کے پانی والا بدھ ہے؟؟"

"کہتا تو یہی ہے۔ چلو"

کالیا بے پرواہ لڑھکتا ہوا سب سے آگے تھا۔ مشاہد اُن کے پیچھے بہت پیچھے احتیاط ے نیچے اُتر رہا تھا۔ رات —— غور غشتو کی رات میں —— شائد سُور بھی بولے ہوں گے، یدڑ اور بھیڑیے بھی... لیکن ایک مور بھی —— وہ اپنی مردہ ہڈیاں اور پاؤں اور بے رنگ وں اور نیلی گردن کو کتوں سے بچا کر اُٹھا لایا تھا اور انہیں غور غشتو کی رات میں جگنوؤں لی پہاڑی میں روپوش ہو کر مجتمع کر کے بولا تھا ——

"می آؤں۔ می آؤں"

اور اُس کے ہمراہ فاطمہ بھی تھی۔ وہ اُس کے پہلو میں ایک وہیل چیئر پر بیٹھی اس اگرون کے گرد بازو حمائل کیے اسے دیکھتی تھی۔ خدو خیل کی افیون میں جیسے طاقت تھی یے اُس پر بھی وہاں کی رات میں جو شبنم اُترتی تھی شائد اس نے اثر کیا تھا اور وہ فاطمہ کو یکھتا تھا۔

نیچے ایک بے آباد اور بنجر چہروں والی بستی میں چوکیدار اپنے کچے گھر میں گیا۔ بہت ر بعد واپس آیا اور بخت نصیب کے کان میں سرگوشی کر کے چلا گیا۔

"شِٹ —" کالیے نے زمین پر تھوکتے ہوئے سر جھٹکا۔

نسان پٹرول میں بیٹھتے ہی جیسے وہ اپنے گھر میں آ گئے ہوں اور نوگرام کی بے آبادی اور بے چہرگی سے الگ ہو گئے ہوں۔ کالیے نے ڈیش بورڈ میں سے ہِپ فلاسک نکالی اور ڈھکن کھول کر ایک لمبی پُرسکون ڈیک لگائی "بہن یا وہ ہیڈ اس کے پاس تھا صرف تمہاری وجہ سے وہ انکاری ہو گیا۔"

"میری وجہ سے؟"

"اُس کا خیال ہو گا کہ تم شائد سرکاری آدمی ہو — میں اُس کا چہرہ پڑھ سکتا تھا چوکیدار کا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا — ویسے بخت نصیب بہت شاندار دوست ہے پر مذہبی بہت ہے۔ اُس کے سامنے میں پینے کی جرأت نہیں کرتا۔ کبھی کبھار ایسا پیس لے آتا ہے کہ قسمت سنور جاتی ہے اور ہیروئن بھی ایک نمبر سپلائی کرتا ہے —"

"تم — یہ کاروبار تو نہیں کرتے —"

"توبہ —" کالیا ہنسا "ایسے کسی یار دوست کی ضرورت ہو تو پوری کر دیتا ہوں۔ خود کچھ نہیں کرتا۔ اللہ رسول کی قسمے۔" اس نے نسان سٹارٹ کر دی۔

بخت نصیب اپنے کسی رشتے دار کے گھر ٹھہر گیا تھا۔ نسان گاؤں دوبئی سے گذر کر نہر کنارے آ گئی تھی۔ اشوک کے فرمانوں کے شہر شہباز گڑھی کے راستے تخت بائی — مالاکنڈ پاس کی گھمن گھیریاں اور دوسری جانب بٹ خیلہ — جہاں سفر کا اختتام ہوا کرتا تھا، چار چیزیں ہیں.. لیکن انہیں آگے جانا تھا، منگورہ تک —

"یہاں طوطا کان میں دریا کنارے ایک مکمل اور بالکل سالم حالت میں ایک بدھ کامپلکس ملا تھا۔ عبادت گاہ کی پوری عمارت، درجنوں سٹوپے اور ہزاروں مجسمے۔ ایک رات کے اندر اندر ٹریکٹر کے ساتھ اُنہیں توڑ کر جس کے ہاتھ جو لگا نکال لے گیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو بہن یا زمین ہموار ہو چکی تھی اور اُس میں سے کہیں کہیں نیلے پتھر سے تراشے ہوئے مجسموں کے ٹکڑے نظر آتے تھے، کوئی کمال کا ہاتھ، کوئی یونانی ناک... بدھ کا دامن.. ایسے نئے نویلے جیسے ابھی بنا کر دبا دیئے گئے ہوں۔ اگر اس کامپلکس کو بچا لیا جاتا تو پوری دنیا میں یونیک ہوتا — اتنا دکھ ہوا کہ ساری رات سو نہ سکا مشاہدی —"

"صرف اس لیے کہ تمہیں وہ پیس مل جاتے تو تم انہیں سمگل کر کے ایک اور پلازا خرید لیتے اس لیے دُکھ ہوا؟"

"نہیں —" کالیے نے بریک پر پاؤں رکھ دیا "مشاہدی نہیں — اللہ رسول کی ہے نہیں — میں تو انہیں سینت سینت کر رکھتا۔ یارا میں انہیں چومتا، اور اُن پر ماتھا ٹیکتا، لیا کاریگر تھے بہن یا —"

مشاہد نے باہر دیکھا۔ کیا یہ اتفاق تھا کہ اُن کی نسان پٹرول وے سائڈ ہوٹل کے بن سامنے کھڑی تھی۔ دریا کا شور، سلیٹی رنگ کے پانی، آلوچے کے جنگلوں کی سرد ہوا... ہیں نرگس کی زرد مہک کا ایک ہُلارا — "واپسی پر رُکیں گے، ابھی چلو۔"

کالیے نے بادلِ نخواستہ ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔

واپسی پر رات ہو چکی تھی اور وہ وہاں رُکے۔

مینگورہ جیل کے وارڈن نے اُنہیں اطلاع دی تھی کہ ڈاکٹر ارشد کو چھ برس کی قید نائی گئی تھی اور اُسے کسی اور جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ کونسی جیل میں اور کہاں؟ — ن کے لیے وزارتِ داخلہ سے رجوع کرنا ہو گا۔

دریا کے شور میں ایک آہستگی اور تسلسل تھا۔ آلوچے کے خشک ٹہنیوں والے نگل میں سے جو ہوا آتی تھی اس کی مہک میں بھی سلیٹی رنگ تھا۔ وے سائڈ ہوٹل کے ھمبوں پر جھولتے بلب اور پھر اُن کی روشنی دریائے سوات کے بہاؤ پر — یہاں، وہاں اور ہربہہ جاتی ہوئی — وہی بِرکی کرسیاں لیکن ڈاکٹر ارشد کی غیر موجودگی۔

کالیا کم از کم تین ہِپ فلاسکس اپنے اندر انڈیل چکا تھا اور اُس کا ذہن اور بدن دریائے سوات کے بہاؤ سے ہم آہنگ اور ہم ترنگ ہو چکا تھا "تمہارا کیا خیال ہے مشاہدی کہ اندھیرا بہت ہے؟"

مشاہد چپ رہا۔

"لیکن مجھے دکھائی دیتا ہے۔ میں نے ایک سال پہلے یہاں اپنے برادر عزیز سے لی ملاقات پر بھی بیان دیا تھا اور میں بیان بدل نہیں رہا کہ مجھے دکھائی دیتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ ہزاروں برسوں کی کمائی ہاتھوں، آنکھوں اور دماغ کی ضائع ہو رہی ہے یارا — ڈیاں سوکھ رہی ہیں — تم بنا شک اُلٹے ہو جاؤ پر ملک تبھی قائم رہتے ہیں جب وہ اپنی ہزاروں برسوں کی کمائی کو قلعی بنا کر دیواروں پر مذہبی اور سیاسی نعرے نہیں لکھتے — جب وہ انصاف دیتے ہیں اُن کو جو کم ہوتے ہیں اور جن کے عقیدے سے انہیں اختلاف ہوتا

ہے —— اور سنو مشاہدی تاقیامت کچھ قائم نہیں رہتا —— کاش اس وقت تمہاری جگہ میرا برادر عزیز ہوتا تو وہ کم از کم ایک "وَف" کر کے میری حوصلہ افزائی تو کرتا۔" کالیے نے ایک اور فلاسک نکالی اور ڈھکن کھول کر ڈیک لگانے کو تھا کہ اُس نے پانی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے آپ کو سنبھالتا کنارے تک گیا اور پوری فلاسک پانی میں اُنڈیل دی... واپس آیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا "اگرچہ ڈاکٹر اسے منہ نہیں لگاتا تھا لیکن یہ اُس کا حصہ تھا۔" اس نے خالی فلاسک گھما کر دریا کے پانیوں کی طرف اچھال دی.. وہ پتہ نہیں کتنی دور گئی، کہاں گری —— بس گم ہو گئی۔

سردی برفیلی تھی اور بہت بے آرام کرتی تھی۔

"اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ——"

"چپ ——" کالیے نے انگلی لبوں پر جما کر کہا "چُپ میرے ویر —— چُپ"

چار چیزیں ہیں —— قادر آباد کی جھیلیں گُم شد، دریائے راوی کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا گُم شد اور اب سوات کا سلیٹی منظر بھی ——

کرسمس کی شب شیشم اور جامن کے درختوں تلے بہت رونق تھی... وہاں مجید امجد کے ساز بج رہے تھے، برف گر رہی تھی... میرا دِل ہے کہ شہر لاہور ہے —— ٹہنیوں سے قمقمے جھولتے تھے اور ان کے نیچے ایک کین چیئر پر فاطمہ بیٹھی مسکراتی تھی۔ مردان جھکا جھکا کبھی برگیتا کی طرف جاتا تھا اور کبھی فاطمہ کی جانب رجوع کرتا تھا —— میڈم میرے لیے کیا حکم ہے —— لیکن اُس کا پاؤں درد سے گھسٹتا تھا اور وہ ران پر ہاتھ رکھے بہت تحمل سے اِسے برداشت کرتا تھا۔

فاطمہ کی سیاہ آنکھوں میں زندگی بہت تھی، وہ چمکتی تھیں اور —— دیکھتی تھیں۔

"اور جب تم اور بابو جیب میں مِسل ٹو کی شاخیں ڈالے ساؤتھ اینڈ کی کرسمس ایو میں گھومتے تھے۔ یاد ہے۔"

مشاہد چپ رہا۔ اُسے یاد تھا لیکن وہ بہت ہی پرانے زمانے تھے... فاطمہ ابھی وہیں تھی، وہ بہت بہت دور نکل آیا تھا لیکن وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"اور تم جہاں کہیں بھی کوئی خوبصورت لڑکی دیکھتے تھے جیب میں سے مِسل ٹو کی شاخ نکال کر اس کے سر پر معلق کرتے ہوئے اُسے میری کرسمس کہتے تھے اور اُسے رواج

کے مطابق تمہیں چومنا پڑتا تھا —— یاد ہے؟"

ماضی یا شرمندگی ہوتا ہے یا جھوٹی انا ——

ماضی کے موسم وہیں رہ جاتے ہیں۔ وہ صحن جن میں دھریک کے درخت ہوتے ہیں وہ ڈھے جاتے ہیں اور تب بھی ہم اُن کی چھاؤں کو یاد کرتے ہیں۔

کرسمس سے اگلے روز مردان واپس چلا گیا تھا. شوبھا کی شادی کے بوجھ تلے دبا۔

چوہدری اللہ داد کی اولاد میں سے کون ہے ——

شوبھا تو نہیں ——

شائد وہ لاپرواہ ٹورسٹ لڑکی جو سات کمروں والی کوٹھی کے پھاٹک پر دستک دے کر "مسٹر موشاہد" کا پوچھ کر چلی گئی تھی۔

درختوں کے جھنڈ میں کین چیئر پر بیٹھی اپنے سامنے چمکتی آنکھوں سے تکتی فاطمہ اس کے آس پاس سلیٹی رنگ کی لینڈ سکیپ پر نقش ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جو خشک ٹہنیوں کے جنگل تھے اُن میں اس کی سیاہ آنکھیں تھیں. جاپانی پھل کے باغ ابھی خزاں کی ٹھنڈک میں آرام کرتے تھے اور ان میں اُس کا سفید بچ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ دونوں —— مشاہد اور کالیا —— اپنے آپ میں گُم سُم بیٹھے تھے۔

مشاہد سات کمروں والی کوٹھی کے درختوں کے جھنڈ میں ——

اور کالیا... طوطا کان میں... بدھ کے سونے کے پانی والے ہیڈ میں اور... مینگورہ جیل کے وارڈن کی اس اطلاع میں کہ ڈاکٹر کو چھ برس قید ہو گئی ہے۔

وہ بہت دیر تک اس آس میں وے سائڈ ہوٹل کے آلوچے کے درختوں کو دیکھتا رہا کہ صرف اُس کے غور کرنے سے موسم گذریں گے، رُت بدلے گی اور اُن پر شگوفے پھوٹیں گے —— لیکن ایسا نہ ہوا... کالیے نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر کہا "شریعت یا شہادت"

آس پاس ایک سکوت ٹھہر گیا —— ہوا نہ تھی۔ بہاؤ کی آواز بھی جیسے مدھم ہو گئی اور سردی ایسی بج کہ ہڈیوں کو برف کرنے لگی۔ وہ دونوں ڈھیٹ بنے بیٹھے رہے، اپنی ناکافی گرم جیکٹوں میں سکڑتے رہے... وہ خود اٹھنا نہیں چاہتے تھے تو انہیں کون آ کر اُٹھائے...

کالیے کو تو اپنی ہپ فلاسک کے پانیوں کا آسرا تھا لیکن مشاہد تو خشک تھا۔

ایک ٹھہراؤ تھا۔ ایک چپ تھی۔

اور پھر رات کی سیاہی میں آسمان سے سفیدی اُترنے لگی۔

آہستہ آہستہ، ڈولتے ہوئے، دھیرے دھیرے برف کے گالے اُن پر اُترنے لگے۔

رِکٹی چیئرز پر دریائے سوات کے کنارے، وے سائڈ ہوٹل سے ذرا دُور بیٹھے ہوئے اُن پر — اُن کے رُخساروں پر، بالوں پر سفید نم آلود گالے اُترنے لگے..... بدن کی گرمی سے وہ پگھلتے اور اُن کا یخ پانی جیکٹ کے کالر کے نیچے جاکر گردن کو برف کرتا..... ان گالوں میں کہیں شائد آلوچے کے شگوفے بھی ہوں لیکن کون جانتا ہے یا پہچان کرپاتا ہے کہ یہ برف کے گالے ہیں یا آلوچے کے شگوفے ہیں — دونوں سفید اور ٹھنڈک لیے ہوئے.....

"وَف —" کالیے کو برادر عزیز کی آواز سنائی دی۔

"بہن یا آگیا ہے۔ وہ میرے پاس آگیا ہے —"

مشاہد اپنے رُخساروں پر سے یخ کرتے برف کے کپاس پھولوں کو پونچھتا رہا اور سر میں اور بالوں میں، اُن کے گرنے اور پھر پانی ہونے کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا خاموش رہا۔

بھلا کالیے کا کُتورا یہاں کیسے آسکتا تھا، یہ اُس کے خمار کے کُتورات تھے جن کی وَف وہ سنتا تھا۔

"می آوں۔ می آوں"

مشاہد ذرا سیدھا ہوا اور اپنی گود میں گرے برف گالوں کو پونچھا اور غور سے سنا...

وہ سن رہا تھا.... اُسے واضح طور پر مور کی آواز سنائی دی تھی — ہو سکتا ہے کُتورا بھی آ گیا ہو۔

آلوچے کے جنگلوں پر تاریکی بتدریج کم ہوتی گئی اور اُن پر ایک ہلکی سرخ روشنی سایہ کرنے لگی....

"بہن یا سورج نکل آیا ہے۔" کالیا بڑبڑایا۔

یہ سرخ روشنی پاپلر کے درختوں کو عبور کرکے وے سائڈ ہوٹل پر پھیلی اور پھر آہستہ آہستہ چرچل پوسٹ کی پہاڑی کو روشن کرتی نیچے دریا تک آئی.... اور انہیں دریائے سوات دکھائی دینے لگا۔ وہ خود بھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شفق کی سرخی میں رنگے اُن کے چہرے پہچانے نہ جاتے تھے... آلوچے کے درختوں کی سرمئی ٹہنیاں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔

"مشاہدی یہ کیا ہے —"

"یہ وہ ہے جس کی ہمیں خبر نہیں —"

لیکن مشاہد کو خبر تھی کہ یہ قلعہ ڈیراور کے بازار میں ٹھہری ہوئی ناقابلِ فہم شام کی روشنی ہے جو اُن کے آس پاس اُتری تھی — صرف اُن کے لیے۔

"ہمیں اسلام آباد بھی پہنچنا ہے کالیے — چلیں۔"

اور اُسی لمحے وہ روشنی بجھ گئی اور سرمئی لینڈ سکیپ پھر اندھیرے میں چلی گئی لیکن برف کے گالے ایک تسلسل سے گرتے رہے۔ جنگلوں کی خالی ٹہنیوں اور کھیتوں کی رنگت بھی سفید ہو رہی تھی اور اس سفیدی میں اگر غور سے دیکھا جاتا تو وہ دونوں بھی تھے دریا کنارے رِکٹی چیئرز پر براجمان اور اُن کے لباس اور چہرے دکھائی نہ دیتے تھے صرف برف تھی جو اُن کو ڈھانپے چلی جا رہی تھی...

"کیا سچ مچ ہمیں خبر نہیں مشاہدی —"

مشاہد خاموش رہا۔

ولیز جیپ کا انجن اسلام آباد کی یخ آلود ہوا سے اتنا سرد اور مُردہ ہو چکا تھا کہ مشاہد نے آخری بار چابی گھمائی تو مکمل مایوسی میں گھمائی کہ اس بار بھی یہ سٹارٹ نہ ہوئی تو گیٹ کے قریب کھڑے، اُسے خدا حافظ کہنے کے لیے کھڑے کالیے سے گذارش کی جائے گی کہ وہ گیٹ کی اُترائی پر اِسے دھکا لگا دے لیکن حیرت انگیز طور پر وہ متعدد بار پھٹ پھٹا کر سٹارٹ ہو ہی گئی اور اُس کی بے ڈھب آواز سے سیکٹر F-10 کے مکینوں نے خاصی سُبکی محسوس کی کہ کون ہے جو اس پاش سیکٹر میں قیام پذیر ہے اور اس قسم کی مڈل کلاس گاڑی رکھی ہوئی ہے جو سٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لیتی اور جب نام لیتی ہے تو اتنی بے ڈھب آوازیں نکالتی ہے۔ جیپ کے ٹائر متحرک ہوئے تو کالیے نے خدا حافظ کہنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور پھر فوراً ہی اُسی ہاتھ سے جیپ کے دروازے کو مضبوطی سے تھام کر سختی سے، حکم دیتے ہوئے بولا "مشاہدی نیچے اُتر آؤ۔"

وہ آج ایک دُھندلی تاریک سویر میں سوات سے اسلام آباد پہنچے تھے جہاں سیکٹر F-10 میں واقع کالیے کی وہ جڑواں کوٹھیاں دور سے اپنے ریڈی میڈ یونانی ستونوں اور بے ونڈوز کے سستے پن سے نمایاں نظر آتی تھیں۔ مشاہد اپنی جیپ یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ انہوں نے اکٹھے ناشتہ کیا تھا اور مشاہد فوری طور پر لاہور روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ بمشکل جیپ سٹارٹ ہوئی تو متلون مزاج کالیے نے اسے روک لیا تھا۔

"کیا ہوا ہے کالیے؟"

"بہن یا میں جو کہتا ہوں انجن بند کرو اور نیچے اُتر آؤ۔"

مشاہد چابی واپس گھما کر آہستگی سے اُتر آیا۔

"میرے ساتھ آؤ —" کالیے نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا —

وہاں شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ سیکٹر F-10 کی ان جڑواں کوٹھیوں کے ریڈی میڈ یونانی ستونوں اور بے ونڈوز کے سستے پن کے نیچے موہنجو ڈارو کے بڑے تالاب جتنا ایک تہہ خانہ ہو گا جس کے بھاری دروازے پر قرونِ وسطیٰ کے متعدد تالے لٹک رہے ہوں گے اور کالیا ہاتھ برابر لمبی قدیم چابیوں سے انہیں ایک ایک کر کے کھولے گا اور پھر دائیں جانب کسی سوئچ کو چھوئے گا تو شیشے کے سینکڑوں شوکیس بجھ بجھ کر روشن ہوتے چلے جائیں گے اور ان شوکیسوں میں....

مشاہد سر جھکائے اس قدامت کی ونڈر لینڈ میں اور کالیا اسے ایسے دیکھتا ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے... قرآن مجید کے ایسے نایاب نسخے جن کے ری پرنٹس دنیا کی کسی کتاب میں نہیں... خالص سونے کے پانی سے لکھے ہوئے اوراق، قدرتی رنگوں کی آمیزش سے ایسی خطاطی، تازہ، شفاف اور ستھری جیسے ابھی ابھی کسی نے قلم ہاتھ سے رکھا ہو۔ ظروف، شالیں، فرنیچر، ملبوسات، منی ایچر تصاویر.... غزنی سے نکلے ہوئے کوفی عہد کے نوادرات، مسلم مغل عہد کے کشمیری برتن، لیمپ، فروٹ ڈشز، قلم دان... فن کی ایک قدیم دنیا —

"یہ سب کیا ہے؟" مشاہد شوکیس پر جھکا ہوا حیرت سے پوچھتا تھا۔

کالیا ہنسا "بقول شمس تبریز — یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں — بلکہ اب تک خبر نہیں تھی۔ ابھی جب تم بار بار اپنی جیپ کو سیلف لگاتے تھے اور وہ سٹارٹ ہونے سے انکاری ہوتی تھی تب میں اپنے آپ سے بحث کرتا تھا، ایک مخمصے میں تھا کہ کیا میں نہیں — اپنے اس راز میں شریک کر لوں.. یا نہ کروں... اور جونہی تمہاری جیپ سٹارٹ ہوئی اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا... بہن یا زندگی کا کیا پتہ... آج مرے کل دوسرا دن... اور مُردے کے لیے تو آج مرے تو کل دوسرے کی بجائے تیسرا، پانچواں دن کہاں سال... ہزاروں سال... مشاہدی ذرا غور کرو اس کولیکشن میں ایک خصوصیت ہے.... اور وہ جانتے ہو کیا ہے؟"

مشاہد نے شو کیسز میں سجے اور اُن کے علاوہ دیواروں پر ترتیب شدہ نوادرات کو ایک نظر دیکھا "میں نے اس سے پیشتر کسی یورپی میوزیم میں بھی اتنے شاندار اور اہم نوادرات نہیں دیکھے —"

"دُر فٹے منہ —" کالیا بظاہر بے مزہ ہوا "

ذرا فوکس کر اپنی آنکھوں کو... جتنے بھی نوادرات ہیں... صراحیاں، مخطوطے، لباس، تلواریں، زیورات سب کے سب... ہمارے ماضی کی یادگاریں ہیں.. صرف مُسلم پیریڈ یار.."

مشاہد کا سر شوکیس پر جھکتا گیا... وہ سر اُٹھاتا تو دیواروں پر آویزاں قدامت کی خوبصورتیوں کو دیکھتا رہا.. عباسی عہد، فاطمی عہد کے ہتھیار، اُندلس کی نقاشی، غزنی کے برتن اور مغل عہد تو جیسے پورے کا پورا اس تہہ خانے میں موجود تھا۔

"مشاہدی میں جو جھک مارتا ہوں گندھارا کی سمگلنگ کی.. اور... دوسرے نوادرات کی تو صرف اِس لیے — صرف اس لیے۔"

"کس لیے؟" مگن اور بہت گہری توجہ میں گم مشاہد سر اُٹھا کر بولا اور پھر موتیوں کو پیس کر اُن سے بنائی ہوئی ایک ایرانی تصویر پر جھک گیا۔

"اپنے مسلم ماضی کے لیے یار... یہاں جو کچھ ہے وہ میں نے جاپان، امریکہ، فرانس اور انگلستان کے نیلام گھروں سے خریدا ہے۔ کالیے کو علم ہو جائے کہ فلاں جگہ کوئی برتن، کوئی شے اسلامی عہد کی مل سکتی ہے، نیلام پر ہے تو کالیے پر لاکھ لعنت اگر وہ وہاں اُڑ کر نہ پہنچے اور اُسے نہ خریدے۔ سب یورپی آرٹ ڈیلروں سے بڑھ کر بولی نہ لگائے.. مشاہدی یار ایمان کا معاملہ ہے... اور ایسے سودوں کے لیے رقم چاہئے اور رقم کا بندوبست تم جانتے ہو کیسے ہوتا ہے —"

"اِس کولیکشن کا بالآخر کیا ہو گا؟"

اس وسیع تہہ خانے کے سنگ مرمر کے فرش پر چلتے ہوئے، آہستہ اور قدم پھونک پھونک کر چلتے ہوئے وہ دونوں ایسے چور لگتے تھے جو کسی آرٹ گیلری میں سے کوئی مونالیزا یا ٹوپ کاپی کے ہیرے چرانے آئے ہیں۔

"مشاہدی یہاں آج تک کوئی نہیں آیا سوائے میرے... تم دوسرے شخص ہو۔ یہ میری کمائی ہے... یہ میری نجات بھی ہے شائد — روزِ قیامت میں نے بھی تو جواب دینے ہیں، اپنی کرتوتوں کے... اپنی اس غیرقانونی زندگی کے — یہ میرا جواب ہو گا — میں نے اُس کا سامان جو بکھرا ہوا تھا، غیر مسلموں کے پاس تھا، جمع کیا ہے.. آئندہ نسلوں کے لیے... مشاہدی میں بخشا جاؤں گا ناں؟" کالیے نے ایک ہچکی بھری اور مشاہد کو دیکھا جو اسلامی تاریخ کے تسلسل پر جھکا ہوا تھا اور اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

"پتہ نہیں —" بہت دیر بعد اس نے کہا۔

"کیا پتہ نہیں —"

"یہی کہ تم بخشے جاتے ہو یا نہیں لیکن.. جو کچھ یہاں ہے کہیں بھی نہیں کالیے —اور یہ ایک معجزہ ہے۔"

"پوری دنیا کے آرٹ ڈیلر جانتے ہیں کہ یہ نیم خواندہ پاکستانی ڈیلر جس کے بال ن کے ماتھے پر پڑے رہتے ہیں جو سونے کی زنجیروں کا شوقین ہے.. یہ جب نیلام گھر میں اخل ہو گا۔ کرسٹیز میں، سدبیز میں — اور اگر نیلام کی ہتھوڑی کے نیچے کوئی ایسی شے گی جس کا تعلق مسلمانوں سے ہے — تو یہ جانے نہیں دے گا — اور اسی لیے وہ ت بڑھاتے چلے جاتے ہیں لیکن کالیا اُن سے دو قدم آگے جاتا ہے، دوگنی، سہ گنی قیمت ا کر دیتا ہے کیونکہ — ایمان کا معاملہ ہے یار۔"

"صرف ایمان کا معاملہ نہیں کالیے... ایمانداری کا معاملہ ہے۔"

"اور مشاہدی ایک اور تہہ خانہ ہے اس کے برابر میں... دوسری کوٹھی کے نیچے... ن میں گندھارا ہے، ہڑپہ اور مہرگڑھ ہے... جو بھی نایاب اور یونیک مجسمے اور ٹکڑے ہیں ہ وہاں سجے ہیں... ایسے ہی شوکیسوں میں... میں نے انہیں جان بوجھ کر سمگل نہیں کیا، جو ترین ہیں وہ میں نے سنبھال رکھے ہیں اپنی تاریخ کے بقا کے لیے.... ہم نے شرمندہ تو یں ہونا آئندہ نسلوں کے سامنے — کیوں مشاہدی؟"

"ہاں —"

اور تب اُس تہہ خانے میں، شوکیسوں کی روشنیوں میں اور اُن دونوں کی نیم خفیہ جودگی میں ایک آواز آئی جو مشابہت رکھتی تھی جیسے کوئی مور بولا ہو۔

سات کمروں والی کوٹھی کے مستطیل کمرے میں برگیتا کے اندر ایک دراڑ تھی۔

جس کے فرش میں سے بھی گھاس سر اُٹھاتی تھی وہاں سفید بال اور سیاہ آنکھیں یں....

اور شائد لال حویلی کے ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں میں بھی ایک شبیہ تھی..

مور کے پاؤں کے نشان کہاں کہاں نہیں تھے...

مشاہد ایک ایسے قرآن پر جھکا جسے بنو امیہ کے عہد میں ایک نابینا خطاط نے لکھا ا.. سیاہ آنکھیں جو دیکھ نہیں سکتی تھیں... اور... تعز من تشاء و تذل من تشا، رتو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔

مریم کے مجسمے، سنگی گلدستے اور صلیبیں اور ان میں سے بیشتر جھکی ہوئیں جیسے ان کے نیچے اب بھی ایک سنگی پُشت ہے۔ لیکن فرشتوں کی بہتات تھی۔ ہر سائز کے پَر پھڑپھڑاتے ہوئے لیکن زمین سے پیوست — پر طاقتِ پرواز نہ تھی۔

"اِس ہوا میں ایک احساس ہے جو میرے وجود کو چھو کر گذر جاتا ہے کہ تم ابھی تک اُلجھن میں ہو برگیتا کے بارے میں۔ تمہاری گفتگو میں ربط ٹوٹتا ہے — وہ آ جائے گی۔"

"ہاں —" اس نے مختصراً کہا اور اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے نہایت تیز "ہاں" سے شائد ایک آدھ سنگِ مرمری فرشتہ ٹھٹک کر پرواز کر گیا ہے۔ وہ قبر پر جھکا اور نوٹ بک پر اردو، انگریزی اور فارسی میں تحریر شدہ کتبے کی عبارت نقل کرنے لگا۔

آخری آرام گاہ شہزادی بمباسدرلینڈ
دخترِ کلاں راجہ دلیپ سنگھ پوتی مہاراجہ رنجیت سنگھ شیرِ پنجاب
ولادت ۲۹ ستمبر   در لنڈن
وفات ۱۰ مارچ   در لاہور

فرقِ شاہی و بندگی برخاست   چوں قضائے نوشتہ آید پیش
گر کسے خاکِ مردہ باز کند   نہ شناسد تونگر از درویش

"کیا تم یہاں ہو؟"

"ہاں —" اس نے پھر تیزی سے کہا لیکن کتبے سے نظریں ہٹائے بغیر۔

"تو پھر چُپ کیوں ہو؟"

"شہرِ خموشاں میں پوچھا جا رہا ہے کہ چُپ کیوں ہو — اس لیے کہ چار مرغابیوں کا

کوٹھی سے کوئی تعلق نہیں —"

"یقیناً —" فاطمہ بے اختیار مسکرائی... بابو اور مشاہد بے وجہ دوست نہیں تھے... وہ بھی یکدم کوئی ایسی بات کہہ جاتا تھا جس کا ربط صرف اس کے اپنے ذہن میں ہوتا تھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ گلبرگ کے کرسچن گریویارڈ کی پہلی دھوپ میں اس کے سفید باب کٹ بال جیسے راکھ سے سفیدی کی طرف آ رہے تھے۔

"میں نے بڑی مشکل سے اور تحقیق سے اس شہزادی کو تلاش کیا تھا... برگیتا ہمیشہ کوٹھی نمبر 101-A کی رانی کو مرغابیاں بھیجتی تھی یہ جانے بغیر کہ وہاں کوئی رانی ہے بھی یا نہیں — سبھی کہتے تھے کہ وہاں خان بہادر محمود شاہ کی آبائی کوٹھی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی رہتی ہے... لیکن وہ تو کب کی مر چکی تھی... ذرا دیکھو... میرا مطلب ہے میں پڑھتا ہوں.. وفات، 10 مارچ 1957 —"

"تو کیا آج پرنس کی ڈیتھ اینورسری ہے جو ہم خاص طور پر صبح سویرے یہاں آئے ہیں؟"

"نہیں —" مشاہد ہنسا... اور ایسے کہ اگر وہ سات کمروں والی کوٹھی میں ہنستا تو ہر کمرے میں گونج جاتی "میں نے کالیے سے تذکرہ کیا تھا اور وہ میری جان کو آ گیا کہ لاہور پہنچتے ہی قبر تلاش کرو اور شہزادی کے کتبے کی عبارت کاپی کر کے مجھے روانہ کرو۔"

"وہ کیا کرے گا؟"

"کسی پرانے پتھر پر یہی عبارت لکھوائے گا اور اُسے اورجنل کتبے کے طور پر ہیں... کینیڈا میں مقیم کسی سکھ کے ہاتھوں فروخت کر دے گا — فاطمہ، تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ آ جائے گی؟"

"ہاں —" یہ "ہاں" بھی اتنی تیز اور یکدم تھی کہ اگر اس سے پیشتر کسی سنگی فرشتے نے پرواز نہیں کی تھی تو اب ضرور کر گیا تھا۔

"عجیب ناقابلِ فہم حرکت کی ہے اس نے —" مشاہد نے نوٹ بک قبر کے تعویز پر رکھ دی جس کی ایک دراڑ میں سے ایک چڑیا بار بار سر نکال کر دیکھتی تھی "فار ہیونز سیک یہ وہ کامونکی ایسے قصبے میں... عیسائیوں کے گیٹو میں اپنے باپ کی کچی غلاظت بھری کوٹھڑی میں اپنے سو کالڈ درجن بھر بہن بھائیوں کے ساتھ زندگی کیسے گذار سکتی ہے۔"

"اُس نے تم سے کیا کہا تھا؟"

مشاہد نے جواب میں خاموشی اختیار کی اور پھر کتبے پر جھک کر اس کی عبارت نوٹ بک پر درج کرنے لگا...

Here lies in Eternal Peace
The Princess Bamba Sutherland
Eldest Daughter of Maharaja Dilip Singh
And Grand Daughter of Maharaja Ranjit Sing of Lahore
Born on 29th Sep 1869 in Londen
Died on 10 March 1957 at Lahore

اے واقف اسرار ضمیر ہر کس   در حالت عجز و دستگیر ہمہ کس
یارب تو مرا توبہ دہ، عذر پذیر   اے توبہ دہ و عجز دستگیر ہمہ کس

"تم پھر خاموش ہو گئے ہو؟"

"ہاں —" اس نے نوٹ بک پر درج شدہ عبارت کو ایک نظر دیکھا اور اُسے جیب میں رکھ لیا۔ "شائد اس کرسچن گریو یارڈ میں یہ واحد قبر ہے جس پر فارسی کی رباعیاں درج ہیں.. کورٹ لینگوئج آف رنجیت سنگھ یو نو — چلیں؟"

"چلنے کا — یا مجھے چلانے کا اختیار تو تمہارے پاس ہے —" فاطمہ نے ہاتھ آگے کر دیا۔

وہاں سویر کی پہلی دھوپ میں اس کا بڑھا ہوا ہاتھ ایسے ساکت تھا جیسے وہ کسی قبر پر آویزاں مریم کے مجسمے کا ایک حصہ ہو۔ ظفر علی روڈ کے گندے نالے کی بو ابھی گرمی سے ناگوار نہیں ہوئی تھی اور جیل روڈ پر رواں ٹریفک نے ابھی آسیب کی کیفیت اختیار نہیں کی تھی... وہ فوری طور پر اُس کا ہاتھ تھامنے سے ٹھٹکا — اس کے اندر ایک جھجک آ گئی تھی جو کسی تاریک گوشے میں شائد خفیف سے احساسِ جرم کی پروردہ تھی۔

"تم کہیں چلے تو نہیں گئے؟" فاطمہ نے پوچھا یہ جانتے ہوئے کہ وہ وہاں موجود ہے۔

"نہیں —" اس نے فوراً کہا اور فاطمہ کا ہاتھ ایسے تھاما جیسے وہ اُس کا سہارا چاہتا ہو۔

"اُس نے تم سے کیا کہا تھا؟" فاطمہ نے پھر دوہرایا۔

"اُس نے آج تک مجھ سے پوچھے بغیر اپنے کمرے سے باہر بھی قدم نہیں رکھا تھا
یہ نہیں کہ میں ایک قاہر اور جابر قسم کا خاوند ہوں۔ نہیں — یہ ہمارا ارینج منٹ ہے۔
م ایک دوسرے کو آگاہ رکھتے ہیں لیکن کل صبح میں بیدار ہوا ہوں اور وہ — نہیں ہے۔
بی جی کامونکی گئی ہیں صاحب جی — مالی شریف مجھے بتا رہا ہے —"

"اُس نے تم سے کیا کہا تھا — جب تم اسے واپس لانے کے لیے کامونکی گئے ہو..
ب... اس نے کیا کہا تھا —"

"وہ کسی دراڑ کی بات کرتی تھی..."

یقیناً کہیں ایک برہنہ گول مٹول سنگ مرمری فرشتے کے پر پھڑپھڑائے۔

"وہ جانتی ہے کہ میں وہ دراڑ نہیں ہوں —"

"شائد تم ہو —"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور سر جھٹکا... اُس کے تمام بال راکھ سے سفیدی میں آ
ے تھے "نہیں... میں نہیں ہوں... اور اسی لیے آج شام میں جا رہی ہوں... تم کم از کم
ری نشست تو کنفرم کروا دو۔"

"کویت کے لیے؟"

"نہیں انگلینڈ کے لیے۔ کویت شائد اب مجھے قبول نہیں کرے گا — میں اپنے
دا کے خیمے میں جانے کے قابل نہیں ہوں... انگلینڈ میں کوئی کسی سے اُس کا حسب
ب، کردار اور مذہب نہیں پوچھتا — میں وہیں جاؤں گی..."

"کس کے پاس؟"

"نو باڈی — وہاں میرا کون ہے... ڈیئر از نو باڈی —"

"تو پھر؟"

"میری ایک سپنسٹر دوست ایک ہوم میں بہت اچھے دن گذار رہی ہے — میں
کچھ جمع بھی کر رکھا ہے اور کچھ سوشل سیکیورٹی بھی مل جائے گی برطانوی شہریت کی وجہ
... میں اپنے دن گذار لوں گی مشیل —" اُس نے پھر اپنا ہاتھ بڑھایا "میں کبھی اس
دبار میں برگیتا کے حصے کی خواہش نہیں کروں گی۔"

"وہ زیادہ دیر تک اُس غلاظت کے ڈھیر میں نہیں رہ سکتی۔" وہ اپنے آپ میں ہنسا

"اور اس نے جواز پتہ ہے کیا دیا تھا؟ —"

"دراڑ؟"

"اس کے علاوہ... وہ کہتی تھی کہ حضرت موسیٰ بھی تو شاہی محل چھوڑ کر اپنے قبیلے میں واپس چلے گئے تھے.. گندگی اور کیچڑ میں واپس گئے تھے۔"

"وہ آ جائے گی۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں" اور فاطمہ کے ہاتھ میں محبت کا وہ رچاؤ تھا جو اُس کی لاعلمی میں — شائد اُس کی لاعلمی میں دراڑ بن چکا تھا۔

باہر، گلبرگ کے گورا قبرستان کے باہر جیل روڈ پر ٹریفک کا گھنا اژدہا پھنکار رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اندر... گورا قبرستان کے اندر، فرقِ شاہی و بندگی برخاست۔

گندے نالے کی بُو ظفر علی روڈ پر مسلسل معلق تھی اور اُس میں سے گذرنے والے لوگ کم سے کم سانس لیتے ہوئے اُس میں سے گذرتے تھے۔ ولیز جیپ مال روڈ پر آئی تو مشاہد نے ایک گہرا سانس لیا اور سٹیئرنگ بائیں جانب گھما دیا۔

"میری سینس آف ڈائرکشن بتاتی ہے کہ ہم واپس ماڈل ٹاؤن کی جانب سفر نہیں کر رہے —"

"نہیں —" مشاہد نے کہا۔ اس کے سامنے سبزے کی ایک سرنگ تھی جو ٹریفک کو نگلے چلی جا رہی تھی "سات کمروں والی کوٹھی میں صرف مالی شریف ہے۔"

"اور ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"شہر کی طرف... شہر کے اندر... تمہیں اعتراض تو نہیں — ؟"

"نہیں —" فاطمہ کے سفید دانت درختوں کی چھاؤں میں نمایاں ہوئے "شہر کے اندر ہم جب بھی گئے ہیں تم میرا ہاتھ سختی سے تھام کر چلے ہو.. نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں..."

ریگل چوک تک وہ خاموش رہے — مشاہد نے بائیں جانب لکشمی مینشن کی طرف دیکھا اور اُس کے ماضی نے اتنا گہرا سانس لیا کہ اسے فاطمہ نے بھی محسوس کر لیا۔

"میں سن سکتی ہوں کہ آج ٹریفک معمول سے کم ہے۔ اور دوکانوں کے شٹرز گرنے کی کرخت آوازیں بھی کبھی کبھی سنائی دیتی ہیں — آج کوئی سرکاری چھٹی تو نہیں؟"

"نہیں —"

بڑے ڈاک خانے کے چوک تک وہ پھر چپ گئے۔

"ٹریفک کیوں کم ہے مشیل؟" فاطمہ نے پھر پوچھا۔

"ہڑتال ہے —" مشاہد بولا... پھر اس نے بہت محتاط ہو کر لفظوں کا چناؤ کیا اور فاطمہ کی جانب دیکھا جو دیکھ تو سامنے رہی تھی لیکن اس کے کان جواب کی آس میں منتظر تھے... اور اس نے بہت محتاط لفظوں میں اسے بتایا کہ بابری مسجد مسمار کر دی گئی ہے اور ہر جانب ایک پُرجوش اور شدید ردعمل ہے... فاطمہ سامنے دیکھتی رہی لیکن اُس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑتا نچڑتا گیا... اُس کا ہاتھ مشاہد کے اس ہاتھ پر آیا جو سٹیئرنگ پر تھا اور اس کے نزدیک تھا تو وہ بے اختیاری میں لرزتا تھا اور اُس میں حدت تھی۔ اس کے لب کھلتے تھے، دانتوں پر سے چپکتے ہوئے ہٹتے تھے اور پھر بند ہو جاتے تھے۔

"آئی ایم سوری —" مشاہد نے جیپ کی رفتار آہستہ کر دی "تم ٹھیک تو ہو فاطمہ؟"

اس کے ہونٹ کپکپاتے رہے، گھونسلے سے گرے بوٹ کی طرح.. پھر وہ بولی تو کسی اور آواز میں بولی جو کہیں فاصلے سے آتی تھی اور جس میں کوئی جذبہ کوئی جان نہ تھی — "میں نے انہیں آشیرواد دی تھی"

"ہو سکتا ہے وہ اس اندھے اور متعصب ہجوم میں شامل نہ ہوں —"

"وہ سب سے آگے ہوں گے.. اپنے آپ کو اُن سے بڑھ کر متعصب ثابت کرنے کے لیے... میرے بیٹے مشیل... میرے بیٹے —"

"تمہاری اُلجھن ماڈل ٹاؤن جانے سے کم ہو سکتی ہے تو ہم واپس چلتے ہیں۔"

"نہیں... تم چلو... جہاں مجھے لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ —" اُسی لمحے کہیں ایک ر شٹر گرا تو فاطمہ کے بدن میں ایک گرم سیسہ اُترا اور وہ بے طرح کانپی "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

لال حویلی کے نیچے جو گھنا اور پُررونق بازار تھا وہ بھی بند پڑا تھا۔

فاطمہ بہت مضبوطی سے مشاہد کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور ادھر اُدھر ایک گمشدہ بچے کی طرح دیکھتی تھی... کیا دیکھتی تھی۔ یہ صرف اسے علم تھا... حویلی کی بالائی منزل کو جانے والی تنگ اور پُرپیچ سیڑھیوں پر وہ بار بار رُکتی اور سانس درست کرتی۔

"کیا یہاں بہت اندھیرا ہے؟" اُس نے یکلخت پوچھا۔

"ہاں... ایک چھوٹا سا روزن ہے لیکن.. اندھیرا ہے۔"

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ فاطمہ کا منتظر بدن اس کے ساتھ لپٹ گیا اور وہ سینے میں اُٹھتی ہوئی سِسکیوں کو دبانے کی کوشش میں بری طرح ناکام ہونے لگی... اُس کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتہ تھا جو لرز رہا تھا "ہم سب بے اختیار ہیں فاطمہ —" مشاہد نے اس کے سفید بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اُن پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی "گلیشئرز میں سے نکلنے والے تیز نالوں کے پرشور پانیوں میں کہیں ایک تنکا ہیں، ہمیں ناحق بدنام کیا گیا ہے... ہم بے اختیار ہیں۔"

"وہ میرے سامنے —" اس نے الگ ہو کر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جیسے اُسے دیکھتی ہو "وہ میرے سامنے تلک لگا کر کھڑے تھے... اور..."

روزن میں سے داخل ہوتی دھوپ میں مٹی کے ذرے کچھ اوپر اٹھتے تھے آہستگی اور سُستی سے اور کچھ نیچے بیٹھتے جا رہے تھے.. اپنے آپ میں مگن... ان کا کیا اختیار تھا۔

اوپر سے قدموں کی چاپ نیچے آنے لگی۔

"اوئے کون ہے؟"

نیم اندھیرے میں انہیں کچھ دکھائی نہ دیا "میں مشاہد ہوں، آپ کون ہیں؟"

قدموں کی چاپ اُن کے قریب آ گئی، پھر اندھیرے میں دانت نمایاں ہوئے اور چمڑے کی بو میں رچی ایک آواز آئی "میں کاریگر ہوں جی ادھر فیکٹری میں... گرگابیاں بناتا ہوں... مجھے ہڑتال کا تو پتہ تھا پر ہمارا اُستاد جی بڑا نانیم ہے... میں نے سوچا خود دیکھ کر آتا ہوں کہ سچ مچ چھٹی ہے کہ نہیں — اور ادھر آیا ہوں تو فیکٹری میں بندہ نہ بندے کی ذات... آپ ادھر کیا کرنے آئے ہیں صاحب جی؟"

روزن کی مختصر روشنی تھوڑی دیر میں ناکافی سے کافی ہوئی تو شکلیں کچھ کچھ ظاہر ہونے لگیں... وہ ایک کچی عمر کا نوجوان تھا جو بہت دنوں سے نہایا نہیں تھا اور اس کا چہرہ ایک روز کی مشقت سے آزادی کے رچاؤ میں دمکتا تھا۔ اُس چہرے پر سیڑھیوں میں سے اُترتے ہوئے یکدم نیم تاریکی میں دو انسانوں کو غیر متوقع قربت میں پا کر جو شکوک ظاہر ہوئے تھے وہ ان انسانوں کے عمدہ لباس اور تہذیب یافتہ شکلوں کو دیکھ کر شرمندگی میں بدل گئے کہ یہ تو ہم جیسے ہوتے ہیں جو ایسے ہوتے ہیں۔ ان جیسے ایسے کیسے ہو سکتے ہیں۔

"ہم ادھر نُوراں سے ملنے آئے ہیں —" مشاہد نے اپنے آپ کو فاطمہ سے

ایسے لاپروائی سے الگ کیا جیسے یہ ایک بہت معمولی بات ہو۔

"مائی نُوراں سے؟"

"ہاں —"

"مائی نُوراں تو جی اللہ کے فضل سے فوت ہو چکی ہے — تین مہینے ہو گئے ہیں۔"

ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے جو آسمان دکھائی دیتا تھا اس میں رنگ برنگے گُڈے اور پتنگیں نیلاہٹ میں بل کھاتی تیکھی کشتیوں کی طرح تیرتے تھے... اس کے طرز تخاطب میں ایک اپنائیت تھی جو جنسی قربت کے بعد ظاہر ہوتی ہے — اور یہ ممکن نہ تھا۔ عمروں کا تفاوت.. بل کھاتی تیکھی کشتیاں اور سکھ سرداروں کی شوخ رنگ پگڑیاں... ٹوٹے ہوئے رنگین شیشوں سے پرے..

"تین مہینے؟"

"ہاں جی — اوپر حویلی کی چھت پر جو کمرہ ہے جس میں رنگ برنگے شیشے تھے وہاں ہمارا اسحاق سریش والا گیا تو مائی جی وہاں موئی پڑی تھیں.. اور جناب عالی گوٹے کناری والا گھگرا پہنا ہوا تھا مائی جی نے..." اُس نے اب انہیں بیزاری سے دیکھا کیونکہ وہ نیچے جانا چاہتا تھا یہاں اندھیرے میں کھڑے ہو کر مائی جی کے بارے میں مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں اسے راستہ دینے کے لیے سُرخ بُرادہ ہوتی چھوٹی اینٹوں کی گولائی کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے اور وہ اپنے بدبُو دار بدن کو اُن سے بچاتا نیچے اُتر گیا۔

مشاہد کے ہاتھ بھی گھونسلے سے گرے بوٹ کی طرح گرم اور پھڑپھڑاتے ہوئے لرزتے تھے..

"ہمیں ناحق بدنام کیا گیا ہے" فاطمہ کی گرفت میں مُحبت کا وہی رچاؤ تھا جو دراڑ بنتا ہے "ہم پر تہمت لگائی گئی ہے —"

"ہاں —" مشاہد بمشکل بولا اور فاطمہ کے بدن سے لگ کر جو اس کا منتظر تھا بہت دیر تک اس کی مُحبت کے رچاؤ میں، سکون سے اور خاموشی سے نُوراں کی موت کے شدید صدمے کو سہنے کی کوشش میں اپنے آپ کو نارمل زندگی کی جانب واپس لاتا رہا۔

"تمہیں اس سے بھی لگاؤ تھا؟"

وہ اس سے الگ ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا جن کے بارے میں وہ اب بھی

شک میں مبتلا تھا... وہ دیکھتی تھیں اور اُن میں ایک سیال زندگی تھی جو بہتی ہوئی اس کے رگ و پے میں سماتی تھی "مُحبت کی بھی عجیب مِتھ ہے — لگاؤ کی — آشنائی کی — عجیب دقیانوسی مِتھ ہے کہ یہ صرف ایک شخص سے ہو سکتی ہے — صرف ایک شخص اور ایک شکل کے لیے — یہ تو ایک بیمار خیال ہے فاطمہ — انسان کے وجود اور احساسات کے جگ ساپزل کے ہر ٹکڑے کے لیے بالکل ویسا ہی ٹکڑا درکار ہوتا ہے جو اُس کی تسلی کر سکے... اس کے ساتھ جُڑ سکے — اس کا لگاؤ جب تک بہت سارے ٹکڑوں کے ساتھ نہیں ہو گا وہ مکمل نہیں ہو سکتا — وہ ادھورا رہے گا... جو برگیتا ہے... جو سمیعہ تھی... جو کرسٹین تھی... اور جو تم ہو... وہ نُوراں نہیں تھی... اس لیے... جو وہ تھی وہ تم نہیں ہو۔"

اس نے اپنے باب کٹ کو بے چارگی میں جھٹکا اور وہ اپنے مرکز سے ہٹ کر پھر واپس آ گئے "میں تم سے اتفاق کرتی ہوں مشّیل — جو تم ہو وہ بابو نہیں ہو سکتا تھا۔"

وہ نیچے آئے تو تنگ اور خالی بازاروں میں پرتشدد آنکھوں والے اور بہت دکھی لوگ چلتے تھے اور باتیں کرتے تھے... ہم کوئی بے غیرت ہیں جو اُن کے مندروں کی حفاظت کرتے پھریں.. اور وہ بابری مسجد کو شہید کر دیں... کدالیں... بیلچے... جین مندر میں بچوں کا سکول تھا.. لیکن مندر تھا... گرودوارے اور مندر ان میں کوئی فرق نہیں.. اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

"جیپ تو بھاٹی دروازے کے باہر پارک کی ہوئی ہے.. لیکن.. یہ بہتر ہو گا کہ ہم ادھر شاہ عالمی کی طرف سے نکلیں... میرے پرانے سکول کی طرف سے —"

"مجھے اپنا ہاتھ دو —" فاطمہ نے جیسے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔

وہ دونوں اپنی بابری مسجد اور اپنی نُوراں میں گُم تھے اور کچھ بھی نہیں سُن رہے تھے.... وہ قدیم اینٹوں اور موت کے بوجھ تلے تھے اور گُم تھے۔

رنگ محل مشن ہائی سکول کی دیدہ زیب اور خوش نما فساڈ والی عمارت زوال میں تھی.... خوانچہ فروش، برتن بیچنے والے، حلیم فروش، پھل فروٹ، نالے پراندے، سوڈا واٹر — یہ سب اس کے فساڈ پر پردہ ڈال رہے تھے...

شاہ عالمی کا دو رویہ بازار اور بدنما عمارتیں صرف آج خاموش اور ویران تھیں ورنہ یہاں روزانہ ٹریفک اور کاروبار کی قیامت برپا رہتی تھی۔

شائد بائیں جانب وہ گلی تھی... ایک فلمی سیٹ کی طرح.. جس میں بندو رام کی چھلیا

ہوا میں سرسراتی تھی — شائد...

"میں کہیں نہیں جا رہی تم میرا ہاتھ اتنی سختی سے نہ تھامو. مجھے اذیت ہو رہی ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"سوری —"

جہاں بندو رام سبزی کی چھری اپنی پُشت پر سجائے بے جان جھکا ہوا تھا وہیں نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز — ایاز کی قبر تھی

"تمہارے بہت ہی بے لگام خوابوں میں بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ اب جو تم اپنے دونوں جانب بلند اور بدشکل عمارتیں دیکھ رہی ہو — یا میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ عمارتیں یہاں ہیں تو آج سے... چلو ہم وقت کے پیمانوں میں نہیں اُترتے.. بہت زمانہ پہلے یہاں ایک سوختر آباد تھا... سب کچھ جل چکا تھا اور میں اس کے ٹیلوں پر راکھ کریدتا تھا... جستجو کیا تھی، نہیں جانتا تھا... رنگ محل سکول سے واپس آتا تھا تو راکھ کریدتا تھا، تمہارے بہت ہی بے لگام خوابوں میں بھی یہ ممکن نہیں ہو سکتا — کیوں فاطمہ؟"

"میرا اور تمہارا جغرافیہ الگ ہے مشّیل — اس لیے۔"

اس کے جذباتی دھارے تھم گئے اور اس نے بے حد شرمندگی محسوس کی.. فاطمہ کو کیا کہ یہاں وقت کے پیمانوں میں کیا تھا — اور اس وقت بھی اس کی جین کی ہپ پاکٹ میں اُس کنگن کی گولائی اُبھرتی تھی جو اسے راکھ کریدنے سے — جستجو کیا ہے، میں ملا تھا۔

"اس کے باوجود — تم کہو — میں سن رہی ہوں.. صرف یہ کہ ہوا میں مٹی کے ذرّے ہیں جیسے کچھ مسمار ہوا ہو —"

مشاہد نے ایک گہرا سانس بھرا "کچھ بھی نہیں — لاہور میں بھی آلودگی بڑھ گئی ہے.. اور کچھ بھی نہیں.. میں بھاگ رہا تھا فاطمہ اور میرا بستہ میری پُشت پر برستا تھا اور مجھے اذیت دیتا تھا، میں بھاگتا تھا اور ہر سو ویرانی تھی اور مجھے کوئی لینے نہیں آیا تھا.."

"ہوں —" فاطمہ نے اس کا ہاتھ دبا کر صرف اتنا کہا۔

مشاہد نے جان لیا کہ ان دونوں کا جغرافیہ واقعی مختلف ہے — اب وہ گھر جانا چاہتا تھا.. کیا پتہ برگیتا وہاں ہو، وہ واپس آ چکی ہو —

دونوں جانب سوختہ ٹیلے تھے، کھنڈر تھے، اُن میں جابجا تجوریوں کی آہنی کشتیاں

تھیں جو مدوجزر کی وجہ سے کھنڈروں کی ریت میں پھنس چکی تھیں اور رواں نہیں ہو سکتی تھیں۔

"میں راکھ کریدتا تھا اور سب کچھ جل چکا تھا —" مشاہد نے اپنے آپ سے کہا کہ فاطمہ کا جغرافیہ اس سے مختلف تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہمدردی سے سنتی تھی اور وہ سنانا چاہتا تھا "اس پورے علاقے میں صرف تین عمارتیں آگ سے بچی تھیں، بُندو رام کی گلی کا چہرہ، دوسری لال مسجد تھی جس کی دیواروں کو چھوتے ہی شعلے بجھ گئے تھے اور تیسری شاہ عالمی چوک کا سنہری کلس والا پُرشکوہ مندر — جس کی طرف ہم جا رہے ہیں۔"

ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی لیکن ہجوم زیادہ ہونے لگا۔

لوگ آ جا رہے تھے اور ان کے لہجوں میں اور چال میں ہیجان تھا۔

مشاہد اب ذرا آگے ہو کر چلتا تھا تاکہ سامنے سے آنے والے فاطمہ سے کھے کر نہ گذریں... اُس کی ہتھیلی میں پسینے کی نمی تھی۔

ہجوم گھنا اور نیت میں پُرتشدد ہوتا جا رہا تھا۔ مشاہد نے اپنا راستہ بدل کر شاہ عالمی کی طرف آنے کی غلطی کی تھی۔ اُن کے عقب میں بھی بہت لوگ اپنے آپ کو دھکیلتے چلے آتے تھے اور وہ واپس بھی نہیں جا سکتے تھے۔

"مشیل —" فاطمہ اس کے کندھے کے ساتھ لگتے ہوئے بولی اور اُس کی آواز میں خوف کی تھراہٹ تھی "ہم خطرے میں تو نہیں؟"

"نہیں —"

"لیکن میں محسوس کر رہی ہوں مشیل — آس پاس جو شور ہے اُس میں.. لوگوں کی آوازوں میں اور اُن کے لباسوں کی سرسراہٹ میں کچھ علامتیں ہیں... جو مجھے بے چین کرتی ہیں..."

"یہ میرا اپنا ملک ہے فاطمہ... میں اس کے ہجوم کی نفسیات سے شناسا ہوں... کم از کم ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔"

"یہ کیا چاہتے ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو یہ یہاں نہ ہوتے —"

لوگوں کے سروں کے اوپر سے مشاہد کو شاہ عالمی چوک میں کچے برتنوں اور قبروں کے لیے سنگ مرمر کی جالیاں اور کتبے بنانے والوں کی دوکانوں کے اوپر ایک غبار دکھائی

یا۔ ایک رُکا ہوا گرد کا طوفان... ایک گرد آلود خاموشی کے ساتھ چوک پر معلق... مشاہد کا تھا پسینے سے بھیگتا گیا — چوک کو عبور کرنا ممکن نہ ہو گا... وہاں کچھ ہو رہا تھا... تیسری دنیا ا ایک معمول، آپ ایک نارمل زندگی بسر کرتے ہوئے گھر سے نکلتے ہیں اور کسی ایک وک، کسی شاہراہ پر آناً فاناً ویرانی آ جاتی ہے... یا ہجوم بڑھ جاتا ہے اور ٹائروں کی جلنے کی بُو ضا میں ہے اور آپ جان جاتے ہیں کہ وہاں کچھ ہو رہا ہے اور آپ اپنی جان کی فکر کرتے ں اور متبادل راستے تلاش کرنے لگتے ہیں لیکن یہاں سے رنگ محل لوٹ جانا بھی ممکن نہ ہا تھا۔

اُنہیں بہت کم اپنے قدموں پر اختیار تھا... ہجوم اُنہیں اپنا ایک حصہ بنانے پر تلا ا تھا۔ اُن کے قدم اس ہجوم کی اجتماعی مرضی کے تابع ہو چکے تھے اور اسی لیے مشاہد بار ر فاطمہ کے پسینے سے بھیگے ہوئے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط تر کرنے کی سعی کرتا تھا — وہ شاہد کی پُشت پر چپکی چلی آ رہی تھی کہ اُس کے پیچھے جو لوگ تھے وہ اس کے وجود اور نف سے بے خبر اُمڈے چلے آ رہے تھے — وہ جانتی تھی کہ مشاہد کے پاس اس ورتِ حال کے لیے تسلی کے لیے بہت کم لفظ ہوں گے اسی لیے وہ اپنے بے پناہ خوف کا ہار کرنے سے اپنے آپ کو روک رہی تھی۔

اس نے بے چینی میں اپنے لبوں کو بھینچا تو اُن پر جمتی ہوئی گرد کی ایک ہلکی تہہ کا ئقہ تالُو کے نیچے تک گیا۔

ہجوم کی بے مہار بھنبھناہٹ اور شور سے الگ فاطمہ کے کانوں میں ایک مشینی ڑگڑاہٹ اُتری... اس نے اپنی سمعی توجہ اس ایک نکتے پر مرکوز کی... جیسے صحرا کی رات یں مورچے کے اندر بیٹھے ہوئے ٹینکوں کی حرکت سنائی دے... خفیف بھی اور مہیب ی... ایسے ایک مشینی گڑگڑاہٹ.. ہجوم کی اجتماعی مرضی کے تابع وہ چوک کے قریب ہو ے... نعرے جو پہلے شور کا ایک حصہ تھے اب اُن کے آس پاس تھے اور اسی لیے واضح ہو ہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے مشیل؟"

لاہور کارپوریشن کے دو بُل ڈوزر شاہ عالمی چوک کے سُنہری مندر کی بنیاد میں اپنے ی بلیڈ گھسائے اُسے مسمار کر رہے تھے... درجنوں متاثرین کدالوں اور بیلچوں کی مدد سے ناقابل گرفت جوش میں غرق مندر کی دیواروں کو ڈھانے کی کوشش کر رہے تھے...

کچھ لوگ مندر کے سنہری کلس کی بلندی تک جا پہنچے تھے اور اُسے توڑنے میں مصروف تھے... عمارت اور عقیدے پرانے ہوں تو اُن کو ڈھانا آسان نہیں ہوتا اس لیے.... پچھلے دو گھنٹوں سے بُل ڈوزر اور کدالیں اس قدیم ساخت سے نبرد آزما تھیں اور بہت آہستہ آہستہ ایک ایک اینٹ مشکل سے الگ ہوتی تھی... ایک اینٹ الگ ہوتی تھی تو تھوڑی سی گرد اُٹھتی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے مشیل؟"

مشاہد نے بتایا۔

اس نے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈال کر اپنے آپ کو اس کا ایک حصہ بنا لیا اور یہ حصہ بری طرح کپکپا رہا تھا' جیسے ایک خوفزدہ بلیک بک کا بخار زدہ ماس ہو.... "مشیل ـــ" وہ اسے اب بہت بلند آواز میں پکارتی تھی "اگر انہیں علم ہو جائے کہ وہ میرے بیٹے تھے.."

مشاہد یکلخت پلٹا... فاطمہ کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں اور سفید بال دُھول سے اٹے ہوئے تھے "فاطمہ، چپ رہو ـــ"

"نہیں ـــ اگر یہ جان جائیں تو ـــ"

"کیپ یور ماؤتھ شٹ فاطمہ ـــ" مشاہد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تو جیسے اُس کی آنکھیں پانی کے پار بولنے لگیں... ایک خوفزدہ بلیک بک کی آنکھیں شاہ عالمی چوک میں سُنہری کلس والے مندر کے ڈھیتے ہوئے ملبے میں سے اُٹھنے والی گرد کے اندر بولنے لگیں... اور اس کے بالوں کا رنگ راکھ ہو رہا تھا' مندر کی راکھ بے رنگ تھی۔

یکدم خاموشی ہو گئی۔

ہجوم جہاں تھا... مندر کے کنگروں پر چڑھتا ہوا.. کلس کو توڑتا ہوا... بنیادیں پر کدالیں چلاتا نعرے لگاتا ـــ یکدم سکوت میں آ گیا ـــ کوئی شے زیرِ زمین سرکی... مشاہد کا ہاتھ جین کی جیب میں رکھے کنگن کی گولائی پر گیا' اس کی ہتھیلی پر وہ ثبت ہوا... اور پھر زیرِ زمین جو شے سرکی اس کی ایک گہری اور بھید بھری آواز سنائی دی جو ہجوم کے سکوت پر حاوی ہوئی اور شاہ عالمی چوک میں ایستادہ سنہری مندر سر کے بل گرد بھرے آسمان میں سے جھکتا نیچے آنے لگا۔

بلند قامت درختوں کے کسی قدیم آبائی جنگل کو جب کاٹتے ہیں تو جانتے ہیں کہ یہ

جب نیچے آئیں گے تو کس رُخ پر کہاں آئیں گے... کہاں گریں گے.... اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن مندر اور مسجدیں چونکہ ہر روز نہیں گرائی جاتیں اس لیے اُن کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ انہوں نے کہاں اور کس زاویے پر زمیں بوس ہونا ہے.. شاہ عالمی چوک میں جمع ہجوم کی آنکھوں میں پہلے خوشی در آئی اور پھر خوف آیا کہ یہ معبد ہم پر گرنے کو ہے اور وہاں ایک بھگدڑ مچ گئی... ہجوم کی ایک بے قابو لہر میں اتنا زور تھا کہ اس نے فاطمہ کو الگ کر کے کچے برتنوں کی دوکان کے قریب کچے گھڑوں پر گرا دیا اور مشاہد نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں بلیک بک موجود نہ تھا اور جب اُس نے پیچھے مڑنے کے بعد پھر اپنے سامنے دیکھا تو اس کے عین اوپر سُنہری کلس نیچے آ رہا تھا اور اس کے عقب میں سورج تھا اور اسی لیے اس کی تکونی عمارت اسے آہستہ آہستہ اپنے اوپر آتی دکھائی دے رہی تھی۔

جب زیرِ زمین کوئی شے سرکی تو مندر پر چڑھے ہوئے لوگوں نے اپنے بچاؤ کے لیے چھلانگیں لگا دیں لیکن ایک نوجوان کو شائد موقع نہ ملا ـــ شائد یہ اس کی اپنی پسند تھی۔ وہ مندر کی چوٹی پر تلوار سونتے ہوئے ایک سپاہی کی طرح ڈٹا کھڑا رہا اور اب اس کے ملبے کے ساتھ نیچے آ رہا تھا... آخری لمحوں میں زرد ہوتے چہرے کے ساتھ کہ اُس کے منصوبوں میں مندر ڈھانا تھا اس کے ساتھ خود ڈھے جانا نہیں تھا۔

گرد کا ایک بہت بڑا مشروم ایٹم طرز کا شاہ عالمی چوک میں سے اُٹھ کر آسمان پر پھیلنے لگا.. بہت سے لوگ ملبے کے نیچے دب گئے تھے۔

فاطمہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا ـــ اس کی گرفت میں ایک کچا گھڑا آیا جو اس کو مشیل تک نہیں لے جا سکتا تھا۔

مشاہد پر بھی ملبے کا کچھ حصہ گرا تھا.. اور وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا ـــ اس کے بدن پر گرد تھی اور وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا.

ہجوم کم ہو رہا تھا...

کارپوریشن کے بُل ڈوزر سرخرو ہو کر واپس جا رہے تھے۔

وہ خود سے اپنے آپ کو ملبے میں سے نہیں نکال سکتا تھا.. اس کی کمر کے نچلے حصے بہت بوجھ تھا اور وہاں شکستگی کی ٹیسیں تھیں۔

ہجوم مزید کم ہوا تو اس نے چوک کے پار کچے برتنوں کی دوکان کے چھپر تلے فاطمہ کو ہاتھ پھیلائے دیکھا ـــ پھر وہ اُٹھی اور اس کی جانب چلنے لگی۔ سڑک پر اینٹیں اور مٹی

کے ڈھیر تھے اور اُن پر ٹھوکریں لگتی تھیں — مشاہد وہیں بے بسی سے پڑا ہوا اور ملبے کی قید میں جکڑا ہوا اس کی جانب حیرت سے تکتا تھا کہ وہ کیسے جانتی ہے کہ میں یہاں ادھر ہوں — اور اُس لمحے فاطمہ ٹٹولتی ہوئی ہاتھ پھیلائے اُس کے قریب ہوئی اور کہنے لگی ''مشل... تم یہاں ہو۔''

اور وہ اس کے پاس بیٹھ گئی، اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا جہاں چند خون آلود خراشوں پر مٹی جمی ہوئی تھی اور اس کے پپوٹوں پر سے گرد صاف کی اور پھر جھک کر مٹی بھرے ہونٹوں کو چوما اور پھر کہا ''مشل... تم یہاں ہو۔''

''ہاں — '' مشاہد کراہا ''میں یہاں ہوں۔''

چند لوگ چند لمحوں کے لیے ایک ناآشنا چہرے کے لیے جو کہ فاطمہ کا تھا، کھڑے ہوئے اور پھر چلے گئے...

مجھ سے باتیں کرو مشل —''

ایمبولینس والے آ رہے ہیں بی بی فکر نہ کرو — کسی نے کہا... فاطمہ نے سُنا نہیں۔

مشاہد کے اوپر ایک گرد بھرا آسمان تھا اور ایک ایک ذرّہ دھیرے دھیرے جیسے لال حویلی کی سیڑھیوں کے روزن میں سے آنے والی دھوپ میں ایک ایک ذرّہ آہستگی سے نیچے آتا تھا... ایسے مشاہد کے چہرے پر آتا تھا اور جہاں ملبہ اس پر بوجھ ہو رہا تھا وہاں ریزہ ریزہ ٹیسیں تھیں...

''مشل، مجھ سے باتیں کرو''

''میں جب ماں کے پیٹ میں تھا تو میری دادی نے جو کالیاں میں ایک خواب دیکھا کہ اُس کے صحن میں بیری کا جو درخت ہے اس پر چراغ جلتے ہیں۔ وہ اَن پڑھ دیہاتن گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس بھاگی گئی... فاطمہ بی بی — انہوں نے کہا، تمہارے گھر پوتا ہو گا... تمہارے اکلوتے بیٹے کے گھر ایک بیٹا ہو گا جو چراغوں کی طرح تمہارے خاندان کو اور تمہارے گھر کو روشن کرے گا — تم آج شام انگلینڈ نہیں جا سکتیں، اب نشست کنفرم کروانے کے لئے وقت نہیں رہا —''

''بھول جاؤ — '' فاطمہ مسکرائی اور پھر اس کے چہرے پر جھکی... آس پاس بہت کم لوگ تھے... اور وہ بھی ان کی جانب دیکھتے نہیں تھے — '' پھر کیا ہوا؟''

''میں پیدا ہوا تو... پہلے گاؤں کے کمہار آئے دِکھائی دینے — اور وہ کچے گھڑے لے کر آئے — ہم چناب کے کناروں پر رہنے والے ہیں اور کچے گھڑے ہمیں پار اُتارتے ہیں... '' مشاہد ذرا ہنسا۔ اور اُس میں اذیت تھی اور اُس کے چہرے پر گرد کے نیچے ے زردی اُمڈتی تھی ''ابھی تم جب ادھر سے آئی ہو تو کچے گھڑے نے تمہیں راستہ دکھایا یا —''

''ہاں ہاں پھر کیا ہوا — کمہار آئے''

''تو میرے دادا نے غربت کے باوجود انہیں بہت کچھ دیا — پھر ملاح آیا اور اس نے کشتی کا ایک کیل میرے سینے پر رکھ دیا، شائد اسی لئے میں ہمیشہ سفر میں رہا کشتی کے کیل ی گُڑھتی کی وجہ سے — اُسے، ملاح کو بھی میرے دادا نے اپنے بھڑولے کی آدھی گندم ال کر دے دی... پھر ترکھان آئے میرے لئے ایک طوطا لے کر... ایک رانگلا ریڑھا جس سہارا لے کر بچے چلتے ہیں اُسے گاؤں میں طوطا کہتے ہیں... پھر لوہار آیا، اُس نے ہل کا ب پھل میرے پنگھوڑے کے ساتھ رکھا اور میرے داد سے لاگ وصول کیا... اور میراثی ی آئے جنہوں نے ہمارے کچے کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر بین بجائی کہ چوہدری اللہ بخش ے ہاں پوتا ہوا ہے اور آخر میں داروگر آئے — انہوں نے بیری کے نیچے کھڑے ہو کر ولے چھوڑے تک آس پاس کے دیہات تک اُن کی آواز جائے اور لوگ جان جائیں ۔ چوہدری اللہ بخش کے ہاں...'' مشاہد کے چہرے پر مُردنی کی زردی چھانے لگی — فاطمہ کھ نہیں سکتی تھی لیکن جان سکتی تھی... اس نے چاروں طرف نگاہ کی... ایمبولنس آ رہی ہے — کسی نے کہا۔

''مشل — مجھ سے باتیں کرو'' اس نے پھر کہا۔

''تمہیں نابینا ہونے کے باوجود یہ کیسے معلوم ہو جاتا تھا، کیسے نظر آ جاتا تھا کہ بیٹے تمہارے سامنے کھڑے ہیں، تلک لگا کر کھڑے ہیں... اور بابری مسجد کو ڈھانے جا رہے ں... کیسے نظر آ جاتا تھا؟''

''اگر تمہیں صحرا میں ایستادہ اپنے دادا کے خیمے سے کوئی بھی مناسبت، کوئی لگاؤ ہو ر تمہارے اپنے بیٹے... ماتھے پر تلک لگا کر سامنے کھڑے ہو جائیں تو نظر آ جاتا ہے ل۔''

''میری جیب میں ایک کنگن ہے — جو میں نے سوختہ آباد کے ملبے میں سے کریدا

تھا... یہ تمہارے لئے ہے —" وہ درد کی آخری حد تک پہنچ کر کسمسایا۔

"پلیز... زیادہ حرکت نہ کرو... ایمبولنس آ رہی ہے۔"

تارکول کی سڑک پر اُس کی سخت سطح پر مشاہد کا چہرہ بے آرام اذیت میں تھا اور اس پر اتنی دُھول تھی کہ وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس پر جھکی فاطمہ کے سفید بال اس کی اذیت کو کم کرتے تھے... اور پھر اُس کی ناک کے عین سامنے... آنکھوں کے برابر میں تارکول کی سڑک پر... گرد آلود اور ملبے سے اٹی سڑک پر — ایک سفید شگوفہ گرا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ گرے گا — ایک سلیٹی منظر سے الگ ہو کر وہ یہاں بھی شاہ عالمی چوک میں بھی گرے گا۔

فاطمہ نے مکمل بے یقینی سے اسے دیکھا... اپنی بے نور آنکھوں سے اُسے دیکھا، اُٹھایا اور ناک کے ساتھ لگایا — "یہ کیا ہے مشیل؟"

"یہ ہم ہیں فاطمہ —" وہ درد سے کراہا "یہ ہم ہیں"

چڑیاں شور کرتی تھیں...

اور اب وہ مستطیل کمرے میں آرام کرسی پر دراز سفیدے کے کٹے ہوئے تنے پر ہاتھ رکھے جو اُس کے پلستر شدہ ٹانگ تھی اور رنگین شیشوں سے پرے جامن، پیپل اور شیشم کے جھنڈ میں سے تاریکی کی بڑھتی ہوئی ٹھنڈک میں سے شور مچاتی چڑیوں کے یکدم چپ ہو جانے اور اُسی لمحے جیسے سوچ آن ہو جائے اُن کی پر شور چہچہاہٹ کے غبار میں تھا۔ اُس جھنڈ تلے گھاس لٹکتی چھت والے کمرے کے اندر اب کوئی نہ تھا — وہ ابھی ابھی اُس کی ٹانگ کے سفید پلستر پر اپنے لبوں کی لپ سٹک ثبت کر کے اور اُسی طور جھکی ہوئی اُس پر سرخ مار کر سے "فاطمہ پٹیل" لکھ کر گئی تھی... اے سوونیئر — اکلوتی یادداشت — جب تم پلستر کٹواؤ گے تو اس حصے کو تم سنبھال بھی سکتے ہو اور ڈسٹ بن میں بھی پھینک سکتے ہو... یو آر گوئنگ ٹو بی آل رائٹ...

ہاؤ دے ڈیول ڈزشی نو دیٹ آئی ایم گوئنگ ٹو بی آل رائٹ —

چڑیوں کا شور ایک لونگ ڈسٹنس کال کی طرح یکلخت منقطع ہو گیا —

چند روز کے وقفے کے بعد ایک ایئرلیٹر آنا تھا — ڈیئر مشیل — مجھے امید ہے کہ اب تک تمہارا پلستر کٹ چکا ہو گا اور تم چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے ہو گے — اپنی ٹانگ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالنا... اور روزانہ زیتون کی تیل کی مالش کرنا — میرے دادا کا آزمودہ نسخہ — میں اپنی دوست کے ساتھ شفٹ کر گئی ہوں جس کا تم سے ذکر کیا تھا۔ یہ ہوم بہت کوزی اور آرامدہ ہے اور یہاں میری طرح کے اور بہت سے لوگ اختتام کو پہنچ چکے ہیں... منتظر ہیں... میں نہ تمہیں دیکھ سکتی ہوں اور نہ مستقبل کو — صرف انتظار کر سکتی ہوں — کیونکہ مُحبت کچھ بھی نہ بدل سکی — تمہارا دیا ہوا کنگن میری کلائی میں ہے — تمہاری فاطمہ۔

اس نے اس کے چہرے سے دھول پونچھتے ہوئے کہا تھا، یہ راکھ رنگ کی ہے۔

اُس کی سیاہ آنکھوں میں اس کی زندگی کے خدشے تھے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ مجھے کوئی خدشہ نہ تھا — مجھے مکمل زوال دیکھنے کے لئے زندہ رکھا جائے گا — اسی لئے ڈھول نہیں تھی، راکھ تھی۔

چڑیوں کا شور پھر زندہ ہو کر سات کمروں والی کوٹھی پر محیط ہو گیا۔

وہ کنگن اب فاطمہ کی کلائی پر ہو گا اور وہ اُسے دیکھتی ہو گی... اپنی انگلیوں سے اور اپنی سیال آنکھوں سے اسے دیکھتی ہو گی۔

مالی شریف حسب دستور نہائت بدتمیزی سے دستک دیئے بغیر اندر آیا اور سلام دعا کے بغیر ناگواری سے اور نہائت حاکمانہ لہجے میں بولا "نہ ڈہلیا کی پنیری آئی ہے، نہ پنیزی نہ پٹونیا... پھر کہو گے برابر کی کوٹھیوں میں پھول کھل چکے ہیں اور ہماری ابھی کلیاں بھی نہیں بنیں — کب لاؤ گے پنیری؟"

"تم جاؤ شریف — ابھی تم جاؤ"

"پر کب لاؤ گے؟"

"جاؤ شریف —" اُس کے غصے کی شدت سے شریف کی بدتمیزی ذرا کم ہو گئی۔

"پھر کہو گے کہ برابر کی کوٹھیوں میں پھول کھل چکے ہیں —" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

تو End Result کیا ہے؟ بوسیدہ اور گلتی گھاس کئی برس تک یونہی کناروں کے ساتھ لپٹے گی اور کبھی ہوا کے زور سے پیچھے ہٹ جائے گی — لیکن یہ ابھی رہے گی اور میں بوسیدہ ہو جاؤں گا — سچ کیا ہے اور ایک بہتر دنیا کا خواب کیا ہے اور کیا اُس خواب کے لئے ساواک سے سر سفید کروا لینا اور اپنے آپ کو مُردہ کر لینا جائز ہے — ڈسٹ ان ٹو ڈسٹ اینڈ ایشز ان ٹو ایشز — راکھ، راکھ میں۔

کمرے میں چڑیوں کے شور کے ساتھ تاریکی کی تہیں بیٹھتی چلی جا رہی تھیں اور اب انہوں نے سرد شام کی ہلکی روشنی کو بھی جذب کر لیا تھا۔ مشاہد نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا اور اُس کی تیز روشنی نے اسے اتنا ظاہر کیا کہ وہ بے آرام محسوس کرنے لگا — لیمپ آف ہوا تو وہ پھر اپنے آپ میں آ گیا — فاطمہ دراز تھی یا نہیں تھی، زندگی کے جِگ ساپزل کا ایک ایسا ٹکڑا ضرور تھی جو اسے مکمل کرنے پر قادر تھا۔

ابھی وہ ایئر لیٹر نہیں آیا تھا جس میں اُس نے زیتون کی مالش کا مشورہ دینا تھا —

ابھی نہیں آیا تھا۔

وہ تو ابھی اپنے ہونٹ ثبت کر کے گئی تھی، پلستر کی مُردہ سطح پر لیکن اُن کی گرمی اُسے پگھلاتی ہوئی اس کی ران تک پہنچی تھی اور وہاں بھی اس کے ہونٹ ابھی تک ثبت تھے۔ صرف اس کے سرخ دستخط سفید پلستر تک ہی رہے تھے اور اُن میں اسے پگھلانے کی قوت نہ تھی۔

اُس شام میں اور چڑیوں کے متواتر شور میں ایک چرچراہٹ سنائی دی...

یہ برگیتا کا ہاتھ ہے جو سات کمروں والی کوٹھی کے پھاٹک کو ذرا سا دھکیلنے کے بعد جھجک کر پیچھے ہوا ہے —

کچی کوٹھڑی کے اندر درجن بھر چارپائیوں پر وہ درجن سے زیادہ لوگ بدبودار کروٹیں بدلتے تھے اور ڈھیلی ادوائن اور اپنے مقام سے لرزتے پائے انہیں بمشکل سنبھالتے احتجاج کی آوازیں نکالتے تھے اور وہ اپنے اندر کی ہواؤں کو خارج کرتے ہوئے کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے بلکہ لطف اندوز ہوتے تھے اور ان چارپائیوں کے درمیان ایک چارپائی پر — اسے ایک الگ چارپائی دی گئی تھی، اُن کی سسٹر برگیتا سوتی تھی — آنکھیں بند کئے، ناک بند کئے نہ سانس لیتی تھی نہ بولتی تھی۔

یکو ساہ پکّا بھی اسے سسٹر کہتا تھا۔

دریائے یوٹا کے کنارے اُس سویڈش گھر کی یہاں کاموئکی میں ناقابل تصور آسائشوں اور جوہڑ کے کنارے اس سو کالڈ گھر کی بدبوداری کے باوجود — یہاں اس گھر پر اُس کا حق بنتا تھا۔ لیکن یہاں وہ برداشت کے قابل نہ تھی — مشاہد جب اسے لینے آیا تھا تو اس کے انکار پر اس کے چہرے کا تاثر غصے یا مایوسی سے آلودہ نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ اندر سے آگاہ تھا کہ برگیتا وہاں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتی — اور شائد وہ بھی جانتی تھی لیکن — وہ اِس آزمائش میں سے گزر جانا چاہتی تھی۔

اگرچہ وہ سب اس کے آس پاس غلاظت اور بدبو میں لتھڑے ہوئے کروٹیں بدلتے تھے اُسی پانی سے تخلیق ہوئے تھے جو اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی ابتدا تھا لیکن وہ لاچار تھی۔۔ جینز آسائش اور مختلف طرز زندگی کے متبادل نہیں ہو سکتے — وہ جب اُسے ایک بڑی سفارش کی صورت میں دیکھتے تھے — سسٹر اپنے صاحب سے کہو مجھے

لاہور کارپوریشن میں پکا بھرتی کرا دے ہیں سِسٹر — ذرا صاحب سے شفارش کردو کہ مجھے دوبئی کا ویزا لے دے... سِسٹر جی... مشترکہ خون کے باوجود رابطہ ایک جاں لیوا عمل تھا۔

جوہڑ میں جابجا پانی سے کائی ہٹی ہوئی تھی اور ذرا فاصلے پر ایک مرغابی جسے شائد قادر آباد کی جھیلوں پر اُترنا تھا اپنی ڈار سے بچھڑ کر کاموں کی کے جوہڑ کو ایک گرم آماجگاہ سمجھ کر نیچے آ گئی تھی اور اب تنہا اس میں تیرتی تھی اور شائد اس کے بدبودار پانیوں میں پر سمیٹ کر بے مراد ہوتی تھی — پُور تھنگ۔

وہ ہر صبح، سویر کی پہلی مدھم روشنی میں اُس بدبُودار قید سے نکل کر جوہڑ کے کنارے آ بیٹھتی... نزدیکی رُوڑی سے اُٹھنے والی ہوا کی لہروں پر آتی جاتی ناگوار مہک کو وہ سانس روک کر اور پھر جلدی سے سانس لے کر برداشت کر جاتی — اُس کی پوری زندگی یعنی پچھلے سات آٹھ دن برداشت کی کوشش میں صرف ہوئے تھے — اور آج پہلی بار اس نے اپنے پیریڈز کے بارے میں سوچا — وہ قدرے بے قاعدہ ہو جاتی تھی لیکن تین چار دن سے زیادہ نہیں — اور آج — کتنے دن پہلے... ایک ہفتے کی تاخیر... وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور سکول کے بچوں کی طرح انگلیوں پر حساب کرنے لگی... سات دنوں کی تاخیر — آج تک نہیں ہوئی تھی — آئی مُسٹ بی — اُس نے ایک بلند بے یقین سوڈیش ہچکی بھری — مشاہد کے باپ کا کیا نام تھا — مجھے اس کا نام آنا چاہئے... ہاں... ہاں... چوہدری اللہ داد —

"آئی مَسٹ بی پریگننٹ —" اس نے اگرچہ اطمینان بھری سرگوشی میں اپنے پورے وجود سے مخاطب ہو کر صرف اپنے آپ سے کہا لیکن اس کے باوجود جوہڑ میں پر سمیٹتی مرغابی ٹھٹکی اور پانی پر اپنے چپّو چلاتی ایک لہرا راستہ بناتی بلند ہوئی اور قادر آباد کی جھیلوں کی جانب پرواز کر گئی۔

اس شام میں اور چڑیوں کے متواتر شور میں ایک چرچراہٹ سنائی دی...

یہ یقیناً برگیتا کا ہاتھ ہے جو سات کمروں والی کوٹھی کے پھاٹک کو ذرا سا دھکیلنے کے بعد جھجک کر پیچھے ہوا ہے —

مشاہد نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ پھر آن کر دیا۔

اگلے ٹائر میں ہوا کم تھی... وہ ذرا پیچھے ہوا تاکہ اُس پر بوجھ کم پڑے۔

راستے پھر ویران تھے —

اکادکا فائر کی آواز معمول کے مطابق تھی۔

مرڈر شل بریڈ مرڈر نل دے اینڈ آف ہسٹری...

مُردہ مور کے پنجوں کے نشان سات کمروں والی کوٹھی کے ساتوں کمروں میں ثبت تھے جیسے پارسی اپنے تہواروں پر سیڑھیوں پر گُل بوٹے ثبت کرتے تھے۔

زیرو پلس زیرو از ایکول ٹو زیرو —

اگلے ٹائر میں ہوا بہت ہی کم تھی اور مردان کے چہرے پر ایک فکرمندی آئی جو اُن فکرمندی کے علاوہ تھی جو مشاہد کے لئے تھی — انہوں نے پتہ نہیں کیسے کس ملبے کے بوجھ تلے دب کر اپنی ایک ٹانگ کو فریکچر کر لیا تھا اور اب پلاسٹر میں بندھے ایک چھڑی کے سہارے چلتے تھے۔ بھرجائی برگیتا کی آواز میں جب اس نے فون کیا تو ایک اطمینان تو تھا اُس میں گھبراہٹ کے ریزے بھی تھے جو اس کے اندر تک گئے۔ آج شام لاہور جانے والی ٹرین کا ٹکٹ اُس کی جیب میں تھا۔ وہ بُکنگ کروا کے سٹیشن سے واپس آ رہا تھا۔

ڈز — ایک اور سٹرے بُلٹ — جانے اُس سے کتنے فاصلے پر اور کس کے لئے میں ان دیکھا شوٹ کرتا ہوا گیا تھا۔

اور ایک سٹرے بُلٹ کیا ہے —

Stray — راہ راست سے ہٹ جانا۔ گمراہ ہونا — بھٹک جانا — بھولا بھٹکا رہ....

Bullet — اس کے بہت سارے معانی نہیں تھے — بس ایک گولی۔

اس کے پاؤں ایک ہموار آن ذری رفتار سے پیڈلوں پر دائرے بناتے ہوئے چلنے لگے تھے۔

روڈ بلاکس پر کسی بھی وردی پوش نے اسے نہیں روکا — وہ اُن کے لئے ایک بے حیثیت اور کم عقل سائیکلسٹ تھا جو ایک سٹرے بُلٹ کی طرح راہ راست سے ہٹ کر پتہ نہیں کدھر چلا آیا تھا اور کدھر جا رہا تھا۔

شیشم کے دو درخت تیزی سے بڑھ رہے تھے — اُچیاں لمیاں ٹاہلیاں اور اُن کے پتے ہوا کے زور سے تالیاں بجاتے تھے۔ اُس نے سڑک پر سے نگاہ ہٹا کر اُوپر دیکھا — کراچی کے بد رنگ آسمان پر بہت بلندی پر چند گدھ پَر پھیلائے معلق نظر آتے تھے.. اِس آسمان تلے بان کی ایک چارپائی کیسے بچھ سکتی ہے — وہ درخت جن میں سے وہ وحشت، برہنگی اور شرمندگی سے گزرتا تھا ایک جانور کی طرح وہ کونسے تھے — اُن سے پتے نہیں ناریل ٹپ ٹپ گرتے تھے اور اُن کے اندر سُندر بن کے گہرے اندھیرے اور لشکتی آنکھوں والے جنور اسے اپنا جان کر راستہ دیتے تھے — وہ درخت شیشم کے نہیں تھے... اپنے نہیں تھے... اجنبی تھے۔ اُن کے نیچے جو نرم گھاس والی دلدل تھی وہ نا آشنائی اور مغائرت کی تھی... لیکن اُس کے اگلے ٹائر میں ہوا کم تھی اور تیسری بیرک کے برآمدے میں شوبھا کچے راستے پر نظریں جمائے اس کی منتظر تھی۔ دوسری بیرک میں مُکلی کے تعویز اور اُن پر زرد دھوپ ایسے پتھروں پر کھدے بیل بوٹے اور سپاہی ابھی بے جان تھے، پتھر تھے اور منتظر تھے...شائد عارفین بھی —

پتہ نہیں بُکنگ کے باوجود شام کی ٹرین میں اسے نشست ملتی بھی ہے یا نہیں — نہ ملے تو بھی وہ پورا سفر راہداری میں ٹہل کر گزار سکتا تھا — اگرچہ برگیتا کی آواز میں اطمینان تھا — لیکن وہ اُس گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے مشاہد کے پاس جانا چاہتا تھا جس کے ذرّے اس کے بدن میں ابھی تک کیکر کی سُولوں کی طرح کھبے ہوئے تھے، اُسے زخما رہے تھے۔

کیپٹن گُل ریز اور کیپٹن دلاور خان کو اب تک واپس آ جانا چاہئے تھا — اور وہ نہیں آئے تھے، باہر جیسور میس کے باہر سازشی رات کے اندر وہ گئے تھے اور اُن کی گشت صرف دو گھنٹے کے لئے تھی اور اب تیس منٹ اُوپر ہو چکے تھے اور وہ لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ کیپٹن مردان علی بار بار اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتا تھا اور میس سے باہر دیکھتا تھا — اس کے جوان واپس نہیں آئے تھے۔

اور یہ پہلی بار نہیں تھا کہ جوان واپس نہیں آئے تھے — اس سے پیشتر — وہ ملے تھے تو اُن کی شکلیں بگڑی ہوئی تھیں اور وہ یونیفارم میں نہیں تھے اس لئے کیپٹن مردان علی بار بار اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتا تھا اور اُس کے دل میں مکتی باہنی کے ان بنگالی باسٹرڈز کے لئے نفرت کے پہلو بہ پہلو خوف کا عنصر بھی کروٹیں لیتا تھا — ایک کروٹ میں اُن کی بگڑی ہوئی شکلیں، کسی دلدل میں... کسی درخت سے لٹکتے ہوئے دیکھتا تھا۔

"یہ باسٹرڈز ابھی تک کیوں نہیں آئے؟" اس نے صوبیدار علی احمد کی طرف دیکھا جو بار بار کھڑکی سے باہر تاریکی میں جھانکتا تھا۔

"آئیں گے سر، انشاء اللہ آئیں گے۔ شائد مکتی حرامیوں کا صفایا کر رہے ہوں سر — بہادر لوگ ہیں سر —"

"ہاں — دے آر بریو لیڈز — لیکن وہ واپس کیوں نہیں آئے —"

اگلے ٹائر میں ہوا واقعی بہت کم تھی اور اُس نے اپنی رفتار آہستہ کر دی۔

سڑک پر اکا دُکا کاریں آ جا رہی تھیں۔

شوبھا کے بعد زندگی کا ارینج منٹ کیا ہو گا؟

عارفین بہت کم اُس کے سامنے آتی تھی۔ ایک اجتناب اس کی آنکھوں اور بدن کی حرکت میں تھا جیسے اُس نے اپنے آپ کو پابند کر لیا ہو۔ وہ اُس کا نام لینے سے بھی گریز کرتی تھی۔ بیٹ مین بشیر اُسے ناراضگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ وہ غیر محسوس طریقے سے مردان کی ذات سے متعلق گھریلو کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لے رہی تھی۔ شوبھا کے بعد کی زندگی میں اپنے جِگ سا پزل کا ایک ٹکڑا اُس کے ساتھ جوڑنے کا شائبہ سا ہوتا تھا۔ کیا یہ ممکن ہو گا؟ وہ دھکیلا نہیں جانا چاہتا تھا... کسی بھی ارینج منٹ میں — جب آنٹی بابر کا گھر اُداسی اور بے وطنی میں ایک پناہ گاہ تھی... چائے کے ساتھ ہمدردی ملتی تھی جو اُداسی کا توڑ تھی اور عارفین اور نازنین کی آوازوں اور اُن کی خوش گفتاری میں کانونٹ کے دل کو مٹھی میں بھر لینے والے لہجے تھے — لیکن اُن زمانوں کو گزرے تو زمانے ہو چکے تھے —

سڑک پر ٹریفک اب زیادہ ہونے لگی تھی۔

وہ اب بھی عارفین کے سامنے نظر جھکا کر بات کرتا تھا۔

اس کے اجتناب نے اور نام لینے سے گریز نے اسے خبر کی تھی کہ عارفین شائد

حالات کے بوجھ تلے یا شاید واقعی اس کے عشق کے ایسے تناؤ میں آچکی تھی جس میں نتھنے چڑنے کو آ جاتے ہیں... لیکن اُس مرجع خلائق گھر میں جواب ایک غیر ملک میں تھا اور ملیر کینٹ کی بیرک نمبر تین کے درمیان مُسندربن کا ایک سلسلہ تھا جس میں مردان اب تک ایک بے لگام اور نیم وحشی کیفیت میں سلگتی آنکھوں اور دامن کھینچتی جھاڑیوں اور ٹپ ٹپ گرتے ناریل اور دلدلوں میں سے پاؤں اکھیڑتا بھاگ رہا تھا... ایک عرصے سے یہ فرار مکمل نہیں ہو رہا تھا... وہ کیسے اس کے تسلسل میں رک کر عارفین کے عشق کی تنی ہوئی باگیں دیکھتا اور اُن کو ڈھیلا کر کے اُسے سکھ چین سے اپنی آئندہ زندگی میں داخل کرتا —

وہ اب تک واپس کیوں نہیں آئے —

جیسور میس کے باہر ایک ٹھہری ہوئی نیم تاریکی میں وہ گئے تھے اور ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ یہ ایک رُوٹین ریکی تھی — دو آفیسر اپنے جوانوں سمیت آس پاس کے علاقے میں دو گھنٹوں کے لئے گشت پر نکلتے۔ اگر کوئی مکتی باہنی یا کوئی بھی مخدوش لرزتا ہوا دھوتی پوش سایہ جو شاخوں کو ہٹاتے یکدم سامنے آ جاتا اور بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ اگر اُسے آن دے سپاٹ شوٹ نہ کرتے تو گردن سے پکڑ کر واپس لے آتے — اور پھر شوٹ کر دیتے... یہی روٹین تھی... اور انہیں دیر ہو رہی تھی۔ تاخیر کا ہر لمحہ اُن کی شکلیں بگاڑ کر مُردہ کر رہا تھا۔ وہ اگر اُن کے ہتھے چڑھ جاتے تو اُن کی بھی یہی روٹین تھی۔ دلدل میں برہنہ جسم، بگڑی ہوئی شکلیں — وہ سب کچھ اُتار لیتے لیکن کلائی پر بندھی گھڑی کبھی نہ اُتارتے، اُن پر وقت کی سوئیاں حرکت کرتی رہتیں۔ وہ تھم جاتے تھے اور وقت آگے چلا جاتا تھا۔ اور اُن کی پہچان عام طور پر گھڑی کے میک سے ہوتی... کیپٹن خانزادہ — سیکو، لفٹنٹ جہان... سیٹیزن... کرنل آفندی... رولیکس۔ انہوں نے اپنے تئیں لاپروائی کی نظر سے ہمیشہ ایک دوسرے کی گھڑیوں کے میک نوٹ کر رکھے تھے تاکہ...

اور وہ اب چالیس منٹ لیٹ تھے۔

مردان نے سپورٹس سائیکل کے ہینڈل سے ایک ہاتھ اُٹھا کر جیکٹ کی جیب کو چھُوا... حیدر آبادی چوڑیوں کی گولائی ابھی تک مکمل تھی اور اُن میں سے ایک بھی نہیں ٹوٹی تھی... اور یہ شوبھا کے لئے تھیں۔ اظہار کے لئے اس نے بہت اہتمام اور فراخ دلی

سے اپنے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ ناکام رہا تھا۔ کیونکہ وہ فتح جنگی اَن گھڑا اور اکڑی ہوئی گردن والا باریش لڑکا جدائی کا سبب بننے کو تھا اس لئے...

اس کی مٹھیوں میں پسینہ آ رہا تھا... سردیاں تھیں لیکن... کراچی نے موسم کی خنکی کو قبول نہیں کیا تھا اور اپنے نم آلود نیم صحرائی مزاج کو چار چفیرے محیط کر رکھا تھا۔

جیسور کے بعد اس نے کلائی پر گھڑی باندھنا چھوڑ دیا تھا... انسان کی پہچان کا اس سے زیادہ ہتک آمیز طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

اگر اگلے ٹائر میں سے ہوا بالکل نکل گئی تو بہت ستم ہو گا... مصیبت ہو گی۔ ان زمانوں سے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر روزی کمانے والے، دیہاڑی دار مزدور، ٹھیلے والے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ ہوا بھرنے والا پمپ کسی فٹ پاتھی سائیکل ورکس سے ہی دستیاب ہو سکتا تھا۔ یہ ستم نہ ہو تو اچھا ہے — وہ ذرا سا اور پیچھے ہوا تاکہ ٹائر پر بوجھ اور کم ہو۔

ایک بیٹی کی شادی کا پہلا قدم کونسا ہوتا ہے — شادی کارڈز کی چھپائی اور... اس سے آگے سب کچھ نامعلوم تھا لیکن برگیتا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ سنبھال لے گی۔

میس کے اندر بھی تاریکی تھی... پردے گرے ہوئے تھے اور زیرو کا ایک بلب روشن تھا۔ باہر کی نامعلوم اور گھناؤنی رات میں اُن کا ٹارگٹ آسان ہو جاتا اگر اندر روشنی ہوتی... اور وہ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔

"صوبیدار احمد علی —"

"سَر —"

"آؤ —"

"سَر —"

وہ دونوں میس کے چوبی برآمدے پر آہستگی سے پاؤں رکھتے گھنی رات اور گہرے جنگل میں آ گئے چونکہ وہ خود متعدد بار اس گشت پر آ چکا تھا اس لئے سمت کا اُسے اندازہ تھا۔

کوئی ایک جھینگر تھا جس کی آواز مسلسل اُن کا ساتھ دے رہی تھی جیسے وہ اُن کا پیچھا کر رہا ہو اور اُس کے سوا ہوا کی سرسراہٹ تھی جو کبھی سرگوشیوں میں مدھم ہوتی تھی

اور کبھی اس میں اُن آوازوں کا گمان ہوتا تھا جن کی بولی سے وہ ناآشنا تھا۔

"احمد علی ___"

"سَر ___" اور صوبیدار احمد علی نے یہ "سَر ___" اتنی ہی بلند اور گونجدار آواز میں کہا جتنی کہ وہ جیسور میس کے اندر کیپٹن صاحب کے پکارنے پر شن ہو کر کہتا تھا اور پھر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ اس "سَر ___" کی آواز پورے جنگل میں گونجی ہے... اور اس نے ایک مرتبہ پھر احتیاط بھری سرگوشی میں آہستہ سے "سَر ___" کہا۔

"تم شادی شدہ ہو؟"

"سَر ___"

"بچے ہیں؟"

"تین ہیں سَر ___"

"احتیاط برتو ___"

"سَر ___"

لبلبی پر بھی اُنگلی پسینے سے بھیگتی تھی۔

مردان نے دونوں ہاتھ باری باری سائیکل کے ہینڈل سے الگ کر کے مٹھیوں میں آئے ہوئے پسینے کو جین پر پونچھا۔ اُس کی ٹانگ میں گھٹنے سے اُوپر ہاتھ پونچھنے سے ایک ٹیس اُٹھی۔ دسمبر کی پرانی چوٹیں ابھی فراموش نہیں ہوئی تھیں... جگ سا پزل کا ایک حصہ... وقت کی ایک کترن پر نامردی رقم تھی۔ عارفین کیسے زندگی کے ارینج منٹ میں شامل ہو سکتی تھی۔ کیا جنس کی غیر موجودگی میں ایک رشتہ قائم رہ سکتا ہے ___ اس نے مڑ کر دیکھا... کیریئر پر بندھے لفافے میں شوبھا کے لئے ایک سفید اوور آل تھا جس میں ابھی درملین کی بو نہیں تھی۔

اس نے اندھیرے میں چمکتے ڈائل پر ایک نگاہ کی... اومیگا سی ماسٹر کی سیکنڈ کی سوئی رُک رُک کر اٹکتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے فوراً اپنا کف اس کے اُوپر کیا کہ اس گھنی رات میں اس کا چمکتا ڈائل ایک الاؤ کی طرح روشن لگتا تھا ___ اُن کی آنکھیں دُکھنے کو آتی تھیں اور وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اُن کی تلاش میں تھیں جنہیں دو گھنٹے پیشتر واپس

آ جاتا تھا۔ وہ اب زمین کی طرف دیکھتے چلتے تھے اس خوفزدہ یقین کے ساتھ کہ اُن کے راستے میں شائد اب ان کی لاشوں کی رکاوٹ آ جائے۔

ہوا ایک لخت تھم گئی ___ اور ایک مکمل خاموشی ابر آلود آسمان سے اُتر کر جنگل کی پہنائیوں میں جذب ہو گئی ___ اُن کے قدم بھی رُک گئے ___ دم سادھے ہوئے جب مردان نے ایک قدم آگے بڑھایا تو نرم گھاس اور گیلی زمین پر پڑنے کے باوجود اس میں اتنا شور تھا جیسے غدر برپا ہو گیا ہو... ایک اور قدم... اور حد درجہ احتیاط لیکن بہت دور تک علم ہوتا تھا کہ کوئی اس سکوت میں چلتا ہے... وہ کتنی دیر ہوا کے چلنے کا انتظار کرتے۔ بالآخر انہوں نے پھر دانت بھینچتے ہوئے اپنے پاؤں میں بدن کے پورے اختیار اور احتیاط کو اُتارتے ہوئے چلنا شروع کر دیا... پھر وہ قدرے لاپرواہ ہو گئے۔

"احمد علی ___"

"سَر ___"

"تم نے کچھ سُنا ___"

"سَر ___"

"کیا؟"

"کوئی ہنس رہا ہے سَر... بلکہ بہت سارے لوگ ہنس رہے ہیں"

رُک کر قدم روک کر وہ کان لگا کر سننے لگے۔

"کون ہو سکتا ہے؟"

"مکتی باہنی سَر ___" احمد علی کے بدن میں خطرے کی بُو سے ایک دلیری آئی

"بے ایمان ہیں سَر ___ عیش کر رہے ہیں۔ ہم ایبوش کرتے ہیں سَر ___"

لیکن ہنسی عیش کی نہیں، ہسٹریائی لگتی تھی۔

لوڈڈ میگزین کی موجودگی پر اُنگلیوں نے اطمینان کیا اور وہ اپنے راستے میں حائل شاخوں اور ٹہنیوں کو ایک ہاتھ سے ہٹاتے ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے اپنے آپ میں دلیری اور ہمت کو سرایت کرتے آگے بڑھنے لگے۔

قربت... پتوں کو ہٹانے اور ٹہنیوں کے نیچے سے جھکتے گزرتے اور قدم اُٹھانے سے اندھیرے میں... ہنسی کی آواز واضح اور صاف ہونے لگی۔

یہ آواز شناسا اور مانوس تھی... کہیں سُن رکھی تھی، یہ ہنسی کی پُرجوش اور ہسٹریائی

آواز... یکدم ان کے گمان کے بغیر، توقع سے جدا جو ایک گھنی شاخ انہوں نے اُٹھائی تو ہنسی کی آواز براہ راست اُن تک آ گئی اور انہوں نے کیپٹن گل ریز اور کیپٹن خانزادہ کو جنگل کے ایک نسبتاً ہموار اور درختوں سے خالی حصے میں دیکھا۔

لالٹین کی لو بہت مدھم تھی جو ایک حوالدار نے اُٹھا رکھی تھی لیکن یہ مدھم لو بھی بہت تھی۔

کیپٹن گل ریز نہیں صرف کیپٹن خانزادہ ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔

کیونکہ کیپٹن گل ریز نے دونوں ہاتھوں سے اُس تلوار کو تھام رکھا تھا اور وار کرنے کو تھا۔

ایک سہمے ہوئے شخص کی بے چارگی سے مردان نے صرف اس تلوار کو دیکھا جو ایک نامعلوم مدت سے جیسور میس کے ڈائننگ ہال کے داخلے پر محراب کے عین اُوپر سجاوٹ کے طور پر آویزاں تھی... اس کی تاریخ بھی نامعلوم تھی، لیکن اُس کے دستے کے علاوہ پورا بلیڈ زنگ آلود تھا... مشرقی پاکستان کی نم آب و ہوا نے اس کی دھار کند کر دی تھی۔

لالٹین کی مدھم اور گم ہوتی، پھر سے تیرتی، واپس آتی روشنی میں، دھوپ سایوں میں کیپٹن گل ریز کے آگے ایک عورت ناکافی ساڑھی میں لپٹی سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے کسی آرٹس کالج کے طالب علموں کے سامنے ایک ماڈل بے حس و حرکت اپنے آپ کو ساکت کئے بیٹھا ہے تاکہ پنسل کی کوئی سٹروک آگے پیچھے نہ ہو جائے۔

تلوار کی سٹروک اس کی گردن پر آئی اور وہ اسی طرح تڑپے بغیر بے حس و حرکت زمین پر لڑھک گئی۔

"یُو مِسڈ اِٹ یُو باسٹرڈ — یُو مِسڈ اِٹ" کیپٹن خانزادہ نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے چلا کر کہا "یُو مِسڈ اِٹ —"

گل ریز نے پشیمانی اور شرمندگی میں ایک اور وار کیا لیکن تلوار کو بلند کر کے نہیں، ایک نزدیکی فاصلے سے اور عورت کے بدن اور سر کے درمیان جو ایک لوتھڑا تھا، شہ رگ تھی، رابطہ تھا یا ایک تار تھی، اُسے کاٹ دیا... سر کے بغیر انسان کا دھڑ کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے صرف وہی جان سکتے ہیں جنہوں نے اسے دیکھا ہو۔

"عاشق علی —"

"سَر —"

"گراؤنڈ کلیئر کرو یارا —" گل ریز نے ایک میٹر آف فیکٹ آرڈر اِشو کیا۔

عاشق علی نے جو لالٹین اُٹھائے کھڑا تھا، اُسے زمین پر رکھ کر آگے آیا اور عورت کے دونوں حصوں کو سر کے بالوں اور دھڑ کو ساڑھی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک جانب کر دیا۔

"Next" گل ریز نے اطمینان سے کہا۔

سب ایک قطار میں سر جھکائے بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے... کچھ جوان تھے... کچھ بوڑھے تھے، کچھ بچے بھی تھے لیکن سب کے سب اپنے حال پر قانع سر جھکائے بیٹھے تھے۔ صرف غور سے دیکھنے پر اُن کے ناتواں جسموں کی لرزش اور ریلوں کی سی اُن کے بھنچے ہوئے لبوں میں سے نکلتی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

گل ریز کے Next کہنے پر ایک بوڑھا جھکا جھکا ہوا آگے آیا اور اپنے آپ کو عین اُس جگہ پر بٹھایا جہاں پر دو دھڑوں والی عورت کا خون ابھی گرم تھا اور زمین میں جذب نہیں ہو رہا تھا۔

"خانزادہ یار تم میں زور نہیں۔ شرط یہ تھی کہ تلوار کے ایک ہی وار سے گردن دھڑ سے الگ ہو کر گرنی چاہئے۔ اب ذرا ہمارا زور اور مشاقی دیکھو۔"

جہاں عورت کی ساڑھی ابھی تک خون اپنے اندر سمو رہی تھی اور اُس کا سَر اور آنکھیں ابھی مکمل طور پر بے جان نہیں تھیں اگرچہ سیاہ اور بڑی بڑی تھیں وہاں چھ سات اور بھی دھڑ تھے جو سرد ہو چکے تھے۔

مردان جتنی دیر میں شاخوں سے الجھتا اور اپنے ماؤف دماغ میں اس تصویر کی جنونیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا اُس کلیئرنگ تک پہنچا گل ریز کی زنگ آلود اور کُند تلوار کا بلیڈ چھکی داڑھی والے بوڑھے کو دو حصوں میں الگ الگ کر چکا تھا اور ابھی اگر اس میں کوئی خون تھا تو وہ وار کے اچانک پن اور شدت سے لمحہ بھر کے لئے رُکا ہوا تھا۔ بوڑھے کی داڑھی میں حنا کی سرخی رچتی ہوئی اسے نم کرنے لگی جب مردان نے گل ریز کے ہاتھ کو اپنے شکنجے میں لیا...

"What the hell do you think you are doing captain?"

گل ریز جو کہیں اور تھا، اپنی ٹرانس میں سے باہر آیا تو اپنے سامنے ایک سینئر

کولیگ کو دیکھا، اس کی جانوروں کی طرح چمکتی آنکھوں کو دیکھا "مکتی باہنی یار — ادھر ہم گشت پر نکلے تو یہ لوگ جنگل میں رینگ رہے تھے۔ ہم نے گھیرا ڈال کر انہیں راؤنڈ اپ کیا تو... کہنے لگے ہم ادھر جا رہے ہیں، ٹو وارڈز انڈیا —"

"تم انہیں قتل کیوں کر رہے ہو؟"

وہی عیش کی نہیں ہسٹریائی ہنسی، کیپٹن خانزادہ کے ہنس ہنس کر دوہرے ہونے سے سنائی دی "Just a game sir, no harm done"... صرف ایک کھیل سر — کہ کون ایک ہی وار سے اِس زنگ آلود تلوار سے — اینڈ ڈو یو نو مردان کہ یہ مغل پیریڈ ہے اور جیسور میس میں ایک سو تیس برس سے آویزاں ہے... ہاں میں تاریخ کے بارے میں کچھ جانتا ہوں... تو ایک ہی وار میں کون اِن باسٹرڈز کی گردن جدا کرتا ہے"

"اور میں جیت گیا — " گل ریز نے انگلی اُٹھا کر کہا اور ایک بے قابو ہنسی میں کہا "میں نے تین بار اور اِس نے صرف ایک بار — کم آن سر آپ بھی قسمت آزمائی کریں .. صرف ایک کھیل ہے... کسی کا کچھ نقصان نہیں ہوتا —"

"ہاں کسی کا کچھ نقصان نہیں ہوتا یارا —"

اُس نے زنگ سے بھری، گاڑھے خون سے بھری تلوار کو دیکھا — " میرا نام کیپٹن مردان علی خان نہیں ہے اگر تم نے جو کچھ کیا ہے اس کی قیمت نہ ادا کرو — کسی کا کچھ نقصان نہیں ہو گا یارا — صرف ایک اور کھیل —"

تیئس برسوں میں بہت دن رات ہوتے ہیں۔ اُن سب راتوں اور دنوں میں وہ زنگ آلود کند اور گاڑھے خون میں لپٹی تلوار اُس کے سامنے آہستہ آہستہ اس کے سامنے آتی رہی...

اگلے ٹائر میں ہوا تشویش ناک حد تک کم ہو رہی تھی۔

وہ ذرا اور پیچھے ہوا —

اُسی لمحے تیئس برسوں کے بعد اس کی ٹانگ میں ایک ٹیس اُٹھی اور اُس کے سینے میں ایک گرم تیرتی ہوئی جلن نے راہ بنائی —

کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔ کوئی بھی متوجہ نہ ہوا کہ سڑک پر ایک سائیکل پڑی ہے اور اُس کا اگلا ٹائر جس میں ہوا بہت کم ہے ابھی تک آہستگی سے حرکت میں ہے اور

اُس کے قریب کوئی شخص ہے جس کے منہ سے گاڑھا خون بہتا ہے اور تارکول میں جذب نہیں ہو رہا۔

ایک سٹرے بلٹ کیا ہے؟

Stray — راہ راست سے ہٹ جانا... گمراہ ہو جانا... بھولا بھٹکا آوارہ۔

Bullet — ایک گولی۔

کیریئر پر بندھا اوور آل ابھی تک سفید اور بے داغ تھا اور ایک پتلی سرخ لکیر اُس کی جانب رینگ رہی تھی۔ حیدر آبادی چوڑیوں میں سے صرف ایک کا دائرہ ٹوٹ کر کانچ کی دو قوسوں میں دو دھڑوں کی طرح الگ الگ ہوا تھا۔

مردان کی نظر اور سامنے کا منظر دھندلانے لگا اور اُس میں شیشم کے دو درخت بلند ہونے لگے کہ شیشم تیزی سے بڑھتا ہے اور اُن کی چھاؤں گھنی ہونے لگی اور اُن میں تیز ہوا چلتی تھی اور اُن کے پتے تالیاں بجاتے تھے اور گرتے تھے تو اس کے آس پاس میں اور اُس کے چہرے پر گرتے تھے۔ اُن کی چھاؤں تلے وہاں بان کی ایک چارپائی بھی بچھی تھی اور وہ اُس پر لیٹنا چاہتا تھا... اگرچہ موسم سردیوں کے تھے لیکن ایک بھری شکر دوپہر تھی جس میں سورج نیچے ہو کر اُس کے سر پر پگھلتا تھا اور دھوپ کی سفید گرمی میں جھولتا، لہریں لیتا ایک خالی تانگہ کوچوان کے بغیر اُس کی جانب گھوڑے کے پاؤں میں بندھے گھنگھروؤں کی چھنکار میں مست اس کی جانب آتا تھا... اور کون کہتا تھا کہ... بھائی لوہاری بھئی، کلّی سواری بھئی... اکلوتی سواری کے عین سامنے آ کر تانگے سے گھوڑا الگ ہوا... ایک سیاہ لشکتا وجود پسینے سے نہایا ہوا جو اپنے گھنگھرو چھنکاتا اُس کی طرف بڑھتا آ رہا ہے... نیں میں جاناں جوگی دے نال...

اور جوگی کا منہ سڑک کے تارکول پر کھلا تھا اور اُس میں سے جو خون رستا تھا وہ جذب نہ ہوتا تھا۔

شیشم کی چھاؤں اُس پر سایہ کرتی جاتی تھی۔ آسمان اس کی بے شمار شاخوں، ٹہنیوں اور تالیاں بجاتے پتوں سے ڈھک گیا تھا اور کہیں سے بھی اس کی نیلاہٹ کی جھلک نظر نہ آتی تھی اور وہ بان کی چارپائی پر لیٹنا چاہتا تھا۔ چوہدری اللہ داد کی مشرقی پاکستان کی تصویروں میں جو بادبان تھے وہ سارے کے سارے کھل گئے تھے اور تمام کشتیاں اس کی جانب رواں تھیں...

جو ٹاہلیاں اُچیاں لمیاں تھیں اُن کے پتّے دھندلاتی آنکھوں کے سامنے سارے کے سارے زرد ہو گئے اور ناآشنا ہواؤں کے زور سے ٹہنیوں سے جُدا ہو کر گرنے لگے... یوں کہ اُن پر ایک پتّہ بھی باقی نہ رہا اور کراچی کا بے رنگ آسمان پھر سے دکھائی دینے لگا اور وہ پتّے کٹی پتنگوں کی طرح ڈولتے گرتے... پَر کٹے راکھ کے سیاہ پرندوں کی طرح بے اختیار نیچے آ رہے تھے .. اُس کے بدن پر اور سپورٹس سائیکل پر اور اُس کے کیریئر پر ابھی تک بندھے سفید اوور آل پر اور خون جو جذب نہیں ہو رہا تھا اس پر وہ جھولتے ہوئے، ڈولتے ہوئے گرتے رہے اور اُسے... ڈھک دیا ایسے کہ دور سے وہ زمین پر گرا ہوا ایک شیشم کا درخت دکھائی دیتا تھا جس کی ٹہنیاں نہیں تھیں صرف ڈھیر پتّوں کا تھا... اُن میں کہیں بھی ایک سفید شگوفہ نہ تھا... اور یہ ہم ہیں... عشقے دا اِک پلنگ نواڑی وے اَساں چانیاں وِچ ڈاہیا...

بیرک نمبر تین کے برآمدے میں اُدھر جہاں سے دُھول اُٹھتی تھی شوبھا کی آنکھیں دیکھ دیکھ کر تھکتی تھیں۔

عارفین بھی تیز ہوا میں چرچراتے ہوئے ایک کواڑ کے عقب میں سے اُدھر دیکھتی تھی جدھر دُھول اُٹھتی تھی... اور اُس دُھول کے اندر ایک سفید ایمبولنس چلی آتی تھی۔

بیرک نمبر دو کے کواڑ اتنی آہستگی سے کھلے کہ وہ دونوں اُدھر متوجہ نہ ہوئیں۔

ان کواڑوں کے اندر بیرک نمبر دو کے اندر ڈھلتی زرد دھوپ ایسے پتھروں پر جامد نقش ارغون۔ ترکھان سمّا اور کلہوڑہ خاندان کی قبروں کے تعویزوں پر کندہ سپاہی اور گھوڑے سیال ہوئے، حرکت میں آئے... وہ اپنی پتھر قید میں سے نکلے اور آہستگی سے کھلنے والے کواڑوں سے باہر نکلے، اُوپر گزرنے والے ایک جیٹ کی پُر خراش آواز سے لاتعلق اور بے پرواہ اب کواڑوں سے باہر نکلے اور نہ قدموں کی چاپ تھی اور نہ سموں کی آواز وہ برآمدے میں بیٹھی شوبھا کے عقب میں ایستادہ ہو گئے، گھوڑے سیاہ تھے، سپاہیوں کے نین نقش سالخوردہ تھے اور اُن کی ڈھالیں اور تلواریں زنگ آلود تھیں۔ شوبھا نے پلٹ کر اگرچہ اُن کی کوئی آہٹ نہ تھی صرف موجودگی کا احساس تھا، اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی ایک منتظر کیفیت میں تھے... اُن کے ہمراہ وہ تمام بیل بوٹے جو ابھی پتھر تھے اور ابھی سندر بن کے جنگلوں کی طرح متحرک اور زندہ تھے... سپاہی، اُن کی ڈھالیں اور تلواریں اور مکلی کے نقش ایک قطار میں کھڑے اُدھر دیکھتے تھے جدھر دُھول اُٹھتی تھی...